

ندوة المستفین دہلی کا ماہوار رسالہ

# برہان

مرتب ہے  
سعید احمد کسرا آبادی  
ایم لے۔ فارمیل دیوبند



# ندوة المصنفین کی کتابیں الرق فی الاسلام اسلام میں غلامی کی حقیقت

تالیف مولانا سعید احمد ایم۔ اے۔ مدیر برہان

کتاب کے اس حصہ میں غلامی کی حقیقت، اس کے اقتصادی، اخلاقی اور نفسیاتی پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد بتایا گیا ہے کہ غلامی انسانوں کی خرید و فروخت کی ابتدا کب سے ہوئی۔ اسلام سے پہلے کن کن قوموں میں یہ رواج پایا جاتا تھا اور اس کی صورتیں کیا تھیں، اسلام نے اس میں کیا کیا اصلاحیں کیں اور ان اصلاحوں کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا نیز مشہور مصنفین یورپ کے بیانات اور یورپ کی ہلاکت خیز اجتماعی غلامی پر مبسوط تبصرہ کیا گیا ہے۔

یورپ کے ارباب تالیف و تبلیغ نے اسلامی تعلیمات کو بدنام کرنے کے لیے جن حربوں سے کام لیا ہے ان تمام حربوں میں سیوری کا مسئلہ بہت ہی موثر ثابت ہوا ہے۔ یورپ امریکہ کے علمی تبلیغی حلقوں میں اس کا مخصوص طور پر چرچا ہے اور جدید ترقی یافتہ ممالک میں اس مسئلہ میں غلط فہمی کی وجہ سے اسلامی تبلیغ کے لیے بڑی رکاوٹ ہو رہی ہے، بلکہ مغربی قوموں کے باعث ہندوستان کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس سے لڑ پڑ رہا ہے۔ انشاء جدید کے قالب میں اگر آپ اس باب میں اسلامی نقطہ نظر کے ماتحت ایک مختصر و سچا بحث دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ضرور دیکھیے۔ جلد سے غیر جلد پیکر

## تعلیمات اسلام اور سچی قوم

تالیف مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند رفیق اعزازی

مؤلف نے اس کتاب میں مغربی تہذیب تمدن کی ظاہر آرائیوں کے مقابل میں اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کو ایک خاص متنوعانہ انداز میں پیش کیا ہے اور تعلیمات اسلامی کی جامعیت پر بحث کرتے ہوئے دلائل و واقعات کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ موجودہ عیسائی قوموں کی ترقی یافتہ ذہنیت کی مادی جدت طرازیں اسلامی تعلیمات ہی کے برعکس آثار کا نتیجہ ہیں اور جنہیں قدرتی طور پر اسلام کے دروہیات ہی میں نمایاں ہونا چاہیے تھا۔ اسی کے ساتھ موجودہ تمدن کے انجام پر بھی بحث کی گئی ہے اور یہ کہ آج کی ترقی یافتہ عیسائی قومیں آئندہ کس نقطہ پر ٹھہرنے والی ہیں۔ ان مباحث کے علاوہ بہت سے مختلف ضمنی مباحث آئے ہیں جن کا اندازہ کتاب کے مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ کتابت و طبعت اعلیٰ، بشرین سفید چمکا کاغذ، صفحات تقریباً ۲۰۰ قیمت غیر جلد ۵۰ سہری جلد ۶۰



# برہان

شمارہ ۱

جلد چہارم

ذی الحجہ ۱۳۵۸ھ مطابق جنوری ۱۹۲۰ء

۱	سید احمد اکبر آبادی	۱۔ نظرات
۹	مولانا عبدالمالک صاحب آزدی	۲۔ بعض مشہور مذاہب کے صحف مقدسہ کی ترتیب اور قرآن مجید کی لسانیاتی اہمیت
۳۰	مولانا محمد غفار الرحمن صاحب سیواری	۳۔ عدم تشدد۔ گاندھی جی کے ایک مکتوب پر تبصرہ
۴۷	شمس العطار مولانا عبد الرحمن صاحب	۴۔ معاہدہ یہود علی نقطہ نظر سے
۶۵	حکیم عبد القوی صاحب دریا بادی	۵۔ تلخیص ترجمہ: گوشتے اور اسلام
۷۱	حضرت بکر مسعود جاوید، رشدی	۶۔ ادبیات
۷۳	س۔ ۱	۷۔ شئونِ علمیہ
۷۸	س۔ ۱	۸۔ تبصرے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

# نظرات

## تعلیم و زبان کے دو جلے

دسمبر کے ختم پر ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم اور زبان کے دو اہم جلسے ہوئے۔ ایک جلسہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا تھاجو کلکتہ میں ۲۹ سے ۳۱ تک نواب کمال یار جنگ بہادر کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ اس جلسہ کو اس اعتبار سے خاص اہمیت حاصل ہے کہ یہ مسلمانان ہند کی سب سے پرانی انجمن کا باونواں جلسہ تھا۔ دوسرا جلسہ جو مسلمانوں کی زبان سے متعلق ہے۔ انجمن ترقی اردو کا "کل ہند" اجلاس ہے جو دہلی میں ۲۹، ۳۰ کو نواب ممدی یار جنگ بہادر کی زیر صدارت انجام پایا۔

اس وقت مسلمانان ہند موت و حیات کی جس دردناک کشمکش سے گزر رہے ہیں اور ان پر کہیں جمہور محسن کہیں بے راہ ردی۔ اور کہیں غابت نا اندیشانہ جوش جنوں طاری ہے۔ ان سب کا تقاضا ہے کہ بیدار مغز اور باب حل و عقد پورے غور و فکر سے کام لے کر تمام قوم کے لیے ایسی مختلف تدابیر سوچیں جو ان کو زندگی کے مختلف شعبوں میں ترقی اور اصلاح کی طرف لی جائیں۔ اور پھر صرف اسی پر کفایت کر کے نہ بیٹھ جائیں بلکہ ضرورت ہے کہ جو کچھ کہیں اُسے کر کے دکھائیں۔ جو تجاویز پاس کریں انہیں عمل میں لائیں۔ اب وقت سہل انگاری اور تساہل کا نہیں ہے۔ قافل لاکھ التفات آمیز سہی لیکن برسوں کا مرہن غم عشق اُسے برداشت نہیں کر سکتا اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہے۔



ہم نے مانا کہ تفاسل نہ کرو گے لیکن  
خاک ہو جائیگے ہم تم کو خبر ہونے تک



حقیقت بہر حال حقیقت ہے، وہ نگاہوں سے خواہ کتنے ہی عرصہ تک محفی رہے لیکن چار د  
نا چار کبھی نہ کبھی اُس کا اظہار زبان سے ہو ہی جاتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جبکہ تعلیم کا مقصد صرف ملازمتوں کا  
حاصل کرنا اور انگریزی کی برابر کرسی پر بیٹھنے کی صلاحیت و اہلیت پیدا کرنا تھا۔ اسی بنا پر اس تعلیم کو صرف  
امیروں یا متوسط لوگوں کے طبقہ تک محدود رکھا گیا تھا۔ اخراجات اس قدر تھے کہ غریب آدمی اپنے  
بچوں کو تعلیم دلا ہی نہیں سکتے تھے۔ پھر مذہب اور معاشرت اور زبان کو تعلیم سے کوئی خاص تعلق  
نہیں تھا۔ بلکہ انگریزی تعلیم سے دماغ میں جو روشنی یا آزادی پیدا ہو جاتی تھی وہ ان تینوں چیزوں سے ہی منفر  
کر دیتی تھی۔ یہاں تک کہ مسلمان برائے نام مسلمان رہ جاتا تھا۔ اسلامی طریق بود و ماند اُس کی نظر میں حقیر  
مذہبی روایات اُس کے نزدیک مجموعہ خرافات اور دینی اعمال و افعال اُس کی نگاہ میں احمقانہ حرکات  
تھیں لیکن اب اقلیت و اکثریت کے منازع للبقائے ایک مدت کے خواب گراں کے بعد آنکھیں کھول دی  
ہیں۔ اور آپ حیرت کے ساتھ سنیں گے کہ آج سیاسی اور تعلیمی پلیٹ فارموں پر بھی وہی وعظ ہوتا ہے جو مولوی  
مسجدوں میں کہا کرتے تھے۔ اب ذکرِ نبوت یا مل کی تھیوری کا نہیں ہوتا جس کو مولانا شبلی نے اپنے مشہور  
قصیدہ

ایکہ پرسی چہ کسانیم و چہ ساماں داریم ❖ آنچہ با پیغ نیزد بجاں آن داریم

میں علیگڑھ یونیورسٹی کی خصوصیت بتایا ہے۔ اب مسجد کے ممبروں پر نہیں، بلکہ کرسیوں اور صوفوں پر کسی تاج  
مست ریش رکھنے والے عالم کی زبان سے نہیں، بلکہ غیر طبعی آئینہ مثال "رخسار رکھنے والے صاحب بہادر  
کی زبان سے وہی مذہب، معاشرت، کلچر اور اسلامی انفرادیت کا ذکر سنیں گے جو کسی زمانہ میں غریب اور



دقیقاً نویسی مولوی کے بیان و دعا کی خصوصیت تھی۔

مثال کے لیے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے باؤنویں اجلاس کلکتہ کی روداد پڑھ جائیے  
آپ کو ہمارے دعوے کی حرف بحرف تصدیق ہو جائیگی۔ اس اجلاس کے صدر نواب کمال یار جنگ  
بہادر نے اپنا خطبہ جو ٹائپ کے چھ صفحات پر ہے۔ انگریزی زبان میں پڑھا خطبہ کی زبان انگریزی ہی  
لیکن اُس کی روح انگریزی نہیں ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

”میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ مسلمان بحیثیت ایک قوم کے اُن تعلیمی اسکیموں سے مطمئن نہیں  
ہیں جو گذشتہ عہد میں ملک کے مختلف گوشوں سے پیش کی جا چکی ہیں، یہاں اُن میں سے کسی ایک  
کے بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔ لیکن ایک بات جس کی نسبت مجھ کو یقین ہے یہاں بیان کر دینی ضروری  
ہے، وہ یہ ہے کہ موجودہ سخت ترین دور میں ہم کسی ایسی تعلیمی اسکیم کو قبول نہیں کر سکتے جو ہم میں اسلامی  
اصول و کلچر کے دائرہ میں رستے ہوئے دماغی بیداری پیدا نہ کرے۔ محترم صدر نے یہ ہی نہیں بلکہ اس سے  
آگے برسبیل ترقی فرمایا ”اسلام کے کلچر کا اپنا مدعا یہ ہے کہ وہ انسانیت کو عروج دے“ اور اسلام صرف  
کسی ایک خاص خیال کے پابند ہونے کا ہی نہیں بلکہ وہ ایک منظم اجتماعی زندگی کا نام ہے۔“  
خطبہ صدارت کے صفحہ ۳ پر ارشاد ہوتا ہے۔

”دربند الی مقصد ہیں جو مسلمانوں کی ہر تعلیمی اسکیم میں لازمی طور پر پیش نظر رہنے چاہئیں۔

(۱) مسلم کلچر کی امتیازی خصوصیات کی حفاظت و بقا۔

(۲) مسلمانوں کے معاشرتی نظام کی پختگی اور مضبوطی۔

جناب صدر نے یہ بھی کہا ہے کہ کوئی قوم اُس وقت تک صحیح معنی میں تعلیم یافتہ نہیں کہلا سکتی  
جب تک اُس کے عوام میں تعلیم کا نام چرچا نہ ہو۔ اور تعلیم کی وجہ سے ان کی اقتصادی حالت خوشگوار



نہ ہو گئی ہو۔



آپ نے یہ جو کچھ فرمایا اس کی واقعیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ عربی کا ایک مصرع ہے ”عند الشدائد تنصب الاحفاد“ اس لیے یہاں اس شکایت کا بھی موقع نہیں ہے کہ انگریزی تعلیم کو ہندوستانی مسلمانوں میں رائج کرتے وقت ہی اگر قومی تعلیم کے ان اساسی مقاصد کو پہلے سے پیش نظر رکھا جاتا اور انگریز کی نقالی کی غلامانہ ذہنیت کو ترک کر کے خالص قومی دلی مفاد پر اس کی بنیاد رکھی جاتی تو آج یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا جس نے مسلمانوں کو صحیح اسلام اور اس کے کلچر سے بہت دور کر دیا ہے۔



اب بھی وقت ہے کہ ہماری قوم کے متاثر اور روشن خیال حضرات اپنے اثر و رسوخ سے کام لیں۔ اور وہ محض کہنے سننے تک اپنی کوششوں کو محدود نہ رکھیں بلکہ اپنی تجاویز کو عملی شکل بھی دیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اسلامی کلچر کے علمبردار خود اس کا نمونہ بنیں۔ پھر اسلامی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم کے نصاب میں ایسا تغیر و تبدل کریں جو طلباء کے لیے اسلامی زندگی میں علمی اور عملی دونوں اعتبار سے زیادہ کمزیر اور مفید اور کارآمد ہو۔ اس سے بڑھ کر ضروری یہ ہے کہ کالج میں ایسا اسلامی ماحول پیدا کیا جائے جس میں ماحول لیسز کے بعد خود بخود انسان اسلامی کلچر کے احترام پر اور اس پر عمل کرنے کی طرف راغب ہو۔ یہ ماحول اس وقت تک ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ وائس چانسلر سے لے کر تمام پروفیسر اور ملازمین کالج تک بوڈاں اور طریق نشست و برخاست میں سراسر مسلمان نہ ہوں۔ ایک طرف تو آپ کو خود یونیورسٹی کے اندر یہ تبدیلیاں کرنی ضروری ہیں۔ پھر صنعت و حرفت اور خاص علمی تحقیقات اور کیمیائی تجربات کے لیے مستقل کامیاب درس گاہیں ہونی چاہئیں۔ جہاں مسلمان طلباء نظری تعلیم کے علاوہ عملی تعلیم اور تقلیدی کے بجائے اجتہادی تعلیم حاصل کریں۔





یہ باتیں نئی نہیں۔ آج ہر مسلمان انہیں جین طور پر محسوس کرتا اور ان کی ضرورت پر یقین رکھتا ہے۔ لیکن ضرورت ہے کہ زبردست جوش و خروش کے ساتھ عملی اقدام کیا جائے صدر محترم نے اس چیز کو ایک کمیٹی کے سپرد کر دینے کی خواہش کی ہے جو تین ماہرین تعلیم پر مشتمل ہو۔ یہیں ڈر ہے کہ آج کل کی عام تجاویز کی طرح کہیں مسلمانوں کی تعلیمی سکیم کی تشکیل کی یہ تجویز بھی نشستوں و گفتگو برخواستہ کی ہی حد تک رہ کر ختم نہ ہو جائے۔ ضرورت تھی کہ اسکیم پہلے سے تیار کر لی جاتی اور اس اجلاس میں اس پر غور و خوض کر کے اسے پاس کر دیا جاتا۔ اور اسلامی اداروں میں اسی کو نافذ کرنے کی موثر کوششیں کی جاتیں۔



دوسرا اہم اجلاس جو ۲۹ و ۳۰ دسمبر کو دہلی میں منعقد ہوا "انجمن ترقی اردو" کا "کل ہند اجلاس" تھا۔ جس کے صدر رحید آباد کے مشہور علم دوست اور علم نواز نواب محمدی یار جنگ بہادر تھے۔ اس میں ہندوستان کے ارباب علم و ادب کا خاصہ اجتماع تھا۔ پہلے دن کی نشست اولیں میں خطباتِ صدارت اور انجمن کی رپورٹ پڑھ کر سنائی گئی۔ شام کو چیف کمشنر دہلی نے علمی نمائش کا افتتاح کیا جس میں عربی فارسی اور اردو کی نادر مخطوطات پڑانے پڑانے سکے۔ قدیم مغل آرٹ کے چند نمونے اور بعض پڑانے بزرگوں کی دستی تحریریں جمع کرنے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ گزشتہ سال یہیں دہلی میں ادارہ معارف اسلامیہ کے ماتحت اینگلو عربک کالج میں جو علمی نمائش ہوئی تھی، اس کی طرح اس نمائش کی عمدگی اور خوش سلیقگی کا بھی سہرا پروفیسر حافظ محمود شیرانی پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال، اور ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کے سر ہے۔ مغرب کے بعد مقالات ہوئے دوسرے دن پہلی اور دوسری نشستوں میں مختلف تجاویز پر بحث ہوئی رہی۔ انجمن نے جو تجاویز پاس کیں وہ سب نہایت مفید ہیں تاہم ان میں تجویز نمبر ۲-۳-۴ اور ۱۰ نہایت اہم اور ضروری ہیں اور اگر ان کو عمل میں لانے کے لیے متحدہ جدوجہد کی گئی تو کوئی وجہ نہیں کہ ان میں کامیابی نہ ہو۔ اور اگر یہ کوشش کامیاب ہو گئیں تو بے شبہ یہ اردو زبان کی عظیم الشان خدمت ہوگی جس سے اس کو استقرار و دوام حاصل ہوگا



یہ ظاہر ہے کہ تمام تجاویز پر ایک وقت یکساں عمل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً تجویز نمبر ۳ میں دہلی، پنجاب، لکھنؤ، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ وغیرہ میں اُردو کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانے کی جو تجویز منظور کی گئی ہے اُس پر عمل کرنے کی راہ میں سرت چند در چند دشواریاں ہیں۔ مثلاً یہ کہ ان یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم دینے والے اساتذہ میں کثیر تعداد ان لوگوں کی ہے جو اپنے مضامین کو اُردو کی نسبت انگریزی میں زیادہ آسانی کے ساتھ سمجھا سکتے ہیں۔ اُردو میں کسی علمی مضمون پر لکچر دینے کے لیے تو خود اُردو کی اعلیٰ قابلیت درکار ہے۔ اور وہ ان اساتذہ میں کہاں؟ پھر یونیورسٹی میں تعلیم پانے والے طلباء میں ایک ہی کلاس میں مسلمان طلباء بھی ہوتے ہیں، اور ہندو بھی، بنگالی بھی اور مدراسی بھی، مرہٹی بھی اور پنجابی بھی۔ پس اگر آپ ذریعہ تعلیم اُردو کو قرار دیتے ہیں تو جو طلباء اُردو بالکل نہیں جانتے اُن کو اُسی طرح شکایت ہوگی جس طرح آج مسلمانوں کو انگریزی زبان کے ذریعہ تعلیم ہونے سے ہے، اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے جس کو بالکل صفائی کے ساتھ کہہ دینا چاہیے کہ اگرچہ حیدر آباد کے دارالترجمہ نے یورپین علوم و فنون کی گراں بہا کتابوں کے تراجم شائع کرنے میں بڑی مستعدی اور سرگرمی کا ثبوت دیا ہے، تاہم یہ ذخیرہ ہندوستان کی مستعد یونیورسٹیوں کی ضرورتوں کے لیے نہ کافی ہے اور نہ قابل اطمینان۔ ان وجوہ کی بنا پر سرت اس تجویز کو عمل میں لانا نہایت دشوار ہے۔ البتہ تجویز نمبر ۴ جس میں اُردو کو ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں اُن اختیاری مضامین کا درجہ دینے کی درخواست کی گئی ہے جن میں کامیابی لازمی ہے۔ اب بھی قابل عمل ہے۔ اور اگر اس کے لیے سرگرم جدوجہد کی گئی تو کامیابی بھی یقینی ہے۔ اس تجویز کو کامیاب بنانے کے بعد اگر یونیورسٹیوں میں دیانت داری کے ساتھ اس پر عمل ہوتا تو اس سے تجویز ۳ کے لیے بھی راہ ہموار کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔ بہر حال مقصد یہ ہے کہ ان تجویزوں میں فوری طور پر قابل عمل ہونے اور نہ ہونے کے اعتبار سے جو فرق مراتب ہے اُس کو پیش نظر رکھتے ہوئے انجمن کا فرض ہے کہ جن تجویزوں کو بغیر کسی تاخیر کے قابل عمل ہونے کی وجہ سے تقدم حاصل ہے۔ اُن کو کامیاب بنانے کے لیے اپنی جدوجہد کا آغاز پوری سرگرمی کے ساتھ کر دے کہ یہ وقت اب



آسمان سے من و سلویٰ کے نزول کے انتظار کا نہیں ہے، زمانہ بڑی سرعت کے ساتھ بدل رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ غفلت ایک لمحہ صد سالہ راہ کے گم کر دینے کا باعث بن جائے اور تلافی یافتہ کے دروازہ پر محرومی و ناکامی کے قفل پڑ جائیں۔



اس موقع پر یہ گزارش کرنا بیجا نہ ہوگا کہ اردو زبان و ادب کی حقیقی خدمت کوئی انجمن اُس وقت تک نہیں کر سکتی جب تک اُس میں دوسری اسی قسم کی انجمنوں اور اداروں کے ساتھ تعاون و اشتراک کرنے کا مصداقانہ جذبہ نہ ہو۔ یہ کام سب اربابِ علم و ادب کے مل جل کر کرنے کا ہے۔ اس میں خود اپنے کو نمایاں کرنے اور دوسرے اہم اداروں کو نظر انداز کر جانے سے نہ تو اس مقصد میں ہی خاطر خواہ کامیابی حاصل ہو سکتی ہے اور نہ خود اپنی ذاتی وجاہت و شخصیت کو ہی کوئی خاص فائدہ پہنچ سکتا ہے جس جہاں آرا و رنق بزم ہو کر ہی دیدہ و دل سے خراج تحسین و ستائش وصول کر سکتا ہے۔ کسی ایک تہمت کدہ غرور و تنہائی میں روپوش ہو کر نہیں۔ عمل دنیا کا یہ ایک ایسا واضح اصول ہے جو ”انجمن ترقی اردو“ یا کسی اور مخلص و ”کل ہند“ انجمن سے کسی نظر انداز نہ ہونا چاہیے۔

### حضرت مولانا سید احمد مدنیؒ

ہیں یہ معلوم کر کے بیدار فہم ہو کر پچھلے دنوں حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے برادر بزرگ مولانا سید احمد صاحب صاحب جہاد نبی جواز نبوی میں ایک عرصہ مدید کے قیام ہجرت کے بعد پچھلے دنوں رگڑائے عالم جاودانی ہو گئے۔ اُن مہم کی تعریف میں مختصر یہ کہنا کافی ہوگا کہ آپ صبح معنی میں مولانا حسین احمد صاحب کے بڑے بھائی تھے۔ عادات و اطوار میں اسلاف کرام کا نمونہ تھے۔ آپ کا عظیم الشان کارنامہ مدینہ طیبہ میں ایک شاندار دینی و صنعتی مدرسہ کا قیام ہے جس میں اس بلدہ مطہرہ کے غریب بچے دینی اور صنعتی تعلیم حاصل کر کے سامانِ معاش پیدا کرتے ہیں حق تعالیٰ اُن مرحوم کو صدیقین و شہدائے مراتب عالیہ سے شرف اندوز فرمائے، اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق ارزان ہو۔  
رحمۃ اللہ رحمۃً واسعۃً۔



# بعض مشہور مذاہب کے صحفِ مقدس کی ترتیب

اور

## قرآن مجید کی لسانیاتی اہمیت

از جناب مولانا عبدالمالک صاحب اڈوی

(۳)

### قرآن مجید کی ترتیب

داخلی روایات | اسدی روایات کا متفقہ بیان ہے کہ قرآن مجید حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ایک مصحف میں جمع کیا، اور حضرت عثمانؓ نے اس کی نقیص اطرافِ عالم میں بھیجیں، حضرت ابو بکر صدیقؓ نے بیچ بادل سلسلہ میں ضیفہ مقرر ہوئے اور جہادی ۲۳ھ (مطابق جون ۳۳ھ - گرت ۳۳ھ) کی ۱۳ تاریخ کو انتقال کیا۔ اور یہی قرآن مجید کی ترتیب کا بھی تاریخی زمانہ ہے۔ امام بخاری نے بڑی مفصل و طویل حدیثیں قرآن کی ترتیب و کتابت کے سلسلہ کے متعلق روایت کی ہیں جن کا جملہ یہ ہے کہ یمامہ کی لڑائی میں جب قرآن کے بہت سے حفاظ شہید ہو گئے تو حضرت عمرؓ نے ابو بکر صدیقؓ کو مشورہ دیا کہ قرآن مجید کو ایک صحیفہ میں جمع کر دیا جائے۔ اول اول حضرت ابو بکرؓ نے اسے بدعت خیال کر کے احتراز کیا لیکن پھر وہ بھی حضرت عمرؓ سے متفق ہو گئے اور زید بن ثابتؓ کو حکم دیا کہ قرآن مجید جمع کریں۔ چنانچہ انہوں نے یہ کام شروع کیا خود زید بن ثابتؓ کا بیان ہے :-



فتتبع القرآن اجمعہ من حسبہ میں نے قرآن کی تدریس شروع کی کہیں کھجور  
 ولخاف وصدور الرجال حتی کی چھڑیوں پر، ہیں باریک پتے تھروں پر  
 وجدت آخر سورة تنويع مع وٹھیکروں پر، کھاپا یا۔ یا کچھ بوگوں کو زبانی  
 بوخرمہ رخصت ری جرحہا ہا۔ یہاں تک کہ میں نے سورہ توبہ کی  
 مع احد غیرہ لفظ حاء کہہ رسول آخری آیت صرف بوخرمہ نصاریٰ کے پاس بیٹھی  
 من نفسکم عزیز غیبہ و اعنتکم یہی آیت لفظ حاء کہہ سہول من انفسکم  
 حتی حاتمہ راۃ فکانت عنہا خرسوۃ تک پھر مصحف جو زید بن ثابتؓ نے  
 عبدی بکر حتی توفاه لله ثم متب کیا تھا، بوکر مدین کی وراثت تک ان  
 عند عمر حیاً نہ ثم عند حفصہ کے پاس رہا۔ ان کے بعد حضرت عمرؓ کے پاس  
 بنت عمر۔ حضرت عمرؓ کی وراثت کے بعد ام مونس حضرت حفصہؓ

کے پاس تھا۔

مصر عثمانؓ کے زمانہ میں حذیفہ بن یمان نے ثمامہ اور ازہر بن ابی ان کے موقع پر شامی  
 اور عراقی سمجھیں کہ وہ دکھائے قرآن کی قرات میں بہت اختلاف کرتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے  
 حضرت عثمانؓ سے اس کا تذکرہ کیا، انہوں نے حضرت حفصہؓ سے مصحف کا نسخہ منگایا اور زید بن  
 ثابتؓ عبد اللہ بن زبیر، سعد بن عاص، عبد الرحمن بن حارث بن ہشام کو حکم دیا کہ ان کی نقلیں  
 کتاب و تینوں قریشیوں، عبد اللہ، سعد و عبد الرحمن، سے کیا کر زید بن ثابتؓ (جو انصاری  
 تھے) کے اب میں اختلاف ہو تو قریش کے محاورہ کو ترجیح دیں چونکہ قرآن قریش ہی کے  
 محاورہ میں اترتا ہے۔ عرض حضرت عثمانؓ نے اس کی چار نقلیں کر لیں، اور ایک ایک نسخہ کو ذہ  
 بصرہ شام میں بھیجا، وریک مدینہ میں رکھا بعض روایتوں میں ہے کہ سات نقلیں کرائیں اور



مکہ، شام، یمن، بحرین، بصرہ اور کوفہ میں ایک ایک مصحف بھیجا، ایک مدینہ میں رکھا۔  
 یمامہ کی بڑائی سنہ میں ہوئی۔ اسی میں بنی ضیف جیسے سخت دشمنان، سلام کو شک  
 فاش ہوئی اور سلمہ کذاب مارا گیا۔ الغرض قرآن مجید اس حضرت کی وفات کے ایک سال اور چند  
 ماہ کے بعد اس مصحف کی شکل میں مرتب ہو گیا جو آج تک اسلامی دنیا میں متداول ہے۔  
 اب بعض داعی ردیتیں ایسی ہیں جن کی بنا پر غیر مذہب والوں خصوصاً عیسائی علماء کو  
 قرآن مجید کی صحت و سند پر شکوک پیدا ہو گئے۔ اور انہوں نے دوسرے مصحف مقدسہ کی طرح اس  
 کو بھی مشتبہ قرار دیا۔ چنانچہ فارنگ "مذہب کا تقابلی مطالعہ" میں قرآن کو بھی وید، دستا، عمد  
 عتیق و جدید وغیرہ کی طرح مستند قرار نہیں دیتا۔

قرآن مجید نے جس اہمیت کے ساتھ اپنی حفاظت، دیانت کا دعویٰ کیا ہے اُس سے بھی یہ  
 تاریخی حقیقت کم از کم واضح ہو جاتی ہے کہ جو کچھ پیغمبر اسلامؐ نے وحی کے نام سے پیش کیا اُس کا ایک  
 ایک لفظ محفوظ ہے اور اس کی حفاظت کے لیے وحی کے دن ہی سے کوشش کی گئی۔ چنانچہ قرآن مجید  
 کی اس آیت سے یہ دعویٰ ثابت ہوتا ہے۔ لا تحرك به لسانك لتعجل به ان عينا جمعه قرآنہ  
 فاذا قرأنا فأتبع قرآنہ ثم ان علينا بیانہ امام بخاری نے ایک روایت نقل کی ہے جس میں  
 آیت بالا کی تفسیر میں حضرت ابن عباس کا بیان ہے۔

قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب حضرت جبریلؑ

علیہ وسلم اذا نزل جبریل بالوحی وحی سے آگرتے آپ زبان اور لب ہاتھ ہر

وکان متا یحرك به لسانہ و کہیں بھول نہ جائیں، اس کو آپ پر بہت

شفقتیہ فینشد علیہ وکان یعرف سختی ہوتی بہ سختی لوگوں کو بھی معلوم ہو جاتی



منہ فانزل اللہ الاية التي في

لا اقسم بيوم القيمة لا تحرك به

لسانك لتعجل به ان علينا

وقرأه فاذا قرأه فاستمع قرأه

فاذا انزلناه فاستمع ثمرات

علينا بيا نذ قال ان علينا

بنينه بلسانك قال وكان اذا

الله جبريل اطرق فاذا ذهب

قرأه كما وعده الله

عباس کتبی میں ن آیتوں کے ٹونے کے بعد جب

جبریل وحی لے کرتے تو آپ خاموش رہتے جب وہ

جڑ جاتے تو اس وقت آپ اس کو پڑھ کر دیتے

روایت ہلست ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام کو اس کی صیانت و حفاظت کا کس حد تک خیال

تھا۔ چنانچہ وحی کے ذریعہ قرآن کا جو حصہ اترتا آپ اس کو کاتبوں کو لکھا دیتے۔ زید بن ثابت بھی جنہوں نے

عند صدیقی میں قرآن مجید کو صحیفہ میں جمع کیا ان حضرات کے زمانہ میں کتابت وحی کی خدمات انجام دیا

کرتے تھے اور خود سائے قرآن کے جید حافظ تھے۔

ام بخاری نے ایک حدیث روایت کی ہے جس میں مذکور ہے کہ

ان جبریل کاں ملقاء فی کل

لکھ فی شہر رمضان حتی ینسلخ

یعرض علیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن سنائے



دوسری روایت میں ہے کہ

کان يعرض على النبي صلى الله  
عليه وسلم القرآن كل عام مرة  
فعرض عليه مرتين في العام  
الذي قبض -  
حضرت جبریل ہر سال ایک بار آن حضرت صلی  
اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قرآن کا دور کیا کرتے پھر  
سال آپ کی وفات ہوئی اس سال انہوں نے  
دو بار دور کیا -

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید غد غوت میں زبانی مرتب تھا۔ سورتیں بالاتفاق مرتب  
شکل میں تھیں جیسا کہ حاکم اور بیہقی نے حدیثیں روایت کی ہیں، بیہقی کی حدیث بقول حاکم صاحب  
مستدرک، بخاری و مسلم کی شرط پر ہے۔ البتہ صحیفہ کی شکل میں پورا قرآن مرتب نہ تھا۔ اور بغیر مسلم  
کی وفات سے صرف تقریباً ڈیڑھ سال بعد مرتب ہوا۔

آن حضرت کے زمانہ ہی میں قرآن مجید کے بڑے بڑے حفاظ موجود تھے۔ چنانچہ خود آنحضرت  
نے فرمایا کہ قرآن مجید چار آدمیوں عبداللہ بن مسعود، سالم مولیٰ ابی حذیفہ، سعذ بن جبہ اور ابی بن کعب  
سے لیکھو۔

بخاری میں مذکور ہے کہ لقد اخذت من فی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بضعا  
وسبعین سورةً دوسری روایت میں عبداللہ بن مسعود کا یہ بیان پایا جاتا ہے۔ واللہ الذی لا  
الہ غیرہ ما انزلت سورة من کتاب اللہ الا انا اعلم ان انزلت ولا انزلت من کتاب  
اللہ الا انا اعلم فبما انزلت۔

اس میں شک نہیں حضرت عبداللہ بن مسعود نے بھی قرآن مجید کی ترتیب دی تھی جو مصحف  
عثمانی کی ترتیب سے مختلف تھی لیکن آیات میں اختلاف تھا۔ ورنہ ایک دوسرے میں کمی بیشی تھی۔  
حضرت انس کی روایت ہے کہ رسول اللہ کی وفات کے بعد چار انصاریوں کو پورا قرآن حفظ



تھا کہ میں بوندہ ہوں معاذ بن جبل زید بن ثابت اور ابو زید۔

بخاری کی روایت سے کہ سورہ توبہ کی آخری آیت نزلت ابو خزیمہ انصاری کے پاس تھی اور دوسری روایت کے مطابق سورہ حزاب کی آیت میں مومنین رجال صدقوا ما عاہدوا اللہ علیہ صحت ابو خزیمہ انصاری کے پاس تھی۔ درج ذیل سے ظہری وغیرہ کو وہ ضعیف حدیث پہنچی جس میں مذکور ہے کہ قرآن مجید پر چھ حصہ ثابت ہو گیا ہے اور بہت ممکن ہے شیعہ کے بعض فرقے اور سنیوں کے فرقہ مشویہ نے قرآن مجید کے نقص و فقدان کا عقیدہ یہیں سے لیا ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام باتیں محدث فہمیوں کی پیداوار ہیں حدیث کے الفاظ یہ ہیں

قَالَ فِي شَهَابٍ وَخُمُوفِي خَازِمَةَ  
 بَنُ زَيْدٍ بَنِ ثَابِتٍ سَمِعَ زَيْدُ بْنُ  
 ثَابِتٍ قَالَ فَقَدْ رَأَى مِنْ  
 وَخَزِيمَةَ حِينَ نَسَخَ الْمُصْحَفَ  
 وَرَأَى سَمْعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى  
 عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُهَا وَتَمَسَّهَا  
 فَوَجَدَ نَاحِيَهَا مَعَ حَزْمَةِ بْنِ ثَابِتٍ  
 وَانْصَارَى مِنْ الْمَوَظِينَ رِجَالُ  
 صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا لَهِ عِبَادَتًا  
 فِي سُوْرَتِهَا فِي الْمُصْحَفِ -  
 میں لگا دیا۔

”نسخہ مصحف سے من موگوں کو شہادت فہمی پیدا ہوئی بخاری کی دونوں حدیثیں زید بن ثابت ہی سے مروی ہیں جن میں سورہ توبہ کی آخری آیت اور سورہ حزاب کی ایک آیت کا ابو خزیمہ انصاری کے



پاس ہونا بیان کیا گیا ہے۔ سورہ توبہ والی آیت کے سلسلہ میں تو صاف مذکور ہے کہ :-

قال ارسل لی ابوبکر قال انک  
 کنف تکتب الوحی برسول اللہ  
 صلی اللہ علیہ وسلم فاتبع لقرآن  
 فتبعت حتی وجدت آخر سورة  
 التوبة ایتیں مع ابی خزيمة انصار  
 لما جدھا مع غیرہ  
 محمد کو ابو خزيمة انصاری کے سوا اور کسی کے پاس  
 نہیں ملی۔

یہ اُس وقت کا واقعہ ہے جب حضرت زہ کو جناب صدیق ثانی نے ترتیب قرآن  
 کے لیے مامور کیا تھا۔ اس لیے روایات کے وفق و ربط سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نسخہ  
 المصحف سے مراد عہد عثمانی کی نقل و کتابت نہیں بلکہ وہی دور صدیقی کی ترتیب ہے۔ اور اسی کے  
 ساتھ یہ بھی نتیجہ نکلا کہ ابو خزيمة کے یہاں اخراب اور توبہ کی وہ آیتیں لکھی ہوئی ملیں۔ ورنہ یاد اور لوگوں  
 کو بھی تھیں۔ چنانچہ اسی روایت میں خود زید کا بیان ہے کہ کنت اسمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
 وسلم یقرأ بها۔ اس سے پتہ چلا کہ حفاظ کو وہ آیتیں یاد تھیں لیکن لکھی ہوئی کسی دوسرے کے پاس تھیں  
 اسلامی تاریخ و روایات کے غائر مطالعہ سے پوری طرح ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید وحی کے  
 دن سے آج تک بالکل محفوظ چلا آتا ہے۔ عہد رسالت ہی میں پورا قرآن صحابہ کو یاد تھا۔ عہد صدیق  
 میں جب اس کو صحیفہ میں جمع کیا گیا قرآن کے بڑے بڑے حفاظ موجود تھے، جس طرح آج ایک حافظ  
 بلا اختلاف ایک حرف سارا قرآن زبانی منادیتا ہے۔ اور لکھا دے سکتا ہے۔ اس سے زیادہ ماہرین  
 قرآن کی ترتیب کے وقت موجود تھے۔ اس لیے فارنگ کا یہ اعتراض کہ قرآن کی اصلیت دوسرے

مذہب کی صحیفہ مقدسہ کی طرح نامعتبر ہے۔ بالکل مہمل سی بات ہے۔

۱۔ دنیا کا کوئی بھی نسخہ اپنی حفاظت و صیانت کا خود بسا ادعا نہیں کرتا جیسا کہ قرآن مجید کا دعویٰ ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وحی کے دن ہی سے اس کی صیانت و حفاظت کا التزام رکھا گیا۔

۲۔ کسی مذہب کی الہامی کتاب مہم کی وفات کے بعد اس قدر جلد مرتب نہ ہوئی جس طرح قرآن مجید مرتب ہوا۔ وید بقول جرمن مستشرق و سترز "صدیوں میں عالم وجود میں آیا اور صدیوں رہی متدوں" بدھ مذہب کی کتاب ٹی پی ٹیکا کا اس نسخہ ہی دنیا سے غائب ہے صرف اس کا پالی ترجمہ ہوا ہے اور یہ ترجمہ بھی اگر تم بدھ کی وفات کے کئی صدی بعد معرض وجود میں آیا یہی حال عہد مہنت اور عہد مہ جدید کا ہے۔ کہ ن کا بھی اصل نسخہ دنیا سے معدوم ہو گیا۔ جین مذہب کے چودہ پردے متعلق مستشرقین کا بیان ہے کہ اس پر انقلاب کے تین دور گزرے ہیں کہ خود چینوں کا اعتراض ہے کہ کتاب مدت ہوئی غائب ہو گئی یہی وجہ ہے کہ جرمن مستشرق و سترز جین مذہب کو بدھ مذہب سے مذہم تر تسلیم کرتے ہوئے بھی وہ چینوں کی مذہبی ادبیات سے بدھ مذہب کی ادبیات کے بعد بحث کرتا ہے۔ "اوت" کا بھی یہی حال ہے۔ چنانچہ ڈارسٹیر لکھتا ہے کہ گو عربوں کے زمانہ میں ایران کے مذہبی ادب کا بہت بڑا حصہ ضائع ہو گیا لیکن پھر بھی ہم لوگ اس ضخیم ادب کی خصوصیت اور مواد کے متعلق تاریخی میں نہیں گو موجودہ "وتا" اس کے مقابلہ میں محض ایک اثر باقی کی حیثیت رکھتا ہے۔

۳۔ قرآن مجید کا موجودہ نسخہ اصل زبان میں موجود ہے ورنہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کسی حصہ میں طرز بیان سو پائش کے اعتبار سے یگانگت و ہم آہنگی نہیں جیسا کہ وید کے متعلق کہا جاتا ہے۔ کہ زبان سو پائش کے کائنات سے مختلف عہد اور مختلف دماغوں کی پیداوار ہیں یہی وجہ ہے کہ عہد حاضر میں غیر مسلم علماء بھی قرآن کو سائناتی نقطہ نظر سے عربی زبان کا اولین ماضی قرار دیتے ہیں۔



جیسا کہ ڈکٹر اسرائیل ولفسون کی بحث و نظر سے پتہ چلیگا۔

قرن مجید کی لسانیاتی اہمیت پر روشنی ڈالنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ عربی زبان پر ایک نظر ڈالی جائے لیکن عربی زبان کے نشو و ارتقاء کی بحث خود اس قدر متنوع اور تفصیل طلب ہے کہ اس مضمون میں اس مسئلہ کی طرف اعتنا نہیں کیا جاسکتا، عربی زبان کو دوسری سنہ سامیہ، ملی، و اسیری، آشوری و عبرانی کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔

عربی زبان کو بعض علماء نے دو حصوں شمالی و جنوبی میں تقسیم کیا ہے لیکن اب تقسیم درست نہیں سمجھی جاتی ماہرین لسانیات اب عربی زبان کو دو حصوں قدیم عربی (عربیہ بائدہ) اور موجودہ عربی (عربیہ باقیہ) میں تقسیم کرتے ہیں۔ قدیم عربی زبان کی بحث میں ثمودی، بھجانی، و صفوی نقوش کو بڑی اہمیت ہے۔ اسی طرح قدیم عربی کے نمونے نقشِ نمارہ، نقشِ زبدہ، اور نقشِ حران سے ظاہر ہوتے ہیں یہ تین کتبے ہیں جو خطِ مبطلی میں پائے جاتے ہیں۔ خطِ مبطلی (جس کا آخر زمانہ میں رواج ہوا) کو عربی کے خطِ کوفی سے بہت زیادہ مشابہت ہے۔

نقشِ نمارہ سب سے قدیم کتبہ ہے جو عربی زبان کے مشہور شاعر امرئ القیس کے مقبرہ پر کندہ تھا۔ یہ کتبہ سنہ ۳۲۸ (ب م) میں تیار ہوا۔ نمارہ رومیوں کا ایک چھوٹا سا محل ہے جو جبلِ دروز کے علاقہ میں واقع ہے۔ امرئ القیس عرب کا بادشاہ بھی تھا اور اس کا اثر و اقتدار بادیہ شام تک پھیلا ہوا تھا۔ دوسرا نقشِ زبدہ ہے جو تین زبانوں، یونانی، سریانی اور عربی میں لکھا ہوا ہے اس کی کتب کا زمانہ سنہ ۵۱۱ء ہے زبدہ ایک کھنڈر ہے جو قنسرین اور نہر فرات کے درمیان واقع ہے۔

نقشِ حران یونانی و عربی زبانوں میں لکھا ہوا ہے اس کتبہ کا اکتشاف حران میں ہوا جو جبلِ دروز کے شمالی علاقہ میں ہے۔ نقشِ ایک گرجا کے دروازہ کے اوپر پتھر پر کھدایا ہوا ہے اور اس کا تعلق سنہ ۵۲۸ء سے ہے۔

موجودہ عربی (غریبہ بقیہ) کے سلسلہ میں سب سے اہم چیز ظہور اسلام، اسلامی دعوت و تبلیغ در قرآن کی ادبی و لسانی اہمیت ہے۔ موجودہ عربی خط بھی ”اسلامی خط“ کہا جاتا ہے، اس وجہ سے نہیں کہ یہ بھی قرآن کی طرح اسلام کی پیداوار ہے بلکہ اسلام ہی اس کے رواج و احیاء کا سبب ہوا۔ حالانکہ قدیم عربی خط آخری زمانہ کے خط سے مشابہ تھا۔ اسی طرح قرآن کی زبان اور محاورات کے سامنے عربی زبان کے بقیہ بھی اور محاورات نہ ہو گئے۔ اسرائیل و فتنوں مکتب ہے:-

و غولقرآن ثرة لتدیدی جمیع قرآن مجید نے جزیرہ عرب کی عربی زبان پر کے تمام  
للہجات العربیہ فی جمیع الانحاء محاوروں پر گھر ٹرڈ لایہ محاورے اندروں پر  
و بحزیرة فقد بدلت تتبیل و قرآن کی زبان سے مخلوط اور اثر پذیر  
تضطرب و تنجذب بقوہ الی ہونے لگے، یہاں تک کہ ساری زبان اس  
لغة قرآن حتی، نہ محنت کھائی ہمیں جذبہ ہو گئی جو حجاز کا خاص لہجہ تھا اور جس میں  
لہجہ سی ہی لہجہ نجا رکھا گئی ذم کہ دے شکر کرتے تھے۔  
ینطقھا خاصة اهل مکة نے

اب سنی قرآن مجید کے بدیہ انشاء اور لسانی خصوصیت پر بحث کریں۔ اس میں شک نہیں مہر  
یہ دست کے عیب بھی زبان و انشاء کے لحاظ سے قرآن مجید کے عجز کے قائل ہیں، لیکن ہر ہونہ ہی  
تصحب کا کہ اس حیثیت سے بھی بعض علماء نے اعتراض کیا ہے۔

ڈاکٹر ٹنڈل کا اعتراض

ٹنڈل نے اسلام پر یہودیت و یہودی روایات کا اثر دکھاتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر در زیادہ  
ثبوت و ضرورت ہو کہ یہودیت نے کس طرح اسلام کو تر پذیر کیا تو یہ قبل غور و تحقیق پیش کی جاسکتی ہے



کہ گو مسلمان قرآن کی حرز اور اس کی خالص عربیت پر "عجاز" کی حیثیت سے فخر و مباہات کرتے ہیں اور استدلال کرتے ہیں کہ یہ قرآن کے کتاب الہی ہونے کا ثبوت ہے۔ پھر بھی قرآن میں ایسے الفاظ پائے جاتے ہیں جن کو عربی زبان سے بالکل تعلق نہیں۔ بلکہ وہ یا تو آرامی یا عبری زبانوں سے لیے گئے ہیں ان میں یہ الفاظ پیش کیے جاسکتے ہیں۔ طاغوت، سکینہ، جبر، جہنم، جنت عدن، تابوت، تورات، ملکوت، ماعون، فرقان۔ ان میں بعض الفاظ ایسے مادوں سے مشتق ہیں جو تینوں زبانوں میں مشترک ہیں لیکن یہ عربی قواعد کے مطابق بتائے نہیں گئے ہیں۔ اس کے برعکس عام طور پر عبری اور آرامی زبانوں میں ان کا استعمال ہوا ہے اور حقیقتاً انہی زبانوں سے ان کا تعلق ہے۔ لفظ فردوس (رہشت) آخری عبرانی زبان سے لیا گیا ہے لیکن یہ قدیم فارسی زبان سے ... آیا ہے۔ اور فارسی و سنسکرت سے اس کا تعلق ہے اور عبرانی زبان کے لیے اجنبی چیز ہے مسلمان مفسرین ان الفاظ کے صحیح معنی بتانے سے قاصر رہے۔ چونکہ وہ ان زبانوں سے نااہل تھے جن سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ الفاظ لیے۔ جب ہم لوگ ان کے صحیح معنی جان لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہی عبارت قرآن کے لیے موزوں ہے۔ مثال کے لیے لفظ "ملکوت" کو صحیح مفسرین کے یہاں عام طور پر غلطی پائی جاتی ہے کہ "ملکوت" کے معنی ہیں مملکت کا مقام یا خاصہ۔ یہ لفظ "ملک" (فرشتہ) سے مشتق نہیں بلکہ یہ عبرانی کے لفظ ملکوتہ (ملکوت) کا معرب ہے۔

### اعتراض کا جواب

ڈاکٹر ٹنڈل کی ایراد پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نہ صرف عربی زبان کی تاریخ و رفتار سے نااہل ہیں بلکہ انہوں نے قرآن کی لسانیاتی خصوصیت کے باب میں اسلامی شریچہ کا کافی مطالعہ بھی نہیں کیا۔ سب سے زیادہ غور طلب یہ امر ہے کہ اسلام سے قبل عربی زبان پر دوسری زبانوں کا

اثر پڑا ہے یا نہیں؟ اور پھر اس کے بعد اس مسئلہ پر بحث کی ضرورت ہے کہ قرآن مجید میں دوسری زبانوں کے الفاظ ملتے ہیں یا نہیں۔ اور پھر اس باب میں علمائے اسلام کا کیا خیال ہے؟ سب سے پہلے نامہ زبدا و ترجمان کے وہ کتبے غور طلب ہیں جو قدیم عربی زبان کا نمونہ سمجھے جاتے ہیں نقش نامہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس عہد میں آرامی سریانی اور عربی زبانیں مروج ہو چکی تھیں نقش زبدا یونانی، سریانی، اور عربی خطوط میں ہے۔ لیکن یونانی خط کی عبارت میں بھی عربی کے بعض اسمائے معرفہ (Proper noun) پائے جاتے ہیں نقش حران کو زمانہ جاہلیت کی زبان کا مکمل نمونہ کہا جاتا ہے لیکن اس سے بھی یونانی و عربی متراج کا پتہ چلتا ہے خود امرئی، یقیس کے مشہور قصیدے کا شعر ہے۔

مھففہ ببصاء غیر مفاضة تراثها مصقولة كالجنح

سجھیں رومی زبان کا غلط ہے جس کے معنی آئینہ ہیں۔۔۔ امرئی یقیس جاہلی شاعر تھا جس کے مدفن پر علمائے آثار نے نقش نامہ کا پتہ لگایا ہے۔ عرب کے مختلف قبائل اپنے ماحول کے لحاظ سے عجمی زبان سے بھی اثر پذیر ہوئے۔ چنانچہ عجم دجھام کے محاورہ قبلی زبان کا اثر پڑا، قضاعہ اور بنی عسان کی سکونت نام کے نزدیک تھی جس زیادہ تر نصاریٰ آباد تھے۔ وہاں عبرانی زبان کا رواج تھا۔ بنی تغلب مدین یمن یونانیوں کے جو ری تھے قبیلہ کبر قبطی و فارسی سے اثر پذیر ہوا۔ عبد القیس اور ازد کے قبائل ہندوستان و ایران کے تمدن سے ٹکرائے، یمن پر ہندو و حبشہ کا اثر پڑا یہی وجہ ہے کہ عربی زبان بہت سی عجمی زبانوں کا اثر پڑا۔ یہ کلمات کو جو عجمی زبان سے عربی میں داخل ہو گئے لغویین مولد سے تعبیر کرتے ہیں:-

وذاں لزبیدی المولد من الکلام زبیدی نے کہا کہ "مولد" کلام کو کہتے ہیں اور

محدث وذاں فاذی ہذا عربیہ فارابی کی رویت ہے کہ یہ عربی ہے وریہ مولد

وذا مولد

ہے۔



روایات بالا سے واضح ہوتا ہے کہ نزول قرآن سے قبل ہی عربی زبان پر مختلف زبانوں کا اثر پڑ چکا تھا، اسرائیل و فلسطین لکھتا ہے :-

وعلى التأثير العبري الا ارامي على عبرني آرامي تاثير سے عربی زبان سے تہنی و  
اللغة العربية في الفاظ عمرانية مذہبی الفاظ اثر پذیر ہوئے عربی زبان میں سریانی  
و دينية يوجد في اللغة العربية عدد زبان کی وساطت سے بہت سے یونانی الفاظ  
غير قليل من الفاظ يونانية اندجبت شامل ہو گئے مثلاً نجیل، اسطوانہ، اسقف  
في العربية بوساطة السريانية ناموس، ناموس، میل، سفح وغیرہ اور اسی  
مثل البخیل واسطوانہ اسقف طرح عربی میں بعض فارسی الفاظ مل گئے مثلاً  
وناموس ومیل (مقیاس) واسفنج بستہ، حبش، مجوس۔ دانیہ (عربی زبان  
وکنز لك اندجبت في العربية بعض پر) سدوم سے قبل یونانی اور فارسی زبان  
كلمات فارسية مثل استادو کا ترجمانی اور سریانی کی بہ نسبت کم پڑ  
جیش و مجوس علی ن التأثير ہے۔

اليوناني والفارسي قليل جدا قبل  
الاسلام بالنسبة للتأثير العبري

ڈاکٹر ٹیڈل نے قرآن سے آرامی، عربی اور فارسی کے چند الفاظ نقل کیے تھے، ایسے مختصراً بتائیں کہ قرآن مجید میں اور دوسری زبانوں کے الفاظ بھی موجود ہیں جن کا ٹیڈل نے تذکرہ نہیں کیا۔ سورہ یوسف میں لفظ متکا استعمال ہوا ہے، حبشی زبان میں ترنج کو کہتے ہیں "ہیت لك" حورنی زبان کا غلط ہے جس کے معنی ہیں "جا" طہ کے معنی نیلی زبان میں ہیں "اور مرد" سورہ انبیاء میں ہے انکم وما تعبدون من دون الله حصب جهنم اس میں لفظ "حصب" کے متعلق عکرمہ کی روایت

ہے کہ حبشی زبان میں لکڑی کو کہتے ہیں۔ اسی طرح سورہ ص میں لفظ ”حیت“ استعمال ہوا ہے یہی حبشی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی شیطان ہیں۔ سورہ نور میں ”مشکوٰۃ“ استعمال ہوا ہے۔ حبشی زبان میں چراغ کو کہتے ہیں۔ سورہ طور میں لفظ ”طور“ ہے مجاہد کے قول کی بنا پر سربانی میں پہاڑ کو کہتے ہیں۔

س کے علاوہ قرآن مجید میں سنسکرت کا لفظ بھی پایا جاتا ہے۔ علامہ آزاد بلگرامی فرماتی ہیں۔

قال سیوطی فی قوله تعالیٰ طوی سیوطی نے کلام ”ہی“ طوبی لہم وحسن

لہم وحسن مآب اخرج ابن جریر مآب کے متعلق کہا کہ بن جریر اور ابو الشیخ نے

وابو الشیخ عن سعید بن مسعود سعید بن مسعود سے حدیث نکالی اور روایت

قال طوبی اسم الجنة باہندیہ کی ”طوبی“ ہندی میں جنت کو کہتے ہیں، اور

وفی انقاموس صوطی الجنة باہندیہ قاموس میں ہے کہ طوبی کے معنی ہندی میں

وفی سیوطی فی قوله تعالیٰ سند جنت ہیں در سیوطی نے اللہ تعالیٰ کے کلام

خضر عن شیدۃ سندس سندس خضر کے متعلق شیدہ سے یہ روایت

سریق الدیبا ج باہندیہ۔ نقل کی کہ ”سندس“ ہندی میں باریک ریشم کو

قال سیوطی اخرج ابو الشیخ عن کہتے ہیں، سیوطی کی روایت ہے کہ ابو الشیخ نے

حضرت محمد عن ابیہ رضی اللہ حضرت محمد سے انہوں نے اپنے والد سے یہ روایت

عنہما فی قوله تعالیٰ یا ارض اللہ تعالیٰ کے کلام یا ارض ابلعی ماءك کے

ابلی ماءك سربانی بلغہ الہندی متعلق بین کی کہ ابلعی ہندی زبان میں شرابی

الغرض روایت بالاسے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ عربی زبان پر نزول قرآن سے قبل عربی زبان کا اثر

سے ما حفظہ جو بخاری کتاب تفسیر سے سب سے عربی زبان فی آثار ہندوستان ص ۲۰۔



پڑچکا تھا۔ اور دنیا کی کوئی زبان ایسی پیش نہیں کی جاسکتی جس پر اجنبی اثر نہ پڑا ہو۔ قرآن میں وہی زبان استعمال ہوئی ہے، جو عرب کے فصحا کے درمیان مستعمل تھی۔ اور اہل عرب سمجھ سکتے تھے۔ ہر زبان کا یہ اصول ہے کہ تمدن کی ترقی اور مجاورۃ و اختلاط، سیاسی و مذہبی تبلیغ و رشامہ کے ساتھ زبان میں بھی تبدیلیاں ہوتی ہیں چنانچہ عربی زبان میں بھی عجمی آثار جذب ہوئے اور جب زبان نے انہیں قبول کر لیا تو گویا وہ غیر عربی نہ رہے، اس لیے ڈاکٹر ٹسڈل کا اعتراض لسانیات کے مبادی و اصول سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح وہ محققین اسلام کے معتقدات سے بھی نا بلند ہیں۔ عکرمہ، مجاہد، ابن عباس تمام حضرات نے قرآن کے حبشی، عبرانی، سریانی، فارسی تمام کلمات کی توضیحات کی ہیں۔ جن کو بخاری نے کتاب التفسیر میں جمع کر دیا ہے۔

بایں ہمہ قرآن مجید کا اسلوب اور طرز بالکل تخلیقی (Productive) ہے اور ہمیں سے ”اعجاز قرآن“ کا عقیدہ پیدا ہوتا ہے۔ جس پر ٹسڈل نے ایراد کیا ہے۔ علامہ ابن خزم اور قاضی عیاض کی بحثیں آگے آتی ہیں۔ ٹسڈل کی نظر سے غالباً حدیث کا مشہور تاریخی صلیح نامہ نہیں گذرا۔

سنہ کا زمانہ ہے، ذیقعدہ کا مہینہ ہے، آن حضرت بیت اللہ کی طرف حج کے لیے روانہ ہوئے ہیں۔ چودہ سو انصار و مہاجرین جلو میں ہیں حدیبیہ کے پاس ثنیۃ لمرار میں پہنچے تو آپ نے صحابہ کو پڑاؤ ڈالنے کا حکم دیا، کفار قریش داخلہ مکہ سے مانع ہوئے، صلح کی بات ہوئی و قریش کی طرف سے سہیل بن عمرو آیا اور نبی سے گفتگو کرنے لگا، بات سٹے پا چکی۔ تحریر و کتابت کے لیے آپ نے حضرت علیؓ کو بلا دیا۔

فقال اكتب بسم الله الرحمن الرحيم      (آنحضرت نے) فرمایا کہ لکھ بسم اللہ الرحمن الرحیم  
فقال سہیل لا اعرف هذا ولكن      سہیل نے کہا کہ میں یہ چیز نہیں پہچانتا بلکہ  
اكتب باسمك اللهم      یوں لکھیے ”باسمک اللہم“

اس سے پہلے کہ قرآن نے انت میں ایک تخلیقی طرز اسلوب کی بنیاد ڈالی، اور دینی ضروریات کے لحاظ سے بہت سے اصطلاحات وضع کیے۔

كانت العرب في جاهلية تها على      عرب قوم جاہلیت کے زمانہ میں نسلاً بعد  
ارث من ارباب اباہم في لغاتهم      نسل اپنی زبان اپنے ادب، اپنی عبادت  
وادارہم و نساً بکھم و قرابہہم      اپنی قربانیوں میں آبائی طریقہ پر قائم تھے جب  
فلما جاء الاسلام حالت احوال      سلام آیا تو حالات بدلے، مذاہب فنا ہوئے  
ونسخت دینا نات و ابطلت امور      لگے، رسم و رواج ٹٹنے لگے، اور زبان سے  
ونقلت عن اللغة الفاظ عن مواضع      الفاظ ایک محل سے دوسرے محل پر استعمال  
الی مواضع اخر بزیا دات ذہبت      ہونے لگے، اور قانونی و اصطلاحی معانی کا  
و شرائع شرعیہ و شرائع شریعت      اضافہ ہونے لگا، پس جدید نے قدیم کو مٹا دیا  
فعفی رخصار رول سے

اس لیے قرآن نہ ذات خود عربی زبان کا ایک عجیب و غریب شاہکار ہے۔ اب آئیے  
اس کے سبب سے متعلق بعض پرزور تنقید سے بحث کریں۔

### ذکر اسرار تہذیب و فنون

ذکر تہذیب و فنون کا بیان ہے کہ وہ قصائد و اسلوب شعری جو عرب کے  
جہلی شعروں میں مسلوب ہیں پہلی صدی ہجری کے خبر میں مدوں و در مرتب ہو کر زیب قرطاس  
ہوئے۔ ذہن ذہان کے ترتیب اس سے بہت پہلے ہو چکی تھی۔ اس لیے عربی زبان کی تاریخ  
و فنون اس سے بحث کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ بحث و نظر میں پہلے قرآن مجید ہی کو پیش  
نظر رکھے۔



جب ہم کو یہ معلوم ہے کہ قرآن کی زبان کو مدینہ، مکتہ اور حجاز کی تمام مسند آبادی میں سمجھی جانی تھی تو لازمی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عربی زبان کی سب سے قدیم چیز جو ہم تک پہنچی اور جو عموماً شمالی جزیرہ اور خصوصاً حجاز کے علمی طبقوں میں متداول تھی وہ یہی قرآن ہے۔ یہ زبان قرآن کی آیات سے واضح ہے۔ حجاز کے دور دراز مقامات سے عرب قوم کی جماعتیں آتی تھیں، اور وہ قرآن سنتی، سمجھتی اور دیکھتی رہتی تھیں۔ باوجودیکہ قرآن کی زبان اس عام زبان سے جو مکہ میں مروج تھی ممتاز ہے۔ قرآن ہی وہ سب سے بہترین الہ ہے جس کے ذریعہ طور اسلام کے زمانہ کی زبان سے بحث کی جاسکتی ہے۔ گو یہ عربی زبان کے تمام الفاظ و کلمات پر مشتمل ہیں، کیونکہ اُس نے اپنی طبعی ضرورت کے لحاظ سے ان کلمات کو لے لیا جو مناسب تھے اور نامناسب الفاظ کو ترک کر دیا۔

اور یہ جو روایت کی جاتی ہے کہ قرآن قریش کی زبان میں نازل ہوا۔ اگر اس سے مقصود یہ ہے کہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) قریش کے محاورہ میں گفتگو فرماتے تھے۔ یہی تمام اہل مکہ کی زبان تھی، تو یہ صحیح ہے لیکن اگر اس سے مراد یہ لیا جاتا ہے کہ قریش کی کوئی خاص علمی زبان تھی جس میں تقریر کمانت اور شعر پایا جاتا ہے، اور جس کی نظیر دوسرے قبائل کے یہاں نہیں ملتی تو یہ صحیح نہیں چونکہ اس سے دائرہ تنگ ہو جاتا ہے اور اس سے اس زبان کے سمجھنے والے عربوں کی تعداد کم ہو جاتی ہے، حالانکہ واقعات سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔

مشہور جرمن مستشرق نولڈک (Noeldeke) کا بیان ہے کہ یحییٰ بنی امیہ کے زمانہ میں پیدا ہوا تاکہ نبی صلعم سے وابستہ ہونے کے باعث تمام عربی قبائل پر قریش کا تفوق ثابت ہو، اس خیال سے یہ بھی مقصود ہو سکتا ہے کہ نبی صلعم قرآن مجید اس محاورہ میں پڑھا کرتے تھے جو مکہ میں مروج تھا، اس کی کتابوں میں مختلف روایتیں پائی جاتی ہیں جو حدیث نبوی پر مبنی ہیں۔ ان کا حاصل یہ ہے کہ قرآن مجید سات مختلف محاوروں میں تلاوت کیا جاسکتا ہے، یہ محاورے ان عربی قبائل کی زبان سے

مختلف میں جو مختلف زبانیں بول کر آتی تھیں۔ دوسری حدیث سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اصحاب رسول ﷺ مدینہ و سلم کا گروہ و قرآن مجید کی تلاوت ہو رہی تھی پس ان میں ہر ایک اس کی تفسیر کے باب میں نہیں مگر اس کی قرات کے متعلق اختلاف ہوا۔ ان میں کچھ لوگ دوسرے لوگوں کی قرات کا بیکہ کرتے تھے، حالانکہ ان میں ہر قاری کا یہ دعویٰ تھا کہ قرآن کی وہی قراۃ ہے۔

یہ سب سے سادہ کے ایک طبقہ کی رائے یہ ہے کہ قرآن دس محاوروں میں نازل ہوا اور کسی قراۃ کو کسی پر ترجیح نہیں کیونکہ حدیث میں مروی ہے ”بألفاظ قرآن“ جس محاورہ میں صحابہ دست بستہ۔

قرآن مجید کے مختلف محاوروں در اس باب میں ہر قسم سے نو تر واپاٹ کے متعلق استاذ ڈاکٹر محمد حسین کی رائے قابل ذکر ہے آپ فرماتے ہیں کہ قرآن کی سات قرائتیں کم یا بیش وحی کے ذریعہ نہیں ہیں ورنہ ان کا منکر کا فر ہے، بلکہ یہ قرائتیں لوگوں کے مختلف محاوروں کی اصل یا ماخذ ہیں۔

ابن جریر طبری، عبد الرحمن بن کثیر، شاطبی، اور دانی نے اس موضوع پر بڑی بحثیں کی ہیں لیکن ان کا تعلق لسانیات سے نہیں بلکہ مذہبی بحث و تمجیس کی دنیائے ہے۔

لیکن عربی زبان کی ترقی کے سلسلہ میں جس چیز سے ہمیں بحث کرنا ہے وہ یہ ہے کہ یہ قرائتیں جزیرہ عرب کے محاوروں کے مطابق ہیں یا نہیں۔ حقیقت ثابت ہو چکی ہے کہ ان قرائتوں میں سے بعض محاوروں کے مطابق ہیں جو پہلی صدی ہجری میں عربوں کے درمیان بولے جاتے تھے یہ قرائتیں عربی زبان کے وہ صیغے ہیں جن سے عرب غلبی اثر و نفوذ کے قبل مانوس تھے، اور اس عربی زبان پر جو غلبہ اسلام کے زمانہ میں مدینہ میں پھیلی ہوئی تھی تغیر پیدا نہ ہوا تھا۔

تفسیر الطبری نے اس میں یہ قرائتیں قرآن میں مروی جو حضرت عمرؓ نے حکیم بن ہشام کو ایسی قرات میں تلاوت کرتے ہوئے سنا کہ آپ کو نہیں سکھائی تھی، آخر میں اس حضرت نے دونوں کی قرائتیں سنیں اور (دونوں کو سمجھ گیا)۔  
۱۔ کتاب فی الادب الجاہلی ص ۹۸-۱۰۰۔



یہ بات قابل لحاظ ہے کہ قرآن کی مختلف قراءتوں کے بعض صیغے عربی اور سریانی صیغوں سے بہت زیادہ مشابہت رکھتے ہیں۔

قرآن مجید کے یہ مختلف محاورے سائنات کے نقطہ نظر سے بہت بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ چونکہ ان کے ذریعہ قدیم صحیح عربی زبان کے محاوروں کے لیے کافی مواد مل جاتا ہے اور باوجود اس اہمیت کے علماء مستشرقین نے آج تک عربی زبان کی نشو و ترقی کے موضوع بحث میں اس طرف توجہ نہ کی۔

قرآن کی مختلف قراءتوں کی تقسیم حسب ذیل ہے:-

(۱) قراءۃ نافع بن ابی نعیم = اور یہ اہل مدینہ کی قراءۃ ہے۔

(۲) قراءۃ عبداللہ بن کثیر = اور یہ اہل مکہ کی قراءت ہے۔

(۳) قراءۃ ابی عمرو بن علاء = اور یہ اہل بصرہ کی قراءت ہے۔

(۴) قراءۃ عبداللہ بن عامر = اور یہ اہل شام کی قراءت ہے۔

(۵) قراءۃ قاسم بن ابی الجود = یہ اہل کوفہ کی قراءت ہے۔

(۶) قراءۃ حمزہ بن حبیب الزیات = یہ بھی اہل کوفہ کی قراءت ہے۔

(۷) قراءۃ علی الکسائی = ام فن نحو = اہل کوفہ کی قراءت ہے۔

(۸) قراءۃ یزید بن القعقاع = یہ مدنی قاریوں کے شیخ اور نافع کے سناذ ہیں۔

(۹) قراءۃ خلف = یہ حمزہ کے شاگردوں میں ہیں۔

(۱۰) قراءۃ یعقوب =

اب ان قراءتوں کے بعض اختلافات کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

قراءۃ نافع | لفظ "بنی" میں حمزہ کا استعمال خواہ بنی مفرد یا جمع مستعمل ہو۔ جیسے یا ایہا بنی۔ اور

والنبيون یہ عبرتی زبان کے لفظ بنی کے اندر ہے۔

لفظ اُذُن کی ذال ساکن جیسے اُذُن رشتہ سورہ توبہ کی آیت میں قُلْ اُذُنْ خَيْرٌ لَّكُمْ  
یومہن باللہ میں اُذُن کی جگہ "اُذُن"

فعل حزن رباعی جیسے اتی لبحر ننی لیکن سورہ انبیاء کی آیت لَا یُحْزِنُهُمُ الْفَزَعُ لَا کِبَرُ اس سے  
مشتق ہے۔

کسی لفظ کے شروع میں دو لفت آئیں تو ان میں پہلے الف کو بدلتے ہیں اور دوسرے کو "ک" سے بدل دیتے ہیں جیسے سورہ بقرہ کی اس آیت اَنْذِرْتَهُمْ لَعْنَتُهُمْ لَا یُؤْمِنُونَ میں اَنْذِرْتَهُمْ کے بدلے اَنْذِرْتَهُمْ قرات کرتے ہیں۔

میم جمع کو واو سے وصل کرتے ہیں جیسے عَلَیْہِمُو پڑھتے ہیں۔ یا اے مقصورہ کو نصف الم  
جیسے فتی، ہدی، مصطفیٰ۔

قراۃ بن شمر | بن شمر کلمہ ضیاء کو ضناء پڑھتے ہیں جیسے سورہ یونس کی آیت هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسُ  
ضیاء میں ضیاء کے بدلے ضناء قراۃ کرتے ہیں۔ ابن کثیر صا، ضا، ظا، ظا کے بعد لام کو تغنیم  
نہیں دینے کی وجہ سے "ورش" قراۃ نافع میں تغنیم دیتے ہیں۔

قرۃ بن عمرو | ہر قرۃ ایک ہی لفظ اس کے قریب قریب لفظ کے ادغام پر مبنی ہے۔ مثلاً: سَلَكَكُمْ کو سَلَكَمْ  
رَمَسَكُمْ کو رَمَسَكَمْ پڑھتے ہیں۔ اتَّخَذْتُمْ کو اتَّخَذْتُمْ (ذال کے بدلے دال) پڑھا جاتا ہے۔ جِثْ  
شَتْمًا کو حَتَّ شَتْمًا و العرش سبیل کو العرش سبیل پڑھا جاتا ہے کسرہ کے بعد میم جمع مکسورہ  
جیسے علیہم۔

قرۃ بن م | لفظ برزیمہ کو بعض مقامات میں عربی قرۃ کے مطابق ابراہام پڑھتے ہیں۔  
قرۃ بن م | باشتنا بعض کلمات اس میں تسبیل ادغام اور مالہ نہیں ہے مصر میں اس قرۃ کے متعلق



حفظ کی روایت بہت مشہور ہے۔

قرآن حمزہ | ہر مقصورہ کو پوری طرح کھینچ کر پڑھتے ہیں جیسے ہدی وفتی وشاء و ماء وخاب و طاب و ضاق۔ یؤمنون کو یؤمنون پڑھتے ہیں۔ لفظ صراط کو ذراط۔ اصدق کو ازوق پڑھا جاتا ہے۔ کسائی کی قرآن حمزہ کی قرات سے قریب قریب ہے۔ اور یہی حال قرآن خلف کلبے و ابی جعفر کی قرآن اس کے استاد نافع کی قرآن سے قریب ہے اور یعقوب کی قرآن بعض اگلی قراتوں کے موافق ہے۔

ان مختلف قراتوں میں وقف، ابتداء اور حروف کی صفات اور مخارج مثلاً آہستہ اور زور سے ادا کرنا غنہ، اور کھینچ کر پڑھنے کے متعلق بہت سے احکام ہیں جن کی بحث یہاں ضروری نہیں، چونکہ ان کا تعلق علم تجوید سے ہے۔

علامہ شبلی مرحوم نے قرآن کی تاریخ ترتیب بیان کرتے ہوئے بعض اختلافات قرآن کا تذکرہ کیا ہے لیکن فرماتے ہیں کہ یہ اختلافات معمولی ہیں اور ان سے مضموم پر کوئی اثر نہیں پڑتا، امام بخاری نے کتاب التفسیر میں اختلافات قرات کی بہت سی مثالیں دی ہیں۔ ان اختلافات کے متعلق ہمارے علم کوئی شافی جواب نہیں دیتے تھے، یہاں تک کہ ادب الجاہلی کے بدنام مصنف اور مصری ادیب طہ حسین نے اس کی لسانیاتی توجیہ کی جس سے اسرائیل و فلسطین نے استفادہ کیا اور اب دنیا پر یہ واضح ہو گیا کہ اختلاف قرات عربی زبان کے مختلف محاوروں کا نتیجہ ہیں۔ اور یہ خاص لسانیاتی اہمیت رکھتے ہیں۔

# عدم تشدد گاندھی جی کے ایک مکتوب پر تبصرہ

از جناب مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب بیواری

گاندھی جی نے ۱۔ نومبر ۱۹۳۷ء کے ہرکن میں "خلاف رائے" کے عنوان سے ایک مضمون سپرد قلم کیا ہے، یہ مضمون علی گڑھ کے ایک مسلمان کے مکتوب کے جواب میں لکھا گیا ہے۔

اس مقالہ میں گاندھی جی نے اپنے عقیدہ عدم تشدد پر قرآن عزیز و سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی خاص سلوب و پیرایہ بیان کے ساتھ گواہ بنایا ہے۔

اس وقت ہمارے سخن کے تمام بیان کردہ مباحث سے قطع نظر صرف اسی مسئلہ متعلق ہے تاکہ ان سیاسی مباحث میں یک مذہبی مسئلہ کی حقیقت کے متعلق نہ گاندھی جی کو غلط فہمی رہے ورنہ دوسروں کو۔

بدلت موجودہ تمام عقائد کا اس پر تفاق ہے کہ برسرِ قدم حکومت کے مقابلہ میں آزادی ہند کے لیے ہماری جنگ کا طریقہ کار صرف عدم تشدد ہی ہو سکتا ہے۔ اور اس مسئلہ میں ایک مسلمان کو مذہبی روشنی حاصل کرنے کے لیے قرآن عزیز کی مکی زندگی کے حکام، در رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ کی سیرت کے واقعات کافی و روانی شہادتیں ہیں۔

لہذا ملک کے موجودہ حالات اور اسباب و واقعات کے پیش نظر عدم تشدد کا یہ عملی طریقہ کار مذہبی و سیاسی دونوں اعتبار سے صحیح و درست ہے لیکن گاندھی جی کی بحث صرف اس "نقطہ" ہی پر مرکب نہیں



ٹھہر جاتی بلکہ اس سے تگے بڑھ کر حسب ذیل نتائج ظاہر کرتی ہے۔

(۱) عدم تشدد (اہمسا) طریق کار نہیں ہے بلکہ نہ نون کی اجتماعی اور اخلاقی بلکہ مذہبی اور سیاسی ہر قسم کی زندگی کے لیے نصب العین اور آخری فلسفہ حیات ہے۔

(۲) عدم تشدد کے نصب العین ہونے کے متعلق ان کی یہ ریسرچ تحقیق ہے کہ قرآن عزیز کی تعلیم بھی یہی ہے۔

(۳) کسی کتاب میں ”خواہ وہ الہامی اور وحی الہی ہی کیوں نہ ہو“ اگر ایسے احکام و مضامین بھی موجود ہوں جو اس کے بتائے ہوئے اصول کے خلاف ہوں تو ایسا ہونا ممکن ہے اور اس قاعدہ کے پیش نظر اگر قرآن عزیز کی بعض آیات عدم تشدد کے خلاف نظر آتی ہیں تو چنداں مضائقہ نہیں ہے۔

(۴) باوجود اس امر کے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن عزیز کو خدا کا کلام اور خود کو اس کا نبی اور رسول کہتے ہیں پھر بھی قرآن عزیز کی بعض آیات کا آیات سے اختلاف، اور سیرت رسول کے بعض واقعات اور قرآنی تعلیم کے درمیان اختلاف ممکن ہے۔

اگرچہ گاندھی جی کے مضمون میں الفاظ کی تعبیر اس طرح نہیں ہے جس طرح دفات وارہم نے کی ہے لیکن مفہوم مراد اور معنی کے اعتبار سے ان الفاظ کا صرف یہی مطلب نکل سکتا ہے۔

گاندھی جی نے ساتھ ہی یہ معذرت بھی کی ہے کہ چونکہ وہ غیر مسلم ہیں اور ان کی ہونی تفسیر مسلمانوں کے نزدیک ناقابل قبول ہوگی اس لیے وہ آیات کی تفسیر سے گریز کرتے ہیں ورنہ تو وہ قرآن عزیز کی آیات سے اپنے مقصد کو ثابت کر سکتے ہیں۔

ہم کو ان کے مضمون کے مسطورہ بالا ”نتائج“ اور معذرت دونوں سے اختلاف ہے۔ اور ہم چاہتے ہیں کہ ترتیب داران کو واضح کریں اور بتائیں کہ اس مسئلہ کی اصل حقیقت کیا ہے؟ عدم تشدد نصب العین نہیں ہے، طریق کار ہے، ”تشدد یا عدم تشدد ایک ایسا عمل ہے جو فرد یا جماعت

کے درمیان جانین کے تعلق سے پیدا ہوتا ہے یعنی اس عمل کا تعلق تنہا ایک شخص کی انفرادی زندگی سے نہیں ہوتا بلکہ اس کے اثرات نیکہ و بد کے لیے دو جانوں کا ہونا ضروری ہے۔ لہذا عقلی اور فطری تقسیم کے پیش نظر ان ہر دو جانب کی صورت دو ہی صورتیں ممکن ہیں (۱) یا دونوں کے درمیان قوت و ضعف میں مساوات ہے (۲) یا دونوں میں تفاوت اور فرق ہے۔ پس اگر ایک دوسرے پر ظلم و تعدی کرے اور جائز حقوق کو پامال کر کے اس کی عاقبت تنگ کر دے تو ایسی حالت میں دوسرے کو اس کے جواب اور رد عمل کے لیے ”عقل اور فطرت“ کا قانون کیا فیصلہ دیتا اور اخلاقی حکم اس کے بارے میں کون سی راہ بتاتا ہے؟ درحقیقت عقل و فطرت یا خدائی حکم ایسے شخص یا اسی جماعت کے لیے جو بھی فیصلہ دیتے ہوں بحث طلب بات یہ ہے کہ اس کی اس مقاومت و رد عمل کی زندگی کے لیے ”فیصلہ“ یک طریق کا ہے یا نصب العین؟

یہ دو مسئلے ہیں جن کو سب سے پہلے ”عقل“ کی ترازو میں تولنا اور فطرت کے پیمانے سے ناپنا ضروری ہے۔ اس کے بعد اس پر غور و فکر کو متوجہ کرنا آسان ہے کہ اسلام نے اس کے متعلق کیا پیغام دیا ہے اور آباؤہ پیغام ”فطرت و عقل“ کے عین مطابق ہے یا مخالف۔

علم صدق (Ethics) اور علم نفسیات (Psychology) کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ قوت طبعی (کو بالکل فنا کر دینا و مٹا دینا قطعاً ناممکن اور محال ہے، اس لیے کہ جس قدر عقل بستی نے انسان کو وجود سے نوازا و مشرف کیا ہے اُس نے بد فطرت اور وجود انسانی کے دفت ہی سے ان فنی و ملکات کو اُس کے خمیر میں گوندھ دیا ہے لہذا انسان اور بشری طاقت سے یہ باہر ہے کہ وہ اس کو فنا کر دے اور ان کے مقابلہ میں دوسرے ملکات کو عالم وجود میں لائے یا ان کی ہیئت و حقیقت کو تبدیل کر کے ان کے لیے کوئی دوسری حقیقت تجویز کر دے۔ البتہ اُس کو یا خیر بخشا گیا ہے کہ وہ اپنے عمل و کردار میں ان کو صحت یا غلط طریقہ پر استعمال کر کے اور ان سے اچھا



یا بڑا کام لے سکے۔

اسی کے ساتھ علم الاجتماع (Ethics) اور علم الاخلاق

کا یہ بھی متفقہ مسئلہ ہے کہ افراد انسانی میں ہر فرد "جماعت" کا ایک عضو ہے اور جماعت اس کا مکمل پیکر اور یہ کہ جماعتی زندگی کی ترقی کا آخری نقطہ یہ ہے کہ تمام عالم انسانی جغرافیائی، نسلی، قومی، وطنی، اور ہر قسم کے امتیازات سے بالاتر ہو کر ایک اور صرف ایک برادری بن جائے جس کا ہر فرد دوسروں کی طرح یکساں حقوق کا مالک ہو اور جماعت انسانی کا مکمل پیکر اپنے ہر ایک عضو اور فرد کی حیاتِ کامل کے لیے کیساں کفیل و ضامن۔

اسی طرح یہ امر بھی غیر اختلافی ہے کہ انسان کے فطری ملکات اور طبعی قویٰ میں "قوتِ غضبیہ" بھی ایک قوت اور ملک ہے جو اس کی ذات اور اس کے حقوق کو دوسروں کی دستبرد سے بچاتی اور محفوظ کرتی ہے۔

پس جس انسان میں یہ قوت اعتدال سے کمزور پڑ جاتی ہے تو وہ خودداری کے شرف کو محروم، اور پستی و خواری سے دوچار ہو جاتا ہے اور جس شخص میں حد اعتدال سے آگے بڑھ جاتی ہے وہ وحشی اور درندوں کی طرح بربریت اور ظلم و تعدی کا پیکر بن جاتا ہے۔

لہذا ان ہر متفقہ مسائل کے پیش نظر عقل اور فطرت کا یہ قانون نے ہے کہ انسان جب کبھی ظلم و تعدی کا شکار نہ ہو تو اگر وہ اس کے دفع اور ردِ عمل کی طاقت نہیں رکھتا۔ تب اس کے لیے یہ مناسب ہے کہ وہ ہرگز مقاومت اور ردِ عمل کا وہ طریقہ اختیار نہ کرے جس سے ظلم دفع ہونے، اور ظالم کی قوت شکست ہونے کے بجائے خود اس کی ہستی ہی مٹ جائے اور اسی طرح دوسروں کو برباد کرنے کے لیے ظالم کی طاقت میں اور اضافہ ہو جائے۔ بلکہ صبر و ضبط کے اسلحہ کو کام میں لا کر ایسی مقاومت اور ایسے ردِ عمل کو اختیار کرے جس کے نتیجے میں ظالم کی ظالمانہ طاقت کو صدمہ پہنچے، اور آہستہ

بہتہ شکست ہو کر مظلوم کو آزادانہ اور مساویانہ زندگی میں سانس لینا نصیب ہو۔

اور اگر برابر کی طاقت یا ایسی کمزور طاقت کا مالک ہے جو مساویانہ نہج و آزمانی اور مقادست و مقابلہ کے لیے اس کے غالب گمان میں کافی ہے، اور ماحول کے اثرات سے وہ غالب کو مغلوب کر دینے پر قادر ہے تو اس کے لیے انفرادی زندگی میں دونوں راہیں کشادہ ہیں یہ کہ اپنا نقصان برداشت کرے، خود کو مصائب و آلام کا شکار بنائے، اور مخالف کو عفو اور درگزر کے اخلاقی اسلحہ سے فتح کرے، ورنہ ظالم کو ظلم سے رستگاری دلائے۔

یاد دہی قوت و طاقت کے ذریعہ صرف اس حد تک مقابلہ کرے جس حد تک ظالم نے ابتداء کی ہے اور اس سے ایک شوشہ زیادہ بھی اس میں اضافہ نہ کرے تاکہ بدلہ اور انتقام کی سپرٹ میں کہیں یہ خود ظالم نہ بن جائے۔

اور اگر یہی صورت اجتماعی زندگی کے مقابلہ میں پیش آئے تو پھر یہ دیکھنا فرض اور ضروری ہوگا کہ حسب حق و مدافعت ظلم یا انتقام حق کے لیے کوئی راہ جماعت کے مفاد کے لیے بہتر اور انسب ہے اور کوئی راہ مضر اور نقصان دہ۔

پس اگر عفو و درگزر اور صلح و آشتی کے ذریعہ کامیابی متوقع ہے تو وہ صورت اختیار کی جائے اور اگر عدم تشدد کے طریق کار سے مقدمت و مدافعت مناسب ہو تو اس کو کام میں لایا جائے اور اگر ایسے سم تو دشمن کو کاٹ دینا اور مادی سحمہ کے تریاق سے اس زہر کو بچھا کر جماعت کو بچالینا ضروری نظر آئے تو ایسا راز نہ صرف مناسب اور مفید ہے بلکہ وقت کا اہم فریضہ ہے۔

قدیم و جدید اہل عقل کا یہ فیصلہ "واقعی اور عملی زندگی" میں ہمیشہ کامیاب رہا ہے اور اس کے خلاف ایک مختصر سے حد و اخلاق نے جب کبھی یہ آواز بلند کی ہے کہ ہم کو مجاہدہ اور ریاضت کے ذریعہ ان قوانین طبعی کو موت کی نیند سے دینا چاہیے تو سلیم اعظم و علماء اخلاق کی کثیر جماعت نے ہمیشہ ان کے



اس نظریہ کو علم و عمل کی روشنی میں ناکام ثابت کر دکھایا، اور یہ واضح کر دیا کہ تو اے طبعی کے وجود سے جنگ کرنا خود فطرت اور خالق فطرت کے ساتھ جنگ کرنا ہے اور اس کا نتیجہ خوبصورت خواب اور حسین خیال کے سوا دنیا پر علم و عمل میں بے حقیقت و بے بنیاد ہے۔

اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لیے اُس نے بھی انفرادی و اجتماعی زندگی کے دونوں پہلوؤں کو اخلاق کے ان ہی فطری اور عقلی اصولوں پر قائم کیا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ تمام انسان ایک ہی رشتہ اخوت میں منسلک ہوئے چاہئیں، انسانیت کا جو رشتہ اپنے خالق کے ساتھ ہے وہ بغیر امتیاز کے سب کے لیے یکساں ہے، اس لیے قومیت، وطنیت، نسلی اور خاندانی امتیازات، تعارف باہمی کی حد تک اگرچہ قابل قبول ہیں لیکن اعمال و کردار، فضائل و رذائل، معادرت و مناصرت، اور اعتقاد و ایمان کی حدود میں ناقابل قبول اور خود ساختہ مصمم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

لہذا اُس کی دعوت و ارشاد کا نصب العین یہ ہے کہ تمام عالم انسانی اعتقاد و ایمان اور اخلاقی کردار و اعمال میں ایک ہی نقطہ پر جمع ہو جائیں، اور اُن کے درمیان کوئی دوی باقی نہ رہے۔ ہر فرد انسان دنیا کی تمام انسانی برادری کو اپنا پیکر اور جسم یقین کرے اور کل دنیا انسانی ہر فرد انسان کو اپنے پیکر و جسم کا ایک کارآمد عضو تصور کرے۔

اسی وسعت نظر، اور بلندی فکر کا نام علم الاخلاق میں ”مثل اعلیٰ“ ہے، اور یہی انسان کی اخلاقی زندگی کا آخری مقصد ہے۔ اسی لیے قرآن عزیز نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے متعلق یہ تصریح کی ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تم کو تمام انسانی برادری کے لیے یکساں

لِلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا (اے نبی) میں نے تم کو سب کے لیے اچھے کردار پر بشارت دینے والے

نذیراً (سبا) اور بڑے کردار پر ڈرانے والے ہیں۔

اور اس پیغام سے متعلق آپ کی ذاتِ اقدس کی حقیقی صفت کا اس طرح اظہار فرمایا ہے۔

وما أرسلناك الا رحمة للعالمینؑ اور ہم نے تم کو کل جہان کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے

اور خود ذاتِ اقدس نے اپنی بعثت اور مقصدِ نبوت و رسالت کو ان حکیمانہ الفاظ میں ارشاد

فرمایا ہے۔

الی بعثتکم مکارم الاخلاق میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاق کریمانہ کو

(او) محاسن الاخلاق (احمدیث) حدِ کمال تک پہنچاؤں۔

اسی لیے اسلام نے کسی حالت میں بھی اخلاقِ کریمانہ کے اصول سے ہٹ کر ظلم و عدوان یا

تشدد و سختی پر اپنی "دعوت و تبلیغ" کی اساس کو قائم نہیں کیا اور اس نے اس کے لیے صرف ایک ہی

اصول بیان کیا ہے۔

ادع الی سبیل ربک بالحکمة اپنے پروردگار کی راہ کی طرف بلاؤ حکمت و دانائی

والموعظة الحسنة و جادلہم کے ساتھ، اور چھی، چھی نصیحتوں کے ذریعہ، اور ان

بآسانی ہی احسن، (منہل) (خفی غلوں) سے بحث و مباحثہ کرو اچھے طریقہ اور بہتر

روئے کے ساتھ۔

البتہ جب کوئی شخص یا فرد یا عالم انسانی کی چھوٹی بڑی جماعت اخلاق کی اس بلند پایہ تعلیم

(دعوتِ عامہ) کے خلاف علم بغاوت بلند کرے، اور اس راہِ صداقت میں راہ کا پتھر بنے تو اب

داعی حق و صداقت کا فرض ہے کہ وہ غور کرے کہ اس مقصدِ اعلیٰ اور اجتماعی نصب العین کے بقا و

تخلّص کے لیے یا راہ کا پتھر بنانے کے لیے کونسا طریقِ عمل مفید ہے۔ اور جس کو مفید سمجھے اختیار کرے۔

مؤمنین کی تمام زندگی میں نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفقاء (صحابہ رضی اللہ عنہم) کو



قرآنی تعلیم نے صرف صبر و ضبط، عفو و درگزر، اور عدم تشددانہ مقاومت و مقابلہ ہی کو جماعتی فلاح کے لیے ضروری قرار دیا۔ اور آپ نے اور آپ کے تمام فداکاروں نے اسی کو اپنا اسوہ عمل بنایا۔ اور مکہ معظمہ سے ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ کے ابتدائی دور میں قوت و طاقت آجانے کے بعد بھی ان ہی اخلاقی اسلحہ کا استعمال باقی رہا۔ مدنی غیر مسلموں (یہود و نصاریٰ) کے ساتھ بغیر جنگ و جدل کے ابتدائی معاہدے اور صلح و آشتی کی روش بھی اسی حکم کی ایک فرع اور شاخ ہے۔

لیکن مخالفوں کی معاندانہ روش، اور مقصدِ اعلیٰ کو تباہ و برباد کرنے کے ناپاک جذبہ نے جب خوفناک صورت اختیار کر لی، اور دعوت و تبلیغ کے لیے اُن کی مڑکاؤں میں بلکہ اُن کی ہستیاں مستقل خطرہ، اور مہلک خطرہ بن گئیں تب اسلام نے یہ فیصلہ دیا کہ اب صبر و ضبط، عفو و درگزر، اور عدم تشدد کا طریق کار آپ کے ذاتی اخلاق کی سرلمبہ یوں کے لیے کتنا ہی حسین اور خوبصورت شاہکار کیوں نہ معلوم ہوتا ہو لیکن خانیق کائنات کے نزدیک اس زہر زدہ عضو کی قطع و ہرید واجب ہے اور یہ نہ صرف اخلاق کے اس اعلیٰ پیغام کو فتنہ و فساد سے بچانے کے لیے ضروری ہے بلکہ عالم انسانی کے امن عام کی بہتری و بہبودی کے لیے بھی سچ ضروری ہے۔ اور اس لیے اپنے فداکاروں کو مادی طاقت کے مقابلہ میں مادی طاقت کے استعمال کی یہ کہہ کر اجازت دی۔

اُذِنَ لِلَّذِينَ يُقْتَلُونَ بِآثِمِهِمْ  
ظَلُّواهُ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ  
لَقَدِيرٌ الَّذِيْنَ اَخْرَجُوْا مِنْ  
دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّا اَنْ يَقُوْلُوْا  
سُبْحَانَ اللّٰهِ وَلَوْ اَدْفَعْنَا اللّٰهَ  
النَّاسَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ لَّهٰدٍ  
جَن لُّوْگُوْنَ سَی نَاحِقُ لِّلّٰہِیْ کِی جَاتِیْ ہِے اُن کو  
اِس بنا پر لڑنے کی اجازت دی گئی کہ اُن پر  
ظلم کیا گیا ہے اور بیشک اللہ اُن کی مدد کرنے پر  
دیا سر ہم بغیر حق الا ان یقولوا قادر ہے۔ اُن کو جو ناحق اپنے گھروں سے نکالے گئے  
سبنا اللہ ولولا دفع اللہ صرف اس تصور پر کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار  
الناس بعضہم لبعض لہد مت اللہ ہے اور اگر اللہ کا لوگوں کو بعض کو بعض کے ذریعہ

صوامع و بیع و صلوات و سے دفع کرنا نہ ہوتا تو ضرور درویشوں کے خلوت خانے

مساجد یذکر فیہا اسم در گرجے اور یہودیوں کے صومعے در مسجدیں جن

لہ کثیر و یبصرن اللہ میں اللہ کا کثرت سے ذکر کیا جاتا ہے گرا دیے جاتے

من ینصرہ فان اللہ تقویٰ وراثہ اس کی ضرورت دکر لگایا جو اس کی مدد کرتا ہے

عزیز۔ (المح) بیشک اللہ قوت والا ہے غالب۔

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین وراثہ کی راہ میں ان سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں

بقاتلونکم ولا تغتلبوا ان اللہ اور اپنی طرف سے زیادتی نہ کرو بیشک اللہ حق ہے

لا یحب المعذین۔ ( ) بہر نکلنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

کتب عسکوا یقتال وھو کمرہ تم پر جہاد فرض کیا گیا ہے ورنہ تمہیں ناگوار ہے

لکم و عسی ان تکرھوا شیئا اور ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے

وھو خبر لکم و عسی ان تجبوا حق میں بہتر ہو ورنہ ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو و

شیئا وھو شر لکم واللہ نہ تمہارے حق میں بُری ہو، اور اللہ جانتا ہے اور

یعدو انتم لا تعلمون وقرہ تم نہیں جانتے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ اسلام نے جماعتی فلاح و بہبود اور امن عام کی حفاظت کے لیے جس لڑائی

کی اجازت دی اس کا نام تشدد و جنگ، یا اس قسم کا کوئی دوسرا نام تجویز نہیں کیا، بلکہ "جہاد" کہہ کر پکار

تا کہ یہ واضح ہو جائے کہ ان جنگوں کا مقصد محض جنگ اور تشدد نہیں ہے۔ بلکہ اصل مقصد "اعلاء کلمۃ اللہ" اور

خود کار کی تکمیل کے لیے جدوجہد کا ایک خاص طریقہ کار ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب اس جنگ کا

مقصد صرف طمع دولت و دوسروں پر بی لاکت آفرینی، اور دنیا طلبی ہو تو وہ جہاد نہیں ہے بلکہ ناپاک

جنگ ہے جو تکبیر و عنفوان کاٹ کھانے والی حکومت کی خاطر لڑی گئی ہے۔



اس تمام تفصیل و تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تشدد یا عدم تشدد خوردہ کوئی نصب العین یا مقصد ہیں اور نہ یہ اخلاقی فلسفہ کی کوئی شاخ، بلکہ یہ دو طریقہائے کار ہیں جو نیک اور بد دونوں مقاصد کے لیے استعمال کئے جاسکتے ہیں، پس اگر مقصد نیک ہے تو حسب موقعہ مفاد عامہ کے اعتبار سے دونوں طریقے عمل نیک شمار ہونگے۔ اور اگر مقصد بُرا اور ناپاک ہے تو اُس کے لیے عدم تشدد (دھنسا) بھی اُسی طرح بُرا عمل ہے جس طرح تشدد (دھنسا) یعنی مادی طاقت کا استعمال۔ نیز تشدد و عدم تشدد کے درمیان خیر اور شر کے تناسب کا محاذ بھی ضروری ہے۔ مثلاً ایک فرد یا ایک جماعت، فتنہ و فساد کی درپے ہے اور امن عام اور حق و صداقت کے لیے مملکت خطرہ بنی ہوئی ہے تو ایسی حالت میں اگر مادی طاقت (تشدد) کا طریقہ اختیار کر کے اُس کو فرد کیا جائے تو بہت آسانی کے ساتھ فرد ہو جاسکتا ہے اور اگر عدم تشدد (دھنسا) کے ذریعہ اُس کو ختم کرنے کی سعی کی جائے تو نصف صدی صرف ہوئے کے بعد کامیابی کی توقع ہو سکتی ہے تو ایسی صورت میں عدم تشدد کے طریقہ کو استعمال کرنا خیر نہیں کہلایا جاسکتا۔ اس لیے کہ نصف صدی کے اس درمیانی حصہ میں ظالم اور فتنہ ساز کے تمام مظالم و فتنوں کے ایک طرح وہ بھی ذمہ دار ہونگے جو تشدد پر طاقت رکھنے اور اُس کی کامیابی کے متیقن ہونے کے باوجود اُس سے گریز کر کے ظالم کو ظلم کی فرصت دیتے رہے۔ اور بلاشبہ اس حالت میں مادی سلحہ کی طاقت کا استعمال ضروری ہو جائیگا جس کو گاندھی جی تشدد کہتے ہیں اور اسلام "جہاد" سے تعبیر کرتا ہے، گاندھی جی اور اس تفصیلی بحث سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ گاندھی جی کی یہ ریسرچ (تحقیق) کہ قرآن مجید قرآنی ریسرچ صرف عدم تشدد ہی کی تعلیم دیتا ہے اور بس "صحیح نہیں ہے، خود قرآن عزیز کی مکمل تعلیم اُن کے اس دعوے کو غلط ثابت کرتی ہے۔

اس میں عفو و درگزر اور عدم تشدد کے بھی احکام ہیں جو مکی اور مدنی دونوں قسم کی صورتوں

یعنی سورہ مائدہ کے رکوع (۱)، اعراف کے رکوع (۲۴)، النحل کے رکوع (۱۶)، الحج کے رکوع (۸)

امؤمنون کے رکوع ۵، الشوریٰ کے رکوع ۳۔ اور تہابین کے رکوع ۱ میں مفصل درج ہیں۔ اور اُس میں تشدد اور جہاد کے احکام بھی موجود ہیں، اور اسی قرآن عزیز نے فرضیت جہاد کو بیان کرتے ہوئے یہ بھی صاف کر دیا ہے کہ یہ مسئلہ جہاد تا قیام قیامت اپنی فرضیت پر قائم و دائم رہیگا اور اسی طرح خلاف کریمانہ کے احکام عفو و درگزر اور صبر و ضبط بھی حالات و واقعات کی روشنی میں ابدی و سرمدی ہیں۔ اور یہ کہ وہ تشدد و عدم تشدد کو طریق کار تسلیم کرتا ہے اور مقصد و نصب العین کی حیثیت نہیں دیتا۔

اور اسی لیے گاندھی جی کا یہ قول کہ غیر مسلم ہونے کی وجہ سے اُن کی تفسیر ناقابل قبول ہوگی ورنہ تو وہ قرآن عزیز سے سب بخوبی کو ثابت کر دکھاتے، درست نہیں ہے۔ کیونکہ اس مسئلہ کے قبول و عدم قبول کی یہ بحث مسلم اور غیر مسلم کے امتیاز سے زیادہ تعلق نہیں رکھتی بلکہ قرآن دانی کے لیے جن علوم کی معلومات شرط ہے اور بجا شرط ہے اُس پر موقوف ہے پس اگر ایک مسلم بھی اُن علوم سے نا آشنا ہے تو وہ بھی یہ حق نہیں رکھتا کہ قرآن عزیز کی تفسیر کر سکے کیونکہ وہ بلاشبہ غلطی کھائیگا اور مگر ہی کا باعث بنیگا۔

جی الہی میں عقل و فطرت کا یہ صفت اور روشن فیصلہ ہے کہ اہل عقل کے کلام میں باہمی تضاد اور باہمی تضاد اور محنت نہیں ہونی چاہیے۔ کیونکہ یہاں متضاد کلام یا صاحب کلام کے نقصان عقل پر محنت و لفت و لالت کرتا ہے یا رچاری و مجبوری پر۔ ترجمہ گاندھی جی کا یہ مفقہ کہ کس قدر حیرت زا ہے کہ اُن کے نزدیک خدا کے احکام میں اگر ایسی محنت و لفت نظر آئے تو خدا ان مضائقہ نہیں ہے۔ لہذا اس جہرت کو دور کرنے کے لیے یہی کہا جاسکتا ہے کہ گاندھی جی حقیقت کسی کلام کے کلام نہیں ہونے کے صحیح تصور سے اس بے عاجز میں کہ اُن کی اعتقاد ہی تعلیم ”جی الہی“ کے نزول کی اس حقیقت کو قطعاً وضع نہیں کرتی جس کا اعتقاد یقین اسلام کے معتقدات میں اسلامیت کی پہلی شرط ہے۔ قرآن عزیز بے شک دہل اعدان کرتا ہے۔



افلا یتدبرون القرآن ولو کان من عند غیر اللہ لوجہ افیہ کسی اور کے پاس سے آتا تو اس میں طرح طرح اختلاف اکثر ( ) کے اختلافات پاتے۔

یعنی جبکہ خدائے تعالیٰ عالم غیب و شہادت ہے اور قادر مطلق بھی تو پھر یہ ناممکن ہے کہ اُس کے کلام میں اختلافات ہوں، اختلافات تو بلاشبہ جس و نادانی، وریچاگی و مجبوری سے پیدا ہوتے ہیں۔

قرآنی تعلیم اور اسی طرح گاندھی جی کا یہ نظریہ بھی دور از عقل و خود ہے کہ خدا کے سچے پیغمبر اور رسول کی سیرتِ رسول زندگی کے بعض واقعات کلام الہی کی تعلیمات کے خدات ہو سکتے ہیں۔ میں نے جہاں تک غور کیا گاندھی جی کا یہ نظریہ بھی غائباً اس غلط اعتقاد پر مبنی ہے کہ خدا کے پیغمبر کی حیثیت یک ریفر اور مصلح کی برابر ہے۔

کیونکہ بلاشبہ ایسا ہوتا رہا ہے اور ہو سکتا ہے کہ ایک ریفر "مصلح" کی تمام زندگی کے باہمی حصوں میں پوری صف بقت نہ پائی جائے بلکہ بعض مرتبہ یک دوسرے کے خدات نظر آئیں لیکن اس میں "پیغمبر" اور "نبی و رسول" کے متعلق جو عقیدہ بتایا ہے درحقیقت یک سچے مذہب کے یہ نہ جس ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ کا کلام اور وحی الہی ایک "قانون" ہے۔ جس نبی پر وہ کتاب نازل ہوئی ہے وہ اُس کا ایک مکمل عملی نمونہ ہے۔ تاکہ معاش و معاد کے ہر شعبہ میں قانون اور عمل کے درمیان عدم صف بقت کی وجہ سے عالم انسانی ضلالت و گمراہی میں نہ پڑ جائے اور خود نبی و رسول کی ذات بھی بے عملی یا کذب جیسی قبیح صفات سے بری اور پاک رہے۔ اس لیے قرآن عزیز نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ کا یہ طفرائے امتیاز بیان کیا۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ لارباب ہناکے ہے اللہ کے رسول میں عمدہ نمونہ



کو اس عقیدہ سے ہٹنے کا حق نہیں رکھتے نیکن ان پر یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہندو مسلم اتحاد اور  
سیاسیات ملکی وطنی میں ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے ایک قوم ہونے کے جواز کو تسلیم کر کے  
باوجود اسلامی تسلیم ہرگز کسی مسلمان کو یہ اجازت نہیں دیتی کہ وہ دوسرے مذاہب کا مذاہمی جی کے بتائے  
ہونے معنی سے احترام کرے۔

اس سلسلہ میں اسلام کا صاف اور سادہ عقیدہ یہ ہے کہ وہ تسلیم کرتا ہے کہ دنیا انسان کی  
ابتداء سے خدا کی بھی ہوئی روحانی روشنی (مذہب) ایک ہی قسم کے اصولوں پر قائم ہے جس کے مجموعہ  
کا نام "اسلام" ہے، اگرچہ زمانہ اور وقت کے اعتبار سے اس کے مختلف نام ہی کیوں نہ رہے  
ہوں۔ اور یہ کہ خدا کے اس نور کے لانے والے پیغمبر ہمیشہ دنیا کے مختلف گوشوں میں جاتے رہے ہیں

وان من امنہ لا خلافتہا کوئی گروہ یا سنس ہے جہاں ہماری جانب کو

نذیرہ (ناظر) ہماری راہ سے ڈرانے والا نہ آیا ہو۔

منہم من قصصنا علیک و ان رسولوں میں سے بعض کے وقعات ہم سے قبل

منہم من لم نقص علیک پر بیان کر رہے ہیں، بعض کے بیان سنس کیے۔

اس لیے ایک مسلمان کا یہ عقیدہ ہونا چاہیے۔

لا تفرق بین احد ہم خدا کے سچے پیغمبروں میں سے کسی کے دھوکے

من رسلہ (بقرہ) بھی "ایمان لانے میں" فرق نہیں کرتے۔

اور ان ادیان و مذاہب میں ان کے ماننے والوں کی من، نئی کنز بوست اور تحریف کی بدولت

جب اصل سچائی معدوم ہونے لگی تو خدا نے اس کو آخری اور مکمل قانون کی شکل میں محمد رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے اسلام اور شرابی نسیم کے نام سے بھیج دیا۔ وراپ گزشتہ

یہودیت، نصرانیت، اور دیگر ممالک کے سچے مذاہب کی صحیح تعلیم کی شکل صرف اسی "اسلام" در قرنی



تعلیم میں منحصر ہے۔ باقی سب محرف و ناقابل قبول مذاہب ہیں۔

ان مدین عند اللہ لا سلام بر شہ خد کا (پسندیدہ) دین اسلام ہی ہے ورجو  
ومن یتبع غیرہ لا سلام دینہ تنفس میں سلام کے سوا دوسرے دین تلاش کرتا ہر خدا  
فلن یقبل منہ آل عمر : کے پاس وہ قطعاً نامقبول ہے۔

اس لیے اسلام جو خدا کی توحید میں دینی شائبہ شرک کو برداشت نہیں کر سکتا اس مذہب کے  
احترام کی جواز کیسے سے مستلزم ہے جس میں خدا کے لیے بیٹا یا بیٹی جو یزید جاتا یا اس کی مخلوق کو اسی کی  
طرح معبود مانا جاتا ہو ورنہ اس طرح کے شرک کو اختیار کیا گیا ہو۔

اسلام کتنا ہے کہ صداقت ایک ہی ہو سکتی ہے اور ایک ہی ہے، اور جس طرح دن کی روشنی  
رات کی تاریکی نہیں ہو سکتی اسی طرح توحید اور شرک میں یگانگت ناممکن اور محال ہے۔

اور اگر گاندھی جی کے نزدیک اس احترام کے معنی دوسرے مذاہب کے ساتھ رویہ داری  
اور مذاہب کے پیشواؤں کے ساتھ باعزت برتاؤ کے ہیں۔ تو یہ تعین اسلام کی تعلیم ہے اور اسلام کسی سے  
متاثر ہو کر نہیں بلکہ خودی بنیادی طور پر غیر مذہب اور دل آزار رویہ کو ناپسند اور ناجائز قرار دیتا ہے۔ اور  
روایتی کی تعلیم کا نام ہے بلکہ آج سے صدیوں پہلے ہندوستان کے علمائے اسلام اور صوفیائے  
کرام نے بعض سوالات کے جواب میں رام چندری، کرشن جی اور ہاتھامدھ کے لیے یہاں تک  
نہیں بے زبان حضرات کے متعلق ایک افتاء بھی خلاف شان نہ کہا جائے کیونکہ ممکن ہے کہ سب خدا  
کی جانب سے بھیجے ہوئے ہوں ورنہ میں ان کے مقلدوں نے ان کی تعلیمات کو شرک کی تعلیمات  
سے بدل دیا ہو نکلات طیبات میں مرزا منظر جانجاں رحمۃ اللہ علیہ کا مکتوب اس سلسلہ میں قابل  
مطالعہ ہے۔ قرآن عزیز صاف یہ کہتا ہے۔

لا تسبوا الذین بدعون من (شرکین) اللہ کے سوا جن تلوں کو پوجتے ہیں تم ان

دون اللہ فیسبوا اللہ علیہ ۱۲ کے لیے بدگوئی نہ کر دو کہ پھر وہ تا بھی میں عداوت کی  
بغیر علم . (۱۱ نام) رام سے خدا کو گالیاں دینے لگیں۔

معرکہ جنگ جیسے اہم موقعہ عداوت میں بھی دوسرے مذاہب کے اُن پیشواؤں کے ساتھ بُرے  
سوک سے اسلام نے سختی سے رد کا ہے جبے خطر اپنے مذہب کے مطابق خدا کی یاد میں مشغول ہوں۔ اور اسی  
طرح اُن کے معابد کی تخریب سے بھی باز رکھا ہے۔

اور متضاد عقائد رکھنے والے اہل مذاہب کے درمیان یہی دوسرا طریقہ صحیح اور مطابق عقل ہے  
اور فقط یہی عملی زندگی میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

گاندھی جی کا دوسرا جملہ ”متحدہ قومیت متعلق ہے۔ ہم اُس وقت اس مسئلہ میں صرف  
اس قدر کہ دنیا کافی سمجھتے ہیں کہ ملکی اور وطنی بیابیات اور آزادی ہند کے مسئلہ میں بلاشبہ ہندوستان کے تمام باشندے  
بلا امتیاز مذہب و ملت ہندوستانی اور ایک قوم ہیں۔ لیکن مذہب اور مذہبی معاشرت کے اعتبار  
سے اقوام ہند کا ایک قوم ہونا صحیح نہیں ہے اور نہ اسلام مسلمانوں کو اس کی اجازت دے سکتا ہے۔  
مذہب کی مثال تو ابھی بیان ہو چکی مذہبی معاشرت کی مثالوں میں سے ”ازدواج بین الملل“ کو لیں۔  
اس مسئلہ میں سیاسی اختلافات کے باوجود کانگریسی ہو یا مسلم لیگی یا مہاسبھائی ہندو اور مسلمان دونوں میں ایک جماعت  
ایسی موجود جو حوصلہ میرٹھ کو ہر حیثیت سے جائز سمجھتی ہے اور دوسری جماعت جس میں ہندوستان کی  
قوام کی اکثریت شامل ہے اس کو ناپسند کرتی ہے۔

لیکن کوئی مسلمان پسند کرے یا نہ کرے اسلام ایک لمحہ کے لیے بھی اس کو جائز نہیں کہتا۔  
دعویٰ (۱۲) القیاس) البتہ دنیوی طرز پر دوا مذ اور دوسرے دنیوی حالات میں کہ جن کے متعلق پیغمبر اسلام صلی  
اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے :-

انتم اعلم باصول دنیا کم تم اپنے دنیوی امور میں خود زیادہ واقف کار ہو۔





# معادہ یوودی نقطہ نظر سے

جناب شمس الدین پروفیسر مولانا عبدالرحمن صاحب

اکتوبر ۱۹۸۵ء کے برائن میں ”متحدہ قومیت اور اسلام“ کے عنوان سے میرا ایک مضمون چھپا تھا۔ نومبر کے نمبر میں اس مضمون پر جناب مولوی حفیظ الرحمن صاحب نے ایک مفصل تنقید فرمائی ہے اور مجھے میری غلطیوں پر متنبہ فرمایا ہے۔ ۶ روک دو گر غلط چلے کوئی، ہر مسلمان کا فرض ہے کہ جائیکہ علماء کا، میں نے اس تنقید و تحقیر کو بخور پڑھا۔ میں جناب مولوی صاحب کی نیت بخیر کا تذکرہ سے شکر گزار ہوں لیکن ان کی تنقید میری نظر میں ابھی تحقیق طلب ہے۔ اسی تحقیق کی غرض سے میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں، اور کوشش کروں گا کہ جہاں تک ہو سکے باختصار لکھوں کہ ناظرین کے لیے بارخاطر ہو۔

برائن نمبر نومبر، خلاصہ صفحہ ۳۷۳۔

جناب مولوی صاحب نے لکھا ہے، یہ روایت (نامہ مبارک کی جس کو میں نے اسناد منقطع ہونے کی بنا پر ناقابل احتجاج کہا تھا)، اسی طرح صحیح و مقبول ہے جس طرح سیرت کی دوسری صحیح و مقبول روایات۔ اس کو، بن کثیر، ابن سلام، اور ابن ہشام جیسے تاریخ، حدیث، اور سیرت کے اکابر علمائے صحیح مانا اور روایت کیا ہے سہیلی جیسے ناقد نے بھی اس پر کسی قسم کی جرح نہیں کی۔ البتہ اس قسم کی سیرت کی روایات سے وجوب و حرمت کے احکام نہیں بیان کیے جاسکتے۔ حضرت مصنف ”متحدہ قومیت و اسلام“ نے بھی اس روایت کو اس غرض کے لیے پیش نہیں کیا ہے، بلکہ شرعی ضرورت کے لیے اسلامی واقعات کی شہادتوں میں سے ایک شہادت کے طور پر پیش کیا ہے۔

میں کتابوں متحدہ قومیت و سلام میں یہ روایت شرعی حکم ہی کے طریق پر بیان ہوئی ہے۔ اسی لیے ہم ختم روایت پر یہ عبارت پاتے ہیں، ”مذکورہ بالا بیان (اسی روایت) سے واضح ہو گیا کہ مسلمانوں کا غیر مسلموں سے مل کر ایک قوم بنانا، مذہب کے نفس دین میں خلل انداز ہے اور نہ یہ امر فی نفسہ اسلامی قوانین اجتماع کے خلاف ہے“ ص ۵۰۔ مطلب یہ کہ مسلمانوں اور نامسلمانوں سے مل کر ایک قوم بنانا یا نہ بنانا میری نزدیک ایک امر شرعی ہے، اس کے لیے روایت بھی ایسی ہونی چاہیے جس سے حلت و حرمت کے احکام بیان کیے جاسکیں اور کتب سیرت کی روایتیں جب تک کسی اور طریق سے صحیح ثابت نہ ہوں۔  
۵۔ اس قسم کے شرعی معاملات میں قابل احتجاج نہیں، تاہم متحدہ قومیت و اسلام میں اس روایت سے احتجاج کیا گیا ہے۔

جناب مولوی صاحب نے فرمایا ہے کہ یہ روایت ”متحدہ قومیت اور اسلام“ میں بطور شہادت لائی گئی ہے نہ بطور حجت شرعی۔ میں کتابوں کہ مسئلہ زیر بحث کو جناب مولوی صاحب نے بھی ضرورت شرعی مانا ہے۔ گریہ روایت شہادت ہے اور ستراد بر حجت ہے تو پھر حجت کہاں ہے۔

صفحہ ۳۳ پر جناب مولوی صاحب فرماتے ہیں

پروفیسر صاحب نے صنف رسالہ پر اس سے بدیتی کا الزام لگاتے ہیں کہ حادہ کی تمام عبارت کو کیوں نقل نہیں کیا اور صرف اپنے مطلب کی دفت کو کیوں نقل کیا.... کیا پروفیسر صاحب عملی تدبیر کے اس طریق سے بالکل نادقت ہیں کہ کسی طویل عبارت میں سے ہمیشہ اسی قدر عبارت نقل کی جاتی ہے جو دعویٰ کے ثبوت کے لیے شہادت بہم پہنچاتی ہو..... البتہ باقی ماندہ عبارت میں کوئی مضمون ایسا نہ ہونا چاہیے جو دعویٰ کی پیش کردہ شہادت کے خلاف ثبوت حیا کر کے اس کو مضحک کرتا ہو ورنہ اس بات پر شک نہیں ہے۔

میں کتابوں ”ایسا ہی ہے“ اور ”یہی عمل کلام ہے“ بعض دعوے کے ثبوت کے لیے صرف

اتنی عبارت کافی تھی ”ہذا کتاب من محمد النبی رسول اللہ بین المؤمنین والمسلمین من قریش واهل  
 یثرب ومن تبعہم فلحق بہم فحل معہم وجاہد معہم ائمۃ واحداً دون الناس اس عبارت  
 پر اپنے مطلب کی دفات کا نام مبارک سے جن جن کے اضافہ کیا گیا ہے۔ اگر چھوڑی ہوئی دفات امور جزئیہ کھلانے  
 کی مسحت میں توجہ نہ کور ہیں وہ از قبیل کلیہ کیسے ہو گئیں۔ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ سو سوویں دفعہ تک کا انتخاب ہوا اور  
 پنج کی دفات نظر سے رہ جائیں، بالخصوص وہ جو اہم تر ہونے کے علاوہ ومن تبعہم فلحق بہم وجاہد  
 معہم کی تفسیر و توضیح بھی کرتی ہوں۔ اس پر بھی جناب مولوی صاحب فرماتے ہیں۔

”بہر حال اس معاہدہ کی عام دفات کو قطع نظر کر کے صرف ان دفات کو بیان کرنا جو زیر غور مسئلہ  
 سے متعلق ہیں علمی دیانت کے خلاف نہیں بلکہ علمی طریق استدلال کے لیے بہت موزوں اور  
 منی برمدات ہے۔“

میں کہتا ہوں بہت خوب۔

صفحہ ”راہ امر کہ مسلمان مدینہ میں مغلوب تھے تو یہ پروفیسر صاحب کے مطالبہ کے زیر نظر ہو تو  
 ہو ورنہ تمام سیر و تاریخ کی کتابیں اس امر کی شہادت دے رہی ہیں کہ جب حضرت رسول مدینہ  
 تشریف لے آئے، وہ مہاجرین بھی لگے تو مدینہ میں مسلمان ہی مسلمان تھے درباری شہر ذمہ قبیل  
 علاء رضری بک کی تقریر سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے..... اگر مدینہ میں کفار و مشرکین کا غلبہ  
 ہوتا کہ جس میں یہودی بھی شامل ہیں اور جن کا اسلامی حسد مشہور ہے تو وہ ایسے معاہدہ کو کیسے قبول  
 کر لیتے جس میں ان کی مغلوبیت اور مسلمانوں کا غلبہ واضح تھا۔“

میں کہتا ہوں کہ یہ صحیح نہیں کہ میں نے اپنے مضمون میں کہیں بھی یہ لکھا ہے کہ نامہ مبارک کے لکھ  
 جانے کے وقت مسلمان مدینہ میں مغلوب تھے ہیں نے تو یہ لکھا ہے ”یہ اور اسی قسم کی اور ہدایتیں اور شروط  
 مصلحت کے قالب میں ڈھلی ہوئی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) غیر مذہب والوں کے سامنے ایسے وقت پیش



کرتے ہیں جبکہ مدبر ہیں کوئی مٹی قوت آپ کے ساتھ نہیں ہے، ساز و سامان کی ایک کمی ہے اور سن قریش صیہون دشمن سے ہے جو شوکت و قوت بھی رکھتا ہے اور ساز و سامان بھی "میری اس عبارت سے جناب مولوی صاحب نے سمجھ لیا کہ میں نے کہا ہے۔" مسلمان مدبر ہیں مغلوب تھے "مولوی صاحب ہی فرمائیں کہ یہ کہاں تک صحیح ہے۔ میری تحریر سے ۱۰۰ سے زیادہ مفہوم ہو سکتے ہیں کہ مسلمان اس وقت کمزور تھے۔ سو یہ میری رائے نہیں بلکہ کسی سہیلی نے لکھا ہے جس کو جب مولوی صاحب نے بڑا قہار مانا ہے وہ لکھتا ہے۔

"وقال ابو عبید (قاسم بن سلام) فی کتاب الاموال انما کتب رسول اللہ

هذا الكتاب قبل ان تفرض الجزية اذا كان رسلا مضعيفا۔

(الروض اللاف - جلد ۱ ص ۱۴)

میں نے لکھا تھا جو بنی امت قتل نازل ہوئی یہاں مفسوخ اور ہمیشہ کے لیے مفسوخ ہو گیا۔ اب اس کی سند پر مختلف مذہب والوں سے اُمت و حدہ کے قیام و اثبات پر استدلال کرنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ (ساتھ ہی اس کے ذیل میں لکھا تھا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) بہت قتل کے نازل ہونے سے پہلے ہی بنو قینقہ، بنو نضیر اور قرینہ کا ستم کیا، چلے گئے، مدعا یہ تھا کہ رسول اللہ نے پہلے خود اپنی قائم کردہ جماعت متحدہ کو (باسباب و وجوہ) توڑا اور اپنی تحریر کو مفسوخ ٹھہرایا۔ پھر قرآن نے نازل ہو کر اس نسخ پر ہر دوام ثابت کر دی کہ آئندہ باوجودیکہ کچھ نہ کچھ یہود مدینہ میں موجود تھے۔ اس نامہ مبارک کے مطابق اُمت واحدہ کا تیسرا جزو نہ رہے بلکہ متجاوز ذمی ہو کر رہے۔

اس حاشیہ کے بعد میں نے لکھا تھا کہ عام ستمہ صول کی بنا پر اُمت واحدہ کے قیام و اثبات کی بحث یہاں حتم ہو جاتی ہے اور پوچھنی چاہیے۔ اس کا مطلب میرے نزدیک یہ تھا کہ نسخ اس نامہ نبوی کا واقعی اور دائمی ہے۔ کسی لیے جہاں تک ہمیں علم ہے اس ہزار بارہ سو برس میں کسی نے مسلمانوں اور نامسلمانوں سے اُمت و حدہ قائم نہیں کی اور نہ اس کی مشروعیت پر کبھی اس نامہ سے استناد کیا لیکن

ہیں جانتا تھا کہ نسخ کا مسئلہ نہایت پیچیدہ ہے، مختلف فیہ چلا آتا ہے، ایک بات کو ایک عالم منسوخ کرتا ہے، دوسرا انکار کر دیتا ہے۔ اس لیے جس بات کو میں منسوخ کہوں کیسے ممکن ہے کہ دوسرے اُسے آسانی سے مانیں۔ اسی لیے میں نے لکھا کہ اگر کوئی (جو اس نسخ کو نہ مانے) کہنے لگے "اور پھر کہنے والے کے قول کو بھی دو شفتوں میں تقسیم کر دیا۔ چنانچہ جناب مولوی صاحب نے نسخ کو نہیں مانا اور ۳۷۷ کے وسط سے ۳۸۲ تک نسخ کی بحث کی ہے۔ اس کی نقل کی یہاں گنجائش نہیں ناظرین دیکھ چکے ہیں اور پھر دیکھ لیں اس کا جواب میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ اگر کوئی نسخ کو نہ مانے نہ مانے، یونہی سہی۔ جو چاہتے ہیں وہ سارا حصر اسی نامہ پر رکھیں اور پھر دیکھیں کہ نامہ مبارک کی تعلیم کیا ہے؟ ..... اور متحدہ قومیت کے داعی و حامی کیا فرماتے ہیں۔ مطلب یہ تھا اور ہے کہ نامہ مبارک کو منسوخ نہیں مانا تا تو پھر مسلمانوں اور مسلمانوں سے جو متحدہ قومیت بنائی جاتی ہے وہ نامہ مبارک کی شروعات دنیویہ کے مطابق تو ہونی چاہیے

(اس سے آگے کی بحث ناظرین اگر چاہیں برائے نامہ مبارک ۲۸۹ صفحہ ۲۸۹ پر اور اس سے آگے کے صفحات پر پڑھ لیں)

صفحہ ۲۸۲ سے تقریباً ۲۹۳ (برائے نامہ مبارک) تک جناب مولوی صاحب نے دو باتیں ثابت کرنی چاہی ہیں، اول یہ کہ بنو قینقار، بنو النضیر اور قرظہ کو میرا، اسرائیلی یہودی کہنا غلط ہے، وہ اسرائیلی نہیں بلکہ قحطانی عرب تھے۔ دوسرے کہ نامہ مبارک کے معاہدہ میں یہ تینوں قبیلے بھی شریک تھے اور انہوں نے اس عہد نامہ کو رسول اللہ کے حضور میں منظور کیا تھا۔

امرا دل کے متعلق جناب مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ "اگرچہ عام مفسرین کا بیان ہے کہ یہ تینوں قبیلے یثرب کے یہودی نسل تھے، مگر محققین کی رائے اس کے خلاف ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ بجز غیر معروف دو تین خاندانوں کے یثرب کے تمام یہود جن میں خصوصیت کے ساتھ قرظہ، بنو النضیر اور بنو قینقار بھی شامل ہیں یہودی المذہب تو ہیں مگر یہودی نسل (اسرائیلی) نہیں بلکہ عربی نسل قحطانی ہیں۔ چنانچہ یعقوبی اور مسعودی جیسے مشہور مورخوں نے یہی لکھا ہے۔"

میں کتابوں کہ جناب مولوی صاحب نامبرہ قبائل کو چند مشہور مورخوں کی سند پر عربی نسل قرار دیتے ہیں اور مدینہ میں صرف دو تین غیر معروف خاندانوں کو یہودی نسل یا اسرائیلی بتاتے ہیں مگر قرآن کریم اس کے خدشہ خبر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سورہ نمل میں بنی اسرائیل کے بہت سے قصے بیان فرماتے ہیں کہ بعد کتاب ہے۔ ان هذا القرآن یقص علی بنی اسرائیل (یہ قرآن بنی اسرائیل کو یہ قصے سناتا ہے) یہ اہتمام قرآن کا دو تین غیر معروف اسرائیلی خاندانوں کے لیے نہیں ہو سکتا عقل چاہتی ہے کہ قرآن مجید میں جو یہ ہتمام بنی اسرائیل کے ذکر کا ہے تو مدینہ میں یقیناً ان کا شمار تھا یہ ہوگا اور مدینہ میں اسرائیلی یہود گڑبڑی تعداد میں ہو سکتے تھے تو وہ یہی قینقار، نصیر اور قرظہ دے سکتے تھے اوس ذخیرہ کا تو قحطی الاصل ہونا، کلام مسلم ہے۔ یہ دلیل ایک حد تک قیاسی ہے۔ اب قرآن ہی سے نصیحیے۔ اللہ تعالیٰ سورہ بقرہ میں فرماتا ہے۔ اور بڑے اہتمام سے فرماتا ہے۔

یٰ بنی اسرائیل ذکرنا نعمتی الّتی انعمت علیکم وادفون بھدی اوف بھدکم و  
اینا ی فادھبون ..... یٰ بنی اسرائیل اذکرنا نعمتی الّتی انعمت علیکم  
و فی فضلکم علی العالمین۔

واذ واعدنا موسیٰ .. اور اے بنی اسرائیل یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے تم کو وعدہ کیا  
واذ واعدنا موسیٰ ... سے بنی اسرائیل یاد کرو اس وقت کو جب ہم نے موسیٰ کو وعدہ کیا  
و ذق آل موسیٰ لقومہ ... اور اے بنی اسرائیل یاد کرو اس وقت کو جب موسیٰ نے کہا قوم میری  
و ذقتم ینوسی .. دریا کر اے بنی اسرائیل وہ وقت جب تم نے کہلے موسیٰ۔  
و ذقنا دخلوا .. دریا کر اے بنی اسرائیل وہ وقت جب ہم نے کہا تم داخل ہو  
واذ استسقی موسیٰ .. دریا کر اے بنی اسرائیل وہ وقت جب موسیٰ نے پانی مانگا۔  
واذ قتلتم ینوسی ... دریا کر اے بنی اسرائیل جب تم نے کہلے موسیٰ۔



واذا اخذنا ميثقكم ... اور یاد کرو اے بنی اسرائیل وہ وقت جب ہم نے تم سے عہد لیا۔

واذ قال موسى لقومه ان الله ... اور یاد کرو اے بنی اسرائیل اُس وقت کو جبکہ موسیٰ نے کہا

اپنی قوم سے کہ اللہ تعالیٰ۔

واذ قتلتم نفسا ... اور یاد کرو اے بنی اسرائیل وہ وقت جبکہ تم نے ایک آدمی کو مار ڈالا تھا۔

واذا اخذنا ميثاق بنی اسرائیل ... اور یاد کرو اے بنی اسرائیل وہ وقت جب ہم نے بنی

اسرائیل سے وعدہ لیا۔

واذا اخذنا ميثقكم لا تسفكون اور یاد کرو اے بنی اسرائیل وہ وقت جب کہ ہم نے تم سے

دماء کم ولا تخرجون انفسکم من عہد با کہ تم خون نہ بہاؤ اور اپنے آدمیوں کو اپنی سرزمین

دیار کہ تم اقرار نہ کرو انتم تشهدون سے نہ نکالو۔ تم نے اس کا قرار کیا در تم ہی سکا گوہ ہو

ثم انتم هوء لاء تقتلون انفسکم پھر تم ہی لوگ ہو وہ جو اپنے آدمیوں کو قتل کرتے ہیں

وتخرجون فریتا منکم من دیا رہم اور اپنے آدمیوں کی ایک جماعت کو ان کے گھروں سے

تظهرون علیہم بالاثم والعدوان نکالتے ہو۔ اس طرح کہ ظلم و برائی سے تم ان کے قتل

ان یا تو کم اسری تغدوہم وهو محرم ہو جاتے ہو اور پھر اگر وہ قید ہو کر تم سے پاس آتے ہیں

علیکم اخراجہم افتؤمنون ببعض تو تم ان کا مذہب دے کر ان کو چھڑاتے ہو۔ عانا کہ ان کا

الکتاب وتکفرون ببعض نکامنا ہی تم پر حرام تھا۔ کیا تم کتاب کے ایک حصہ پر ایمان

لا تے اور دوسرے سے انکار کرتے ہو۔

تم مفسرین بجا اختلاف کہتے ہیں کہ یہ آیت جن میں تذکرہ کلام بنی اسرائیل کو ہے بنو قینقاع بنو نضیر اور

قرنید کے حق میں نازل ہوئی ہیں۔ پھر اسی آذ کے تحت میں اس سے آگے چوتھی آیت ہے۔

ولما جاء هو کتب من عند اللہ اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف انکی اپنی کتاب

مصدقاً لما معهم وكانوا من  
 قبل يستفتحون على الذين كفروا  
 فلما جاءهم ما عرفوا كفروا  
 به فلعنة الله على الكافرين

یثرب میں رسول شریعی سید علیہ وسلم، در قرآن کی دعوت پہنچنے سے پہلے مشرک، دس و خزیج  
 تھے: یہودی، دس و خزیج میں بھی یہودی تھے، لیکن کم کم، ان آیات میں جن کا سرعنوان ہم لکھتے  
 ہیں جسے ہم نے پہلے خطاب ہے تو بنی اسرائیل کو، مذہب ہے تو بنی اسرائیل کو۔ انہی کی بابت قرآن مجید بصراحت  
 خبر دیتا ہے کہ وہ کافروں کے خلاف فتح اباب غلبہ و کامیابی کی امیدیں لگایا کرتے تھے۔ ان کے نزدیک دس  
 و خزیج، اس لیے کہ مشرک تھے بن پرستی کرتے تھے، کافر تھے، اس لیے یہاں اپنی فتح اپنی کامیابی کی امید  
 کرتے تھے غلبہ کی توقع رکھنے دے صرف یہی تینوں قبیلے یہود کے ہو سکتے تھے اور وہ نبی قرآن بنی اسرائیل  
 ہیں۔ دس و خزیج کے یہودی بر بنائے مذہب اس استفتاح میں شریک بھی تھے تو بتجاء یہ نص ہے۔  
 محبت ہے بران ہے اس بات پر کہ بنو قینقار، بنو النضیر در قرآن بنی اسرائیل تھے، اس پر مشرود ہے  
 بہ شہادت کہ جمہور مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ آیت انہی نامبرودہ قبائل کے حق میں نازل ہوئی۔

بنی اسرائیل کی خصوصی تذکیر نہیں آیات پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ در آئے تک چلی گئی ہے اور  
 ان کو ان کے اسلاف کے وقوت اور ان کے حال پر بار بار اور طرح طرح سے شہنشاہی اپنے بڑے  
 بڑے انصاف، تہذیب و تمدن ہے ورمہ جد حزی، انہیں ایمان و اسلام کی دعوت دیتا ہے، کیا یہ اہتمام دو قین  
 غیر معروف، سریلی غاند نوں سے ہے۔

مختصر یہ کہ میں بدایت نص قرآن اور شہادت جمہور مفسرین بنو قینقار، بنو النضیر اور قریظہ کو اسرائیلی  
 یہودی سمجھتا ہوں۔ جناب موسیٰ صہب کو اختیار ہے کہ یعقوبی در مسعودی جیسے مشہور مورخین کی تحقیق کو

ہائیں یا س نص قرآنی درجہ و مفسرین کے متفقہ بیان کو۔

ب را جذب موسوی صاحب کا یہ فرمان کہ یثرب کے یہ میتوں قبیلے (بنو قینقاع، بنو نضیر، اور قریظہ) بھی زیر بحث! یہی کی رد سے عہد نبوی میں داخل تھے اور دلیل اس دعوے کی یہ پیش کرنا کہ ابن کثیر، بن اثیر، ہیملی (رحمہم اللہ) اور علامہ شبلی مرحوم نے بھی اپنی تاریخوں اور سیرت کی کتابوں میں یہی لکھا ہے۔

اس کے متعلق میں کہتا ہوں کہ یہ باتیں کم و بیش مجھے بھی معلوم ہیں۔ یہی کیا بلکہ اور بھی بہت سے اکابر نے کچھ ایسے ہی الفاظ لکھے ہیں، خواہ یہ نامہ اپنے یہاں نقل کیا ہے یا نہیں۔ میں بھی یہ نہیں کہتا کہ قبائل مزبورہ رسول اللہ کے معاہدہ نہ تھے مگر تحقیق طلب امر یہ ہے کہ یہ قبائل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاہدہ تھے تو کس طرح اور کس حیثیت سے مجھے کوئی عہد نامہ (جہاں تک میری نظر ہے) تاریخ و سیر کی کتابوں میں ایسا نہیں ملا جس کو میں کہہ سکوں کہ رسول اللہ قبائل مزبورہ کا عہد نامہ ہے۔ اس لیے اب میرے نزدیک ان قبائل کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہونا تین صورتوں میں سے کسی ایک صورت پر ہوگا۔

اوں یہ کہ رسول اللہ جب یثرب تشریف لائے تو یہ قبائل پہلے سے الگ الگ اوس و خزرج کے حلیف تھے۔ جب اوس و خزرج بالافتق بواسطہ نقبائے قوم رسول اللہ کے صیغ بنے تو دستور کے موافق ان کے حلیف یعنی یہ قبائل بھی آپ کے حلف میں داخل ہو گئے۔ کیونکہ معاہدہ کا معاہدہ بھی معاہدہ ہوتا ہے۔ اس لیے ان قبائل سے کوئی جداگانہ معاہدہ نہیں کیا گیا۔ میرے اذعان میں یہی بات صحیح ہے۔ غزوہ ابواء (بروایتے بواط) میں بنی صمیرہ کے کچھ لوگ بیاد ت مثنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاہدہ بنے۔ پھر غزوہ الخبیرہ میں بنو مدلج اور ان کے صفاء بنو صمیرہ سے معاہدہ ہوا۔ بنو صمیرہ سے جو معاہدہ ہوا وہ موجود ہے لیکن بنو مدلج کا اس میں کہیں کچھ ذکر نہیں ہے اور جداگانہ معاہدہ بنو مدلج کا کہیں نہیں ملا۔ اگر

سے دیکھیے برہان الکتوبر ص ۲۹۶۔ اس کے ذیل میں میں نے لکھا ہے۔ وہ اس قبائل، حلیف تھے مگر اس حیثیت پر کہ وہ اوس و خزرج کے حلیف تھے نہ اس حیثیت سے کہ اس نامہ کے ماتحت تھے۔

مع غزوہ الخبیرہ۔ الرمن الافد و سیرت ابن ہشام۔

مع غزوہ رذان سیرت ابن ہشام



وہ کھوڑا نہیں جب درکھا بھی نہیں گیا تو ظاہر ہے کہ بنو نضیر کا معاہدہ ان کے لیے بھی کافی سمجھ گیا کہ معاہدہ کا معاہدہ معاہدہ  
ہوتا تھا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور نہ کوڑا نہ صدر یہود قبل اس میں کوئی  
عہد نامہ تو ہوا جو زیر بحث نامہ بنوی کے علاوہ تھا لیکن اب وہ نہیں پایا جاتا، ضائع ہو گیا یا تاریخ و سیرت  
کی کتاب میں کسی وجہ سے نہ لیا جاسکا۔ بات یہ بھی ممکن اور قرین قیاس ہے اور مجھے اس سے بھی انکار  
نہیں۔ تاریخ ہجری سیرت کسی کی زندگی کے سارے واقعات میں کہاں آتے ہیں۔ اس لیے معاہدہ کا نہ  
پایا جانا اس کے عدم وقوع کو مستلزم نہیں ہو سکتا۔ غزوة تبوک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی نضیر  
اور بنی نضیر دونوں سے عہد و پیمان کیا جو معاہدہ بنی نضیر سے ہوا وہ کتابوں میں بالفاظہ موجود ہے۔ اور بنی  
نضیر کا نہیں ملتا۔ حالانکہ ممکن ہے کہ ان کے یہ بھی عہد کا نہ لکھا گیا ہو۔ شواہد بھی اس کے موجود ہیں۔

وقدی نے کھسے (مناقل کعب بن اشرف) "فرغت یہود و من مہا من مشرکین  
فجاءونی لنبی صلعم حبس صبحو فتاقد صرف صاحبنا لیلۃ و ہرستد من سادانا۔  
فتل عیدہ بلاجرم و حدت علمناہ فساں رسول اللہ صلعم نہ بوقر کما قرغیرہ من ہو علی  
مثل رائہ ما اغتیل و نکتہ نائنا من الاذنی و عجا ذابا لشعر و لم یفعل ہذا احد منکم الا  
کان لہ السبع و دعاہم رسول اللہ صلعم) الی ان یکتب کتابا ینتھون الی ما فیہ فکتبو۔  
بیہود و سینہ کتبا تحت عذقی فی دار سملہ بنت الحارث۔ اس بیان میں یہود کی جس عذرا  
عہد و پیمان کا ذکر آیا ہے وہ اب کہیں نہیں ملتی۔

نیز وقدی ہی نے بنو نضیر قینقل کے بیان میں لکھا ہے "ما قدم رسول اللہ صلعم مدینۃ  
و دعت یہود کھنا و کتب بیہ و بینہا کتابا و احق رسول اللہ صلعم کل قوم بحلفاءہم و  
جعل بینہ و بینہم ما اوشط علیہم فکان فیما شرط ان لا یظاہر علیہ عدا یعنی جب رسول

مدینہ میں تشریف لائے تو سب سے یہود نے آپ سے موادعت چاہی۔ اور آپ نے اپنے اور ان کے باب میں ایک تحریر معاہدہ لکھوائی اور ہر قوم کو اس کے حلف کے ساتھ لایا (شامل ٹھہریا) اور اپنے اور ان کے درمیان امن رکھا۔ کچھ شرطیں بھی ان پر لکھیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ وہ آپ کے خلاف کسی دشمن کی مدد نہیں کریں گے۔ میرے نزدیک یہ عہد نامہ بھی تاریخوں میں مذکور نہیں۔ غرض کسی چیز کا ہمیں نہ ملن اس کے واقعی نہ ہونے کے دلیل نہیں اس لیے ممکن ہے کہ رسول اللہ اور تمام یہود مدینہ کا باہم کوئی عہد نامہ ہو جو اب نہیں ملتا ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ نامہ زیر بحث ہی وہ عہد نامہ ہے جو رسول اللہ نے لکھوایا جس میں اوس خراج کے علاوہ مدینہ کے تمام یہود داخل تھے، خواہ وہ اسرائیلی تھے یا غیر اسرائیلی۔ جب یووی صہ جب فرماتے ہیں۔ ورنہ کہتے ہیں کہ فلاں فلاں نے بھی یہی لکھا ہے۔ یہ بالکل بجا و درست ہے نہ لوگوں نے لکھا ہے لیکن میں ان حضرات کی شہادت کی صحت کو نہیں ماننا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ زیر بحث نامہ مبارک میں مجھے کوئی اندرونی شہادت ایسی نہیں ملتی جو محوہ یا بیرونی شہادت کی تصدیق کرتی ہو یعنی اس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ نامہ زیر بحث وہ عہد نامہ ہے جو رسول اللہ نے مدینہ کے تمام یہود سے کیا تھا اور اس میں اسرائیلی و غیر اسرائیلی یہود دونوں داخل تھے، اور جب تک یہ بیرونی شہادتیں اندرونی شہادت سے مطابقت نہ ہوں میں محض اس بیرونی شہادت کو ماننے کے لیے تیار نہیں خواہ ان کا کتنا ہی ببار کیوں نہ ہو۔ اس لیے کہ ان بیرونی شہادتوں کے الفاظ میں، الفاظ کے مفہوم میں، مفہوم کے نتائج میں کھد کھد خدات موجود ہے۔

ابن ہشام نے اس نامہ کے عنوان میں بروایت بن اسحاق لکھا ہے اور نسبت اچھا لکھا ہے۔

کتب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) رسول اللہ۔ ایک تحریر مہاجرین و انصار کے باب

کتب ابابن المہاجرین و الانصار میں لکھوائی جس میں یہود سے عہد و

واد۶ فیہ یہود وعاہد ہمہ پیمان منسرا یا۔

مگر سیرت ابن بٹم کے شرح علامہ سیلی الرضیۃ نف میں سی عنوان یا اس کے مفہوم کو یوں  
ادافرتے ہیں۔

کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ رسول اللہ کا وہ نامہ جو آپ نے اپنے اور یہود  
وسلم فیما بینہ وبین الیہود کے مابین لکھو۔

کس بین امہاجرین والانصار اور کہاں بینہ وبین الیہود اس میں نامہ مبارک کے الفاظ ہی نہیں  
چھوٹے بلکہ تحریر کی نوعیت ہی بدل گئی ہے۔ ابن ہشک کی روایت میں یہود کی مواعدت تبعا ظاہر ہوئی  
ہے سیلی کے الفاظ میں وہ اس فرقہ بنجستے ہیں اور براہ راست ان سے اور رسول اللہ سے معاہدہ  
کا ہونا مفہوم ہوتا ہے۔ ب۔ بن اسیر کو دیکھیے فرماتے ہیں۔

فصل۔ فی عقدہ عبیہ السلام رسول اللہ کا ہاجرین و انصار میں ایک تحریر کے

الافتہ بین امہاجرین والانصار ذرہ دھبکی بابت آپ نے حکم دیا اور وہ بھی گئی، باہم

بالکتاب الذی امر بہ فکتب الفت اور وہ بھائی چارہ قائم کرنا جس کے لیے

ولمواخاۃ التی امر ہم بہا و آپ نے رشتہ فرمایا اور مسلمانوں پر لازمی ٹھہرایا تھا

قرہم علیہا ومواعدت الیہود اور آپ کا ان یہود سے جو مدینہ میں تھے باہم عہد

والذین کانوا بالمدینۃ و پیمان کرنا۔

دہی نامہ سے اور اسی کا عنوان اور اسی میں ہاجرین و انصار کی مواخات بھی ذکر داخل ہو گئی ہے  
جس کے لیے رسول اللہ کا کوئی تحریر لکھنا ثابت نہیں ہے اور پھر طرہ یہ ہے کہ اس عنوان کے بعد ہی  
ذکر یہود کا شروع ہوتا ہے۔ جب کہ جناب موسوی صاحب نے لکھا ہے۔

عہد مشہلی مرحوم نے لکھا۔ حسب تحفہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو آپ کا پند گام



یہ تھا کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے تصفیات وضع در منضبط ہو جائیں۔ آپ نے یہود و انصار کو جا کر حسب ذیل شرائط پر ایک عہد نامہ لکھوایا جس کو دونوں فریق نے منظور کیا۔

اس بیان میں پہلا جملہ "منضبط ہو جائیں" خود علامہ کی رائے معلوم ہوتی ہے۔ اور ایک حد تک صحیح ہے، گے جو کچھ لکھا ہے وہ بیان واقعہ ہے۔ اس کی کوئی سند ہونی چاہیے تھی جو غائب ہے۔ ابن بشام نے تو یہ نہیں لکھا کہ آنحضرت نے یہود و انصار کو بلایا اور ایک عہد نامہ لکھوایا جس کو دونوں نے منظور کیا۔ اس واقعہ کی سند علامہ مرحوم کو کھنی چاہیے تھی مگر جناب مولوی صاحب کو بھی۔ جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ یہ کس نے لکھا ہے کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اس کا لکھنا کہاں تک جڑ ہے۔

نامہ نبوی کے متعلق مذکورہ بالا بیانات میں جو جناب مولوی صاحب ہی کی تحریر ہے، ماخوذ ہیں ظاہر ہے۔ کہ باہم کس قدر اختلاف ہے۔ اسی اختلاف کی وجہ سے ضروری ہے کہ ہم نامہ مبارک کی اندرونی شہادت کو دیکھیں اور اس کے متعلق جو کچھ کہیں اسی کی شہادت کی بنا پر کہیں کہ وہ بہر حال مقدم ہو۔ اس اندرونی شہادت سے جناب مولوی صاحب نے بھی چشم پوشی نہیں کی ہے۔ چنانچہ وہ اس کے متعلق فرماتے ہیں

"یہ بات البتہ قابل غور ہے کہ آخر جس طرح اس معاہدہ میں قبائل انصار کے یہودیوں کا قبائل مذکور ہوئے، ان تینوں (بنو قینقاع، بنو النضیر اور قریظہ) کا ذکر کیوں نہیں ہوا۔ سو اس کے متعلق غرض یہ ہے کہ اس کی وجہ صاف ہے جو معمولی غور کرنے سے حاصل ہو جاتی ہے

لہٰذا اسی اختلاف میں واقعہ کے س بیان کو بھی شامل کر لینا مناسب ہے جو اس نے غزوہ بنو قینقاع کے ذیل میں لکھا ہے، اور ہم کہیں پیچھے لکھتے ہیں یہ اس لیے کہ ممکن ہے کہ کوئی کہنے لگے کہ واقعہ کے ذیل میں جو کچھ لکھا ہے نامہ زیر بحث ہی کے متعلق لکھا ہے۔ خصوصاً اس لیے کہ اس میں کل یہود کا لفظ آیا ہے۔ اگرچہ ہماری رائے اس کے خلاف ہے تاہم اگر کوئی اس بیان کو نامہ زیر بحث ہی سے متعلق ہونے پر اصرار کرے تو ہم اس کی ضرورت نہیں ہم کہیں گے اچھالیوں ہی سہی۔ یہ اختلاف فہم و اختلاف بیان کا ایک نمونہ اور سی۔

وہ سے جس اسلامی سلطنت کے خاتمہ کا یہ معاہدہ کیا گیا وہ جس کی طرف مڑ رہی تھی اسے بھی پیڑ  
 بنیں اور وہاں سے اس کے خلاف سے معاہدہ کا حقیقی رخ اپنی تینوں قبائل میں بوقت وقوع  
 ہونے پر قرینہ کی جانب سے بدیشہ میں ہودایت کے نام اور جس میں نمایاں  
 شدت کے انگ تھے اور یہودیت کی تنازعہ کو اس کی باگ ڈور اپنی کے ہاتھ میں تھی۔  
 مذ معاہدہ میں داندمن سے داندمن ہودایت نہ نصیر۔ و ن یہودینفقون مع  
 امویین و ادا ہو محی رہین جیسے عام جس کے لئے کہ وہ ہر شخص باسانی سمجھ سکتا تھا کہ  
 اس سے وہی یہودی مراد ہیں جو یہودیت کے پیش رو ہیں۔ اللہ جبکہ کچھ یہودی جیسے بھی  
 تھے جو ان کی قربت کی وجہ سے نصیر کے قبائل میں سے یہودی المذہب ہو گئے تھے۔  
 بوضاہل ہو سکتا تھا کہ تاہم اس معاہدہ کا رخ ان یہودیوں کی جانب قطعی نہیں ہے بلکہ نصیر  
 کے ہم قبیلہ اور صیغ ہونے کی وجہ سے ضمناً وہ خود بخود شریک ہیں۔ حالانکہ اب انہیں تھا  
 ہوسکتا تھا کہ ان کا رخ ہر طرح کے مختلف نظروں کے یہودی اسی طرح معاہدہ میں  
 راہ دست شامل ہیں جس طرح مشہور یہودی سائل کہ مناسب سمجھا گیا کہ معاہدہ میں تفصیل کی حیثیت کا  
 لحاظ نہ کیا جائے بلکہ یہودیت کا ہی نظریہ رکھ کر اسی پر اس تینوں قبائل کی تفصیل کی گئی اور اولی  
 قادیان تینوں قبائل نے ہر ہر دست میں ہر گروہ در بیان کردہ نہ کوہ کرنے کے لیے انصاری قبائل کے  
 یہودی قبائل کی تفصیل دی تھی تاہم جب معاہدہ میں نصیر کا اضافہ تو اس کی تفصیل بھی شامل مراد ہو  
 یوں کہ یہ صلیح انہی ارض میں مدد سے رہنے والے قبائل میں سے یہودی کا ذکر کرنے تو قبائل  
 کی تفصیل سے ملتا ہے اس کا یہودیت دینہ یہ بھی ہے کہ معاہدہ میں ہمارے قبائل کی  
 تفصیل سے ملتا ہے اس کے نہیں ہے لیکن انصاری کے قبائل کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہے۔

میں کہتا ہوں۔ اس منقون یا منقون غنہ عبارت میں یہ جو ہے اسی لیے ان تینوں کی تفصیل کی گئی۔

میں نے سچہ پرخت کھینچ دیا ہے میں سمجھتا ہوں "تفصیل نہ کی گئی کی جگہ" تفصیل کی گئی غلط چھپ گیا ہے۔ اگر یہ غلط نہیں چھپا تو پھر میں اسی سلسلہ کی عبادت کو قطعاً نہیں سمجھ سکا ہوں۔ نیز جناب مولوی صاحب لکھتے ہیں "بیان کردہ شبہ کو دور کرنے کے لیے انصاری قبائل کے یہودی قبائل و تفصیل دی گئی ہے تاکہ جب معاہدہ میں انصار کا لفظ آئے تو اس سے صرف یثربی سدن مرد ہوں" نامہ مبارک (جو میں نے نقل کیا ہے اور جسے معاہدہ کہا جا رہا ہے) میں تو انصار کا لفظ ہی نہیں آیا ہے پھر میں اس توجیہ یا تعلیل یا دلیل کو اگر نہ سمجھا تو معذور ہوں۔

میں یہ بات بھی معقول نہیں سمجھتا کہ جس کی طرف معاہدہ کا حقیقی رخ ہو اور جو جماعت کے امام، نمایاں شہرت کے مالک ہوں اور لوگوں کی زمام اختیاران کے ہاتھ میں ہو معاہدہ میں ان کا نام نہ لیا جائے۔ اور کسی عام طریقہ پر ان کا ذکر کر دیا جائے اور جو مجموعہ و مایم ہوں وہ بصرحت قبائل و در بیان کیے جائیں۔ اس لیے کہ میں نے معاہدات میں رؤس کو بصرحت مذکور پایا ہے اور اذنب و تواج کو متردک۔ اگر جناب مولوی صاحب اپنے دعوے کی کوئی مثال بھی لکھ دیتے تو اچھا ہوتا۔

یہ حجت بھی میرے فہم سے بالاتر ہے۔ ممکن ہے ناظرین سمجھ سکیں "کہ جبکہ کچھ ایسے یہودی بھی تھے جن کی قربت کی وجہ سے انصار کے قبائل میں سے یہودی مذہب ہو گئے تھے تو یہ خیال ہو سکتا تھا کہ شاید اس معاہدہ کا رخ ان یہودیوں کی طرف قطعی نہیں ہے، بلکہ انصار کے ہم قبیلہ اور حلیف ہونے کی وجہ سے ضمناً وہ خود بخود شریک ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ بلکہ اس کے برعکس آپ کو یہ واضح کرنا تھا کہ اس و خورج کے مختلف بطون کے یہ یہودی بھی اسی طرح معاہدہ میں براہ راست شامل ہیں جس طرح مشہور یہودی قبائل لہذا مناسب سمجھا گیا کہ معاہدہ میں قبیلہ کی حیثیت کا لحاظ نہ کیا جائے بلکہ یہودیت کا ہی ذکر رکھا جائے۔ میں کہتا ہوں اس حالت میں ان کو بھی شارۃ یہود کہہ دینا کافی تھا، دونوں کی معاہدہ میں کیا شمولیت بھی اسی کی مقتضی تھی یہ دونوں کا ذکر قبیلہ وار ہونا چاہیے۔ کیا یہ بات عجیب و غریب نہیں کہ معاہدہ



میں بقول جناب مودی صاحب دونوں براہ راست ایک خط شریک میں مگر ذکر ایک کا قبیلہ دوسرے کا  
 دوسرے کا جنہ فہینوں کے نام کے صرف نام ہے۔ آخر اس سلوب خاص کی ضرورت کیا تھی جو  
 نام مبارک میں یہودی کے ذکر کے اندر میں کیا یہودی بیٹرب کلہا کافی نہ تھا، یہاں ایک جماعت کے  
 ساتھ کٹ نام پیسے گئے تھے، تین ورکا اضافہ ممکن نہ تھا۔

جناب مودی صاحب فرماتے ہیں۔ ومن تبعنا من یهود فان له النصر والاسوة۔ وان الیہود  
 ینفقون مع المومنین ما د یوحی اربین۔ جیسے عام صہوں سے ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا تھا کہ اس سے وہی  
 یہودی مرد ہیں جو ہودیت کے پیش رو ہیں۔

میں کہتا ہوں آخر یہ کیوں اور کیسے! کیا ومن تبعنا من الیہود کے تحت ہی صرف وہی آسکتے تھے  
 کیا اتباع کرنے والے وہی تھے۔ اس جہ سے پہلے نام مبارک میں ان کا کہیں ذکر چکا تھا۔ یا کہیں اس نام  
 میں ان کے اعتراف اتباع کا بیان موجود ہے؟

گر کیسے کہ ہودیت کے نام وہی تھے، ورنہ ہر کا رخ ہنی کی جانب تھا۔ میں دریافت کر ڈنگا کہ نام  
 مبارک میں کونسا لفظ اور کونسا فقرہ اس پر دلالت کرتا ہے۔ نام مبارک سے کوئی شہادت پیش کیجیے  
 اس کے علاوہ معاہدہ کا رخ ہنی کی جانب تھا، تو اس صورت میں تو بدرجہ اولیٰ بصرحت تمام ان قبائل یا  
 سردارین قبائل کا نام معاہدہ میں ہونا چاہیے تھا۔ جب کہ تمام معاہدوں میں ہوتا ہے۔ بلکہ یہ سب کچھ نامہ نامی  
 میں سب سے پہلے آنا چاہیے تھا کہ ہنی عام وعدہ سے اور رہا ہے۔ مگر یہاں نہ ان کے نام کا کہیں پتہ ہے نہ ان کو ہودیت  
 دی گئی ہے۔ بلکہ پہلے قریش و یشیب کے مومنوں مسلمانوں کا ذکر آتا ہے۔ یہ معاہدہ کا رخ ان کی طرف خوب ہے  
 کہ نہ عنوان میں کہیں ان کا پتہ ہے ورنہ کہیں آگے چل کر۔ قریش اور یشیب کے مومنوں مسلمانوں کے ذکر کے  
 بعد سب سے پہلے جو حمر کے لیے آتا ہے، وہ یہ کہ ومن تبعنا من الیہود فان له النصر والاسوة جس کا مطلب  
 اس کے سوا کچھ نہیں کہ جو ہودی سر نیلی ہو، غیر اسرائیلی ہمارا تابع ہے یا آئندہ اتباع کرے گا ہم اس کی مدد کریں گے۔

یہ زیادہ سے زیادہ معاہدہ کی ایک شرط ہے۔ یا اتباع کرنے والوں کو ایک وعدہ ہے اور پس اس میں نہ کہیں مذکور ہے نہ کسی طرح مفہوم ہو سکتا ہے کہ معاہدہ کا مسخ بنو قینقار بنو النضیر اور قرظہ کی طرف سے ہے، نامہ مبارک کے عنوان میں قریش و یثرب کے مومنوں مسلمانوں کے عذرہ جن لوگوں کا مذکور ہے وہ باسم لقب نہیں بلکہ بصفاء عہدہ ہے یعنی ومن تبعهم فلحق بهم وجاہد معهم جس میں یہ صفات ہوں وہ رسول اللہ کے اس نامہ کے تحت میں ہے خواہ یہودی ہو یا مشرک۔ چنانچہ نامہ مبارک کی ہماری تقسیم کے موافق گیارہویں دفعہ ہے۔

وانذرہ یحیر مشرك ما لا لقریش ولا نفسا ولا یحوں دونہ علی موہن۔ یہودی کے لیے بھی کوئی قید نہیں ہے خواہ وہ اسرائیلی ہو یا غیر اسرائیلی۔ قید یہ ہے کہ جب یہ نامہ لکھا گیا، وہ مسلمانوں کا تابع تھا یا نہیں۔ ان میں شامل تھا یا نہیں جہاد کا معاملہ وقت کے لیے تھا۔ اس و خراج کے یہودی چونکہ مسلمانان یثرب کے تابع تھے اور باستثنائے مذہب اور ہر طرح ان کے شریک حال تھے۔ ممکن ہے اس کے علاوہ بھی کوئی اور مصلحت حکمت ہو جس کی بنا پر رسول اللہ نے اس نامہ میں ان کو مسلمانوں کے ساتھ ذکر کیا ہو کہ امتہ من المومنین کہ آیا امتہ مع المومنین۔ برخلاف اس کے بنو قینقار، بنو النضیر اور قرظہ میں یہ صفات نہ تھیں ان کا نام بھی نامہ مبارک میں نہیں آیا تاہم دروازہ معاہدہ کا ان کے لیے کھلا ہوا تھا۔ مسلمانوں کے شریک حال ہوں اور امتہ واحدہ کے ممبر بن جائیں۔ مگر یہ کہ وہ یہود ان اس و خراج کی طرح اس عہد نامہ میں وقت تحریر داخل تھے یہ کسی طرح صحیح نہیں۔ عہد نامہ کے وقت وہ مسلمانوں کے شامل حال ہوتے تو ان کے نام جانا یا تفصیل اسی طرح لیے جاتے جیسے اس اور بطون خراج کے لیے گئے ہیں۔ یہ دعویٰ کہ ان کے نام اس لیے نہیں لکھے گئے کہ معاہدہ کا رخ ہی ان کی طرف تھا۔ میرے نزدیک ایسی بات اور ایسی توجہ ہے جس کو میں نہیں مان سکتا یہ کیوں؟ اس لیے کہ عہد ناموں کا ہمیشہ دستور رہا ہے اور اب تک ہے کہ جس سے معاہدہ ہوتا ہو وہ

سے میرے نزدیک اس فقرہ میں صرف مسلمانوں کا ایک فریق بنایا گیا ہو مسلمانوں کے واجبات کے سلسلہ میں آیا ہے۔ یہود کا حال مستقلاً سولہویں دفعہ سے شروع ہوتا ہے۔

تھ چنانچہ کتب القرظی کا نام بحیثیت معاہدہ رسول اللہ اکثر جگہ آیا ہے۔

ایک آدمی جو یا ایک جماعت ایسی آدمی ہوں یہ کسی بات میں لازمی طور پر اس کا یا ان کے سرداروں یا وکلہ کا نام لکھا جاتا ہے اور لکھا جا رہا ہے۔

جس نام میں نامہ زیر بحث لکھا گیا اسی کے پچھڑے پیچھے رسول اللہ در بنی نصر میں معاہدہ ہوا۔ اگر یہ بنی نصر کو وہ شوکت و عظمت حاصل نہ تھی جو بنو قینقاع، بنو النضیر اور قرظہ کو تھی، اہم عہد نامہ نبوی میں بنی نصر کا نام جو جو ہذا کتاب میں محمد رسول اللہ بنی نصرۃ دھم امنوں علی اموالہم وانفسہم وان لہم النصر علی من راضیہ۔ کلا ان یحاربوا فی دین اللہ و لہم اجر صوفیہ وان لہم اجر لہم نصرہ اچھا ہو۔ علیہم بذات ذمۃ اللہ و ذمۃ رسولہ و لہم نصر علی من یزول نفی۔

یہ چھوٹا عہد نامہ ہاں نمونہ کے طور پر نقل کر دیا ہے باقی تمام عہد نامے بھی رسول اللہ کے بعد صاف راشدہ کے زمانہ کے بھی سب تقریباً اسی انداز پر چھپے۔ یہودی بنی اسرائیل یعنی بنو قینقاع، بنو النضیر اور قرظہ سے یہ معاہدہ ہوا تھا۔ اس میں داخل ہوتے تو ان کے قبائل یا ان کے سرداروں کے نام، نہ مارک میں مذکور ہوتے۔ جب یہ بات نہیں، بلکہ کیسے نام نہیں (خود کہنے والا کوئی ہو کہ یہی نام ہے جس میں مدینہ کے تمام یہود سے معاہدہ ہوا اور اس معاہدہ کا رخ برہ راست بنو قینقاع، بنو النضیر اور قرظہ کی جانب تھا اور ہے۔

ان سب باتوں کی کتابوں میں کوئی عہد نامہ رسول اللہ کا۔ ایسا نہیں ملتا جو خود اس بات کا ثبوت ہو کہ وہ ضرور رسول اللہ اور یہود کا معاہدہ سے گزرا۔ اس کے ذمے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ لکھا ہی نہیں گیا یا یہودی بنی اسرائیل آپ کے کسی طرح معاہدہ ہی تھے۔ نہ یہ لازم آتا ہے کہ جب ایسا کوئی معاہدہ نہیں ملتا تو خواہی نہ خواہی یہ، نہ ہی چاہیے کہ نامہ زیر بحث ہی رسول اللہ اور یہود کا وہ عہد نامہ ہے جس کی نسبت اکثر مورخین نے لکھا ہے کہ رسول اللہ شب میں تشریف لائے تھے یہ تشریف لانے کے قریب ترین زمانہ میں لکھوایا تھا۔ کیونکہ نامہ نامی خود اس بات کی شہادت ہے کہ وہ حضور کے یثرب میں تشریف لائے ہی نہیں لکھا گیا، جیسے کہ ہم بیان کر چکے ہیں اور خود اسی کی شہادت ہے۔

دہلی آئندہ



# تلخیص و ترجمہ

## گوٹے اور اسلام

(حکیم عبدالقوی ضاد ریاضی)

(پروفیسر عبدالستار خیری ایم۔ اے نے جرمن سوسائٹی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں عنوان بالا پر

ایک مضمون سنایا تھا جس کی تلخیص حسب ذیل ہے)

جرمن کے متعلق دنیا جانتی ہے کہ یہ مفکروں، فلسفیوں اور سائنس دانوں کا ملک ہے۔ ہیکل، کانٹ، ہٹے، فگتے، ہرڈر، پستالوزی، فردیل اور لوتھر وغیرہ کا نام دنیا کا ہر مذہب شخص جانتا ہے۔ علم کے ہر شعبہ میں درجہ اول کے بیسیوں ماہر اور تجربہ کار اس ملک میں پیدا ہو چکے ہیں۔ سنسکرت کے مطالعہ کی تجدید بھی جرمن فضلاء کی کاوش کی بدولت ہوئی۔ اسی طرح عربی اور اسلام کے مطالعہ میں بھی سب سے زیادہ دلچسپی جرمنوں نے لی ہے۔

شاید بہتوں کو اس کا علم نہیں کہ لوتھر پہلا جرمن شخص ہے جس نے قرآن مجید کا ترجمہ جرمنی زبان میں کیا۔ بعض اوقات اس کے معترضوں نے اُس پر مسلمان ہونے کا الزام لگایا ہو۔ یورپ میں بڑی مذہبی اصلاح و ترقی وجہ سے ہوئی ہے، اور خود لوتھر، اسلامی تخیلات سے بہت کچھ متاثر تھا۔ جرمنی کا شاہ فریڈرک ثانی لقب بہ بار بدوسہ بھی اسلام سے غیر معمولی دلچسپی لیتا تھا، اور دراصل یورپ کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز اسی کے عہد حکومت میں جرمنی سے ہوا۔ اس فریڈرک کو تعلیم دو مسلمان فاضلوں نے دی تھی۔ اس کے ارد گرد مسلم ادیبوں اور مفکروں کا ہجوم رہا کرتا تھا۔

اور اس کا دورہ یورپ سے کہیں زیادہ مشرقی معلوم ہوتا تھا۔ اس کی سلطنت میں اسلامی علم و ادب کا نثر و نثر خوب ہوا۔ ایک مرتبہ وہ اسلامی خلافت کی نقل میں یہاں تک آگے بڑھ گیا تھا کہ پوپ و رومنشاہ کی طاقتوں کو ایک ذلت میں اُس نے مجتمع کرنا چاہا تھا۔ اس کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی سی طرح یورپ کی نشاۃ ثانیہ جو اس کے عہد میں شروع ہوئی تھی، قبل از وقت ہونے کے باعث ناکام رہی۔

جن جرمنوں نے اسلام سے غایت دلچسپی لی، اُن سب کے نام گننا ایک خشک کام ہے، اور محدود وقت اس کے لئے کافی نہیں اس لئے اب میں اصل موضوع پر آتا ہوں۔

گوئے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ جرمن کا سب سے بڑا شاعر تھا، اور اس کے اثرات اس کے ملک کی حدود سے گزر کر خوب دور دراز پھیلے۔ ۱۸۰۷ء اس کا سنہ ولادت اور ۱۸۳۲ء اس کا سنہ وفات ہے۔ گوئے اور اس کی شاعری کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی۔ عہد ہنودور سے قبل کا جرمن ادب انگلستان میں بالکل غیر مشہور تھا۔ اور ۱۸۰۷ء سے پہلے انگلستان میں گوئے کی صرف اس قدر شہرت تھی کہ وہ "در تھر" کا مصنف ہے۔ اس کے بعد اس کی کتاب "فاز نمبرا" (False I) شائع ہوئی اور اس سے اس کو یکدم شہرت حاصل ہو گئی۔ انگریز شاعر وڈسور تھ نے گوئے کے کلام کے مطالعہ کی کوشش کی مگر چونکہ اس کی جرمن زبان کی استعداد کم تھی اس لئے وہ کچھ چل نہ سکا۔ کاریج نے جو جرمن فلسفہ سے بہت کچھ متاثر تھا، گوئے کا اصل کلام پڑھا اور اس کی قوت تخلیق کا پورا اعتراف کیا۔ بائرن بھی گوئے کا بہت بڑا شہید بنی تھا۔ اس طرح سروالٹر، سکاٹ ٹیل، وکمارٹ ورسن نے اس کا بہت اعتراف کیا ہے۔ یمن سب سے زیادہ شہرت، انگلستان میں گوئے کو اس وقت حاصل ہوئی جبکہ میڈم ڈی سینٹ کی کتاب "ڈی ل لیگن" انگریزی زبان پر لندن سے شائع ہوئی۔ بعد ازاں کارلائل نے گوئے اور جرمن سب کے سب بڑے نقیب کی حیثیت اختیار کی۔ کارلائل ہی نے جرمن کو شعرا

و مفکرین کے ملک کی حیثیت سے انگلستان میں شہرت دی اور اپنے ملک کی مادیت کا موزن نہ جبرمن کی روحانیت اور مذہبیت سے کیا۔ اس نے اس ملک والوں کی شاعری کی تعریف اس بنا پر خاص طور سے کی کہ یہ شاعری، پابند مذہب اور راسخ الاعتقاد و گوئی شاعری ہے، یہ مقابلہ فرانس کی خشک مادی شاعری کے، جس کا شیوع انقلاب فرانس کے دوران میں ہوا جو اسے ناپسند تھی کا۔ لائل کے نزدیک گوئے ایک قابل پرستش ہیرو تھا۔ اس کی رائے تھی کہ جبرمن تخیل کے ذریعہ بہت بڑا قدم اس غرض کے لئے اٹھایا تھا کہ تجربات کے مختلف نتائج کو متحد دیکھا کر کے، عمیق مذہبی روایات کو عہد حاضر کے افراد کی باغ النظری اور آزاد خیالی کے ساتھ سمویا جائے، اور اس میں مدد ملی گئی تھی ذہن و جذبات کی عظیم شان قوتوں سے۔ کارل لائل کے تراجم اور مضمون متعلق گوئے کی وساطت سے "ویلم میسٹر" (Wilhelm Meister) کو، انگلستان میں گوئے کے سب سے اہم کارنامے کی حیثیت حاصل ہوئی۔ گوئے کی اسلام فہمی کا، شری بھی کارل لائل پر بہت کچھ پڑا تھا۔ اور کارل لائل کی کتاب "ہیرو بطور نبی کے" (Hero as a prophet) پہلی بار روانہ کتاب تھی جو اسلام کے متعلق انگلستان میں لکھی گئی۔ فی الحال کارل لائل کی یہ مایف ہی، انگلستان میں، عدم کے خلاف تصبات کو دور کرنے کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اگرچہ سارے تصبات ابھی تک دور نہیں ہوئے۔ لیکن کارل لائل سے قبل تو، انگلستان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا، جو اسلام کے حق میں ایک کلمہ فیر بھی کہتا۔

اب اصل موضوع یعنی گوئے اور اسلام پر ہم آتے ہیں

گوئے کے کلام میں بہت کچھ وہ لئے گا جو مشرقی اور اسلامی ہے۔ اس کو مشرق سے بہت محبت تھی وہ ہر وقت، مغرب چھوڑ کر سکون و چین کی تلاش میں مشرق جانے کا خواہاں نظر آتا تھا۔ اسکا اپنے متعلق یہ خیال تھا کہ ایران کے حافظ اعظم نے مغرب میں دوسرا جہنم لیا ہے۔ سعدی اور جلال الدین رومی سے بھی وہ واقف تھا اور ان کو بڑی ہستیاں سمجھتا تھا۔ اپنے دیوان ویٹ او۔ لیچن میں



(جو اس کے محبوب و پسندیدہ تخیلات و جذبات سے بھرا ہوا ہے) صاف صاف کہتا ہے :-

”یہ ماننا پڑتا ہے کہ شعور مشرق، ہم مغربی شعرا کے مقابلہ میں کیوں بڑھ چڑھ کر ہیں“

(حکمت نامہ ۱۸)

گوئے مشرق کے زوال سے باخبر تھا، لیکن ساتھ ہی اُسے مغرب کے دائمی تفوق و غلبہ کا بھی یقین

نہیں۔ چنانچہ وہ کہتا ہے :-

”سورج ڈوب چکا، بایں ہمہ دو مغرب میں چمک رہا ہے۔ لیکن میں یہ جانتا چاہتا

ہوں کہ تاب کے یہ شفق باقی رہے گی۔“ (ساقی نامہ)

مشرق اور اسلام سے جو شینٹیلی اُسے تھی، اس کے حوالے اس کی تصانیف سے ہر شخص بہر

وسے سکتا ہے۔ لیکن یہ سب کو معلوم نہ ہو گا کہ اسلام کے عقیدہ توحید، اور مشیت الہی پر تسلیم و رضا سے

وہ کس درجہ متاثر تھا۔ وہ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نبی سمجھتا اور خدا کی وحدانیت کا معتقد تھا۔ اور یہی

اسلام کا اصل اصول ہے۔ اس کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے یہ عقائد کس طرح زندگی بھر اس کے ساتھ رہا

”یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر شخص اپنے معاملہ میں اپنی ہی رائے کی تعریف کرتا ہے :-

اگر اسلام کے معنی طاعت خدا کے ہیں تو ہم سب اسلام ہی کے اندر جیتے اور مرتے ہیں“ کہا جاتا

ہے کہ ”اسلام“ سے زیادہ کسی لفظ نے گوئے کو متاثر نہیں کیا تھا، اور نہ کسی اور لفظ کی صدا کے باز

گشت آخری زیادہ اس کے دل میں گونجی۔ لفظ اسلام کا ترجمہ اُس نے (*Ergebung* to God) ”

خدا کی اطاعت در اس کی مشیت پر اپنے کو حوالہ کر دینا“ سے کیا ہے۔ اس کے اشعار کے علاوہ اس کی تحریریں

خطوط، مباحثوں، مذکورہ اور مقالوں میں بھی ایسی ہی مضمون ملتا ہے۔ اس کا عقیدہ تھا کہ کوئی شخص اپنی

قدیر بدل نہیں سکتا، اسی کو وہ اسلام کا اصل مغز سمجھتا تھا، اور مرتے دم تک وہ اپنے اس عقیدہ پر جارا

۱۸۱۹ء میں اُس نے کانزلیر میلر *Kanzler Museller* لکھی جس میں اُس نے اپنی

پختہ رائے حسب ذیل الفاظ میں ظاہر کیا :-

”تسلیم و رضا، اور اپنے کو ایک بالاتر ہستی کی مشیت کے حوالہ کر دینا، بہتر مذہب کی حقیقی بنیاد ہیں۔ یہ بالاتر ہستی ساری کائنات کو چلاتی، اور ہمارے تصور سے پرے ہے کیونکہ وہ ہماری قوت استدلال و عقل سے بلند ہے۔ اسلام اور اصلاح شدہ مذہب، ان بنیادوں سے قریب تر ہے۔“

اپنی روزمرہ کی زندگی میں بھی، اسلام کا حوالہ دینا اس کی عادت میں داخل ہو گیا تھا۔ جس زمانہ میں اُس کی رفیقہ حیات کا انتقال ہو گیا تھا اور اس کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اپنے دوست میٹر سے بھی اس کو جدا ہونا پڑے گا، اس وقت انتہائی رنج و غم کا عالم اس پر طاری تھا۔ اُس وقت اُس نے یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دی تھی ”اب ہم بھی اسلام کے ماتحت رہیں گے یعنی مشیت ایزدی پر تسلیم غم کر دیں گے۔“

جس زمانہ میں وہ اپنی بہو کی خرابی صحت کی وجہ سے حد سے زیادہ پریشان تھا، آہ سرد کہیں پھر اُس نے یہ کہا تھا ”میں اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اس موقع پر بھی میں اسلام کو اختیار کرتا ہوں۔ یعنی اپنے کو بالکل خدا کی مشیت پر چھوڑتا ہوں۔“

ولمس کی ایک کتاب کو، جس کے مضامین ایک معقول مذہبی نقطہ نظر سے متفق معلوم ہوتے تھے، دیکھ کر گوئے نے یہ کہا کہ ”اسلام ہی اکیلا مذہب ہے جسے ہم سب کو، خواہ جلد، خواہ بہ دیر، تسلیم کرنا ہو گا۔ ایک بار اُس نے اپنے متعلق کہا ”میں ہمیشہ سب چیزوں کو چھوڑ کر تسلیم و رضا میں اسلام کی زندگی اختیار کرتا ہوں۔“

اپنی عمر کے آخری دنوں تک وہ اسلام کی تعلیم دیتا رہا۔ ۱۹۲۷ء میں اُس نے مسلمانوں کے طریقہ تعلیم کی تعریف ایک مین سے بایں الفاظ کی ”اس سے نوجوانوں میں یہ عقیدہ راسخ ہو جاتا ہے کہ کوئی ایسی چیز انسان کو پیش نہیں آ سکتی جو سرِ باطلت خدا نے اس کی تقدیر میں نہیں لکھی۔ اس عقیدہ

کی وجہ سے وہ اس کے لئے تیار ہو جاتے ہیں کہ ساری زندگی ہمت اور ثبات کے ساتھ گزاریں۔  
 گوٹے اس کا معتقد تھا کہ اسلام بڑا شیر نہیں پھیلا۔ نبی کریم (صلعم) کی عجیب و غریب کامیابی  
 کے متعلق وہ اپنے دیوان میں لکھتا ہے :-

”صرف یک خدا کے تخیل کے ذریعہ انھوں نے ساری دنیا کو مسخر کر لیا ہے۔“

ن ثواب سے یہ ثابت ہوا کہ گوٹے خدا کی یمانی کا قایل تھا۔ (حضرت محمد کو خدا کا نبی، متنا  
 تھا، سلام کا صحیح نقطہ نظر کہ اپنے کو مشیت ایزدی کے پردہ کو دینا چاہئے، ہر وقت اس کے سامنے  
 تھا، اور اس عقیدہ سے اس نے اپنا غم بھلایا، اور اس کی بدولت اس کو زندہ رہنے اور فہمی خوشی  
 زندگی گزارنے کی ہمت ہوئی۔ کیا وہ مسلمان تھا؟



# اکیبیتا

## کلام جگر

(از حضرت جگر مراد آبادی)

جناب موصوف نے یہ تازہ غزل "انجمن ترقی اردو" کے مشاعرہ کے لیے لکھی تھی لیکن دہان کی ہڑبگ دیکھ کر اسے سنا نہیں سکے۔ اب آپ نے اس کو "برہان" میں شاعت کے لیے عنایت کیا ہے جس کو ہم دلی شکر یہ کے ساتھ شائع کرتے ہیں۔

نہیں جاتی کہاں تک فکر انسانی نہیں جاتی	مگر اپنی حقیقت آپ پہچانی نہیں جاتی
کسی صورت نمود سوزِ پشانی نہیں جاتی	بجھا جاتا ہمدرد چہرے کی تابانی نہیں جاتی
اگر حل ہو گئی مشکل تو آسانی نہیں جاتی	بہر صورت محبت کی پریشانی نہیں جاتی
نگاہوں کو خزاں نا آشنا بننا تو آجائے	خزاں میں بھی چین کی جلوہ سامانی نہیں جاتی
جے جاتے ہیں اڑاڑ کر مٹے جاتے ہیں گر گر کر	حضورِ شمع پروانوں کی نادانی نہیں جاتی
خدا ہی جانے کس عالم میں حُسن یار دیکھا تھا	کوئی عالم ہو آئینہ کی حیرانی نہیں جاتی
ہنگامہ شوق کی گستاخیاں تو بہارے تو بہ!	تلافی لاکھ کرتا ہوں پشیمانی نہیں جاتی
بلند ہی چاہئے انسان کی فطرت میں پوشیدہ	کوئی ہو بھیس لیکن شانِ سلطانی نہیں جاتی

مزاجِ اہل دل بے شور و مستی رہ نہیں سکتا  
 کہ جیسے نگہستِ گل کی پریشانی نہیں جاتی

## دریا

## گرمی کی دوپہر میں

(از جناب مسود الرحمن صاحب آبادیہ غسانی)

چمچلاتی دھوپ میں سوتا پچ و خم کھاتا ہوا  
 دوپہر کے خستہ سوج کو سینہ میں لئے  
 نوکی آتشناک آمدی میں ٹمٹما پھیلتا  
 دشت میں وحشی گھوڑوں کے جنوں کا کیلتا  
 ساحلوں پر ریت کی چنگاریوں کے درمیاں  
 کالے کالے کساروں میں گرجتا گونجتا  
 جہت کر کے آتشباروں کے ہلاکت نیز جہت  
 زندگی کے جوش میں اُمتڈا ہوا پھرا ہوا  
 زندگی کی گھاٹیوں میں ہر قدم پر ٹھوکریں  
 اور ہر ٹھوکر پر بیٹنے کی قسم کھاتا ہوا

دیکھنے والے! وقار زندگی کا بیگم لے

ہو سکے تجھ سے تو دریا کی روانی بیگم لے

اس کا عزم زندگی عبور ہو سکتا نہیں

یعنی دریا خشک ہو سکتا ہو سکتا نہیں

## عزمِ مومن

(از جناب رشدی قادری صاحب فاضل دیوبند)

حیرانِ بخت گردشِ دوراں کی طرف دیکھ  
پھر تازگی آجائے گی افسردہ دلوں میں  
گذرے ہوئے لمحاتِ محبت کو صدائے  
ہر حلقہ زنجیر ہے بزارِ اسیری  
کچھ جائز و سہیِ دُعا لے تو جہاں میں  
گرتی ہے ابھی برقِ نگاہِ ہوس آگیاں  
کس طرح سے کرتا ہے جہاں کو تہ و بالا  
پامال نہ کر دے کوئی گلزارِ اخوت  
جب ختم ہو تو میرِ عمل بزمِ جہاں میں  
مومن ہے اگر قوتِ یہاں کی طرف دیکھ  
ہاں! آنکھ اٹھا برہاراں کی طرف دیکھ  
موجودہ ستمرائیِ دوراں کی طرف دیکھ  
اے تنگ نظر قیدیِ زنداں کی طرف دیکھ  
مردِ ہوشِ نابینا بن عمر گریزاں کی طرف دیکھ  
کیا دیکھتا ہے مریضِ دہقان کی طرف دیکھ  
اے یاسِ ذرا غمِ مسلمان کی طرف دیکھ  
گلچیں کی نظر اور چمنستاں کی طرف دیکھ  
پھر آنکھ اٹھا نشانِ یزداں کی طرف دیکھ

چھایا ہوا ہے سبزِ بیگانہ صحن میں  
اے پھول کے متوالے گلستاں کی طرف دیکھ



# شؤون علمیہ

## قطب شمالی کی طرف نیا سفر

منطقہ قطب شمالی کے نامعلوم طراف میں علمی کشفیات و تحقیقات کا جو کام ہو رہا تھا، اسکو جاری رکھنے کے لئے امریکہ کی حکومت نے اب ایک نئے تحقیقاتی کمیشن کے روانہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو امریکہ کے پانچ تحقیقی مہتمم ہوں گے۔ اس کمیشن کے صدر ڈاکٹر بولٹر ہوں گے۔ جو اس سے قبل ایک مرتبہ اور بھی پیرڈ کمیشن کے دورے سفر میں اس منطقہ سے گزر چکے ہیں۔ یہ جدید کمیشن آئندہ موسم گرما میں اپنا سفر شروع کرے گا اس کے ہمراہ ایسا سا اوزار ایسے جدید آلات ہوں گے جن کی مدد سے ایک پورا سال یہاں گزارا جاسکے۔ اس کمیشن کے ساتھ نئی چیزوں میں سے ایک عجیب و غریب کشتی ہوگی جو خود ڈاکٹر بولٹر نے دشوار گزار برف پریش خیلوں کو عبور کرنے کی غرض سے بنائی ہے، کیونکہ اس خط میں اونچے اونچے ٹیلے اور بڑے بڑے درے پائے جاتے ہیں اس کشتی میں ایک موٹر لگا ہو جس کا طول پچیس اور عرض پندرہ قدم ہے۔ اس موٹر کے اوپر ایک میارہ ہے کشتی کے طرافت و جنوب میں مختلف چوٹے کمرے ہیں جن میں کمیشن کے ممبروں کے رہائش گاہیں ہیں وہ اپنے آلات و سہا ب کے ساتھ ٹھہر سکیں گے۔ موٹر پر دو انجن ہیں جن میں سے ہر ایک کی قوت دو سو گھوڑوں کے برابر ہے، ان انجنوں کے ذریعہ موٹر کی کلوں کو حرکت دیجائیگی اور تار برقی گنت و شنید کے لئے جو آلات لگائے گئے ہیں ان میں بھی ان انجنوں سے مدد لی جائے گی ان کے علاوہ کشتی میں کسی ایک برقی چوٹے میں جن سے کھانا پکانے اور حرارت کے پیدا کرنے کا کام کیا جاسکے گا، موٹر کے چار پیٹروں میں سے ہر ایک پیٹہ ایک مخصوص برقی محرک پر مشتمل ہے ان سب چیزوں کا

مجموعی اثر یہ ہو گا کہ موٹر ان ٹیلوں اور وروں کو عبور کر کے گا جو اُس کے راستہ میں واقع ہوں گے، اور اُس کی صورت یہ ہو گی کہ موٹر جب کسی یک درہ پر پہنچے گا تو وہ اُس کی کسی ایک جانب پر رُکے گا نہیں بلکہ کچھلے دوپہتے اگلے دوپہتوں کو ایسی شدید حرکت دیں گے کہ وہ اس درہ سے با سانی گذر جائیں گے اس کے بعد کچھلے دونوں پہتے ساکن ہو جائیں گے، اور اب اگلے دونوں پہتے حرکت شروع کریں گے یہاں تک کہ وہ کچھلے پہتوں کو بھی درہ سے نکال کر باہر لے آئیں گے۔

اس موٹر پر جو ہوائی جہاز (طیارہ) ہے اُس میں پانچ نشستیں ہیں جن میں ایسے آلات لگے ہوئے ہیں جن کی مدد سے موٹر جن خطوں پر سے گزرے گا اُن کے باریک باریک جغرافیائی عکس اُن میں مرقم ہوتے رہیں گے اس جہاز میں ایک ایسا آلہ لگا ہوا ہے جس کے ذریعہ جہاز موٹر کی سطح پر بہت سرعت کے ساتھ رکھا جاسکتا اور اُس سے الگ بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس کشتی اور اُس کے لازم و آلات کی تیاری پر تیس ہزار گنیاں صرف ہو چکی ہیں۔ اور اندازہ کیا گیا ہے کہ یہ پانچ ہزار میل کی مسافت طے کرے گی۔ اس کی رفتار کا اوسط ایک گھنٹہ میں دس میل سے تیس میل کے درمیان ہو گا۔ یہ واضح رہنا چاہئے کہ اس کمیشن کا مقصد جغرافیائی تحقیق نہیں بلکہ علمی امتحانات و تحقیقات ہیں۔ یعنی کمیشن یہ دریافت کرے گا کہ قطب شمالی کی مقناطیسی قوت کس درجہ کی ہے؟ برٹ پوٹس حصہ کی پچھلی کیسی ہوتی ہے؟ وہاں شفق کی جو روشنیاں پیدا ہوتی ہیں وہ کس طرح کی ہوتی ہیں؟

## موجوں جنگ کے بعد سیکر و باؤں کا خطرہ

لوگوں کو معلوم ہے کہ سترہ جنگ عظیم کے تخریبی مینوں میں جنگ کے بے تعداد مقتولین اور گن کی بے گور و کفن، شوں کے تعفن سے تمام دنیا میں انہماک کی سخت ترین و با پھیلی تھی جس کے متعلق

حقیقین کا بیان ہے کہ اُس نے صرف دو مہینہ میں اتنے آدمی ہلاک کر دیئے تھے کہ جنگ عظیم کے تمام سالوں میں بھی اتنے آدمی ہلاک نہیں ہوئے تھے۔ یورپ کے مشرق میں اس منحوس دبا کے جراثیم اڑے تو چین اور ہندوستان تک پہنچے اور صرف ہندوستان میں ہی پچاس لاکھ انسانوں کا خاتمہ کر کے رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی ان جراثیم نے یورپ کے مغرب کا رخ کیا تو بحیرہ اوقیانوس کو عبور کرتے ہوئے امریکہ تک پہنچے جہاں انھوں نے مقبولین جنگ سے دس گنے آدمی موت کے گھاٹے مار دیئے اس عالمگیر دبا کا اثر یہ تھا کہ امریکہ اور یورپ میں تابوت اور کفن کے دام حیرت انگیز طریقہ پر بڑھ گئے اور جو بے روزگار تھے ان کو قبر نمودنے کا روزگار مل گیا۔

یہ تو گذشتہ جنگ عظیم کی وہ عالمگیر نحوست، اور بدبختی تھی جس نے مشرق و مغرب میں قیامت برپا کر دی۔ اب طب و صحت کے مشہور ماہر ڈاکٹر ڈمس ریفرز نے بیان کیا ہے کہ اگر موجودہ جنگ کی مدت دیراز ہو گئی اور اس نے زیادہ دوست اختیار کر لی تو یقینی بات ہے کہ اس کے خاتمہ پر ایسی ہلاکت انگیز وبا نہیں پھیلیں گی جو گذشتہ اظہارِ انرا کی بہ نسبت کہیں زیادہ مہلک اور خطرناک ہوں گی۔ ڈاکٹر موصوف کی رائے میں یہ دبا میں جنسی امراض کے علاوہ مختلف بخاروں کی شکل میں ہوں گی۔ مثلاً میخاوی بخار اور مونٹریا فوریو تپ اسماں، ڈاکٹر موصوف نے اس بات پر بھی اٹھار افسوس کیا ہے کہ طرکیمیا و رسائیں کی ترقی نے جنگ کے زخمیوں کے لئے ایسی دوائیں دریافت کر لی ہیں جنکے استعمال سے ان کو زخموں کی شدید تکلیف و کرب زیادہ محسوس نہ ہو لیکن افسوس ہے اب تک کوئی ایسی چیز ایجاد نہیں ہوئی جس کے ذریعہ سول آبادی کے لوگوں کو ان دباؤں کی مصیبت سے محفوظ رکھا جاسکے جو جنگ کا لازمی نتیجہ ہیں۔

## جرمنی میں یونیورسٹی تعلیم

جرمنی اپنی علمی تحقیقات و رسائیں کی غیر معمولی ترقی و اکتشافات کے لئے مشہور ہے لیکن بڑا



نازیم کی ترقی کی وجہ سے خاص علمی جدوجہد پر بھی بڑا سخت اثر پڑا ہے۔ ہٹلر نے اپنی کتاب  
 (Mein Kampf) میں اس امر کا بار بار ادعا کیا ہے کہ جرمنی کی فلاح و بہبود  
 کا دار و مدار صرف ایک مضبوط اور قوی نظامِ عسکری پر ہے۔ ہٹلر کے خیال میں جو لوگ دن رات علمی  
 مسائل کے غور و فکر میں منہمک رہتے ہیں یا جو شعراء اور ادباء تخیل کی وسیع فضا میں شب و روز پرواز  
 کرتے رہتے ہیں ان کے قوی علمی اجتہاد درجہِ مضلل اور مست ہو جاتے ہیں اور اس لئے وہ کسی ملک  
 کی سیاسی ترقی میں کارآمد ثابت نہیں ہو سکتے۔ علمِ تحقیق کی نسبت اس طرح کی نازیانہ ذہنیت کے  
 پیدا ہونے کا یہ ہمہ نتیجہ ہے کہ جرمنی سے بعض بڑے بڑے ماہرینِ اکتشافات کو شہرہء کر دیا گیا جو  
 جن میں یہودیوں کے سوا کچھ خاص جرمنی علم بھی ہیں۔ ان چیزوں کا یونیورسٹی کی علمی تعلیم پر بھی اثر  
 پڑنا ناگزیر تھا۔ چنانچہ ۱۹۳۲ء و ۱۹۳۳ء کے تعلیمی سال میں جرمنی کی یونیورسٹیوں کے طلباء کی تعداد  
 ۱۱۶،۵۳۴ تھی، لیکن نازیوں کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد ۱۹۳۳ء و ۱۹۳۴ء کے تعلیمی سال میں ان طلباء  
 کی تعداد گھٹ کر ۵۳،۷۵۳ رہ گئی۔ اس حالت میں تھوڑے بہت طلباء یونیورسٹی کی علمی تعلیم کا کورس  
 پڑھتے بھی ہیں تو انھیں پڑانے پر تحقیق کے ساتھ تعلیم نہیں دی جاتی بلکہ سرسری طور پر انھیں درس دیا  
 جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ایک مرتبہ جرمنی کے ذریعہ معارف نے یونیورسٹیوں  
 کے پروفیسروں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس وقت آپ لوگوں کی توجہات محض نسیم پر مرکوز  
 ہو جانی چاہئیں۔ اس کی ضرورت نہیں ہے کہ آپ ٹھوس علمی تحقیقات و مذاکرات میں مصروف رہیں  
 اور اپنے اکتشافی تجربات کو جاری رکھیں۔ اس تقریر کا مدعا یہ تھا کہ طلباء کو نازی اصول و ضوابط کے  
 تحت تعلیم دینی چاہئے۔ اور فکری اجتہاد و آزادی کا دروازہ کن پر بند ہو جانا چاہئے۔

# تبصرے

ہندوستان کے آثارِ قدیمہ پر ایک اجمالی نظر :- زہرانا غلام یزدانی صاحب ڈاکٹر کٹر  
آثارِ قدیمہ حیدرآباد دکن، قیام خور و ضحامت، ۵ صفحے طباعت کتابت بہتر اور دید و زیب قیمت ۱۰ روپے  
پتہ :- مکتبہ جامعہ دہلی، لاہور و لکھنؤ

یہ اصل ایک مقالہ ہے جو فصلِ مصنف نے اردو اکادمی جامعہ ملیہ کی فرمائش پر اس کے ایک جلسہ  
میں پڑھا تھا جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ اس مقالہ میں ہندوستان کے آثارِ قدیمہ پر ایک اجمالی نظر ڈالی گئی  
ہے۔ موصوف حیدر آباد دکن کے نثری آثارِ قدیمہ کے ڈاکٹر ہیں۔ اس لئے ظاہر ہے اس موضوع پر گفتگو  
کرنے کے لئے آپ کا انتخاب نہایت موزوں اور مناسب تھا۔ مقالہ کا اصل موضوع ہندوستان کی  
قدیم عمارتیں ہیں۔ لیکن ضحامتوں اور ہندوؤں کی فنی خصوصیات کا بھی ذکر آگیا ہے اور سنگتراشی اور  
نقاشی پر بھی ایک طائرانہ تبصرہ کر دیا گیا ہے۔ ہمیں کہیں ہندوستان کی بعض عمارتوں کا مقابلہ اندلس کی  
بعض مشہور عمارتوں سے کر کے ان کے وجود امتیاز و فرق بیان کئے ہیں۔ پورا مقالہ پڑھنے کے بعد  
اجمالی طور پر یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کے فنِ تعمیر میں عہدِ بعد کیا کیا تغیرات ہوئے۔ اور  
یونان و ایران کا ہندوستانی فن پر کیا اثر پڑا۔ مقالہ مختصر ہونے کے باوجود نہایت قابلِ قدر ہے۔ لیکن  
گر یہ اجمالِ تفصیل سے بدجائے تو میں شبہ نہیں موصوف ایک زبردست علمی کام کو انجام دیکر اچھریل کے حق میں  
تاریخِ ہندوستان کی تمہید :- از پروفیسر محمد نجیب صاحب بی۔ اے (دکن) چھوٹی قیام خور و ضحامت  
۲۴ صفحے کاغذ اور کتابت و طباعت بہتر قیمت ۵ روپے۔ مکتبہ جامعہ دہلی ڈی۔ پی۔ لاہور و لکھنؤ

یہ بھی ایک مقالہ ہے جو پروفیسر محمد نجیب صاحب نے اردو اکادمی جامعہ ملیہ میں پڑھا تھا محمد نجیب صاحب  
ایک مختصر تاریخِ ہند لکھ رہے ہیں۔ یہ تبصرہ مقالہ اس کی ہی تمہید ہے۔ اس مقالہ میں بتایا گیا ہے کہ تاریخ

کا دراصل مقصد کیا ہے۔ اور ایک مورخ کو تاریخ لکھتے وقت کن کن چیزوں کی رعایت کرنی ضروری ہے۔ پھر اس پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ اب تک ہندوستان کی جو تاریخیں نامور مورخوں کے قلم سے نکلی ہیں ان کا عام انداز کیا ہے اور ان سے صحیح تاریخی خدمت کا فرض کس حد تک ادا ہوتا ہے، موصوف نے اپنے مقالہ کا مقصد خود ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ”میرے اس ناچیز مقالہ کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ ہندوستان زندگی کی سوت کے باوجود ہماری تاریخ تسلسل اور یک جہتی، جوصلے اور ترقی کی داستان ہے ہم خود ادھر دھیان نہیں کرتے ورنہ یہ کمائی تو ایسی ہے کہ نیند کے اتے بھی جوش اور دلوے سے اچھل پڑیں“ بے شبہ یہ مقصد نہایت نیک اور بلند ہے۔ اور اگر مجیب صاحب نے اپنی تاریخ سے اس غرض کی تکمیل کر دی تو وہ یقیناً ایک شاندار علمی کارنامہ ہو گا جو سیاسی اعتبار سے بھی ملک کی زبردست خدمت ہو گی۔ یہ مقالہ تاریخ کے عام طلبہ کے لئے بھی بہت مفید ہے۔ انہیں اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

**قتیل اور غالب :-** از جناب سید اسد علی صاحب انوری فرید آبادی بی ایس سی، علیگ  
تفصیل خوردنضامت ۳۰ صفحات کاغذ کتابت اور طباعت عمدہ قیمت درج نہیں۔ پتہ: مکتبہ معجم دہلی، لاہور۔  
مرزا غالب کے دور میں ان کے اور قتیل کے حامیوں کی محرکہ آرائی ادب اُردو کی تاریخ کا ایک مشہور واقعہ ہے۔ ”مرزا غالب قتیل پر کلمہ چینی کرنے میں بڑے قشود واقع ہوئے تھے۔ اور انھوں نے اپنے بعض خطوط میں خصوصاً در بعض اشعار میں عموماً جن الفاظ میں قتیل کا ذکر کیا ہے اس سے ادبی مخالفت کے علاوہ کچھ ذاتی نفرت و عناد کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ مرزا کے سوانح نگاروں نے ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ لیکن اب تک کسی نے اپنی کتاب میں قتیل و غالب کے موازنہ کو مستقل موضوع بحث نہیں بنایا تھا۔ اب اس جدید بحث کا دروازہ سید اسد علی صاحب نے کھولا ہے۔ لیکن اگر یہ بحث محض شعری اور سانی و ادبی موازنہ تک محدود رہتی تو بہت اچھا ہوتا۔ افسوس یہ ہے کہ لائق مولف نے اس خالص ادبی بحث میں ذاتیات کو درمیان میں لا کر اور مرزا غالب کی اخلاقی کمزوریوں کو بے نقاب



کر کے بحث کی بنیاد کو گم کر دیا ہے۔ موصوف نے شروع میں ہیرود کی جو تعریف کی ہے وہ صحیح ہو لیکن سوال یہ ہے کیا شاعر کو بھی اس خاص تعریف کے ماتحت کسی قوم کا "ہیرود" کہا جاسکتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس کا جو بنگلی میں ہونا چاہئے۔ اس بنا پر ایک شاعر سے ہم کو صرف "شاعر" ہونے کی توقع کرنی چاہئے۔ اس میں محاذ اخلاق۔ اور مجاہدین و ائمہ مذہب و علم کے عادات و خصائل کی جستجو قطعاً بیکار اور عبث ہے۔ ہر حال اس کتاب نے مرزا غالب کے متعلق ایک نئے انداز نگاہ کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اس لئے موافق و مخالف درمشتاقانِ اردو ادب کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی کا باعث ہو گا۔

محاذ انکشاف ۱۰۔ تہ حافظ اخلاق احمد رضا صدیقی و سجاد حسین حسنا صدیقی کبر آبادی۔ پاکٹ سائز انشائیہ صفحات ۸۴ کاغذ سائب و طباعت بہتر و خوشنا جلد قیمت ۱۲ اخیر مجلد ۸ رپہ۔ مکتبہ قصر الادب اگرہ  
لکھنؤ میں کچھ دنوں جو تبرہ ابھی ٹیشن ہو تھا۔ نا لباس سے متاثر ہو کر تبرہ کے زیر کا تریاق بہم پہنچانے کی غرض سے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ شروع میں اس کے، خذ اور حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب کی تقریظی سطور کے بعد سبب و خذفت دفعہ ۱۰ اور بعد رضی اللہ عنہم کی شان منقبت بیان میں چند نظمیں ہیں جو مولانا یسار کبر آبادی کی قلمیہ ہیں۔ پھر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے چاروں خلفاء کے نسب نامے ہیں اس کے بعد اصل کتاب کے موضوع کا آغاز ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں خلفاء اربعہ کے سوانح زندگی ترتیب وار سچ لکھے ہیں کہ پہلے منقہ سوانح زندگی۔ پھر قرآن مجید میں ان کے جو فضائل ہیں وہ۔ پھر احادیث سے ان کی جو فضیلتیں ثابت ہوئی ہیں ان کا ذکر۔ اور ان سوانح و فضائل کے شروع اور اخیر میں ایک ایک نظم سوانح اور فضائل دونوں مستند اور معتبر کتابوں سے خذ کے گئے ہیں، اس پر حسن ترتیب نے کتاب کو اور چار پانچ گنا دیئے ہیں۔ آخر میں بعض شخصیات کی تقریظیں ہیں۔ کتاب پکٹ سائز ہونے کی وجہ سے ہر وقت جیب میں رکھ سکتی ہے۔ اس کا مطالعہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ غیر مسلموں کے لئے بھی نور بعیرت پیدا کرنے کا موجب ہو گا۔

زبان بہت سہل و سلیس۔ جسے ہر معمولی اردو خواں سمجھ سکتا ہے

# اسلام کا اقتصادی نظام

ایف مرقا محمد حفظ الرحمن صاحب سیداری

اس کتاب میں اسلام کے معیش کے اصول و قوانین کی روشنی میں اس کی تشبیح کی گئی ہے کہ دنیا کے تمام اقتصادی نظاموں میں صرف اسلام کا اقتصادی نظام ہی یہ نظام ہے جس نے محنت و سرمایہ کا صحیح توازن قائم کر کے اعتدال پر پہنچا ہے۔ اس وقت اقتصادی مسئلہ تمام دنیا کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ سرمایہ داری کی تباہ کاریوں سے ملک آتی ہوئی قوموں کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ وہ کونسا نظام سے جو اختیار کر کے ایک انسان کو ان کی طرح زندہ رہنے کا حق مل سکتا ہے۔ آپ اس اسلام کی اقتصادی ریسٹوں کا مکمل نقشہ دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ضرور مدد حاصل فرمائیے۔ یہ موضوع پر پہلی کتاب ہر صفحہ ۲۶۴۔ قیمت مجید ۲۰ غیر مجید ۱۰

## سوشلزم کی بنیادی حقیقت

مترجم سید منشی الدین صاحب شمس ایمنی

اس کتابت کی بنیادی حقیقت اور اس کی اہم قسموں سے متعلق مشہور جرمن پروفیسر کارل ڈیلن کا تقریریں جنہیں پتی مرتبہ اور میں منتقل کیا سلسلہ اس کے ساتھ سوشلزم کے حیرت اور اس کے موجودہ وقت رتاتی کے متعلق مترجم کی کتاب سے ایک ہموار و مختصر مقدمہ بھی شامل ہے۔ اس کتابت جو مسرت کا ذخیرہ ہے۔ ہر صفحہ ۲۶۴ قیمت مجید ۲۰ غیر مجید ۱۰

## ہندوستان میں قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ

ہندوستان میں قانون شریعت کے نفاذ کی ممکن عملی تشکیل پر ہندو بصیرت و دور رسمنوں میں درج ہے۔ اس کے ساتھ ہی شریعت کے نفاذ کی بنیادی مسئلہ کے جس دور رسمنوں کے تحت ابی سرکار و ران کے علمی نصاب پر نمایاں ہے۔ اور اس بحث کی اہمیت سے ہندو مسوں کی عقیدہ میں موجود و محدث کی تمام قابل ذکر و فوٹ پر زبردست تنقید کی گئی ہے۔ صفحات ۳۸۔ قیمت ۳۰

میجر ندوۃ المصنفین قرواں پاشا نئی دہلی

# قواعد

۱۱۔ ہر ماہ ہر گزری مہینہ کی ۵ تاریخ کو منع ورثہ ہوگا۔

۱۲۔ مذہبی اعلیٰ تحقیقی، خدائی، عصا من بشرطیکہ وہ سہ روزہ ن کے معیار پر پورے نہیں اڑاں میں شائع کیے جاتے ہیں۔

۱۳۔ جو در اہتمام کے بہت سے ریلے ڈاک فون میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس بار نہ پینے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ تاریخ تک دفتر کو صدر سے دیں ان کی خدمت میں رسالہ روزانہ ہر وقت بھیج دیا جائے گا اس کے حد تک یقیناً قیاب میں نہیں سمجھی جائیگی۔

۱۴۔ جو صاحب مور کے لیے رکالٹ یا جوانی کا راز بھیجنے والی ہے۔

۱۵۔ 'روزانہ' کی صفحہ مت کہے کہ سنی صفحہ یا پورے دور ۲۰ صفحہ رسالہ ہوتی ہے۔

۱۶۔ قیمت رسالہ پانچ روپیے ہفت روزہ کے دو روپیے ہر آٹے (مع محسوسات) فی پرچہ ۸

۱۷۔ مئی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر پناکس پتہ ضرور لکھیے۔



ندوة المستفین دہلی کا ماہوار رسالہ

# برہان

مترتب  
سعید احمد کسرا بادی  
ایم اے۔ فارمیل دیوبند

# ندوة المصنفین کی کتابیں الرق فی الاسلام اسلام میں غلامی کی حقیقت

تالیف مولانا سعید احمد ایم۔ اے مدرسہ اسلامیہ

کئی برسوں سے اس حق میں غلامی کی حقیقت میں کے تقدس، خالق، باری تعالیٰ کی پیروی پر بحث کرنے کے بعد بتایا گیا ہے کہ غلامی انسانوں کی خیر و فخر و خوشحالی کی ابتدا کب سے ہوئی۔ اسلام سے پہلے کن کن قوموں میں یہ رواج پایا جاتا تھا اور اس کی سوریں کی تھیں، اسلام نے اس میں کیا کیا اصلاحیں کیں اور ان مدتوں کے لیے یہ کیا طریقہ اختیار کیا نیز منہو مصنفین یورپ کے خیالات اور یورپ کی بدلتی خیریتوں کی غلامی پر ملاحظہ کیا گیا ہے۔

یورپ کے ادب و تالیفات و تبلیغ نے اسلامی تعلیمات کو دنام کرنے کے لیے جس جہد میں کام لیا ہے ان تمام جہدوں میں بیوری کا مسند بہت ہی موثر ثابت ہوئے۔ یورپ امریکہ کے علمی و تبلیغی حلقوں میں اس کا مخصوص طور پر چرچا ہو رہا ہے۔ بدلتی، نئے ملک میں اس مسئلہ میں غلط فہمی کی وجہ سے اسلامی تبلیغ کے لیے بڑی رکاوٹ ہو رہی ہے بلکہ مغربی قوتوں کے باعث ہندوستان کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس کو ٹھکر رہا ہے۔ انشا و جدید کے قلب میں گرا آپ اس بات میں اسلامی نقطہ نظر کے ماتحت ایک محتفانہ و جانہ بحث دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ضرور دیکھیے۔ مجلد سے بغیر مجلد ہمارے

## تعلیمات اسلام اور مسیحی قوم

تالیف مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند رفیق غازی

مؤلف نے اس کتاب میں مغربی تہذیب و تمدن کی شاہرہ آفاقوں کے مقابل میں اسلام کے تمدنی اور روحانی نظام کو ایک سراسر منظر پر پیش کیا ہے۔ تعلیمات اسلامی کی جامعیت پر بحث کرتے ہوئے دلائل و واقعات کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ موجودہ عصر کی قوموں کی ترقی و ترقی و ترقی کی وجہ سے کی ہوئی حد تک طراریاں اسلامی تعلیمات ہی کے زیر اثر ہی رہی ہیں، جنہیں قدرتی طور پر اسلام کے دور میں ہی میں رہا ہو، یہی ہے۔ اسی کے ساتھ موجودہ تمدن کے تمام اہم بحث کی ترقی سے ویرانہ ترقی، انہی کی قومیں ترقی و ترقی پر غور کرنے والی ہیں۔ اس باب میں حد و حد سے مختلف معنی سمجھتے آتے ہیں جس کا رد و تائید کے مدد کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ کتاب میں حد و حد سے مختلف معنی سمجھتے آتے ہیں جس کا رد و تائید کے مدد کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

# برہان

شمارہ ۲

جلد چہارم

محرم ۱۳۵۹ھ مطابق فروری ۱۹۴۰ء

فہرست مضامین

۸۲	سید احمد اکبر آبادی	۱- نظرات
۸۶	مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب سیواروی	۲- حضرت لعل اور طوفانِ نوح
۱۰۳	شمس العلام مولانا عبد الرحمن صاحب	۳- معاہدہ یہودی ملی نقطہ نظر سے
۱۲۱	عمیدہ سلطان صاحبہ ادیب فاضل	۴- نواب زین العابدین خاں عارف
۱۳۱	س	۵- تلخیص ترجمہ (ترجمہ کے تراجم دنیا کی مختلف زبانوں میں)
۱۵۱	نہال سیواروی	۶- ادبیات (مجھے معلوم نہ تھا)
۱۵۲	موسیٰ عزیز الحق صاحب بی بی بی ٹی (علیگ)	۷- بیگم اور میڈم
۱۵۳	س	۸- فنونِ علیہ
۱۵۴	س	۹- تبصرے



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

# نظرات

دارالعلوم دیوبند کا جدید دور

دارالعلوم دیوبند ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد دینی مرکزی درس گاہ ہے۔ خدمتِ ملت و مذہب کا وہ کون سا شعبہ ہے جس میں اس درس گاہ کے تعلیم یافتہ اصحاب کی خدمات نمایاں نہیں۔ درس و تدریس کے حلقہ میں کثرتِ انہی کی ہے۔ تبلیغ کے میدان میں انہی کے قدم سب سے پیش پیش رہے۔، صریح رسوم و معاشرت کی کوششوں میں انہی کی مساعی سب سے زیادہ روشن اور کامیاب ثابت ہوئیں۔ سلامی سیاست کی بساط پر انہی کی فراز نگاری و دانشوری کے مہرے بازی جیتنے میں کامیاب رہے۔ راہِ حق کی روشنی و غلغلہ مند کے خارزار میں انہی کے ایثار و فداکاری کے گھوڑے سب سے زیادہ ثابت قدمی اور استقلال کے ساتھ دائرے صرف جدید لائن پر تصنیف و تالیف کا شعبہ ایک ایسا تھا جو اب تک دارالعلوم دیوبند کے حلقہ میں قائم نہیں تھا۔ توفد کا شکر ہے کہ اس نے ندوۃ المصنفین کے قیام کی صورت پیدا کر دی جو سید افزا کابینہ کے ساتھ اپنے دانشور، ذہم دار، باہرے حقیقت یہ ہے کہ اس امام کا دما زری، اقتصادی، پریشانیوں اور سیاسی برتری و پراگندگی کے دور، مبارک میں بھی ملک نے اس ادارہ کا جس حوصلہ افزا طریقہ پر خیر مقدم کیا ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی گزری حالت میں بھی ایسے مسلمانوں کی کمی نہیں ہے جو سنجیدہ علمی و مذہبی لٹریچر و پرسی کے ساتھ بیٹھتے ہیں اور اس سے قلبی وابستگی رکھتے ہیں۔ ندوۃ المصنفین نے اب

ایک جو کچھ کتابیں شائع کی ہیں وہ برابر نکل رہی ہیں اور کچھ عجیب نہیں کہ تھوڑی ہی مدت میں ہر کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی نوبت آجائے۔



ہماری یہ کامیابی بھی دراصل دارالعلوم دیوبند کی ہی کامیابی ہے کیونکہ جو حضرات اس ادارہ کے اجزاء و ترکیبی ہیں وہ سب کے سب دارالعلوم کے پڑھے ہوئے، وہاں کے بزرگوں کا فیض صحبت، کھانا پوٹا اور انہی کے دامان تربیت میں نشوونما پائے ہوئے ہیں۔ بہر حال مقصد یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے حلقہ میں ٹھوس علمی تصنیفات کے ایک ادارہ کی جو کمی تھی وہ بھی ان لوگوں کے ہاتھوں پوری ہوگئی جو کم از کم غالب کی زبان میں یہ کہنے کے ضرور حقدار ہیں۔

گوداں نہیں پہاڑ کے نکالی ہوئے تو ہیں کب سے ان تہوں کو بھی نسبت ہے دور کی



قوم پر کوئی سخت ادب آتا ہے تو اس کا ایک ایک ادارہ اس سے متاثر ہوتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی عام سیاسی و اقتصادی زبوں حالی ان کی محبوب دینی درس گاہ کو بھی متاثر کیے بغیر نہ رہی۔ اور ایک دیوبند ہی کیا، ہندوستان کی دوسری اسلامی عربی درس گاہ ندوۃ العلماء بھی اس سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ لیکن اب یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ دونوں درس گاہیں اپنی اپنی اصلاح اور اپنی عظمت رختہ کو واپس لانے کے لیے تیار ہوگئی ہیں۔ ندوۃ العلماء کے متعلق بعض اخبارات میں آچکا ہے کہ مولانا سید سیمان ندوی اس کی اصلاح و تجدید کا ایک پروگرام بنا رہے ہیں اور اسی سلسلہ میں وہاں سے دوبارہ ندوۃ کا اجراء ہو رہا ہے۔ دیوبند کے دورِ جدید کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی صدر مستم کی حیثیت سے دیوبند میں مستقل قیام فرمائینگے۔ آپ کا اس عہدہ کے لیے انتخاب مجلس عاملہ نے اب سے چند سال پہلے کر لیا تھا لیکن آپ کا مستقل قیام ڈبھیل میں رہتا تھا۔ آنزیری طور پر دارالعلوم کا کام کرتے

تھے۔ تمام کا مذاق دبو بند سے ڈابھیل ہی چلے جاتے تھے لیکن ظاہر ہے صدر مہتمم کی حیثیت سے آپ پر دارالعلوم کے معاملات کی ہمہ وقت نگرانی کی جو ذمہ داری عائد ہوتی تھی، دیوبند سے آٹھ سو میل دور ہونے اور پھر اس میں تدریس کی چند در چند مصروفیتوں میں منہمک رہنے کے باعث آپ اس سے اچھی طرح سبکدوش نہیں ہو سکتے تھے۔



مسلموں کو سرکارِ اصفیہ حیدر آباد کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اُس نے اپنی دور میں نگاہ سے اس شدید کمی و نقصان کا احساس کیا، اور اس کی تدبیر یہ کی کہ صدر مہتمم کی حیثیت سے مولانا محمد رفیع کے لیے دو سو روپیے مامور کا وظیفہ، بخوارہ، مقرر کر دیا، تاکہ مولانا ڈابھیل سے قطع تعلق کر کے، طینان کے ساتھ مستقل دیوبند میں قیام کریں اور اپنے شب و روز کی قیمتی ساعتوں کو دارالعلوم کی ترقی اور اس کی اصلاح و فلاح کی کوششوں میں صرف کریں۔ ہماری رے میں دولتِ اصفیہ خلد امڈ ٹکنا کا یہ قدم نہایت مبارک و مسعود ہے جس سے دارالعلوم کے ساتھ اُس کی غایت شیعہ فکری اور عقیدہ مندی کا اظہار ہوتا ہے اور جس سے دشمنوں کے اُس پر مینگیٹھ کی واضح طور پر تردید ہو جاتی ہے جو انہوں نے اپنے ذاتی اغراض کے لیے یہ کہہ کر مشہور کر رکھا تھا کہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کی سیاسی سرگرمیوں کے باعث حیدر آباد کا ایک ہزار روپیہ مامور کا عطیہ بند ہونے والا ہے۔ ان خود غرضوں نے صرف یہاں تک کہنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے انہوں نے درپردہ اس کے لیے سرگرم کوششیں بھی کیں مگر محمّد کہ وہ سب ناکام رہیں۔ یہ عدد شود سبب خبر گزرا خواہد۔



دیوبند میں مولانا شبیر احمد عثمانی کا صدر مہتمم کی حیثیت سے مستقل قیام دارالعلوم کی جدید تاریخ میں بے شبہ ایک نئے باب کا آغاز ہے۔ ہمیں امید ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب اور مولانا شبیر احمد صاحب دونوں



بزرگوں کی متحدہ مساعی سے دارالعلوم اپنی مرکزیت کے شایان شان اسلام اور مسلمانوں کی مفید ترغیبات  
 بنام دینے میں کامیاب ثابت ہوگا۔ خدا کرے ہماری توقعات نقش بر آب ثابت نہ ہوں اور مسلمانوں کے  
 موجودہ دور تنزل میں ایک مرکزی دینی درسگاہ کو چلانے کے لیے جس بیدار مغزی، روشنیابی، عالی ہمتی،  
 وسعت نظر اور خلوص و لئیت کی ضرورت ہے۔ دارالعلوم اُن سے محروم نہ رہے۔ یہ دونوں حضرات اگر  
 کوشش کریں تو دارالعلوم دیوبند نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام برعظم ایشیا کی ایک واحد سلامی درسگاہ  
 بن سکتا ہے۔ تعلیمی اور فلاحی تربیت کے لحاظ سے چند در چند نقص میں جن کی طرف فوری توجہ کی ضرورت  
 ہے۔ نصاب تعلیم اور طرز تعلیم کی اصلاح کی ضرورت اب اس درجہ پرانی اور فرسودہ ہو چکی ہے کہ اس پر تفصیل  
 کے ساتھ گفتگو کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ ہر روشنیال عالم اس ضرورت کو بہتین طور پر محسوس  
 کر رہا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اب تک اس کی طرف عملی اقدام کسی نے بھی نہیں کیا۔ جس درسگاہ کو  
 مولانا حسین احمد ایسا سرفروش مجاہد صدر مدرس، اور مولانا شبیر احمد جیسو وسیع النظر، خوش تقریر اور ذی اثر  
 صدر مہتمم نے وہ بھی اگر مسلمانوں کی اجتماعی تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرنے میں ناکام رہے تو اس سے زیادہ مسلمانوں  
 کی ہمتی کیا ہو سکتی ہے؟



دارالعلوم دیوبند کے سلسلہ میں اس مسرت انگیز خبر کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ ابھی رمضان  
 سے قبل مولانا محمد طیب مہتمم دارالعلوم افغانستان تشریف لے گئے تھے وہاں دارالعلوم کے مہتمم کی  
 حیثیت سے اُن کی خاطر خواہ مدارات ہوئی۔ شاہ افغانستان نے اُن سے ملاقات کی۔ دارالعلوم دیوبند  
 کی مختلف عظیم الشان خدمات کا ذکر ہوتا رہا۔ اور ہمیں یہ ظاہر کرنے میں مسرت ہے کہ اسی سلسلہ میں ندوۃ  
 المصنفین کے قیام اور اُس کی خدمات کا بھی ذکر آیا جس پر شاہ و لا جاہ نے اپنی دھچپی کا اظہار فرمایا۔ اس کے  
 علاوہ وہاں کے بڑے بڑے وزراء اور اعیان نے اُن کے اعزاز میں دعوتیں کیں۔ اور پھر شاہ مدوح نے

اپنی عقیدت و اردت ظاہر کرنے کے لیے افغانستان کے راج لوقت سکھ کے چپاس ہزار روپیہ بھی دارالعلوم کو بہ طور عطیہ مرحمت فرمائے۔ ہم اس پر شاہ ممدوح کی خدمت میں ہدیہ تبریک و تهنیت پیش کرتے ہیں، اور اُمید کرتے ہیں کہ وہ آئندہ بھی مسلمانوں کی اس ستارِ گراںمایہ کو اسی طرح اپنی توجہاتِ ساریہ کا سزاوار سمجھتے رہیں گے۔

آج کل پنجاب سمیٹی میں پرلمنٹری تعلیم کے جبری نفاذ کا جوبل مٹھنے سے اُس نے مسلمانوں میں سخت اضطراب بھجان پیدا کر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں مخدوم تقیہ کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا، اور اس پر جبری اور مخلوط تعلیم کے حامیوں نے جو تقریریں کی ہیں وہ دو خباثت میں تفصیل کے ساتھ چکی ہیں: پنجب کے وزیر تعلیم نے کہا کہ قرآن کے دو ترجمے بھی ایک نہیں ہیں! ہم کس ترجمے میں شک دو ترجمے ایک نہیں ہیں! سنیں کیا قرآن مجید بھی ایک نہیں ہے۔ آپ سدا لل قرآن سے چلبستے ہیں یا کسی اور چیز سے؟ را ترجمہ کا اختلاف، تو یہ رشتہ ہو کہ کیا قانونی دفعات کی تشریح میں دو وکیلوں کا اختلاف نہیں ہوتا؟ پھر آپ اس اختلاف کی وجہ سے قانون کی اُس دفعہ کو ہی رد کیوں نہیں کر دیتے۔ بیگم شاہنواز نے کہا کہ اسلام میں پرہیزگار نہیں ہیں تعجب ہے کہ آپ نے صرف اسی قدر کہنے پر کیوں اکتفا کیا۔ یہ کیوں نہیں کہہ دیا کہ اسلام میں عورتوں کا آزادی کے ساتھ غیر مردوں کی مجلسوں میں شریک ہو کر بجا، نہ گفتگو کرنا، کلب میں برج اور کارڈس کھیلنا، ہاں روم میں رقص کرنا، مسنوناتی کی مراد کو منظر عام پر لانا، جذبہ نگاہ، دوس کا سامان بہم پہنچانا، بھی ممنوع ہیں ہے۔

محبت یہ کہ تہذیب و رنگ کی خیر، مگر چمکے مسلمانوں کی ذہنیت کو جس طرح مسخ کر دیا ہے اُس کے ہوتے ہوئے جو چہرہ بھی کہا جائے مگر بین میں ہیں خطا اُن غریبوں کی نہیں جنہوں نے رنگی تہذیب تمدن کے گہوارہ میں انکھ کھولی اور اسکی سی گود میں پرورش پائی، بلکہ دراصل قصور اُس کثرت کا ہے جس نے اپنے دونوں کی قوت کو ان لوگوں کو اپنا ٹھکانہ منتخب کر کے مجلس قانون سازی میں بھیجا، آج رُژن کو مسلم قوم کے نئے نئے مندوں کی شکایت ہے تو اس کی سب سے بڑی ذمہ داری خود انہی نے سر عائد ہوتی ہے۔ وہ تو جیسے کچھ ہیں پہلے سب کی نگاہیں تھے، آج ان کے سر پر پنی نماندگی

# حضرت نوحؑ اور طوفانِ نوحؑ

یہ ایک علمی و تاریخی مسئلہ ہے درجہ قرآن عزیز نے بھی نصیحت و عبرت و عظمت قدرتِ الہی کی شہادت میں اس کو پیش کیا ہے اس لیے یہ مذہبی بھی ہے۔ اور بلاشبہ قابلِ توجہ و دلالتِ انتفاع ہے۔ علماءِ یورپ نے بھی اس کے متعلق اپنی آراء کا اظہار کیا ہے اور قدیم و جدید علماءِ اسلام نے بھی اس پر بہت کچھ لکھا ہے اور غیر مسلم علماء کی آراء پر استدراک اور تنقید و تبصرہ بھی کیا ہے۔ حال کے اہل قلم علماء میں سے شیخ عبدالوہاب بخاری (مصر) نے اپنی جدید تصنیف "قصصُ انبیاء" میں اس پر ایک دھچکپ مضمون سپرد قلم کیا ہے۔ اس میں علمی و تاریخی دلائل و حقائق سے ثبات کیا ہے کہ قرآن عزیز نے اس واقعہ کے متعلق جس قدر نقل کیا ہے وہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ ورنہ جزئیات و قصے اس نے سکوت اختیار کیا ہے وہی غیر مستند و تخمینی ہیں۔ اس مقالہ کا آزاد

ترجمہ مع جدید اضافہ کے ہدیہ ناظرین ہے۔ محمد حفظ الرحمن

حضرت نوحؑ (علیہ السلام) حضرت آدمؑ (علیہ السلام) کے بعد پہلے نبی ہیں جن کو رسالت سے نوازا گیا۔ صحیح مسلم پہلے رسول ہیں

میں باب شفاعت میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے اس میں

مذکور ہے۔

يَا نُوحُ اَنْتَ اَوَّلُ الرُّسُلِ اِلَى الْاَرْضِ اِنَّ نُوْحًا قَدْ مَنَّا مِنْ كُلِّ رَسُوْلٍ يَنْبِئُ بِاَنْتَ اَوَّلُ الرُّسُلِ اِلَى الْاَرْضِ

یہ کتاب بہت دھچکپ ہے اور قرآن و احادیثِ صحیحہ سے ماخوذ اور مستند ہے۔ مفید علمی مباحث و آراء کے کتاب کو مفید تر بنادیا ہے۔ ادارہ سے اس کا آزاد ترجمہ جلد شائع ہونے والا ہے۔

لکھ جس نشان پر خدا کی "وحی" نازل ہوتی ہے وہ "نبی" ہے ماد جس کو جدید شریعت بھی عطا کی گئی ہو وہ رسول ہے۔



**نسب نامہ** | علم الانساب کے ماہر شیخ حضرت نوح کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے۔

نوح بن لامک بن متوشلح بن اخوخ رادرئیس علیہ السلام، بن یارد بن مہلیل بن قینان بن نوش بن ثبث رعلیہ السلام، بن آدم رعلیہ السلام،

رچہ مدغین اور تورات (مفرکوبین نے اسی کو صحیح مانا ہے لیکن ہم کو اس کی صحت میں شک ہے۔) مدغین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت آدم رعلیہ السلام، و حضرت نوح رعلیہ السلام کے درمیان انبیان کردہ سلسلوں سے زیادہ سلسلے ہیں۔ تورات میں خلق آدم علیہ السلام اور ولادت حضرت نوح علیہ السلام، نیز وفات آدم و ولادت نوح کی درمیان مدت کا جو تذکرہ ہے ہم اس کو بھی نقل کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ البتہ یہ بات پیش نظر رہے کہ تورات کے عبرانی، سامری، یونانی زبان کے نسخوں میں بہت زیادہ اختلاف ہے اور اس محبت پر سلامتی شیخ رستم اشہ ہندی (کیرنہ ضلع مظفرنگر) کی مشہور کتاب "اظهار حق" قابل ملاحظہ ہے۔ بہر حال تورات سے منقول نقشہ حسب ذیل ہے۔

سال	عمر بوقت پیدائش ابن	سال	عمر بوقت پیدائش ابن
۱۳۰	عمر آدم بوقت ولادت ثبث	۶۵	عمر اخوخ بوقت پیدائش متوشلح
۵	ثبث " نوش	۱۹۶	" متوشلح " لامک
۹۰	نوش " قینان	۹۳	" لامک " نوح
۷۰	قینان " مہلیل	۱۰۵۶	مدت درمیان خلق آدم و ولادت نوح
۶۵	مہلیل " یارد	۹۳۰	مجموعی عمر آدم علیہ السلام
۱۶۲	" یارد " اخوخ	۱۰۲۶	ما بین وفات آدم و ولادت نوح

**قرآن عزیز میں** | آک ۲ زیر یکے مجزنا شہ کل م کی سینت ہے کہ وہ تاریخی واقعات میں سے جب کسی واقعہ حضرت نوح کا تذکرہ کو بیان کرتا ہے تو اپنے اصل مقصد و حفاظت و تذکیر کے پیش نظر واقعہ کی اسی قدر جزئیات

کو نقل کرتا ہے جو مقصد کے لیے ضروری ہیں اور اجمال و تفصیل اور تکرار و عدم تکرار واقعہ میں بھی صرف ایک ہی مقصد اس کے سامنے ہوتا ہے اور وہ یہی موعظت و عبرت کا مقصد ہے۔ چنانچہ اسی اسلوب بیان کے مطابق قرآن عزیز نے حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ کا اجمالی و تفصیلی ذکر تین جگہ کیا ہے جس کا ثبوت مسطورہ ذیل جدول سے ہوتا ہے۔

سورہ	آیت	سورہ	آیت	سورہ	آیت
آل عمران	۲۳	مریم	۵۸	غافر	۳۱، ۴۵
النساء	۱۶۳	الانبیاء	۷۹	الشوریٰ	۱۳
انعام	۸۴	الحج	۴۲	ق	۱۳
اعراف	۶۹، ۵۹	المومنون	۲۳	الذاریات	۴۶
التوبہ	۷۰	الفرقان	۳۷	انجیم	۵۲
یونس	۷۱	الشعراء	۱۰۵-۱۰۶-۱۱۶	القمر	۹
ہود	۳۲، ۳۶، ۳۲، ۲۵	العنکبوت	۱۳	الحمد	۲۶
	۸۹، ۳۸، ۳۶، ۳۵	الاحزاب	۷۰	التحریم	۱۰
ابراہیم	۹	الصافات	۷۵-۷۹	نوح	۲۶، ۲۱، ۱
الاسراء	۱۷-۳	ص	۱۲		

لیکن اس واقعہ کی اہم تفصیلات صرف سورہ اعراف، ہود، مومنون، شعراء، قمر اور سورہ نوح میں ہی بیان ہوئی ہیں۔ ان سے حضرت نوح اور ان کی قوم کے متعلق جس قسم کی تاریخ بنتی ہے وہی ہمارا موضوع بیان ہے۔

قوم نوح | حضرت نوح کی بعثت سے پہلے تمام قوم خدا کی توحید اور صحیح مذہبی روشنی سے مکہرنا آشنا ہو چکی

حقّی و تحقیقی خدا کی جگہ خود ساختہ بتوں نے لے لی تھی غیر اللہ کی پرستش اور اصنام پرستی ان کا شعار تھا۔

دعوت و تبلیغ اور خرسنت اللہ کے مطابق اُن کے رشد و ہدایت کے لیے بھی اُن ہی میں سے قوم کی نسرانی ایک ایسی اور خدا کے بچے رسول نوح علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا۔

حضرت نوح نے بنی قوم کو رہ حق کی طرف بکارا اور سچے مذہب کی دعوت دی لیکن قوم نے نہ مانا و بغزت و حقارت کے ساتھ انکار پر اصرار کیا۔ مگر اور دسار قوم نے اُن کی تکذیب و تحقیر کا کوئی ہیلو نہ چھوڑا۔ وہ اُن کے پیروں نے اُن ہی کی تقلید و پیروی کے ثبوت میں ہر قسم کی تزیل و توہین کے طریقوں و حضرت نوح پر تازیانیوں نے اس پر تعجب کا ظہر کیا کہ جس کو نہ ہم پر دولت و ثروت میں برتری حاصل ہے نہ وہ ان نسبت کے رتبہ سے بلند ذلت و سبک ہے اُس کو کیا حق پرستوں کا چہرہ نہ دیکھیں گے۔

نایب و مہر و زور و اثر و قوت کو اب حضرت نوح علیہ السلام کا تابع اور پیروں دیکھتے تو مغرورانہ انداز میں حقارت سے کہتے کہ ہم اس کی طرح نہیں ہیں۔ تیرے تابع دامن بن جائیں ورتجھ کو اپنا مقتدا مان لیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ کمزور اور پست لوگ نوح (علیہ السلام) کے مذہب سے مقلد ہیں نہ یہ ذی رتے ہیں کہ مضبوطی رائے سے ہر سی طرح کام لے کر نہ دیں۔ حق میں یہ حقیقت حال کو سمجھ لیتے۔ وہ اگر حضرت نوح اُن بات کی رت بھی توجہ بھی کہتے تو اُن سے صراحت کرتے کہ پہلے ن پست اور غریب افراد قوم کو اپنے دین سے نکال دے کیونکہ ان سے گھن آتی ہے اور ہم اور یہ ایک جگہ نہیں بیٹھ سکتے۔

حضرت نوح اس کا ایک ہی جواب دیتے کہ ابابھی نہ ہو گا کیونکہ یہ خدا کے مخلص بندے ہیں۔ میں ان سے رت خدا کا بندہ کر دوں میں کے تم خوشنمند ہو تو خدا کے عذاب سے میرے لیے کوئی جالے پناہ نہیں ہے میں اس کے دناک مذہب سے ڈرتا ہوں۔ اُس کے پناہ خلاص کی تدریس ہے۔ میرا غریب کا دباں کوئی سوں نہیں ہے۔ یہ ارشاد ذلت کہ میں تمہارے پاس خدا کی ہدایت کا پیغام لے کر آیا



ہوں نہ میں نے غیب دانی کا دعویٰ کیا ہے اور نہ فرشتہ ہونے کا خدا کا برگزیدہ پیغمبر اور رسول ہوں، اور دعوت  
 وارشاد میرا مقصد و نصب العین ہے۔ اس کو سسرایہ دارانہ بلند می، غیب دانی، یا فرشتہ پیکل ہونے  
 سے کیا واسطہ؟ یہ کمزور اور نادار افراد قوم جو خدا پرچے دل سے ایمان لائے ہیں تمہاری نگاہ میں اس سے  
 حقیر و ذلیل ہیں کہ وہ تمہاری طرح صاحب دولت و مال نہیں ہیں اور جب ان کا یہ حال ہے تو تمہارے  
 خیال میں یہ نہ خیر حاصل کر سکتے ہیں اور نہ سعادت کیونکہ یہ دونوں چیزیں دولت و شہرت کے ساتھ ہیں  
 نہ کہ نکبت و افلاس کے ساتھ سو واضح رہے کہ خدا کی سعادت و خیر کا قانون ظاہری دولت و شہرت کے  
 تابع نہیں ہے اور اس کے یہاں سعادت و ہدایت کا حصول و ادراک نہ یہ کی رونق کے زیر اثر نہیں ہے  
 بلکہ ہمارے نفس، رضا و الہی، غنا و قلب، اور انفرادی نیت و عمل پر موقوف ہے۔

حضرت نوح نے یہ بھی بار بار تنبیہ کی کہ مجھ کو اپنی اس ابداری و نعت و ربانی ہدایت میں نہ  
 تمہارے مال کی خواہش ہے نہ جاہ و منصب کی۔ میں اجرت کا سبب نہ بنیں ہوں، اس خدمت کا حقیقی  
 اجر و ثواب تو اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اور وہی بہترین قدر دان ہے۔ غرض سورہ ہود حق و تبلیغ  
 کے ان تمام مکالموں، مناظروں اور پیغامات حق کے اس قسم کے ارشادات کا ایک غیر فانی ذخیرہ ہے۔

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ اس پر قوم کے اُن سرداروں نے جنہوں نے کفر کا راہ

مَا نَزَّلَكَ إِلَّا بَشَرًا مِثْلَنَا وَمَا نَزَّلَكَ اختیار کی تھی کہا ہم تو تم میں سے کے سوا کوئی آدمی

اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَادُوا لَنَا بِكَ نہیں دیکھے کہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو اور جو

الرَّايِ وَمَا نَزَّلَكَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ لوگ تمہارے پیچھے چلے ہیں اُن میں بھی ان لوگوں کے

فَضْلٍ بَلْ نَطْغَمُكُمْ كَيْدًا بَيْنًا ۝ فَتَانَ سو کوئی دکھائی نہیں دیتا جو ہم میں ذلیل و حقیر میں

يَقَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ اور بے سوچے سمجھے تمہارے پیچھے چلے ہیں ہم تو تم

مِنْ رَبِّي وَأَسْتَفِي رَحْمَةً مِنْ عِنْدِهِ لوگوں میں اپنے سے کوئی برتری نہیں پاتے بلکہ سمجھتے



بہر حال حضرت نوحؑ نے انتہائی کوشش کی کہ بد بخت قوم سمجھ جائے اور رحمت الہی کی آغوش میں آجائے مگر قوم نے نہ مانا و جس قدر اس جانب سے تبلیغ حق میں جدوجہد ہوئی اسی قدر قوم کی جانب سے بغض و عناد میں سرگرمی کا اظہار ہوا۔ اور ایذا رسانی، و تکلیف دہی کے تمام وسائل کا استعمال کیا گیا اور ان کے بڑوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ ہم کسی طرح دد، سواع، یغوث، یعوق اور نسر جیسے بتوں کی پرستش ترک نہیں کر سکتے۔ اور اب تو ہم سے جنگ و جدل کو چھوڑ کر ہمارے مذمت پر اپنے خدا کا جو عذاب لاسکتا ہے وہ لے آ۔

حضرت نوحؑ علیہ السلام نے جواب دیا کہ عذاب الہی میرے قبضہ میں نہیں ہے وہ تو اسی کے قبضہ میں ہے جس نے مجھ کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ وہ چاہیگا تو یہ سب کچھ بھی ہو جائیگا۔ اسی قسم کے تمام مباحث ہیں جن کو سورہ نوح میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور جو بڑے شبہ و تردید و ضلالت کے مہم سائل کو شکار کرتے ہیں۔

بہر حال جب قوم کی ہدایت سے حضرت نوحؑ علیہ السلام بالکل مایوس ہو گئے اور ان کی تہمت و سرکشی، باطل کوشی اور عناد و ہٹ دھرمی ان پر واضح ہو گئی اور انہوں نے قرآنی تصریح کے مطابق ساڑھ نو سو سال کی پیہم دعوت و تبلیغ کا ان پر کوئی اثر نہ دیکھا تو خدا نے تعالیٰ نے ان سے فرمایا۔

واضحی الی نوح انہ لن یؤمن من اور نوح پر وحی کی گئی کہ جو ایمان لے آئے وہ لے

قومك الا من قد امن فلا یفتش آئے اب ان میں سے کوئی ایمان لاسنے والا نہیں ہے

بما کانوا یفعلون . (ہود) پس انکی حرکات پر غم دکر۔

جب حضرت نوحؑ کو یہ معلوم ہو گیا کہ ان کے ابلاغ حق میں کوئی کوتاہی نہیں ہے بلکہ خود نہ ماننے والوں کی استعداد کا تصور ہے، اور ان کی اپنی تہمت و سرکشی کا نتیجہ تب ان کے اعمال و رکبہ حرکات سے متاثر ہو کر اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں یہ دعا فرمائی ا۔



رب ۛ تذہر علی الامراض من ۛے پروردگار تو کا فردوس میں سے کسی کو بھی نہیں پر  
 الکفرین دیارا، انک ان تذہرہم ۛاتی نہ چھوڑ۔ اگر تو ان کو یہ نہی چھوڑ دے گا تو یہ تیرے  
 مضلوا عبادک و ۛیلدوا الافلجا ۛندوں کو بھی مراء کریئے اور ان کی نسل بھی ان  
 کھٹارا (نوح) ۛی کی طرح نافرمان پیدا ہوگی۔

**بنائے سفینہ** اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کی دعا قبول فرمائی اور اپنے قانون "پاداشِ عمل" کے مطابق سرکشوں  
 کی سرکشی اور تمردوں کے ثمر کی سزا کا عدل کر دیا اور حفیظ، قہدم کے لیے پیسے حضرت نوحؑ علیہ السلام کو  
 ہدیت فرمائی کہ وہ ایک کشتی تیار کریں۔ تاکہ سب نافرمانی کے اعتبار سے ان کو درمومنین قانتین کو اس  
 عذاب سے نجات دے۔ جو وہ کشتی پر نازل ہونے والے ہیں۔ حضرت نوحؑ نے جب حکم رب میں  
 کشتی بنانی شروع کی تو کھارے مہنسی و مذاق بنانا شروع کر دیا اور جب اُدھر سے گذر ہوتا تو کہتے کہ خوب  
 جب مہنہ غرق ہونے لگیں گے تو تو اور تیرے پر داس کشتی میں محفوظ رہ کر نجات پا جائیگے، ایسا حقاہ خیال  
 ہے۔ حضرت نوحؑ علیہ السلام بھی ان کے اپنے انجام پر غفلت و رخسہ کی نافرمانی پر جرات دیکھ کر ان کو  
 ان ہی کے طرز پر جواب دیتے اور اپنے کام میں مشغول رہتے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی ان کو حقیقت  
 سے آگاہ کر دیا تھا۔

واصنع الفلک باعیننا ووحینا ۛے نوح و ہماری خاطر میں ہماری وحی کے مطابق  
 وارتقا طینی فی الذین ظلموا سفید تیار کیے جا و راب محمد سے ان کے متعلق کچھ ذکر  
 انہم مغفون (ہود) یہ در مشہور ہونے والے ہیں۔

حضرت نوحؑ علیہ السلام بن کرتیار ہو گیا۔ سب خدا کے وعدہ عذاب کا فت قریب آیا اور حضرت  
 نوحؑ نے اس پہلی عداوت کو انہی مس کا ذکر اس سے کیا گیا تھا۔ یعنی ان کے تنور میں سے پانی کا چشمہ اُبلنا  
 شروع ہو گیا، تب وحی ہی نے ان کو حکم سب کشتی میں اپنے خاندان کو بیٹھنے کا حکم دیا اور تمام جانداروں

میں سے ہر ایک کا ایک جوڑا بھی کشتی میں پناہ گیر ہو۔ اور وہ مختصر جماعت (تقریباً چالیس نفر) بھی جو منجھ پرایان لاپکلی ہے کشتی میں سوار ہو جائے۔

جب وحی الہی کی تعمیل پوری ہو گئی تو اب آسمان کو حکم ہوا کہ پانی برساتا شروع ہو اور زمین کے چشموں کو امر کیا گیا کہ وہ دہل پڑیں۔

خدا کے حکم سے جب یہ سب کچھ ہوا، بات کو نشی بھی اس کی خاطر میں پانی پر ایک مدت تک محفوظ مقرر رہی تا آنکہ ہم ساکنان زمین غرقِ آب ہو گئے۔

پسیر نوح | اس مقام پر ایک مسئلہ خاص طور پر قابلِ توجہ ہے دو یہ کہ حضرت نوح علیہ السلام ہنہ طوفانی خذاب کے وقت خدائے تعالیٰ سے پنہ بیٹے کی نجات کے متعلق سفارش کی اور خدائے تعالیٰ نے ان کو اس سفارش سے روک دیا۔ اس مسئلہ کی ہیئت قرآن عزیز کی حسب ذیل آیات سے پیدا ہوتی ہے۔

وَنَادَىٰ نُوحٌ رَّبَّهُ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ  
 وَرَنُوحَ نَعْنِي اِسْتِثْبَاتِ رَبُّكَ كُنْجَااا وِرِكَمَا اسْتِثْبَاتِ رَبُّكَ كُنْجَااا

ابنی من اہلی وان وعدہ الحق بیابیرے اہل ہی میں سے ہے دیرتر وعدہ چاہے در

**وَأَنْتَ أَحْكَمُ الْحَاكِمِينَ قُلْ يُنَوِّج** تو بہترین حاکموں میں سے ہے۔ مہرتوں نے کہا اے نوح

انہا لیس من اہلک انہ عمل یتیرے اہل میں سے نہیں ہے یہ بدکردار ہے بس سمجھ کر ایسا

غیر صالح فلا تسکن مالیہ سوال نہ کرنا چاہئے جس کے بار میں تجھ کو علم نہ ہو میں بلاشبہ

لَا يَمْلِكُ لَكُمْ عِلْمُ الثَّاقِبِ إِلَّا تَكُونُ      تجھ کو نصیحت کرتا ہوں کہ تو، دنوں میں سے نہیں، اوجھنے

من الجاهلینۃ قال رب انی کہ: اے رب میں جڑ تو اس بارہ میں کہ جس سے متعلق مجھے

اعوذ بک ان استکمالیس فیہ علم ط علم نہ ہو میں تجھ سے سواں کروں تیری بنا دیا کتابوں۔ در

[illegible]

الخاسرين قبل يانوح اعطى بسلاً  
 "اور میں جو کچھ نوح سے کہہ دیا تھا" اے لوح ہادی جانب سے

منا وبرکت علیکم وعلی اہل من معکم (ہود)





سستیات بھی ہیں۔ اور اس کے بعد۔ ”من آمن“ است تصریح کر دی کہ وعدہ نجات فقط مومنین کے ساتھ مخصوص ہو گا۔  
حضرت نوح علیہ السلام نے یہ بھی کہ انجام کار ان کی جوسی کے علاوہ ان کا تمام خاندان نجات پا جائیگا۔ ”والا من سبق علیہ التوبہ“  
کا مصداق صرف انکی البیہ ہی ہوگی۔ یہ سوچڑ انھوں نے درگاوالہنی میں ”کنعان“ کی نجات کی دعا کی۔ مگر شہر تانی کو اپنے  
جلیل قدر پیغمبر کا یہ قیاس ”پسند نہ آیا اور ان کو تنبیہ کی کہ جو بستی خدا کی ”وحی“ سے مستفیض ہوتی رہتی ہو وہ بندہ بہت  
پدری میں اس قدر سرشار ہو جائے کہ ”وحی الہی“ کے انتظار کے بغیر خود ہی قیاس رانی کر کے انجام کار تک کا فیصلہ  
کر لے لے لاکہ وعدہ نجات صرف مومنین کے لئے مخصوص ہے اور ”کنعان“ کافروں کے ساتھ کافر ہی رہے گا تو پھر  
تمہارا اس قسم کا سوال منصب رسالت و نبوت کے شایان شان نہیں ہے۔

گویا حضرت نوح سے عدلے تعالیٰ کا یہ خطاب درجہ ”غائب“ نہیں تھا بلکہ شاید حقیقت کیسے یک پکار تھی جس کو  
انھوں نے سنا اور اپنی بشریت و عہدیت کے اختراں کے ساتھ ساتھ مغفرت کے طاب ہونے اور خدا کی سلامتی اور  
برکت حاصل کر کے شاد کام و ابرار بنے پس یہ سوال نہ معصیت کا سوال تھا اور نہ عصمت انبیاء کے منافی اس لئے خطاب الہی  
نے ”س کو“ نادانی سے تیسرے کیا نہ کہ گناہ اور نافرمانی سے۔

بہر حال حضرت نوح کے سامنے یہ حقیقت آشکارا ہو گئی کہ وعدہ نجات کا شمار ”نسل و خاندان“ نہیں ہے بلکہ  
”ایمان باللہ“ ہے۔ اس سے اب انھوں نے اپنا رخ بدل کر کنعان کو مخاطب کیا اور اپنا منصب دعوت ادا کرتے ہوئے  
اس سے چاہا کہ وہ بھی ”مومن“ بن کر ”نجات الہی“ سے مستفیض ہو۔ مگر اس بد بخت نے جواب دیا۔

قال ساوی الی جبل یعمنی من الماء  
(مرد) کہا میں بہت جلد کسی پہاڑ کی بنادیتا ہوں کہ وہ مجھ کو ناقبہ کی بجائیگا

حضرت نوح نے یہ سن کر فرمایا۔

قال لا عاصم الیوم الا من حمل حال  
(مرد) کہا کوئی بچاؤ نہیں ہو سکتا جس پر خدا کا رحم ہو جائے

بینہما الموح فکان من المفترقین  
(مرد) درمیان میں دو دونوں کے درمیان کج حامل ہوئی اور وہ غرق ہوئے

کوہ جودی | عرض جب حکم الہی سے مذاب ختم ہوا تو سفید نوح ”جودی“ پر جا کر ٹھہر گیا۔

وَقَصَى الْأَمْرَ وَأَسَمَتِ عَلَى الْجَوْدَى  
یَقُومُ بِأَمْرِ دَوْلَتِ خُودِیٰ پَر بَاغِیْرِیٰ اَوْر اَعْلَن کَر دِیَا

وَقِيلَ لَعَنَّا الطَّغْيٰیۙنَ ۚ  
 گیارہویں غلامین کے لئے لعنت ہے۔

تو یہ میں جو دی کہ رط کے پہاڑوں میں سے بنایا گیا ہے دراصل حقیقت جزیرہ کا نام ہے یعنی اس علاقہ کا نام جو فرات و دجلہ کے درمیان دیا رہا کہ بتواتر تک مسلسل چلا گیا ہے۔

پانی بہت بہت خشک ہوا، شرٹ بیگیا، درسا کمان کٹی نے دوسری بار من و سلامتی کے ساتھ خدا کی سزائیں پر قدم رکھا۔ اسی بنا پر حضرت نوح علیہ السلام کو ابو بشر ثانی، یا آدم ثانی، یعنی انسانوں کا دوسرا باپ، لقب مشہور ہوا۔

اگرچہ یہاں پنچہ واقعہ کی تفصیلات ختم ہو جاتی ہیں تاہم اس ہم واقعہ میں جو علمی اور تاریخی سوالات پیدا ہوئے ہیں یا پیر کے گتے میں وہ بھی تہہ بل ذکر و مذاکرہ ہیں جو ترتیب وار درج ذیل ہیں۔

۱۱۔ طوفانِ نوح مام تھایا خاص | یک طوفانِ نوح تمام کر، ارضی پر آیا تھایا کسی خاص خطہ پر؟

س کے متعلق مہر قدیم دج پر میں ہمیشہ سے اور اسے یہی میں علماء اسلام میں سے ایک جماعت علماء یہود و نصاریٰ  
اور بعض بہین علوم فکیات، جہانات اور جس اور تاریخ جمعی کی یہ اسے ہے کہ یہ طوفان تمام کرد، رضی پر نہیں آیا تھا بلکہ  
صرف فی خطہ میں نمود و تہی جہاں حضرت نوح کی قوم آباد تھی اور یہ علاقہ مساحت کے اعتبار سے کچھ کم چالیس ہزار مربع کلومیٹر ہوتا ہے۔  
ن کے نزدیک طوفان نوح کے خاص ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اگر یہ طوفان تمام تھا تو اس کے آثار کروا رسی کہ مختلف  
نہوں در پہاڑوں کی چوٹیوں پر مٹنے چاہیں تھے نہ لاکھ ایسا نہیں ہے نیز اس زمانہ میں انسانی آبادی بہت ہی محدود  
تھی اور اس کا رقبہ صرف وہی تھا جہاں حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم آباد تھی۔ ابھی حضرت آدم علیہ السلام کی  
ن کا سلسلہ اس سے زیادہ وسیع نہ ہوا تھا جو اس علاقہ میں آباد تھا۔ لہذا وہی مستحق عذاب الہی تھے اور ان ہی پر طوفان  
کا یہ عذاب بھیجا گیا۔ باقی کرو زمین کو اس سے کوئی سزا نہ تھا۔

اور بعض ملہ عدم۔ دراہرین جنات لہ فیض و تاریخ بھی کے نزدیک یہ خوفان تمام کرہ رضی پر حاوی تھا اور  
 ایک ہی نہیں بلکہ ان کے خیال میں اس میں پر متعدد ایسے خوفان آئے ہیں اور ان میں سے ایک یہ بھی تھا۔ وہ پہلی رائے

کے تسلیم کرنے والوں کو "انمار" کے متعلق یہ جواب دیتے ہیں کہ "جزیرہ" یا عراق عرب کی اس سرزمین کے ساتھ بلند پہاڑوں پر ایسے حیوانات کے ڈھانچے اور ہڈیاں بکثرت پائی گئی ہیں جن کے متعلق ماہرین طب بلقعات الارض کی یہ رائے ہے کہ یہ حیوانات مانی ہیں اور صرف پانی ہی میں زندہ رہ سکتے ہیں۔ پانی سے باہر ایک لمحہ بھی ان کی زندگی دشوار ہے۔ اس لئے کہ ارض کے مختلف پہاڑوں کی ان بند چوٹیوں پر ان کا ثبوت اس کی دلیل ہے کہ کسی زمانہ میں پانی کا ایک ہیبت ناک طوفان آیا جس نے پہاڑوں کی ان چوٹیوں کو بھی اپنی غرقابی سے نہ چھوڑا۔

مگر ان ہر دو خیالات دائرہ کی ان تمام تفصیلات کے بعد جن کا مختصر خاکہ مضمون زیر بحث میں درج ہے بل تحقیق کی یہ رائے ہے کہ صحیح مسلک یہی ہے کہ یہ طوفان خاص تھا۔ عام نہ تھا۔

مگر قرآن عزیز نے سنت اللہ کے مطابق صرف ان ہی تفصیلات پر توجہ کی جو غفلت و جہت کے لئے فوری تھے۔ درباقی مباحث سے قطعاً کوئی تعرض نہیں کیا۔ اور ان کو انسانی علوم کی ترقی کے حوالہ کر دیا۔ وہ تو صرف یہ بتانا چاہتا ہے کہ تاریخ کا یہ واقعہ اہل عقل و شعور کو فراموش نہ کرنا چاہئے کہ آج سے ہزاروں سال قبل ایک قوم نے خدا کی نافرمانی پر اصرار کیا اور اُس کے بھیجے ہوئے بادی حضرت نوح علیہ السلام کے رشد و ہدایت کے پیغام کو جھٹلایا، ٹھکرایا، اور قبول کرنے سے انکار کر دیا تو خدا نے تعالیٰ نے اپنی قدرت کا دکھانا مظاہرہ کیا اور ایسے سرکشوں اور منمردوں کو طوفانِ بادل و باران میں غرق کر کے تباہ و برباد کر دیا اور اسی حالت میں حضرت نوح اور مختصر سی ایماندار جماعت کو محفوظ رکھ کر نجات دی۔ ان فی ذلک لعلوۃ لا ولی الا بصار

(۲) پسرِ نوح کی نسیب بحث | بعض علماء نے حضرت نوح کے اس بیٹے کے متعلق یہ کہا ہے کہ یہ حقیقی بیٹا نہ تھا، اور پھر دورائے جدا جدا ہیں۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ وہ "ربیب" تھا یعنی حضرت نوح کی بیوی کے پہلے شوہر کا لڑکا تھا جو حضرت نوح سے نکاح کے بعد ان کی آغوش میں پلا بڑھا۔ اور دوسری جماعت حضرت نوح کی اس کافر بیوی پر خیانتِ عصمت کا الزام لگاتی ہے۔

ان علماء کو ان غیر مستند اور دور از صواب تاویلوں کی ضرورت اس لئے پیش آئی ہے کہ ان کے خیال میں



پنمبر کا بیٹا کا فریو یہ بہت مستعد اور عجیب معلوم ہوتا ہے۔

گر تعجب ہے کہ وہ اس عشقِ قرانی کو کیوں فراموش کر جاتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کے باپ "ذر" بہت تراش و بُت پرست کا فرزند تھے۔ پس اگر ایک حلیل اللہ پنمبر کے باپ کے کفر سے رسولِ خدا کی ہدایت و عظمت اور منصبِ رسالت و نبوت میں مطلق فرق نہیں آتا تو پھر عظیم المرتبت رسولِ دینی کے بیٹے کے کفر سے اس پنمبر کی عظمت و جلالتِ قدر میں کیا نقص آ سکتا ہے کہ یہ ایک حقیقت نگاہ اور حقیقت شناس کے نزدیک تو یہ رب العالمین اور خالق کائنات کی قدرتِ کاملہ کا منظرِ اتم ہے کہ وہ بنجر زمین میں گلاب اگا دیتا، اور گلاب کے جھکے ہوئے پھولوں کے ساتھ خار پیدا کر دیتا ہے۔ قہرِ یک اللہ احسن الخالقین۔

پس جبہ قرآن عزیز نے یہ تصریح کی ہے کہ "کنھن" حضرت نوح کا بیٹا تھا تو بلا وجہ ان کا ایک درجہ بلند اور ایلات کی کیا حاجت۔

**ایک اخلاقی مسئلہ** | میں مقام پر اگرچہ مذکور بعد الوہاب نے قرآن عزیز کی تصریح ہی کو تسلیم کیسے تاہم ان کے نزدیک حضرت نوح کی بیوی بصرحت قرآن گنہگار ہو سکتی ہے تو اس پر نیا نیا عصمت کا الزام مائد کرنا بھی کوئی نا واجب بات نہیں ہے۔

مگر یہ کہ ان جیسے تمام مقامات میں ن بزرگوں سے بیشر سخاوت رہتا ہے اور میں درط حیرت و تعجب میں پڑ جاتا ہوں کہ ان میں سے کرم کے پیش نظر دینی و رسول کے معاملہ میں ن ہم نزاکتوں کا لیاؤ کیوں نہیں ہوتا جو ان اخلاق و معاشرہ اور تہذیب و تمدن کی زندگی سے وابستہ ہیں۔

مثلاً اسی مقام کو بیٹے کہ صاحبِ قصص اور بیبا اور بعض دوسرے علماء کے نزدیک حضرت نوح کی بیوی جب گنہگار ہو سکتی ہے تو حانِ عصمت کیوں نہیں ہو سکتی اسلئے کہ دوسرا عمل پہلے سے کم درجہ رکھتا ہے؟

جواب یہ کہ اس کا تسلیم کر لینے کے بعد کہ غرضانہت بہت زیادہ ہے۔ در قبیح عمل ہے مجھے اس سے سخت اختلاف ہے کہ کسی پنمبر دینی کی بیوی ان کے جبارِ مقدسین بہت ہوتے نہ ان عصمت ہو اور دینی و رسول اس کی اس حرکت سے

نافل ہے۔ اس لئے کہ اگر کسی نیک اور صالح انسان کی بیوی شوہر سے چھپ کر اس قسم کی بد عملی میں مبتلا ہو جائے تو یہ ممکن ہے کہ نوکروں، واقف رہ سکتا ہے اور جب تک اس سے علم میں یہ بد عملی نہ آئے اس کی شناخت و تقویٰ پر مصلحت کوئی حرف نہیں آتا۔

مگر ایک نبی و رسول کا معاملہ اس سے جدا ہے اس کے پاس صبح و شام خدا کے برتر کی وحی آتی جو وہ خدا کے برتر کی ہیکلائی سے مشرف ہوتا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ نبی کے گھر میں ایک فاحشہ و زانیہ اس کی رفیق حیات بھی رہے اور خدا کی وحی اس سے قطعاً خاموش ہو۔

خدا کے برگزیدہ پیغمبر جب شد و ہدایت کے لئے بھیجے جاتے ہیں تو ظاہری دہائی ہر قسم کے عیوب سے معصوم و پاک رکھے جاتے ہیں کہ کوئی ایک شخص بھی ان کے حسب نسب، خلاق و مشرت پر کلمہ چینی نہ کر سکے۔ لہذا یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ وحی اپنی اور ہیکلائی بہ اکبر کے مدعی کے گھر میں بد خلاق کا جریہ مشتعل ہو رہا ہو اور اس کو بخیر اور خافل چھوڑ دیا جائے۔

ہمارے سامنے "عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا" کا واقعہ دلیل رہا ہے۔ ان ہوائی کو ہوائی کرنے والوں اور بے پرکی اڑانے والوں نے کیا کچھ نہیں کیا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سمع مبارک نے بھی سنا، چند روز بذلت و خوش بخت بننے والوں کے لئے آزمائش کے بھی ملے۔ مگر آخر کار وحی اپنی نے مہار کو ایسا صفت کر دیا کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو کر رہ گیا۔

مکفر، ایک عقیدہ ہے جو بد مشرب سے بڑا جریہ گردہ سب کے سامنے وضع ہوا ہے، پوشیدہ نہیں ہوتا۔ اب یہ امر جدا ہے کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کے متوسط دور سے شرک و اسلام کے درمیان رشتہ مناکحت و قطعی حرام قرار دے دیا گیا۔ ورنہ مصلحت اپنی نے اس سے قبل، ہماری سابقین کی شریعت میں اور خود شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی دور میں اس کو ممنوع نہیں قرار دیا تھا۔ سو اس معاملہ میں مکفر و زنا کے مقابل کا سوال صحیح نہیں ہو سکتا، بلکہ معاشرتی بد کرداری و نیک کرداری کی

بقہ و قیام کا سواں پیر ہوتا ہے۔ درمیرے نزدیک بنی و بنیہ کی زندگی پس کے ساتھ ایسی رفیقہ کا تعلق بھی ناممکن ہے۔ گزر مر، تاج، یک مرتبہ یہ قدم کرتی تو دھجی جی فوج بنی کو مطلع کر کے تفریق کر دیتی۔ یا کم زکم تو بہ نصیرؒ پر جا کر مدد ٹھیکر، میں تو اس سے آگے بڑھ کر یہ جرات کرتا ہوں کہ اگر خدا نہ کر دے کسی روایت میں بھی اس قسم کے معاملات کا تیار دیا جائے، تو بھی ہمارا فرض تھا کہ اس کی صحیح توجیہ تلاش کر کے اصل حقیقت کو سامنے لائیں۔ یہ جیکندہ قرین غریب اس کے متعلق کچھ کہتا ہے، ورنہ صحیح و ضعیف روایات میں سے کوئی روایت حدیث و سیرت اس کا ذکر کرتی ہے تو خود بخود اس قسم کی دور زکار روایات سے غوام و متوسطین بکرہ بدیر الیہاں نوجوانوں کے دل و دماغ پر منہ نقوش نقش کرنے سے بھر بھرت و نقصان کے دیکھا جاتا ہے۔

بہر حال صحیح یہی ہے کہ کنعان پر حضرت نوحؑ کی ہدایت و رشد کی جگہ اپنی کافر دائرہ کی غوش و بھیت و خاندان و قوم کے حوالے سے بڑا بڑا دور و دہنی کا بیٹا ہونے کے باوجود کافر ہی رہا۔

پس نوحؑ بابران بنشت

خاندان بنو تنگم شد

بنی و بنیہ کا کام، شد و بدیت کا پیغام پہنچانا ہے اور وہ، ایہ خاندان اقبیلہ و قوم پر اس کو زبردستی مار کرنا و ان کے قلوب کو چٹ دینا نہیں ہے۔

لست علیہم بمصیطر (ناشر) تو ان (کافروں) پر مسلط نہیں کیا گیا

وہما انت علیہم مجار (ق) اور تو ان کو دہوں حق کے لئے مجبور نہیں کر سکتا

بہرے حضرت نوحؑ کے اس سبب کا نام کنعان تحریر کیا ہے یہ تو راوی کی روایت کے مطابق ہے۔ قرآن

غریب اس کے نام کی مرحمت سے نکت ہے جو نفس و قہ کے لئے غیر ضروری تھا۔ (باقی)



# معادہ یہودی علی نقطہ نظر سے

جناب شمس العلماء پروفیسر مولانا عبدالرحمن صاحب

(۲)

یہاں تک ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس بنا پر لکھا ہے کہ نامہ زیر بحث واقعی ایک عہد نامہ ہے اور یہ طریقہ ہم نے محض اتمام حجت کے لیے اختیار کیا ہے۔ در نہ حقیقت یہ ہے کہ نامہ زیر بحث سرے سے عہد نامہ ہی نہیں بلکہ ایک دستور العمل ہے جو بارگاہ رسالت سے صادر ہوا جسے حضرت نے تمام مدینہ والوں، ہاجر و انصار، یہود و مشرکین کے لیے لکھوایا (یہ مکتوب کو آج کل کی اصطلاح میں اعلان سلطانی یا رائل کیونکہ رائل پر کلیمیشن کہا جاسکتا ہے) اور اس کے ذریعہ اپنے پرانے دونوں کو بتایا کہ انہیں کیا کرنا چاہیے اور اگر وہ ایسا کر سکیں گے تو ان کے ساتھ کیا کیا جائیگا۔ اس دعوے کی دلیل کیا ہے، اب وہ سنئے۔

کتاب کا لفظ عربی زبان میں بہت عام ہے اور ابتدائے اسلام میں عام تر تھا۔ اس لیے لفظ کتاب سے ہر جگہ معاہدہ مراد لے لینا صحیح نہیں۔ یہی حال صحیفہ کا سمجھیے۔ ابتداء اسلام میں ہر قسم کی تحریر کو کتاب کہہ دیتے تھے۔ یہ تعین قرینہ سے ہوتا تھا کہ وہ کتاب (یا صحیفہ) کوئی حکم و فرمان ہے یا عہد نامہ۔ وصیت ہے یا وکالت نامہ یا کچھ اور۔ یہاں نامہ زیر بحث میں وہ قرائن موجود ہیں جن کی بنا پر اس کو عہد نامہ نہیں کہا جاسکتا اور نہیں کہنا چاہیے تھا۔ مگر اس باب میں تسامح ہوتا چلا آتا ہے۔ اور نہ صرف اسی نامہ نبوی کے متعلق بلکہ اور رقائم و کرائم کی بابت بھی۔

ابو عبید قاسم بن سلام کا علمی مرتبہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں۔ آپ نے اپنی کتاب ”کتاب الاموال“

میں ایک باب معاہدات نبوی کے لیے خاص کیا ہے، اور اس میں کئی مکتوب رسول اللہ کے جوہرگز  
عہد نامے ہیں معاہدات کے ذیل میں کچھ یہ ہیں اور وہ معاہدات میں شمار ہوتے چلے آئے ہیں مثلاً  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مکتوب ذرعة کے نام ہے

"اما بعد فان محمد النبي (صلى الله عليه وسلم) ارسل الى ذرعة ذي يزن - اذا اتاكم  
رشي وافي امركم بهم خيرا - معاذ بن جبل وعبد الله بن رواحة ومالك  
بن عداة وعتبة بن نيار ومالك بن مرارة واصحابهم فاجمعوا ما كان  
عندكم من الصدقة والحزبة فابلغوها رسول الله وان اميرهم معاذ بن  
جبل ولا يتقلبن من عندكم لاراضين - اما بعد فان محمد يشهد ان  
لا اله الا الله وان محمد عبده ورسوله وان مالك بن مرارة الرهاوي حدثني  
انك اسلمت من اول حمير فارقتم المشركين فابشر بخير واني امركم يا  
حمير خيرا فلا تخونوا ولا تحادوا وان رسول الله (صلى الله عليه وسلم) مولى  
عنكم وفقيركم وان الصدقة لا تحل محمد ولا اهله - انما هي ذكوة  
تزكون بها فقراء المسلمين وان ما انكا بلغه الخير وحفظ الغيب واني  
قد ارسلت اليكم من صاحي اهلي واولي دينهم فامرهم به خيرا  
فانه منظور اليه والسلام

یہ مکتوب ظاہر ہے کہ حکماً ہے۔ ایک بات بھی اس میں ایسی نہیں جس کی بنا پر اس کو معاہدہ  
کہا جاسکے۔ لفظ امر بھی دو دفعہ اس میں آیا ہے۔ لیکن با این ہمہ کتاب الاموال میں معاہدہ ہو کر درج  
ہوا ہے۔ سی طرح مکتوب ذیل کو دیکھیے۔

هذا كتاب من محمد النبي رسول الله الى المؤمنين عضاة وجو صيدة

لَا يَعْصِدُ وَلَا يَقْتُلُ فَمَنْ وَجَدَ يَفْعَلُ شَيْئًا مِنْ ذَلِكَ فَإِنَّهُ يُوْحَدُ  
فِي بَلَدٍ مُحَمَّدًا رَسُولَ اللَّهِ (صلعم) وَإِنْ هَذَا مِنْ مُحَمَّدٍ ابْنَتِي وَكَتَبَ خَالِدُ  
بْنُ سَعِيدٍ بَا مَرْحُومٍ بَنِي عَبْدِ اللَّهِ رَسُولَ اللَّهِ فَلَا يَتَعَدَّ أَحَدٌ فَيُظْلَمُ  
نَفْسُهُ فِيمَا أَمَرَهُ مُحَمَّدٌ رَسُولَ اللَّهِ لِثَقِيفٍ .

یہ مکتوب جو قبیلہ ثقیف کو اسلام لانے کے بعد لکھوایا گیا سر اسر حکماء سے قطعاً عہد نامہ نہیں لیکن ابو عبید نے معاہدہ سمجھا ہے اور اب تک لوگ معاہدہ سمجھتے چلے آتے ہیں مگر خود نامہ کی اندرونی شہادت اس کی تردید کرتی ہے، وہی قابل تسلیم ہے نہ فلاں و رہبان کا قول۔ ب چیسے وہ قرن جن کی بنا پر زیر بحث نامہ نبوی کا عہد نامہ نہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔

اول یہ کہ اس مکتوب گرامی میں باوجود نہایت طویل ہونے کے اول سے آخر تک کوئی لفظ ایسا نہیں جو اس کے معاہدہ ہونے پر دلالت کرے مثلاً سلم، مسالہ، امنہ، ذمہ، مواد، مصاحہ، عقد، عہد، معاہدہ، میثاق۔ نامہ مبارک کی تیرہویں دفعہ میں اقرار کا لفظ البتہ آیا ہے لیکن وہ مومنوں مسلمانوں سے مخصوص ہے۔ اور ایمان و ایقان کا اقرار ہے، نہ عہد و پیمان کا۔

دوسرے یہ کہ سرنامہ اس مکتوب گرامی کا بارگاہ نبوت اور عہد خلافت کے عام معاہدوں سے مختلف ہے۔ معاہدہ حاضر کے لیے معاہدوں میں فذلان آیا ہے اور غائب کے لیے الی فذلان۔ اس مکتوب میں دستور عام کے خلاف لفظ بئین آیا ہے (بین الموصنین و المسلمین من قریش و یثرب و من تبعہم) یہ اختلاف خود نوعیت مکتوب کے اختلاف کا متقاضی ہے اگرچہ یہ درست ہے کہ یہ لفظ بھی معاہدہ میں آنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس بنا پر اگر اس مکتوب کو عہد نامہ ہی تصور کیا جائے تو اب یہیں بین کے طریق استعمال کو دیکھنا چاہیے۔

بین (جو یہاں زیر بحث ہے) دو متماثل چیزوں کے درمیان کبھی کبھار آتا ہے (جیسے فان



کان من قوم بینکم و بینہم میثاق) اور کبھی ایک بار (جیسے بین المرء و زوجہ) لیکن جب ایک براتا ہے تو ہمیشہ پہلی فرد پر دخل ہوتا ہے۔ جیسے ان اللہ یحول بین المرء و قلبہ اس کے خدشت نہیں آتا۔ اور معاہدہ میں کم از کم دو فریق ہوتے ہیں۔ زیر بحث، مگر گرامی میں لفظ بین تین اسمائے صفاتی کے شروع میں آیا ہے۔ اس لیے یہاں تین ہم تقدیری صورتیں سزاوارہ کی ہو سکتی ہیں۔ ہذا کتاب من محمد بنی بین المومنین من قریش و یثرب و بین المسلمین من قریش و یثرب و من تبعہم دوسری یہ کہ بین المومنین و المسلمین من قریش و یثرب و بین من تبعہم تیسری یہ کہ بین مومنین و بین المسلمین و بین من تبعہم۔

ان تینوں صورتوں میں سے کسی صورت میں بھی یہ مکتوب رسول اللہ کا معاہدہ نہیں کہلا سکتا۔ بلکہ ان صورتوں میں آپ صرف ایک ثالث یا سر پنچ رہ جاتے ہیں اور یہ مکتوب معاہدہ کے بجائے حکم مہ بن جاتا ہے۔ یہ مکتوب بغیر معاہدہ ہو سکتا ہے تو صرف اس طرح کہ من محمد بنی کے بعد ایک ہیں مقرر ہونا چاہئے و تقدیر عبارت یوں سمجھی جائے۔ ہذا کتاب من محمد بنی بین و بین المومنین و المسلمین من قریش و یثرب و من تبعہم فلحق بہم و جاہد معہم یعنی معاہدہ کا ایک فریق خود رسول اللہ ہوں اور دوسرا فریق قریش و یثرب کے مومن مسلمان دروہ ہوں جو ان دونوں کم از کم شرب کے مسلمانوں کا اتباع کریں یا پہلے سے اتباع کر رہے ہوں

وہ اتباع کرنے والے کون تھے؟ اس وقت اس کو چھوڑیے، اس کے متعلق ہم جو کچھ پہلے لکھ چکے، وہ کافی ہے یہاں صرف یہ دیکھیے کہ اگر یہ مکتوب معاہدہ ہے بین النبی و الیہود جیسے کہ سہیلی نے لکھا، درجناب مولوی صاحب فرماتے ہیں، و فرض کر لیجیے کہ واقعہ ہی نے بھی لکھا ہے تو پھر اس معاہدہ میں قریش و یثرب کے مومن مسلمانوں اور مدینہ کے مشرکین کا ذکر کیوں آیا اور اگر

اللہ ہی صحت سے اور یہی ہماری رائے ہے، جس کا عنقریب بیان ہوگا۔

رسول اللہ نے یہ نامہ انصار اور یہودِ یثرب کے باہمی معاملات کو سلجھانے اور ان میں ایک انضباط قائم کرنے کے لیے لکھوایا۔ جیسے کہ علامہ شبلی مرحوم نے (بقول جناب مولوی صاحب کے) سیرۃ النبی میں لکھا ہے۔ تو اولاً یہ رسول اللہ کا معاہدہ نہیں رہا بلکہ ثالث نامہ ہو گیا۔ ثانیاً یہ کہ مومنین مشرکین قریش کے ذکر کی اس میں گنجائش نہیں رہتی، حالانکہ مکتوب میں ان کا مذکور موجود ہے۔ اگر ہم فرض کر لیں کہ رسول اللہ کا یہ مکتوب قریش و یثرب کے مومنوں، مسلمانوں اور یثرب کے یہود سے معاہدہ ہے جیسا کہ ابن اثیر نے لکھا ہے۔ تو اور یہ کہ نامہ میں مشرکین کا مذکور بھی موجود ہے، یہ کیوں۔ ثانیاً یہ کہ قریش و یثرب کے مومنوں مسلمانوں سے معاہدہ کی یا تجدید عہد کی ضرورت کیا پیش آئی تھی خاص کر مومنان قریش سے۔ اور بقرض ضرورت پیش بھی آگئی تھی تو ان سے آخر عہد و پیمان کیا ہوا اور وہ کہاں ہے نامہ مبارک میں تو وہ دکھائی نہیں دیتا۔ البتہ کچھ حکام و ہدایات قریش و یثرب کے مومنوں مسلمانوں کے باب میں ضرور موجود ہیں مگر سی جن کو شروط و عہود نہیں کہا جاسکتا۔

یہ ہیں وہ باتیں جن کی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ زیر بحث نامہ نامی نہ عہد نامہ نبوی یا یہود سے، نہ کوئی معاہدہ۔ بلکہ بارگاہِ نبوت کا ایک اعلان عام ہے، اور ایک دستور العمل پیش کرتا ہے۔ اسی سے مس میں مومنوں، مسلمانوں، یہودیوں، مشرکوں کے ذکر کی ان کے حقوق و واجبات کی گنجائش ہے۔ بلکہ تبلیغ و ہدایت، تعلیم و تذکیر، وعدہ و وعید، انذار و تنہید کی بھی۔ چنانچہ یہ سب باتیں نامہ مبارک میں موجود ہیں۔ اب اہل نظر خود دیکھ لیں کہ آیا یہ مکتوب واقعی سرکارِ عو و عالم کا اعلان ہے جیسا کہ میں کہتا ہوں یا محض سرور کائنات کا معاہدہ ہے مدینہ کے عام اور تمام یہود کے ساتھ اور اس کا نسخ حقیقت میں بنو قینقلع

سے اس نامہ مبارک کے عنوان کے لیے جو الفاظ ابنِ اسحق کے ابنِ ہشام نے روایت کیے ہیں نیز وہ الفاظ جو ابنِ اثیر نے اپنی تاریخ میں لکھے ہیں اور جناب مولوی صاحب نے نقل فرمائے ہیں میرے نزدیک ان سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان کے نزدیک یہ نامہ کوئی معاہدہ یا معاہدہ رسول اللہ یا یہود سے، گو ان دونوں میں مودعت بالیہود اس کا صریح مفہوم موجود ہے۔ وجہ عدم ثبوت کی یہ ہے کہ ابنِ اسحق کے الفاظ یہ ہیں۔ (بقیہ بر صفحہ ۱۰۸)

موصوفہ در قریظہ کی طرف سے جیسا کہ جناب مولوی صاحب ذہن نے کہ نامہ نامی کو (باوجود منقطع الانشا ہونے کے غرض جس قابل احتجاج ہونے کے بعد بھی امر ہماری بحث کا اہم نقطہ ہے، را بنو قیظہ) موصوفہ در قریظہ کا بعد میں ہونا، وہ اپنی جگہ پر مسلم ہے خواہ دوسرے خراج کے اتباع میں جیسے کہ مہری رب پر خود باہر صحت جس سے مجھے انکار نہیں، اس لیے کہ امکان اس کا بھی ہے خواہ عہد نامہ نہ پڑ جائے۔  
جناب مولوی صاحب لکھتے ہیں (برہان نوہر ۳۹ ص ۳۹۰)

”را یہ سداً حد میں رسول شریعتیہ دسم سے یہود سے مدد دینے کو ناپسند فرمایا اور جس کے متعلق پروفیسر صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔“

”زہری سے روایت ہے کہ بعض نصاریٰ نے حضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ تم اپنے

عیسائی یہود (یعنی نصیر و قریظہ) کو زبرد میں وہ آکر جو ری مدد کر گئے، آپ نے سنسرایا

بعد از ثبوت صحیح... و کتب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتابا میں المہاجرین والانصار وادعائہ فیہ  
یہود و عاہدہم وافرہم علی دینہم و موافقہ و شرط علیہم و اس شرط لغیرہ۔ اس تحریر کے ابتدائی حصہ سے  
صاف ظاہر ہے کہ اس حصہ میں مہاجرین و نصاریٰ کے باب میں لکھو باغ (خود) کا ابتدائی حصہ اس کا شاہد ہے پھر  
اس حصہ سے جو دعوت بھی کی، وغیرہ وغیرہ جو غرض شروع ہو چوں کہ حکام و بیات دینے سے آگے چلے اس میں کچھ  
کی ہو وہ سداً نہیں ہو سکتا۔ اس سے کسی فرد کو تکذیب لکھوں... اس میں کچھ دوسرے فسادوں یا کریں یا کریں  
وتم درک ہونے کے ساتھ کہ چاہیے۔ نوہری وہ تحریر جس فساد کے نام کا عہد نامہ نہیں ہو سکتی۔ اس سے اس سے  
بھی زیادہ صاف لکھتے ہیں کہ فی عقدہ علیہ السلام، لافہ باہم المہاجرین والانصار بالکتاب الہی مر  
بہ یہی رسول شریعتیہ مہاجرین و نصاریٰ الف و محبت قائم کرنے کے لیے یہ تحریر لکھوائی۔ لہذا کہ اس میں یہود سے  
موافقت بھی دہائی لیکن پہلی قسم کی تحریر مقدم ہوتے ہوئے قسم کی غارتی نہ عہد نامہ ہوتی ہے۔ کبھی در کہیں عہد نامہ لکھائی  
ہے۔ اس عام فساد... مہاجرین و نصاریٰ میں سب باتیں آ سکتی ہیں کہ دیکھی تاہم بن اسیر کی تحریر میں امت کے  
موجودہ حاکم کا غلط چھ ہیں۔ اس سے موصوفہ در قریظہ ہوتا ہے جس کے بعد اس عہد نامہ نے کوئی تحریر نہیں لکھوائی



### لا حاجة لنا فيهم

ہو اس کا جواب تو صاف اور واضح ہے دوسرے قیام میں کسی طرح بھی اس سے دوسرا حاصل نہیں ہوتا جو پروفیسر صاحب حاصل کرنا چاہتے ہیں اس لئے کہ آپ کی اس ناپسندیدگی کی وجہ سے کچھ ہی پہلے کا وہ وقت ہے جو یہودی تینقار کی غدار کی شکل میں ظاہر ہو چکا تھا۔ نیز یہ میں سمجھوں گی کہ یہودی پر جو حسد یہود کو پیدا ہو گیا تھا ان دونوں اہم حالات کا تقاضا تھا کہ یہودی اہل دین اس موقع پر ہرگز نہ جاسے، ورنہ جس طرح منافقین نے نقصان پہنچانے کی سعی کی اس سے زیادہ یہود باعث مضرت ثابت ہونگے، چہ جائیکہ مداد کریں لہذا حقیقی اور تاریخی وجہ یہ ہے نہ کہ پروفیسر صاحب کی قیاسی وجہ۔

پروفیسر صاحب کے لیے اس مقام پر دو باتوں کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے۔ اول یہ کہ میر کی کتابوں میں اس جگہ یہ غلط درج ہیں "ان الانصار استاذ نواحينيذ رسول الله صلى الله عليه وسلم في الاستعانة بخلفائهم من يهود المدينة فقال لا حاجة لنا فيهم رجب انصار نے یہ اجازت چاہی کہ ہم اپنے مدنی یہودی صیغوں سے مدد حاصل کریں، تو آپ نے فرمایا ہیں ان کی حاجت نہیں،

اس میں یہود المدینہ مذکور ہے۔ پس اگر پروفیسر صاحب کے نزدیک غلط یہود کے عموم میں بغیر تفصیل کے بنی نصیر و قرینہ شامل ہی نہیں ہو سکتے تو یہاں انہوں نے اس لفظ سے ان قبائل کی تخصیص برکت میں کیوں فرمائی۔ جبکہ دوسرے یہودی بھی اسی طرح کے حلیف تھے۔ دوسری بات یہ کہ آپ مصنف رسالہ "متحدہ قومیت" پر سخت ناراض ہیں کہ یہ دیانت کے خلاف ہے کہ مشاہد کے مطابق دفات کو ذکر کر دیا جائے اور خلافت منشا کو ترک کر دیا جائے تو کیا پروفیسر صاحب ازراہ انصاف فرمائیگے کہ یہ دیانت کی کونسی قسم ہے کہ اگر ایک جگہ عام



یعنی اوس و خزرج میں جو یہودی تھے وہ بھی تو بنو قینقاع، بنو النضیر اور قرظہ ہی کی طرح حبیب تھے، لیکن جناب مولوی صاحب کی یہ توجیہ صحیح نہیں یہ کیوں؟ اس لیے کہ ان تینوں قبیلوں کو ہمد جد گانہ رسول اللہ کا حلیف مانا جائے، تو اوس و خزرج کے یہود کا اس عہد میں شامل ہونا ثابت نہیں نہ ابھی جناب مولوی صاحب نے کہیں یہ ثابت کیا ہے۔ اور اگر جناب مولوی صاحب فرمائیں کہ نامہ زیر بحث ہی ہمارے نزدیک وہ عہد نامہ ہے جس میں بنو قینقاع، بنو النضیر، قرظہ، وراوس و خزرج کے سارے یہودی شامل ہیں تو میں کہوں گا کہ میں اب تک برابر کتا چلا آیا ہوں کہ اس نامہ مبارک میں (اگر ہم اس کو عہد نامہ بھی لیں) تو بنو قینقاع، بنو النضیر اور قرظہ کا قطعاً کہیں مذکور نہیں اور بغیر مذکور ہونے کے ان کا اس عہد میں داخل ہونا کم از کم میرے نزدیک مسلم نہیں پھر مجھے یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ ”دوسرے یہود کی طرح یہ (بنو قینقاع، بنو النضیر اور قرظہ) بھی تو حلیف تھے۔ چہ جائیکہ اس کو الٹ کر مجھ سے کہا جاتا ہے کہ دوسری یہودی بھی اسی طرح کے حلیف تھے۔ اور اگر جناب مولوی صاحب فرمائیں کہ بنو قینقاع، بنو النضیر اور قرظہ کو نعم خود بھی تو با اتباع اوس و خزرج معاہد حلیف مانتے ہو۔ صرف نامہ زیر بحث کی رو سے ان کے داخل عہد نامہ ہونے سے انکار کرتے ہو۔ حلیف تو بہر حال رہے۔ میں کہوں گا کہ یہاں تک بات صحیح لیکن اس صورت میں اوس و خزرج کے یہود اوس و خزرج کا جز ہو کر رسول اللہ کے حبیب ہیں اپنی قوم سے لگ ہو کر۔ اس حالت میں کہنے والے انصاری کو کہنا چاہیے تھا کہ ہم اپنی قوم، قوم کے باقیہ لوگوں کو بدر کے لیے نہ بلا لیں لیکن اس نے کہا الا نستعين بمخلفا من يهود (اوس و خزرج کے باقیہ) اور کہتے ولا اوس و خزرج ہی میں سے کوئی انصاری ہو گا۔ اور اوس و خزرج کے حلیف تھے بنو قینقاع، بنو النضیر اور قرظہ۔ ان میں سے بنو قینقاع جنگ احد کے وقت مدینہ میں موجود ہی نہ تھے، پہلے ہی چلا دھن کیے جا چکے تھے۔ رہ گئے دو بنو النضیر اور قرظہ، یہی دونوں نام میں نے برکیٹ میں لکھ دیے تاکہ پڑھنے والے کہنے والے کے کلام کا مصداق صحیح صحیح سمجھیں غلطی نہ کریں۔ اب مولوی صاحب دیکھ لیں کہ یہ شخص



میری طرف سے جس بکہ خود کہنے والے کی طرف سے ہے اور لفظ "صفائت" اس پر دال ہے جو یہود ائمہ میں  
خصوصیت پیدا کر رہا ہے۔ رجب پخصیص ہی مجبوراً صاف میری طرف سے نہیں تو جناب مولوی صاحب  
اس دوسری بات بھی قبل از وقت ہے جیسے جناب مولوی صاحب کی دونوں اہم باتیں ختم ہوئیں اب  
تیسری بات کی باری ہے۔

میں نے لکھا تھا (برائن کتبستان صفحہ ۲۹۵-۲۹۶) یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانہ جنگ  
دار کے مس پس یہاں جو میرے نزدیک ایک دستور عمل ہے، آپ نے مومنین قریش و انصار اور  
انصار ہی کے رشتہ دار یہودیوں کے باب میں لکھوایا کہ ان یہودیوں سے (اس لیے کہ وہ ایمان نہ لانے  
کے باوجود اپنے سمان رشتہ داروں کے ساتھ ساتھ تھے) مصیبت قومی کی بنا پر یہ توقع ہو سکتی تھی کہ  
وہ شریک غزوات ہو جائیں اسی لیے سزا میں یہ لفظ لکھوائے ومن تبعہم فلحق بہم و جاہد  
معہم و رہم و من تبعنا من الیہود کے بعد صریح وہی قبائل نام بنام ذکر کیے جن میں اسلام عام ہو چکا  
تھا اور یہودی کلمہ رہ گئے تھے اور وہ بھی کچھ ایسی حالت میں تھے کہ ظن غالب یہ تھا کہ وہ اپنے ہم قبیل مسلمانوں  
کا ساتھ دیں گے۔ اسی لیے جن یہود سے یہ توقع نہ تھی یعنی سی قینت ح، بنی نضیر اور قرظہ، ان کا نام بھی اس  
نام میں نہیں ہے۔ کبھی آپ نے ان کو جہاد میں شریک کرنا پسند کیا۔

اس کے بعد جب داغہ اس کی تائید میں بایں الفاظ لکھا "رسول اللہ صہ کو قریش کے مقابلہ کو  
خارجے تھے کہ عبد اللہ بن ابی بن سلول جو اس امنا فتن تھا رسول اللہ کے تہائی ہمراہیوں کو ساتھ لے  
کر آپ سے جدا ہوا اور مدینہ واپس چلا آیا۔ ظاہر ہے یہ کیسا نازک وقت ہوگا۔ زہری سے روایت ہے کہ  
بعض انصار نے حضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ ہم اپنے حلیف یہود بنی نضیر اور قرظہ کو نہ بھالیں وہ  
اگر ہماری مدد کریں گے۔ آپ نے فرمایا حاجۃ لنا فیہم نہیں ہیں ان کی ضرورت نہیں۔ مطلب یہ کہ یہود  
بنی سرائیل کو کبھی آپ نے شریک جہاد نہیں کیا۔

میری اس تحریر پر جناب مولوی صاحب نے وہ تنقید فرمائی جو ہم باللفظ نقل کر چکے ہیں، اس میں پہلی تنقید جواب پر تحقیق ہے یہ ہے کہ بنو نضیر وغیرہ یہود سے جنگ اُحد میں آنحضرت کے مدد نہ لینے کا سبب تھا اول بنو قینقاع کا واقعہ اور دوسرے بدر میں مسلمانوں کی فتح و کامیابی پر عام یہود کا حسد کرنا۔ نہ وہ جو پر نضیر صاحب نے سمجھا ہے۔

میں کہتا ہوں یہ دونوں باتیں جناب مولوی صاحب کی اپنی اپنی جگہ پر درست و صحیح، لیکن بنو النضیر اور قرظیہ سے مدد نہ لینے کی یہ دونوں وجہیں تو فتح بدر اور واقعہ بنو قینقاع کے بعد پیدا ہوئی تھیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر اور بدر سے پہلے کے عزوات میں بنو قینقاع، بنو نضیر اور قرظیہ سے مدد کیوں نہ لی۔ اگر آپ ان سے مدد لینا ناپسند نہیں فرماتے تھے۔ اس کے علاوہ میں نے لکھا تھا۔ ”کہ کبھی آپ نے ان کو جہاد میں شریک کرنا پسند کیا۔ اور پھر اس کو دوہرایا اور کہا کہ یہود بنی اسرائیل کو کبھی آپ نے شریک جہاد نہیں کیا۔ جناب مولوی صاحب سے میرے دو دو بار لکھے ہوئے لفظ کبھی کو نظر انداز نہ فرما کر میری عام بات کو خاص اور دوام کو مختص اتمام ٹھہرا کر اپنی توجہ کو جملے کی کوشش فرمائی مگر وہ جم نہ سکی اور جو کچھ میں نے لکھا تھا اب بھی بدستور صحیح ہے۔ ہاں یہ بات جناب مولوی صاحب کی البتہ مقول ہے کہ اگر ان تینوں قبائل سے مدد لینا ناپسند تھا تو پھر انصاری قبائل کو یہودی المذہب سے مدد کیوں نہ لی گئی حالانکہ نسلی اتحاد اس کا مقتضی تھا۔ اس کی بابت میں کہتا ہوں اس و خنسج کے یہود وغیرہ جو دمن تبعہم فلحق بہم کا مصداق تھے خود میدان اُحد کے قریب تک چل کر آئے تھے لیکن عین وقت پر ان کا اتفاق یا مذہبی تعصب قومی عصبیت پر غالب آیا اور وہ جہاد میں شریک ہونے کے بجائے مدینہ کو چل رہے۔ یہ کیسے؟ اب اس کا قصہ سنئے۔

مگر جنگ اُحد کے وقت عین قبیلہ کہاں تھے۔ خود جناب مولوی صاحب کی تحریر کے مطابق اُحد سے کچھ پہلے قینقاع کا واقعہ پیش آچکا تھا یعنی وہ جلد وطن کیسے جا چکے تھے۔ اسی غلطی سے پڑھنے والوں کو بچانے کے لیے ہم نے یہود مدینہ کے بعد برکیث میں بنو النضیر اور قرظیہ لکھا تھا اب جو اس کے بھی جناب مولوی صاحب کو متاثر نہ گا۔ پھر عام دعوام کو غلطی کی بچانے کے لیے میں نے قول قائل کی تعمیل کی توضیح

جنگ بدر کو کوئی تیرہ مہینے ہوئے تھے کہ قریش بدر کا انتقام لینے کی نیت سے مکہ سے چلے اور مشرکین بڑھے ہوئے اُحد کے آس پاس آپہنچے۔ مدینہ میں مجلس شوریٰ ہوئی، اس دفعہ مشرکین تعداد میں بھی بہت تھے۔ دیکھے جی بڑے ساز و سامان سے آئے اور خود مدینہ کے اندر داخل ہو کر رٹنے کا تہیہ کر کے لڑنے چلے تھے۔ مجلس شوریٰ میں تجربہ کاروں کی رائے یہ تھی کہ حریف کو شہر میں آ جانے دو شہر ہی میں لڑینگے اور درود بوارت قلعہ کا کام لینگے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی یہی رائے تھی۔ عبداللہ بن ابی کو بالخصوص اس پر بڑا صبر تھا۔ سبکیں نوجوان اس کے خلاف تھے۔ خاص کردہ جنہوں نے جنگ بدر میں حصہ نہیں لیا تھا۔ ان لوگوں کے اصرار پر رسول اللہ بھی آخر مدینہ سے باہر نکل کر جنگ آنا ہونے پر آمادہ ہو گئے۔ دستکرا سلم مشکوٰۃں سے اُحد پر لڑنے کے لیے مدینہ سے چلے۔ رسول اللہ اس الشیہ پر پہنچے تھے کہ زور سے ہتھیاروں کی کڑکھراہٹ کی آواز کان میں آئی، مڑ کر دیکھا تو ایک فوج کی فوج ہتھیاروں سے اور بھی بنی چلی آ رہی ہے۔ پوچھا یہ کون ہے۔ کسی نے کہا عبداللہ بن ابی کے حلفاء، یہودی ہیں۔ آپ نے فرمایا: لا یتنصر باھل لشرك علی ہل الشرك۔ مشرکوں کے خلاف مشرکوں سے مدد نہیں لی جاسکتی۔ ممکن ہے کہ یہ لفاظی رسول اللہ کے عہد ان اور اس کے ساتھیوں تک پہنچ گئے ہوں لیکن بہر حال قنظرہ تک جو اُحد کے قریب، عبداللہ رسول اللہ کے ہمراہ رہا۔ اس مقام پر رسول اللہ پہنچے تو نماز صبح کا وقت ہو گیا تھا، آپ مع سداؤں کے نماز کو کھڑے ہوئے اور عبداللہ بن ابی نے مع اپنے رفقاء کے لشکر سلم کا ساتھ چھوڑ کر راہ فرار اختیار کی اور مدینہ آ کر دم لیا، یہ سائے غدار بھگوڑے اس خزانہ ہی کے یہودی اور منافق تھے۔

ثبوت اس بات کا کہ یہ بھگوڑے یہود و منافق اس خزانہ ہی کے تھے: بنو النضیر و قرظہ کے یہ ہے کہ جب یہ بھگوڑے بھاگے تو عبداللہ بن عمرو بن حرام نے ان کو روکنا چاہا۔ ابن ابی اسحق نے لکھا ہے کہ اُس نے کہا: "ایسے تمہیں حد کا واسطہ کیا کرتے ہو، دشمن سامنے ہے اور تم اپنی قوم اور اپنے نبی سے دغا کرتے ہو" واقعی نے کچھ ایسی اغاظ کے ساتھ اتنا اور صافہ کیا ہے کہ تم نے تو وعدہ کیا تھا کہ جان و مال



کی اولاد اپنی ماؤں بہنوں بیویوں کی طرح رسول اللہ کی حفاظت و حمایت کرو گے اب کہاں بھاگے جارہے ہو؟ اور یونہی ان کے پیچھے لگا ہوا مدینہ تک پہنچا مگر جب دیکھا کہ وہ کھڑک مدینہ کی گلیوں میں گھسے جا رہے ہیں اور پھوٹے منہ سے اس کے سوا کچھ بولتے ہی نہیں کہ لڑائی نہ ہوگی، لڑائی نہ ہوگی تو وہ ان پر سنت بھیج کر خود اُحد پہنچا اور جنگ میں آشربک ہوا۔

عبداللہ بن عمرو کے الفاظ آپ نے دیکھے۔ وہ کہتا ہے اپنی قوم کو دغا دیتے ہو۔ مدینہ سے میدان جنگ میں آنے والی قوم کونسی قوم تھی؟ وہی اوس و خزرج۔ پھر جن مزید الفاظ میں بھگڑوں کو غیرت ملانا ہوا مدینہ تک جاتا ہے وہ نقباء اوس و خزرج ہی کے الفاظ تھے نہ بنو النضیر اور قرظہ یا ان کے رؤسا کے۔ شہر مدینہ میں رہنے والے بھی اوس و خزرج ہی تھے نہ بنو النضیر اور قرظہ۔ بنو قینقاع البتہ بیشتر مدینہ میں رہتے تھے مگر وہ واقعہ اُحد سے پہلے ہی مدینہ سے نکالے جا چکے تھے۔ غرض میدان جنگ تک جانے والے یہ یہود و منافق بھی اوس و خزرج ہی کے لوگ تھے اور وہ من تعہد فلیحق بھم کے مصداق۔ جہاد میں شرکت کے لیے گئے بھی اور بغیر بلائے گئے۔ مگر وہ عموماً منافق تھے اور درپردہ مشرک و یہودی۔ مگر دنی جذبہ یا مذہبی تعصب قومی عصبیت پر غالب آیا۔ جو واقعی لڑنے مرنے کی نیت سے بھی گئے تھے بھاگ کر چلے آئے۔ یہی منافق انصار کے رشتہ دار تھے جب وہ میدان جنگ میں ور چلے جائیں تو پھر ان کے بلائے کا موقعہ ہی کیا تھا۔ اسی گھبرہٹ میں تو کہنے والے نصاریٰ نے (جو ناثا خزرجی ہوگا) کہا تھا کہ ہم اپنے حلفاء (بنو النضیر اور قرظہ) کو نہ بلا لیں وہ ہماری مدد کرینگے حضرت نے فرمایا نہیں ہیں ان کی ضرورت نہیں کیونکہ آپ جانتے تھے کہ غیروں سے کیا توقع ہو سکتی ہے جبکہ وہی لوگ بھاگ کھڑے ہوئے جن سے قومی عصبیت کی بنا پر ایک حد تک اپنی قوم کے ساتھ ہو کر لڑنے مرنے کی امید ہو سکتی تھی، مگر اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ قومی عصبیت کے جوش میں کوئی منافق یا کھلا ہوا یہودی اوس و خزرج کا مسلمانوں کے ساتھ ہو کر اُحد میں لڑا ہی نہیں۔ کچھ نہ کچھ لوگ ایسے بھی تھے کہ باوجود منافق و یہودی

ہونے کے بھی اپنی قوم قبیلہ کے ساتھ ہو کر لڑے اور محض قومی عصبیت کی بنا پر لڑے۔ مَن میں ہو کسی کسی کا پردہ فاش ہو گیا اور بہتوں کے حال پر پردہ پڑا۔

اب اسحق اور واقدی دونوں نے لکھا ہے۔ قزمان نام ایک منافق تھا بنی ظفر میں محسوب مسلمان لڑنے اُحد کو چلے تو وہ گھر میں بیٹھ رہا، صبح ہوئی درمحلہ کی عورتوں نے اُسے دیکھا تو طعنے دینے لگیں۔ قزمان: مرد مرے مارنے کو اُحد گئے تو گھر میں چھپا بیٹھا ہے۔ تجھے شرم نہیں آتی، تو مرد نہیں حیز ہے، عورت سے بچھٹ ہے تجھ پر۔ یہ باتیں سُن کر قزمان کو تڑا گیا۔ گھر میں گیا ہتھیار لگائے اور سیدھا اُحد میں پہنچ کر بڑی شروع ہو چکی تھی۔ یہی آگ میں کود پڑا اور بڑی ہمداری سے بڑا مسلمانوں کے پاؤں کھرنے پر بھی ثابت قدم رہا۔ جب لوگ بھاگ رہے تھے یہ قریش پر حملہ کر رہا تھا اور اپنی قوم کو ملکاڑتا جاتا تھا۔ اوس، باپ دادا کے نام کو بڑے لگا، بہت کرمیت۔ لوگوں کو دھردیکھو۔ میری طرح لڑو۔ یونہی رٹتے رٹتے چھدرت آدمی مد مقابل کے موت کے گھاٹ اُتار کر خود بھی بُری طرح زخمی ہوا۔ بچنے کی امید نہ رہی تو ہاتھوں کی نہیں خود کاٹ کر خود کشی کر لی۔

زخمی ہو کر جب بنی ظفر کے کیمپ میں پڑتا تو لوگوں نے کہا قزمان مرتا تو ہے مگر آج بڑا کام کیا۔ شہادت مبارک ہو۔ بولا "شہادت! یہ کیسے؟ میں دین و ایمان کے لیے لڑا ہوں، تو مبارکباد کہتے۔ میں تو عصبیت اور نام و تنگ کے لیے لڑا ہوں۔ قریش ہم پر چڑھ کر آئے اور بڑھتا ہوا ہمارے کھیتوں اور باغوں میں آجائے!

دس دھڑلہ میں سے قزمان ہی ایک ایسا نہ تھا جو عصبیت کے جوش میں مسلمانوں کے لیے اپنی قوم کے ساتھ ہو کر لڑا۔ تاریخ میں وہ بھی ایسے لوگوں کے نام آتے ہیں کہ منافق ہونے کے باوجود اپنی قوم دس دھڑلہ کے ساتھ ہو کر لڑے۔ غزوہ تبوک تک ایسے لوگوں کے نام آجائے ہیں اور ان کے غفاق کا پردہ فاش ہو جاتا ہے، اور نہ جانے کتنے ہونگے جن کے حال پر پردہ پڑا۔ جن لوگوں کا حال کسی

کھل گیا ہے اُن کی بھی اچھی خاصی تعداد ہے لیکن مورخین کا ان کے باب میں کہیں اتفاق ہے اور کہیں اختلاف۔ اس لیے ہم یہاں ان کے ناموں سے تعرض نہیں کرتے۔ تاہم اُحد میں جو منافق تھے اور اُن کے بارہ میں قرآن میں (آل عمران) خبر آئی ہے وہ ذیل میں لکھے دیتے ہیں۔ قال اللہ تعالیٰ:

ثم انزل علیکم من بعد الغم احنة

نعا ساً یفتی طائفة منکم۔

وطائفة قد اهتمهم انفسهم یظنون اور دوسرے گروہ کو اپنی جانوں کی پڑی تھی، در اشد

باللہ غیر الحق ظن الجاہلیۃ یقولون کے بارہ میں برے برے جاہلیت کے خیال

صل لنا من الامر من شیء کرتے تھے۔

یقولون لو کان لنا من الامر من شیء کہتے تھے اگر ہمارے بس کی بات ہوتی تو ہم یہاں آ

شیء ما قتلنا ہہنا۔ کراہے نہ جاتے۔

جن آیات پر ہم نے خط کھینچ کر ترجمہ کر دیا ہے یہ بلا اختلاف منافقین کے حق میں آئی ہیں اور اُن منافقین کو اللہ تعالیٰ نے ایک جماعت کہا ہے۔ یہ جماعت منافقین کی ادس و خزع کے مشرکوں اور یہودیوں کا مجموعہ تھی یا اس میں صرف مشرک ہی مشرک تھے اس کی تفصیل کہیں میری نظر سے نہیں گذری لیکن جو جماعت عبد اللہ بن ابی کے ساتھ گئی اور قنطرہ سے بھاگ کر آئی اس میں یقیناً یہود بھی تھے اور یہ بھی یقین ہے کہ درگچہ احد سے ادس و خزع کے یہودی از خود یا عبد اللہ کے سکھانے پڑھانے سے بھاگ آئے تھے تاہم یہود اپنے مذہب یہودیت پر رہ کر بھی کم و بیش غزوات نبوی میں شریک ہوئے ہیں۔ چنانچہ ابو عبید بن سلام نے کتاب الاموال میں لکھا ہے اور روایت کو زہری تک پہنچا ہے۔

کان ایہود یغزون مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیہم لہم یہود رسول اللہ کے ساتھ جہاد میں جاتے اور آپ ان کو مال خنیت میں سے حصہ دیا کرتے تھے۔



یہود اوس و خزرج ہی کے یہود ہو سکتے ہیں اس لیے کہ بدر سے پہلے کے غزوات میں صرف  
 ہاجرین ہی جاتے رہے۔ بدر میں ۳۱۳ مجاہد شریک ہوئے ان کے نام قبیلہ و اراکتا ہوں میں موجود ہیں  
 ان میں ایک آدمی بھی بنو قینقار، بنو النضیر اور قرظہ کا تھیں ملتا۔ احد میں بعض انصار کی درخواست کے  
 ہر وجود حضرت نے ان کے بلانے کی اجازت نہ دی اس کے بعد حالات سی ایسے نہیں رہے تھے کہ وہ  
 رسول اللہ کی مدد کرتے یا رسول اللہ ان سے مدد لیتے جبکہ اس سے پہلے بھی آپ نے ان سے کبھی مدد لینا  
 پسند نہ فرمایا تھا۔ اس لیے یہ غزوات میں شریک ہونے والے یہودی اوس و خزرج ہی کے ہونگے، یا کم از  
 کم بنو قینقار، بنو النضیر اور قرظہ کے نہ تھے اور ہرگز نہ تھے۔

محمّد نے لکھی تھی کہ اوس و خزرج کے ان بھون کو جنہیں رسول اللہ انصار کا خطاب دیتے ہیں  
 یہودیوں کے قبائل فتح غزوہ بدر سے دیا ہے۔

اس پر جناب مولوی صاحب لکھتے ہیں "انصار کے بیان کردہ قبائل کو عمومی حیثیت سے آپ کا  
 انصار کہنا غلط ہے۔ اس سے کہ انصار کی اصطلاح صرف یثربی مسلمانوں کے لیے مخصوص ہے قبائل  
 یثرب کی صفت نہیں ہے۔"

میں کہتا ہوں۔ پہلی جسے جناب مولوی صاحب جرح و تعدیل کا نام فرماتے ہیں، لکھتے ہیں کہ  
 "لکن انصار اسماء لہم فی الجاہلیۃ حتی سماہم اللہ بہ فی الاسلام وہم بنو الاوس و الخزرج  
 زادہ بایں میں اس کا نام انصار نہ تھا۔ اسلام آیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس نام سے موسوم فرمایا، اور وہ  
 اوس و خزرج کی درادہیں۔ اس کے علاوہ اوس و خزرج کے بطون میں مسلمان زیادہ اور یہود کم تھے۔  
 اس بنا پر بھی ان کو بلکہ تمام اوس و خزرج کو انصار کہنا غلط نہیں۔ سلف سے صفت تک سب ہی کہتے  
 آئے ہیں۔ نیز یثرب کے سوائے مسلمان کبھی انصار نہیں کہلاؤں جو اسرائیلی مسلمان ہوئے وہ اب تک اسرائیلی

سے ابن کثیر نے لکھا ہے ان اوس و خزرج وہم الا انصار یہودیہ کے خود جناب مولوی صاحب کا قلم لکھا ہے "انصاری قبائل"

کہلاتے ہیں نہ کہ انصاری۔ باوجود ان سب باتوں کے مجھے اعتراف ہے کہ جس انداز پر میں بحث کرتا ہوا چلا آ رہا ہوں اس کے لحاظ سے مجھے یہ فقرہ کسی اور ہی طرح لکھنا چاہیے تھا۔ یاد نہیں کہ اس کا خیال نہیں آیا یا بن ہی نہ پڑا۔

میں نے لکھا تھا "کہا جاسکتا ہے کہ جن بطون و عشائر کا نام نامہ میں آیا ہے وہ جیسے انصار اور مسلمانوں کے قبیلے تھے ویسے ہی وہ یہود کے بھی قبائل تھے اس منظرانہ نکتہ آفرینی سے میں کیا دنیا میں کوئی بھی انکار نہ کر سکیگا؟"

اس پر جناب مولوی صاحب فرماتے ہیں، یہ منظرانہ نکتہ آفرینی کیوں ہے۔ واقعہ کا اظہار کیوں نہیں میں کہتا ہوں کہ یہ منظرانہ نکتہ آفرینی اس لیے ہے کہ اس مضمون سے باہر نہ کبھی جناب مولوی صاحب نے ایسا کہا اور لکھا ہو گا نہ امید ہے کہ ایسا کہیں یا لکھیں۔ نیز وہ خود اپنے اصول بحث کے موافق بھی یہ ثابت نہ کر سکیں گے کہ فلاں امام تحقیق و تنقید نے ایسا لکھا ہے۔

جناب مولوی صاحب تمام گزشتہ بحث کا پتھر لکھتے ہوئے فرماتے ہیں۔ بالفرض اگر اس معاہدہ میں مہاجرین کے قبائل مختلفہ اور یہود کے قبائل مختلفہ کا ذکر یا اسرائیلی یہودیوں کا ذکر قطعاً موجود نہیں۔ مگر مسلمانوں اور یہودیوں کا ذکر تو موجود ہے خواہ ایک ہی قبیلہ کے مسلمان و یہودی ہوں تو حضرت مصنف کے مقصد پر اس عدم ذکر سے کیا زد پڑتی ہے، ورنہ کی نوعیت میں کیا فرق آ جاتا ہے۔ میں نے خود بھی بہت غور کیا اور دوسرے اہل علم سے بھی دریافت کیا۔ مگر سب نے یہی کہا کہ مطلق کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں کہتا ہوں یہ معاملہ فہم عبارت کا نہیں رائے کا ہے اور پھر رائے بھی ایسی رائے جو قائم ہو سکتی ہے حالات و مقدمات سے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ ایک جماعت کے خیر مسلموں اور قلیل غیر مسلموں کا تعلق دایب ہے جیسا کہ ایک جماعت کے کم مسلمانوں اور دوسری جماعت کے زیادہ غیر مسلموں کا اتحاد اور پھر مسلمانوں کے حق میں دونوں کو یکساں خیال کرتے وہ قیاس مع الفارق کو کام میں لائے ہیں اور اسی لیے غلط نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ صحیح مقدمات کے لیے ایک طرف

قریش و اس خزانہ کی اور دوسری طرف شریک اسرائیلی یہود کی تاریخ کا علم ہی ضروری نہیں بلکہ اس کا پیش نظر ہونا اور کام میں لانا بھی ضروری ہے۔ اگر ہم یقین ہو گیا کہ یہ سب کچھ پیش نظر ہونے کے باوجود بھی جناب مولوی صاحب کی یہی رائے ہے تو پھر ہم اس تاریخ کو ناظرین کے سامنے پیش کرینگے، ممکن ہے کہ اہل نظر سے نتیجہ کی معقوبیت کو مان لیں۔ اس وقت بخواتین طوالت مضمون ہم اس بحث کو نہیں چھیڑتے بلکہ صفحہ ۳۹۳ کے آخر سے ۳۹۵ کے آخر تک جو کچھ جناب مولوی صاحب نے یہ جملہ سرکلام میں لاکر لکھا ہے کہ ”پروفیسر صاحب کا ایک قرض ابھی باقی ہے“ اس کو بھی کسی دوسرے وقت کے لیے رکھتے ہیں کہ حقیقتہً خالص تاریخی اور سیاسی ہے غرض یہ ہے کہ پیسے خالص علمی بحث ختم ہو جائے تاکہ پھر علمی سیاسی مسائل آسانی سے بھوکیں۔ اس کے علاوہ ہم اور بھی بہت سی اہم اور غیر اہم باتیں جن کو مسئلہ زیر بحث سے براہ راست قریبی تعلق نہیں ہے چھوڑتے چھوڑتے ہیں اور جب تک ضرورت نہیں ہم ان سے تعرض نہیں کریں گے۔

## تصحیح

برہان کی اشاعت گذشتہ میں شمس العبد رموز، عبد الرحمن صاحب کے مضمون میں صفحہ ۳۴۳ میں ۱۵ میں ایک جملہ یوں چھپ گیا ہے ”بنی اسرائیل آپ کے کسی طرح معاہدہ ہی تھے“ حالانکہ اصل یہ ہے ”بنی اسرائیل آپ کے کسی طرح معاہدہ ہی نہ تھے“ ناظرین کرام اس غلطی کی تصحیح کر لیں۔



# نواب زین العابدین خاں عارف

از محترم حمید سلطان صاحبہ ادیب فاضل

مرزا غالب در مآثر مرحوم میں جو قلبی ربط و تعلق تھا، اس کا اندازہ مآثر کے میں مثبت ہوتا ہے جو انہوں نے مآثر کی جو فرنگ پر پڑے در کے ساتھ کیا ہے۔ لیکن بیشک نواب عارف مرحوم کے تفصیلی حالات معلوم نہیں تھے۔ ہم کو بڑی مسرت ہے کہ محترمہ حمیدہ صاحبہ نے جو مآثر مرحوم کے بڑے صاحبہ اسے نواب باقر علیاں کامل مرحوم کی نوسی ہیں، اپنے نانا کے مآثر میں تفصیلی مقالہ لکھ کر غائبیات میں چند مفید معلومات کا اضافہ کیا ہے۔ محترمہ نے مآثر مرحوم کے خاندانی اور نجی حالات اپنی نانی نواب معظمہ زانی بیگم صاحبہ سے سنا کر رکھے ہیں جو بہت مفصل حیات ہیں۔ موصوفہ رد و کی خوش فکر ادیبہ بھی ہیں اس لئے واقعات کی تحقیق تفصیل کو گئے سن بیان نے چار چاند لگا دیے ہیں۔ اس مضمون کا لٹاک پہلو یہ ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد دنی مرحوم کی پتھری ہوئی علمی و ادبی سمجھتوں کی یہ قمار ہو کر دل میں طوفان اضطراب برپا کر جاتی ہے۔

زمرہ بان

غالب اور عارف | زین العابدین خاں مآثر مرحوم حضرت مرزا اسد اللہ خاں غالب کی بیوی کے حقیقی بھائی تھے۔ غالب مرحوم عارف کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ اس پابست کی وجہ مآثر کا صرف

رستہ رہا، جس نے تھا بکھار دیا جو دیت بیچ دروہن رسائے حضرت ناب بھی شہباز سخن کو فتح کر لیا  
تھے۔ رات مرحوم حضرت ناب کے رشتہ موافق ہیں تھے۔ گو نقش دل تھے گزشتہ ابھرتے اب درنگ میں  
کسی طرح کم نہ تھے بکھڑکونی میں فضل تھے۔ ناب نے رات کی خوش فکری و گہری اُفت و محبت کے اظہار کے  
سے ایک قطعہ فارسی میں کہی ہے۔ فرماتے ہیں :-

میں پسند میں خوشے عارف نام  
کہہ خوش شمع دو دامن من است  
آنکہ در بزم قرب و خلوت انس  
نگار و مزاج دان من است  
عارف کو طالب کر کے کہتے ہیں :-

ہم ز کلب تو خوش دلم، خوش حال  
کان نال شرف ن من است

جب مہر جونی میں رات داغ منارفت دے گئے تو حضرت ناب نے ان کی وفات پر حد درجہ درد بھرا  
نہ کی جو کئی ہفتوں میں سے جس کا ایک شعر یہ ہے :-

ہاں اسے خاک پر چرواں تھا ابھی عارف  
کیا تیرا گرا تا جو نہ مرنا کوئی دن اور

عارف کی وفات کے بعد حضرت ناب نے ان کے دونوں خور و ساقیوں کو اپنے ہاں لے آئے۔  
ان دونوں کے ساتھ حضرت ناب کو بے انتہا محبت تھی کبھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتے تھے۔ اگرچہ خود بھید  
تنگ مزاج تھے مین مین بیچان و بہار حجاب کے باز ٹھاتے تھے و دان کا دل میلانہ ہونے لیتے  
تھے

منشی برگو پال تفتہ کو لکھتے ہیں :-

”سنو صاحب یتیم خانے ہو کہ زین الدین خاں مرحوم میرا فرزند تھا۔ اب اس کے دونوں بچے کہ وہ میرے پوتے ہوتے ہیں میرے پاس آ رہے ہیں اور وہ بدمعاش کو ستاتے ہیں میں تحمل کرتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ تم کو اپنا فرزند سمجھتا ہوں پس تمہارے نتائج طبع میرے معنوی پوتے ہوتے۔ جب اس عالم کے پوتوں سے کہ مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے دوپہر کو سونے نہیں دیتے ننگے ننگے پاؤں پناب پر رکھتے ہیں کہیں پانی نہ ملتا ہے میں کہیں خاک اڑاتے ہیں تنگ نہیں آتا تو ان معنوی پوتوں سے کیا گنجہاؤں گھا۔“

میرمہدی بخرواح کو لکھتے ہیں :-

سب در درہ دار ہیں۔ یہاں تک کہ بڑا لڑکا باقر علی خاں بھی۔ ایک میں اور میرا بیٹا حسین علی خاں روزہ خور ہیں۔ وہی حسین علی خاں جس کا روزمرہ ہے اکلنے لینے میں بجا رہاؤں گا۔“

باقری علی خاں کامل نواب زین عابدین خاں عارف کے فرزند اکبر کے ہاں بچے کی پیدائش پر حضرت نائب نے ایک قطعہ لکھا ہے جو سبب چین میں موجود ہے :-

بہن ز مقدم فرزند میرزا باقر      سرورش تہنیت ز بداء مطالب گفت  
چو قصد شد متعلق بگفتن تار تار      طریق تمیہ و زریہ دجان قلاب گفت

جانِ نائب کے اعداد میں قصد کے اعداد شامل کئے جائیں تو اس شعر کی تکملی ہے۔

عارف کا خاندان | عارف کے مورث اعلیٰ مرغ سے ہندوستان آئے تھے۔ اس کی حقیقت یہ ہے

بخارا میں خواجہ عبدالرحمن نیوی ایک رئیس عالی خاندان خواجہ احمد نیوی کی اولاد میں تھے۔ اتفاقاً زریہ

سے وطن چھوڑ کر بلخ میں آئے اور یہیں خانہ دار ہوئے۔ خدا نے قین فرزند رشید عطا کے قاسم جان

عارف جان، عالم جان، ان جوانوں کی ہمت نے گھر میں بیٹھنا گوارا نہ کیا۔ ایک جمیت سوار و پیادہ رکھ کر

ازبک وغیرہ کو لے کر ہندوستان میں آئے۔ پنجاب میں معین الملک عارف میرنور خٹک نواب قمر الدین خاں وزیر



ٹھہر کر رہ گئے۔ ان میں زردوں کو اپنی رفعت میں پایا۔ خاکِ پنجاب میں سکھوں کا زور تھا۔ انھوں نے اپنی ہمت کے گویا سے ڈر کر ناموری حاصل کی۔ تھوڑے عرصہ بعد میرٹھ کا انتقال ہو گیا اور انھوں نے دربارِ کانتھیا کی۔ اس وقت شاہ عالم میرٹھ کے مقابلہ پر ہنگامے میں زوج سے پڑے تھے یہ بھی وہیں پہنچے در قاسم جان نے اپنی بہادری سے شاہ عالم کو خوش کر کے نوبِ شرف لدولہ سہراب جنگ کا خطاب پایا۔ اور ہفت ہزاری کی مقررہ رقم بادشاہ کے ہر ہاتھوں بھائی دہلی آئے۔ وہیں سکونت اختیار کی۔ بیماروں کے علاج میں قاسم جان کی انہیں قاسم جان سے منسوب ہے۔ اب بھی ان کے خاندان کے افراد اسی گلی میں سکونت رکھتے ہیں۔

نوبِ قاسم جان کو کٹر بیٹے پرستے تھے۔ چھوٹے بھائی عارف جان دیہات درجاگیر وغیرہ کا انتظام کرتے تھے۔ دونوں بھائیوں کا انتقال بھی تھوڑے وقفے سے ہوا۔

شرف لدولہ سہراب جنگ نوبِ قاسم نے تین بڑے چھوڑے محمد بخش خاں، فیض اللہ بیگ خاں، قدرت اللہ بیگ خاں، محمد بخش خاں، کرم دہر، ریاست جہنی سن کی ہمت دار رکھتے تھے۔ اس لیے فیض اللہ بیگ خاں کو تھوڑے عرصہ بعد ریاست کا کام سنبھالنا پڑا۔ دربار کا خطاب شرف لدولہ سہراب جنگ پایا۔

محمد بخش خاں کے مرتے ایک صاحبزادے فتح اللہ بیگ خاں تھے شرف لدولہ سہراب جنگ نوب فیض اللہ بیگ خاں کے ہاں ۱۱ صاحبزادے اور ایک صاحبزادی تھیں۔ دلاویں تھیں، نوبِ سلام حسین خاں، مسرور، نقشبند خاں، ورنجن، نوب بیگم، قدرت اللہ بیگ خاں نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی سے چار صاحبزادیاں تھیں، دوسری بیوی سے ایک صاحبزادی، تیسری بیوی سے دو صاحبزادے، حسین الدین خاں خاں اور محمد حسن خاں تھے۔

عاجی بیگم صاحبہ منسوب قیس نوب فیض الدین احمد خاں صاحب خزانہ لدولہ سہراب جنگ با محمد بخش خاں

نواب فیض اللہ بیگ خاں کے انتقال کے بعد نواب غلام حسین خاں مسرور نے برودی اختیار کی تھی ریاست ہاتھ سے نکل گئی۔ نواب غلام حسین خاں و نقشبند خاں کو ایک ایک ہزار روپیہ ماہانہ تازیت ملتا رہا۔ نقشبند خاں لاہور تھے نواب غلام حسین خاں کے دو صاحبزادے تھے نواب زین العابدین خاں عارف اور نواب حیدر حسن خاں۔ نواب زین العابدین خاں عارف ۱۳۳۳ء میں پیدا ہوئے۔ ابھی خورد سال ہی تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ان کی والدہ بی بی بیگم صاحبہ نے ان کی پرورش اس زمانہ کے دستور کے مطابق بہت غلی پیمانہ پر کی اور اعلیٰ تعلیم دلائی۔

نواب زین العابدین خاں عارف کو سرکارِ پنجشیر سے ڈھائی سو روپیہ ماہوار ملتے تھے۔ اکس سال کی عمر میں عارف کی شادی نواب بیگم صاحبہ بنت خیرا دلہ رستم جنگ نواب احمد بخش خاں زین جھر کہ فیروز پور سے ہوئی۔ شادی کے بعد ڈھائی سو روپیہ ماہانہ فیروز پور سے عارف کو تازیت ملتے رہے نواب بیگم صاحبہ کا شادی کے دو برس بعد انتقال ہو گیا۔ ان سے کوئی اولاد نہ تھی۔ عارف کی دوسری شادی دہلی کے ایک شریف خاندان میں ہوئی۔ ان دوسری بیوی سے جن کا نام بستی بیگم تھا دو اولادیں ہوئیں باقر علی خاں و حسین علی خاں جن کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔

عارف کے چچا نواب عارف جان نے چار بیٹے چھوڑے بنی بخش خاں، احمد بخش خاں، محمد بخش خاں، ابھی بخش خاں۔ نواب احمد بخش خاں راجہ پنجاور سنگھ داسی اور کی جانب سے معتبر اور دکیل ہو کر لاہور کے ساتھ ہندوستان کی قیادت میں شامل رہے۔ دراپنا ایک ذاتی رسالہ رکھ کر گورنمنٹ کی خدمات انجام دیتے رہے۔ اس صلفہ میں جھر کہ فیروز پور کی ریاست گورنمنٹ سے پائی اور ہمارا جھگڑنے لگا۔ دکان پر گنہ دیا۔ دربار شاہی سے خیرا دلہ دلا اور الملک رستم جنگ کا خطاب ریزڈنٹ کے توسط سے عطا ہوا۔

نواب احمد بخش خاں کی شادی اپنے چچا نواب قاسم جان کی صاحبزادی عالم ماہ سے ہوئی تھی۔ لیکن گیارہ سال بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ ان بیگم سے نوپتے ہوئے ایک بھی زندہ نہ رہا۔ ان کے بعد نواب

حمد بخش خاں نے دو شادیاں کیں ایک بیوی سے دو صاحبزادیاں نواب بیگم صاحبہ و۔ جہانگیر بیگم صاحبہ  
 و۔ دو صاحبزادے شمس الدین احمد خاں و۔ برابر بیگم بیگم خاں تھے۔ دوسری بیوی بیگم جان صاحبہ سے تین  
 صاحبزادیاں و۔ دو صاحبزادے مین الدین خاں، نصیر الدین خاں تھے۔ نواب احمد بخش خاں نے  
 شمس الدین خاں کو جو فرزند اکبر تھے دہلی عبد کی نواب صاحب موصوف کے انتقال کے بعد شمس الدین خاں مندر  
 شہن ریاست ہوئے مین الدین احمد خاں و۔ نصیر الدین احمد خاں کو بڑے بطور جاگیر دیا گیا تھا فیروز پور  
 سے ان دونوں کو ایک ایک ہزار روپیہ دیا جاتا تھا۔ نواب شمس الدین خاں کو فریاد صاحب کشر دہلی کو  
 قتل کرنے کے جرم میں تین سال جیل پھانسی دی گئی و۔ ریاست جہانگیر فیروز پور ضبط کر لی گئی۔ نواب  
 مین الدین احمد خاں میں بڑے بے۔ ان کے بعد نواب مین الدین خاں علاقہ مندر شہن ہوئے۔ یہ  
 حضرت نواب کے بہت محبوب شاگرد تھے علوم مشرق کے ساتھ زبان انگریزی میں کامل مہارت رکھتے تھے  
 نواب نصیر الدین احمد خاں شخص بہترین شاگردوں کے ساتھ ان کے داد کا خطاب خواجہ ابدولہ داد ملک  
 رستم جنگ مت ہو۔ نواب صاحب موصوف فن تارین و۔ علم انساب کے اہل و۔ دو درباری کے اچھے  
 تھے اور حضرت نواب کے چہیت شاگرد مدد کتب کا متعلق شوق تھا کہ دنیا کی بہترین و۔ در کتب کے  
 کتب خانہ میں موجود تھیں۔

**عارف کے ناما معروف** | عارف کے حقیقی نام نواب امین بخش خاں شخص بہ معروف خواجہ ابدولہ رستم جنگ  
 نواب احمد بخش خاں میں جہانگیر فیروز پور کے حقیقی بھائی اور بڑی عمر بزرگ تھے۔ فن شعر و عشق رکھتے تھے  
 در شاعری کے لیے کمنہ مشق سے کہانی شعر کا درجہ حاصل کیا تھا ان کے زمرہ مقدس اور علم و فضل کے پیش  
 ان کے معاصرین ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ ایک اور دیوان کے علاوہ نواب صاحب مرحوم نے ایک مثنوی  
 موسوم تہذیب زہد و۔ جی انہی تصانیف چھاپی ہے اس میں پانچ سو شعر حسن بنز قبا کی مدح میں لکھے ہیں اس  
 مثنوی کی بہت میں مرقع بنی ہا ذکر کتب ریاست راپور کے کتب خانہ میں موجود ہے



مولانا آزاد نے آپ جیات میں لکھا ہے کہ معروف استاد ذوق کے شاگرد ہوئے تھے لیکن ذوق  
سید الدین احمد خاں طالب دیوان معروف کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ یہ قطعاً غلط ہے اور یہ کہ آزاد نے  
اپنے استاد کا مرتبہ بڑھانے کے لئے یہ لکھ دیا ہے ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ معروف مرحوم جن کی عمر وقت  
ساتھ کے لگ بھگ تھی استاد ذوق سے جو تیس بیس سال نا تجربہ کار اور نو مشق شاعر تھے صلاح عینیت بہر  
آپ جیات میں مولانا آزاد یہ فرماتے ہیں:-

”نواب الہی بخش خاں معروف جو ایک عالی خاندان امیر تھے مرحوم فردوسی سے باہر درکنہ مشق شاعر  
تھے اس لئے جہاں تناغ نیک دیکھتے تھے نہ چھوڑتے تھے نہ ان کی درازی نے سات شاعروں کی نظر سے  
ان کا کلام لڈرانا تھا۔ چنانچہ ابتدا میں شاہ نصیر سے اصلاح لیتے رہے اور پھر سدید علی خاں غمیں وغیرہ وغیرہ  
استادوں سے مشورہ ہوتا رہا۔ جب شیخ مرحوم کا شہرہ ہوا تو انھیں بھی اشتیاق ہوا یہ موقع وہ تھا کہ نواب مرحوم  
نے بل فخر کی صحبت دہرکت سے ترک دنیا کر کے گھر سے بکھنا جی چھوڑ دیا تھا چنانچہ استاد مرحوم فرماتے تھے  
کہ میری عمر تیس بیس برس کی تھی گھر کے قریب ایک قدیمی مسجد تھی نلہر کی نماز کے بعد وہاں بیٹھ کر وظیفہ پڑھتا رہتا  
تھا ایک چوبدار آیا اور اس نے سلام کیا اور کچھ چیزیں دال میں لپی ہوئی میرے سامنے رکھ کر بیٹھ گیا وظیفہ  
فاتح ہو کر میں نے اسے دیکھا تو اس میں ایک خوشہ انگوڑ تھا ساتھ ہی چوبدار نے کہا۔ نواب صاحب نے دعا فرمائی  
ہے۔ یہ تبرک بھیجا ہے اور فرمایا آپ کا کلام تو بہتر ہے مگر آپ کی زبان سے سننے کو جی چاہتا ہے شیخ  
مرحوم نے وعدہ کیا ورنہ میرے دن کثرت لے گئے وہ بہت اخلاق سے ملے اور بعد گفتگو کے معمولی کے  
شعری فرمایش کی انھوں نے ایک غزل کہنی شروع کی تھی اس کا مطلع پڑھا سنکر بہت خوش ہوئے اور  
کہا خیر حال تو پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا مگر تمہاری زبان سے سن کر اور مطبقت حاصل ہوا اس دن سے محو ہو گیا  
کہ ہفتہ میں دو دن جایا کرتے اور غزل سنایا کرتے تھے چنانچہ دیوان معروف جواب راج پھوہ تمام و کمال اس  
مرحوم کا صلاح کیا ہوا ہے۔ نواب مرحوم اگرچہ ضعف پرستی کے باعث خود کاوش کر کے مضمون کو لفظوں میں

بٹھا نہیں سکتے تھے مگر کچھ عین وقایف کو یہ پہنچتے تھے کہ بہت سے سام میں سنا مردوم کی جوان طہیت  
اور دین کی کاوش ان کی زایش کے کلیہ نکتہ کافی دکرتی تھی شیخ مردوم کہ رتے تھے گرچہ بڑی کوششیں  
”ٹھانی پڑیں نہیں ان کی خواب ہانے میں ہر آپ ہیں گے“

لیکن بعد یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک کند مشق ورن شعر کے نکات در مورسے واقف شاعر یک باج کا  
فرشتہ نوجوان ست اصداغ س مونا آزاد نے جو داتو اپنے تذ شیخ ذوق مردوم سے نوب کیا جو ہیں  
بھی تذ ذوق کے پتہ شعر سنانے در محدث مردوم کی توفیق ہی کا تذکرہ ہے اصداغ دینے کا ہیں  
ذکر نہیں ہوں یہ ممکن ہے کہ شیخ مردوم نواب صاحب موصوف کے پاس استفادہ کی غرض سے جاتے ہوں۔  
عارف کے پچھلے عارف کے دو پتے تھے باقری علی خاں وحید علی خاں۔ عارف کے انتقال کے  
بعد غائب اور ن کی بیگم صاحبہ حسین علی خاں کو بٹیا بنا کر اپنے گھر آئے۔ جب عارف کی والدہ نبیاد ہی تھی  
کا انتقال ہو گیا تو باقری علی خاں بھی غائب کے ہی پاس چلے آئے۔ غائب کو ان دونوں بچوں کے ساتھ  
بہت بہت تھی خصوصاً حسین علی خاں غائب کے بچہ لاڈلے تھے۔ حضرت غائب جیسی حسین علی خاں کی  
ناز برداری کرتے تھے وردہ ن پر جو ناز فرزند کرتے تھے اس کے لکھنے کے لے لگ یک کتاب  
در کار ہے۔

باقری علی خاں کی عم عارف مردوم کے انتقال کے وقت پانچ ساں کی اور حسین علی خاں کی تین  
ساں کی تھی باقری علی خاں اردو فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے فارسی میں بقراور اردو میں کامل تخلص کرتے  
تھے بہت ہونہار در صداقت جون تھے باقری علی خاں کی شادی نوب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں  
کی صاحبہ دی منڈ زانی بیگم سے سترہ ساں کی عمر میں ہوئی۔ ان کی انبیت عارف مردوم پنی زندگی میں  
ٹپے کر چکے تھے در یہ ننگنی نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں اور نواب زیر عابدین علی عارف  
کے گھر آرٹھ باط و خلوص کا نتیجہ تھی۔

نواب صاحب مرحوم نے اپنے عزیز دوست کے انتقال کے بعد بھی اپنے قول کو نباہا اور اپنی سخت جگر  
 نور نظر کو نواب باقر علی خاں سے بیاہ دیا۔ شادی کے بعد نواب ضیاء الدین احمد خاں تیرہ خٹاں داد کی ہر طرح  
 کفالت کرتے رہے مگر اس غیور جوان نے یہ کسی طرح مناسب نہ سمجھا کہ پناہ بکسر کے سر پر پاؤں دے اور  
 شادی کے تین سال بعد میں سال کی عمر میں۔ راستہ میں ہمارا جہ شیوہان سنگھ کی سرکاری ملازمت کرنی۔  
 معلوم ہوا ہے کہ باقر علی خاں غائب کی زندگی میں ہی ملازم ہو گئے تھے۔ اور دو سال بعد میں ان کے ہاتھ میں خط  
 ملا۔ پہلے خط میں ان کے برسرِ روزگار ہونے پر خوشی کا بیان کیا ہے۔ دوسری ہی سبب بکسریں لکھتے ہیں  
 تمہاری دادی اچھی ہیں تمہارا بھائی چھیڑتا ہے تمہارے عمر میں سب طرح نیریت ہے تمہاری بڑی اچھی  
 ہے کبھی روز کبھی دوسرے قیسرے۔ وزیر سے پاس آجاتی ہے۔

ہمارا جہ شیوہان سنگھ بہت تندرست رہا۔ پہلے باقر علی خاں کو مصباحوں میں بیا بھر جلدی فوج میں  
 لے کر پٹان کے عہدہ پر متنازع کر دیا۔ باقر علی خاں فنونِ سپہگیری میں جی اہر تھے۔ ورثہ کا نیکو نواب  
 لکھتے تھے۔

نواب شہاب الدین خاں ثاقب کے انتقال کے بعد نواب ضیاء الدین احمد خاں تیرہ خٹاں داد  
 کو لے کر سے بلایا کیونکہ وہ خود جوانی کے غم سے دل نہ لگتے ہوئے تھے۔ اور مورخہ بہت ہی مٹانے والا  
 نہ دے سکتے تھے۔ لائق دادا نے یہ سب بار اپنے سر یا اور تازیت س میں منہمک رہے۔ فوس  
 سین عالم شباب میں اٹھائیس برس کی عمر میں صرف سات۔ دو تپ وق میں تندرست رہے۔ گرنے کا دم نہ ہوا۔  
 نواب باقر علی خاں نے تین لڑکیاں چھوڑیں بڑی صاحبزادی محمد سلطان بیگم کی تاریخ پیدائش  
 بدھین میں موجود ہے ان صاحبزادی کو حضرت غائب بہت عزیز رکھتے تھے اور مرزا چوہدری بیگ کہتے  
 تھے کہ اس غائب کی وفات کے وقت چار سال کا تھا ان کی شادی نواب باقر علی خاں کی وفات کے  
 ایک سال بعد مرزا شجاع الدین احمد خاں آباں خٹاں نواب شہاب الدین خاں ثاقب سے ہوئی۔



نہ سلطنت بیکر صاحبہ حیات میں ن کے کوئی درد نہیں سمجھتی صاحبہ جزادی فاطمہ سلطان بیگم کی شادی نواب  
بیر مدین احمد خان غلط فخرالدولہ رستم بنگ نواب احمد خان عدلی سے ہوئی، ان کے ہاں دو صاحبزادیاں اور دو صاحبزادے  
تولد ہوئے۔ فاطمہ سلطان بیکر صاحبہ نے ۹۳ سال کی عمر میں بوائزہ فوج انتقال کیا۔ انکی چھوٹی صاحبزادی فخر سلطان بیگم  
محبوب تھیں مزار انوار الدین اعظم ولیعہد نواب غلط نواب سر میر الدین احمد خان سے، انھوں نے بھی چھ نور و سال بچہ  
چھوڑ کر میں سال شہاب میں چوبیس سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ان کے صاحبزادے نواب سر امین الدین احمد  
نائبی بنائے گئے۔ یہاں پر ہیں، بڑے صاحبزادے معز الدین مام مزار سے پختہ بیس سال کی عمر میں انتقال  
کیا۔ بڑی صاحبزادی فاطمہ سلطان اور چھوٹے صاحبزادے سر الدین خسرو مزار بفضلہ تعالیٰ موجود ہیں۔

باقری نواب کا ف کی چھوٹی صاحبزادی رقیہ سلطان بیگم، بیگم انیسٹ کرنل ذوالنور علی احمد حیات میں  
نواب محترمہ، فاطمہ نواب غیا، مدین احمد خان بیرنشاں کی صاحبزادی نواب مدین، صاحبزادین خاں  
مہر کی بڑی بیوہ، خاندان کی ایک ایسی فرد جنھوں نے حضرت نواب کی باتیں سنیں اور انھیں پچھتم خود  
دیکھ کر بہرہ بردار حضرت نواب کے گھر میں ہیں بفضلہ تعالیٰ حیات میں۔ ملامت نواب کا مکہ اپنے کرم و لد سے  
تکرم میں پڑا ہے۔ ان ضعیفی میں بہرہ بردار کما شکر ہوئے کے، وجود حافظہ بہت تیز ہے۔ موصوفہ کی عمر  
اب ۹۵ سال کی ہے۔ گلی کا سمجھان میں اپنی طہر خیا ستر میں رہتی ہیں۔ اپنے بزرگوں کی شان اور عہد  
قدیم کی مدت و خلاق و رغبت پروری کا علی نمونہ ہیں۔ نواب کے شہیدانی کثران کی خدمت میں حاضر  
ہو کر استفادہ کرتے ہیں۔

مات کے چھوٹے صاحبزادے نواب حسین علی خاں جو شاداں تکمیل کرتے تھے حضرت نواب کے  
نائب مدین احمد خان غلط فخرالدولہ رستم بنگ نواب احمد خان عدلی سے ہوئی، ان کے ہاں دو صاحبزادیاں اور دو صاحبزادے  
تولد ہوئے۔ فاطمہ سلطان بیکر صاحبہ نے ۹۳ سال کی عمر میں بوائزہ فوج انتقال کیا۔ انکی چھوٹی صاحبزادی فخر سلطان بیگم  
محبوب تھیں مزار انوار الدین اعظم ولیعہد نواب غلط نواب سر میر الدین احمد خان سے، انھوں نے بھی چھ نور و سال بچہ  
چھوڑ کر میں سال شہاب میں چوبیس سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ان کے صاحبزادے نواب سر امین الدین احمد  
نائبی بنائے گئے۔ یہاں پر ہیں، بڑے صاحبزادے معز الدین مام مزار سے پختہ بیس سال کی عمر میں انتقال  
کیا۔ بڑی صاحبزادی فاطمہ سلطان اور چھوٹے صاحبزادے سر الدین خسرو مزار بفضلہ تعالیٰ موجود ہیں۔

”آپ فکر نہ کریں دادا جان ہم ضرور شعر کہیں گے۔ لیکن غائب کے بیٹے کو سوچنے کی کیا ضرورت ہے۔“  
شاعرہ ہونامی گرامی شعرائے دلی کی تباہی پر دردناک نظمیں لکھی تھیں اور بہت سوز و گداز سے سنا  
سہے تھے۔ پورا مجمع راکت تھا اہل شاعرہ پر افسردگی طاری تھی۔ دلی کی تباہی، عزیزوں و دوستوں کے  
پھٹ جانے کا خیال دل خون کئے دیتا تھا یکایک غائب نے شاداں کی جانب نظر نہائی مجمع کی نگاہیں اس  
نور نظر پر لگ گئیں کہ دیکھیں غائب کی گودوں کا چاک کیا کتاب ہے شاداں نے صاف اور پیاری آواز میں جرات  
آمینہ آواز سے کہا۔

خوب ہوا سٹ گیا جو نام و نشان دہلی      میری پاپوش بنے مرثیہ خوان دہلی  
اس شعر کو سنتے ہی شاعروں میں اس سرے سے اس سرے تک زندگی کی مردوزگی افسردہ پہروں پر شہنشاہی  
آگئی اور حضرت غائب نے اس ہونہار کو گلے لگا کر پیار کیا۔ حسین علی خاں حضرت غائب کی وفات کے بعد  
نواب کلب علی خان الی راہپور کی سرکار سے وابستہ ہو گئے اور ان کی شادی غائب کی وفات کے بعد نواب  
عارف جان کے پوتے نواب حسن علی خاں کی صاحبزادی سے ہو گئی۔

اپنے بڑے بھائی نواب باقر علی خاں کامل کے انتقال کے بعد حسین علی خاں کا دامانی تو زن بزرگ  
تھا لیکن اس عاں میں بھی جو شعر کہتے تھے ان سے دماغی فوٹو کا انبار نہ ہوتا تھا۔ اپنے بڑے بھائی کے انتقال  
کے ساڑھے تین سال بعد دہائی سال غایبہ سل میں مبتلا رہ کر انیس سال کی عمر میں وفات پائی۔ دو دیوان  
اپنی یادگار چھوڑے تھے جو بعد میں تلف ہو گئے۔

عارف کے شاگرد [عارف مرحوم کو خط نسخ لکھنے کا شوق ہوا تو یہ میر جلال الدین خوشنویس (یہ اپنے  
دقت میں خط نسخ لکھنے میں یا قوت ثانی تھے) استاد بہادر شاہ ظفر کے پاس حاضر ہوئے۔ انبار شوق کے بعد  
استدعا کی کہ زمرہ شاگردوں میں داخل کیا جاؤں حسن اتفاق اُدھر تو اس زمانہ میں عارف کی خوش کلامی کا شہرہ  
تھا اور دہر میر صاحب کے دونوں صاحبزادوں نواب مرزا صاحب ظہیر اور مرزا رضا انور کو شاعری

کا شوق تھا۔ ایک ایسے استاد کی توفیق تھی۔ میر صاحب کو یہ چھابو قہ دُنخوں نے جو ب میں کہا کہ میں تم کو یوں تو  
تاگر دکت نہیں ہوں بہانہ کرتا ہوں میں تو کو خط نسخ کی صورتوں میں کے انصوں میں توں تو میرے ہر  
کو شادی کے رمز ہر دو در اس کے نکات بھی و مانتے منظور کر پیا اور یہ معاملہ طے ہو گیا۔ مانتے  
نسخ کی یہی مشق کی کہ ایک سال کے اندر اس نے اصلاح دینی چھوڑ دی اور سند خوشنویسی لکھی مگر  
یہ دونوں استاد از دست تازیت مانتے مرحوم سے اصلاح لیتے رہے کیونکہ دونوں فطرت شاعرانہ رکھتے  
تھے تھوڑے ہی عرصہ میں کچھ سے کچھ ہو گئے مانتے کی وفات کے بعد ہر شاہ و جنت آرا نگاہ نے اپنے اشنا  
ذوق کا دونوں کو شاگرد کر دیا۔

مارف اور داغ | نوب مز فاس داغ نے بھی جو بعد میں بل ہندوستان اور جہان استاد کے مقب  
سے مشہور ہوئے۔ پہلے زانوے نوب مانتے کے سامنے نہ کیا۔ داغ کی عمر نہ پندرہ سال کی تھی کہ خوش قسمتی  
سے ان کو نوب خیا ندین احمد خان تیرہ برس جیسے عمر و دب کے شیر اور کامل فن کے قریب کا فخر حاصل ہوا  
اور ان بزم و دب میں شرکت کا موقعہ درجہاں ہر وقت شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا چنانکہ قدرت نے داغ مرحوم کو  
ایک روز ان کشتی تھی یہی سورتیں کہ فحش ہو سکتے تھے تھوڑے ہی عرصہ بعد سخن طراز ہی کی جانب مائل ہوئے  
ہو نہاد ہر دو کے چٹنے چٹنے پاؤں نوب فیض احمد فیض نے ان کو نوب ہرانی کا بل پڑا تو مانتے کا  
شاگرد کر دیا مزار انحصار کیا گیا یہ شاگردی چند دنوں کی پیش کش پر نہ تھی بلکہ حضرت داغ کی وید  
نے ان جب صاحبوں کو چور و زور میں شامل ہوتے تھے پرتکلف دعوت دی اور سارے دوستوں و اہل  
میں شیر نیا تیرہ کی کامل فن مانتے مانتے مرحوم سے اصلاح لیتے تھے س کے بعد واقعات نے پٹا کیا۔ داغ  
کی قسمت کا شمار و چمکا قلم مطلق میں ان کے یو پتے ہی صاحب مانتے مانتے مانتے مانتے مانتے مانتے مانتے  
داغ کے سر پرست بن گئے صاحب مانتے مانتے مانتے مانتے مانتے مانتے مانتے مانتے مانتے مانتے مانتے  
پسند کیا۔ اور اپنے استاد یعنی حضرت ذوق کا شاگرد کر دیا۔ جب ذوق نے مزار کو پناہ گزین کیا تو بجا ہے مزار



کے داغِ تخلص رکھا نہ کہتے سچ جانتے ہیں کہ اس تخلص کی تبدیلی میں استادِ ذوق کی کیا مصلحت پوشیدہ تھی۔

آؤر تھیرا داغِ یہ تینوں جو ہر پارے جوستانِ ادب پر ہر تلوں صورتِ شاں بہت مارت مرحوم کی اصلاح سے بنے بنائے تھے ترنماںِ ذوقِ مرحوم کے ہاتھ آئے چنانچہ اہل نظر پرکھ سکتے ہیں آؤر در تھیر کے کلام میں شستِ الفاظ، در ترکیب و بندش وہی ہے جو قائبِ مرحوم کے خونِ نعمت کے ریزہ چھینوں کا خاصہ ہے ہاں داغِ اس نعمت سے محروم ہیں مانبا اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ملی استعداد کم تھی۔

مام وگوں میں جزہ بان بولی جاتی تھی دو واقعی اس کے دمدادہ ہو گئے تھے گرزبانِ ناس کی فطری شوخ طبعی کے ساتھ مل کر سونے پر سیاہی کا کام کیا در ان کے اس تیکھے لہاز پر ایک زراہِ والدِ شید ہو گیا مگر داغ کا یہ حسنِ کلام غزل تک محدود ہو۔ قصائد وثنوی بہت پست ہیں لیکن آؤر ذلیہ قادیان کا کلام شاعر تھے۔ تمام اصنافِ سخن میں ان کی طبیعت کی۔ دنی کیساں تھی۔ جو کچھ کہتے تھے ہوا کہتے تھے۔

عارف کی بزمِ ادب | عارف کی بزمِ ادب میں نواب مصطفیٰ خاں سیفستہ، مرزا غلام حسین خاں مخدوم طغیاں

دشتِ شیخ امام بخش صہبانی یرمندی بروج نواب ضیاء الدین احمد خاں یرمخاں جیسے کاملین فن جمع ہوتے تھے مارت خود شاعر تھے در شعر کے پرستار شستہ مٹل ہوتی تھی دب، ادب کا خیال مخطوطہ مرتب کا حافظ پور پورا کیا جاتا تھا اس لئے ان کا دلدندہ مرجع اہل فضل و کمال تھا خصوصاً نواب ضیاء الدین احمد خاں یرمخاں سے تو بہت گہرا ارتباط تھا رشتہ دار ہونے کے علاوہ یہ دونوں صاحبِ ہمدان تھے دونوں فہمیت سے فاغ ہاں اور علم و دب کے دلدادہ تھے اس لئے کبھی وہ ان کے ہاں بھی یہ ان کے ہاں۔ شعر و شاعری و علم و ادب کے ذکر اذکار کے سوا کوئی اور مسئلہ نہ تھا۔

دیون مارت کا اصلی نسخہ بھی نواب ضیاء الدین احمد یرمخاں کے کتب خانہ میں تھا نواب صاحب موصوف کا کتب خانہ جو پیش بہا کتب کا ذخیرہ تھا و جس کی بابت حضرت نواب نے فرمایا ہے کہ ذکر و عرض کرتا ہوں میں ہزار کی مالیت کا ہو گا اندر کے عالم آغوشِ زمانہ میں ورق و رق ہو کر برباد ہو گیا۔

عارف مرحوم کو شاعر کے کرنے کا بہت شوق تھا۔ مشاعرے کرنا اور ان کو خوش اسلوبی سے انجام دینا انہی کیسے نہ تھا تاہم شہزادے سعد حسین زادے اور اتار دن فن شریک مشاعرہ ہوتے تھے ان کی یہی چشمہ کی بردست ان سب کا سنبھالنا و بحفل کا نظم و مریکھا ایک بہت مرتبہ طبیعت ہی کا کام تھی عارف مرحوم جب کبھی میر شاعر ہوتے تھے اس خوش اسلوبی سے تمام کرتے کہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ملتا اور مشاعرہ بخیر و خوبی ختم ہوتا۔

### عارف کی وفات

عارف نے سن ۱۲۸۵ میں ۴۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔ وفات اچانک طور پر واقع ہوئی یوں تو عارف معمولی شکایت تھیں مگر سے بہتی تھیں اور عارف لاغر ہو گئے تھے لیکن یہ شکایت ایسی زیادہ نہ تھیں جن سے ان کی زندگی کی جانب سے کسی کو فکر لاحق ہوتا۔ اس میں مینے قبل چھپتی ہوئی ہستی بگم کا انتقال ہو جانے سے عارف کو جو صدمہ ہوا تھا اس کا زخم ابھی تازہ تھا ایک روز جو صبح بیدار ہوئے تو طبیعت پر آش تھی تھوڑی دیر بعد خون کا استفراغ ہوا پھر تو یہ سلسلہ بند نہ گیا شہر کے امی گرامی ملہا کا ہجوم تھا جیسے جیسے بدشاہی بھیب اس جاننا خوش فہم ہو گئے پچھلے کی ہر روز کو شش کر رہے تھے لیکن قضا و قدر سے کس کو چاہے کوئی تدبیر کارگر ہوئی نہ کسی دوائے کا کیا دور روز سی حال میں گزے تیسرے دن کی صبح پیغام قضاہلی و رحمت ملک الموت کے پیر مت فصول کی پہنچ کر گلشن جناب کی طرف پہنچ رہی ہوئے اور ان کا یہ شعر ان کے حسب حال ہوا ہے

کھینچے سے دن میں عارف مار مار کر سیر اب تو کچھ اس خاکدان میں دل بہت گہرا ہے  
غائب کے وجہ کا یہ شعر ان کی فوری موت کا منظر سامنے آتا ہے۔

یہ تھے حرب کون سے تو دوست کے کہ ملک الموت قضا کوئی دن اور  
دیوان عارف کے قلمی نسخے | ان مرحوم کا کلیات ان کے زمانہ حیات میں مرتب ہو چکا تھا یہ نسخہ زو اب  
خز الدین حسن خاں خسر و عارف مرحوم کے چچا داد بھائی کے ہاتھ کا کئی ہوا تھا جو زو اب ضیا الدین احمد خاں

نیرنشاں کے خاص کاتب تھے عارف کی وفات کے بعد ان کے کلام کا بقیہ حصہ بھی اسی کلیات میں شامل کر دیا گیا تھا افسوس کہ یہ نسخہ نواب ضیا الدین احمد خاں نیرنشاں کے کتب خانہ اور خزانہ عامرہ کے ساتھ مشن کے ہنگامہ میں تلف ہو گیا بعد کے بعد جب نواب صاحب موصوف دلی واپس آئے تو اپنی گم گشتہ کتابوں کی تلاش میں مصروف ہوئے حسب اتفاق دیوان عارف کے چند اجزاء اسے پریشاں جن میں اکثر اوراق نکلے تھے پھر ملے آئے نواب صاحب موصوف نے ان کو نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر ہاتھوں ہاتھ لیا اور پھر عارف کے کلام کی ترتیب شروع کی جو کچھ ممکن ہوا انہوں نے اس سے نکالا اور جو کچھ خود ان کے حافظہ میں محفوظ تھا وہ جتہ جتہ لکھوایا کچھ مسودے نواب خزانہ الدین حسن خاں کاتب مذکور نے اور کچھ مرزا غلام حسن خاں کو برادر خور و عارف مرحوم نے دیئے المختصر جہاں سے جو کچھ میسر آیا اس کو لیکر ترتیب وار مرزا بھور سے لکھوایا۔ مرزا بھور سے بہت غلط نویسی تھی مگر اور کوئی اچھا کاتب اس وقت نہ ملا نواب خزانہ الدین حسن خاں کو یہ سبب پیری صوف بصارت ہو گیا تھا۔ نقل کے بعد حتیٰ اوسع وقت بلکہ صحت میں کدو کاوش کی مگر پوری تصحیح اس لئے نہ ہو سکی کہ نواب صاحب موصوف اپنے خلف اکبر نواب شہاب الدین خاں عارف کی عیادت سے پریشاں خاطر تھے۔ تھوڑے عرصہ بعد جب ان کا انتقال ہو گیا تو نواب صاحب جو امرگ بیٹے کے غم سے بے دل نکلے ہوئے کہ کسی طرف توجہ نہ دیتے تھے دار و نہ کتب خانہ میر غالب علی نے بیجا کچھ تھا بلند ہو کر دیوان عارف داخل کتب خانہ کیا اور منتظر رہے کہ کوئی اور نسخہ دستیاب ہو جائے تو پھر اس کی تصحیح میں کوشش کی جائے اس اثناء میں یہ دیوان نواب باقر علی خاں کامل خلف اکبر عارف مرحوم نے نواب صاحب موصوف سے مانگ لیا داد اسے نواب صاحب انکار نہ کر سکے۔ باقر علی خاں اور میں ملازم تھے وہاں چلے گئے وہاں سے واپسی کے تھوڑے عرصہ بعد بیمار ہوئے اور انتقال کر گئے نواب صاحب نے اس حال میں ایک کتاب کا مطالبہ یہ وہ بیٹی سے مناسب نہ سمجھا نواب صاحب موصوف کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادہ نواب سعید الدین احمد خاں طالب نے اپنی ہمشیرہ سے دیوان مانگا تو انہوں نے کہا مجھ سے نواب شجاع الدین خاں با



لے گئے ہیں۔ نواب صاحب نے بھیجے سے جب دیوان طلب کیا تو انہوں نے صافٹ لکھا اور دیوان مذکور  
کی بہت دہائی ہوئی ہر صورت وہ مجبور کلام صافٹ چرچا۔

ایک روز حسن تفاق سے "اسٹریٹ" صاحب مصنف تذکرہ مخفیہ جاوید نواب صاحب سے ملے گئے  
تو انہوں نے گفتگو میں معروف دیوان کے کچھ کافز پڑھ کر انہوں نے فرمایا میرے پاس دونوں دیوان موجود  
ہیں نواب صاحب نے دونوں دیوان منگائے دیئے تو وہی تھا جو نواب ضیاء الدین صاحب  
میرزا شاہ نے جمع کیا تھا۔ نواب صاحب مرحوم کے قلم سے لکھے ہوئے الفاظ اس پر شاہ صاحب موجود تھے  
خیر نواب صاحب نے اس دیوان کی نقل پھر سید میر صاحب کاتب سجادہ نشین درگاہ شاہ مرداں سے کر لی مگر  
خط نویسی میں وہ مرزا بھروسے کے جی استاد کے مثل بددست میں بڑی مشکل واقع ہوئی۔ نواب صاحب فیضی کے  
دست اور اپنے شیریں تنبی کی دست کی وجہ سے زیادہ محنت نہ کر سکتے تھے۔ نواب سراج الدین احمد خاں  
ڈاکٹر محمد سمیل خاں ذبیح نواب سید اکبر مرزا صاحب کی نظر سے اس دیوان کی منت کی گئی۔ انہوں نے  
مثنوی بہکان میں کتبستان کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا۔ نواب یہ دیوان جو نواب سید حسین خاں صاحب مرحوم  
نے ترتیب دیہ وہ جس کی تصحیح انہوں نے کی نواب باقر علی خاں کامل کی بڑی صاحبزادی دربارت مرحوم  
کی یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھیں۔ نواب سید حسین خاں صاحب نے نواب صاحب سید حسین خاں صاحب  
میرزا شاہ صاحب کے ترتیب کردہ دیوان جو "اسٹریٹ" صاحب کے کتب خانہ میں تھا لالہ صاحب معروف کے  
دست سے معلوم ہو بنا۔ اس یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ہے۔

ردو شعر کے تذکرے اور صافٹ | تذکرہ شعرات ہندو متعلقہ ہیں مولوی کریم الدین صاحب  
خاں کے متعلق لکھتے ہیں۔

صافٹ شخص: "نواب حسین خاں خواہر" "نواب سادات خاں مرزا شاہ صاحب کے  
ہند میں غیرت شعرا کی اس سے ہی طور پر ایک دیوان بھی لکھا۔ مگر بعد ازاں نواب سادات خاں مذکور کے

اکبر آباد سے نصیر سے اصلاح یعنی چھوڑ کر ان کی خدمت میں رہنا شروع کیا انہوں نے اپنے ڈھنگ پر ان کو کتب فارسی کی تعلیم اور اصلاح شعر کی بھی دی۔ چنانچہ بہت دنوں کے بعد ایک دیوان مسمیٰ مطلع مرصادتِ نوب نے فراہم کیا۔ اس میں قصائد اور قطعات اور غزلیں اور مثنویں اور ترجیع بند مثنویں اور مسدس اور بحر و غیرہ بہت موجود ہیں میں نے بھی وہ دیوان دیکھا ہے اس کو کلیات کہنا چاہئے۔ حقیقت میں یہ شاعر بڑے سب سے کا ذیہندہ اور قابل و لائق تحسین اور آفریں کے ہے۔

فارسی میں بڑی دست قدرت رکھتا ہے۔ جن ایام میں کہ میرے چھاپے خانہ میں شاعر ہوا کرتا تھا۔ یہی شاعر میر مجلس اور میر شاعر مقرر تھا اور اس کے اشعار میں نئے گلدستہ نازینات میں بھی مستخرج کئی ہیں اب ان ایام میں بہ سبب جدتِ ذہن اور تیز بینی فکر سخن کے جو کہ کر مثل کاٹھا ہو گیا ہے بہت اُجڑا ہوا ہے لانا قد ہے۔ ڈارمی بھر کر نہیں نکلی ٹھوڑی ہی پر کچھ بال ہیں خُلق اس کا بہت اچھا ہے۔ اگر کوئی اس سے ملاقات کرے بہت خط اٹھائے۔ فی البدیہہ کہنے کا بھی ذوق ہے۔ تاریخ کہنے میں بہت اچھی قدرت ہے۔ مادہ بھی اچھا نکالتا ہے۔ چنانچہ میری کتاب گلدستہ نازینات کے تمام پر دو مائتھیں اسی نے لکھی ہیں۔ ایک اردو دوسری فارسی ایک مصرعہ اردو سے کیا اچھی تاریخ نکالی ہے۔ دہریہ ہے۔

کہو گلدستہ گلزارِ جنت

اس مصرعے اس کتاب کے تمام کی تاریخ نکلتی ہے۔ اور اس کا جو بحرِ سخن دریافت ہوتا ہے۔ غرض کہ شعر کہنے میں قدرت اسی نے پائی ہے کہ کوئی غزل بجز ساٹھ اور انتی شعر کے پر مضامین رنگا رنگ میں نہیں کہتا۔ اور سب اچھی پر مضمون نئے انداز پر ہوتے ہیں۔ نواب ضیاء الدین خاں بہادر سے کہاں رہتا تھا اور صحبت اس کو رہتی ہے۔ چونکہ دونوں صاحبِ وجہ معیشت سے فارغ اور نواب زادے ہیں باہم شعر و سخن کا چرچا اور صحبت رکھتے ہیں۔ اس سال میں سلاطین سے عمر اس کی قریب تین برس کے ہے یہ اشعار شاعر مذکور کے ہیں۔ جو شاعرے میں میرے مکان پر پڑھے تھے۔ واضح ہو کہ یہ شاعرہ میرے

مکان پر چوبیس تاریخ ۱۰ رجب ۱۲۶۱ء میں شروع ہوا اسی سال درمیان ماہ ذیقعدہ کے بہ سبب ہر دینا  
 دن اتفاقی شرکاء کے ذمہ کے شریکوں نے ٹھہ سے کی تھی۔ اور میرا مال و بار نصب کر کے مجھ کو بے قبضہ  
 کر دیا تھا۔ موقوف ہوا۔

جب تک وہ مشن میرے پاس رہا شاخہ پندرہویں روز چھپا کیا۔ شریکوں نے ہر ایک چھپا۔ ہر  
 نینے دو پرچے نکال کر رکھے تھے۔ اس میں ہر ایک شریک حوالہ لکھنے کا راہ تھا کہ پچھوں کے واسطے ایک  
 تذکرہ بند تیار ہو جائے۔ مگر میرے شرکاء نے جو جاہل تھے اس امر کے مانع کر رکھ دیا۔ جسے پیدائش  
 در وطن مارف کا شاہجہاں آباد ہے لڑکپن سے آج تک یہیں ہے کہیں کا سفر نہیں کیا مکان ان کا  
 لال کنوئیں پر ہے جو مدرسے کے نام سے مشہور ہے

فارسی شعر بھی اچھے کہتے ہیں۔ علم و عقل مروت و راہیت شرافت اور محبت سے گریبان کا خیر  
 ہے مروت جوئی کہ اب ان سے میری ملاقات نہیں ہوتی۔ نقطہ  
 تذکرہ گلستان سخن | موعظہ شمس میں تحریر ہے۔

عارف شمس زو اب زین عابدین خاں مرحوم نصرت رشید زو اب غلام حسین خاں قمر و رہسور  
 تخلص۔ شاگرد مراد احمد خاں صاحب شعر شد توفی زبان و دو کوہم پدہ فارسی در مضامین شعر کوہم پایہ  
 ملکیت ردیا تھا۔ زمینیں سخن سے کاغذ ہر نگہ گل و در و پذیریں کلام سے قلم شمار مہبل۔ اصناف سخن پر  
 قدرت و در انواع کلام پر اقتدار غزل صحرائے ٹوخی کا غزل قصیدہ گلشن شانت کا ہمالی غنم کلام  
 کے واسطے خاص۔ بی۔ نند غنا سرور بد پیکر سخن کی اساس شمس میں رخت سفر باندہ کر گلشن خاں  
 کی طرف ہیں۔ یہ تین تین کی آراء و افات ہیں ان مہبل بہت ہمت کی تائید ہے۔ تا ثانیات تذکرہ  
 ای تمام کی یہ تین تفادات پر مطلع ہو چکے ہیں۔ کاش عارف کے احوالی میں تجاہل مار فائدہ کو کام  
 نہ دے میں دیوان نغمہ اس سے یادگار ہے یہ چند شعرا انتخاب ہو کر مرقوم ہوئے۔



آثار الصنادید | مؤلفہ ۱۲۷۳ھ میں سرسید مروجہ تحریر فرمائے ہیں۔

نواب زین العابدین خاں بہادر عارف تخلص نہاں مدتیہ دوست باہی مہانی خستہ پہل چٹان  
 سنواری طوطی سکرستان یعنی پردی ہمسر سپر کمال۔ دستگیر آئینہ اقبالی سخن پنج معنی پناہ ہنر پرور کمال  
 دستگاہ۔ بند پایہ رفعت سرا یہ رکن بنائے جاہ و ثروت معراج عروج جہت و عظمت زبدۃ اراکین  
 روزگار قدوۃ ارباب دولت ملک و دیار مقبل جہاں مقبول جہانیاں۔ نواب زین العابدین خاں عارف  
 تخلص خلع رشید نواب غلام حسین خاں بہادر۔ ابن شرف الدولہ نواب فیض اللہ بیگ خاں بہادر  
 سہراب جنگ نے۔ مرزا اسد اللہ خاں نالاب کی خدمت میں مشق سخن ہم پونچائی ہے۔ اور تحقیق قانع  
 علمی اور تفتیش محاورات انہیں کی خدمت فیض نسبت میں کی ہے۔ باوجود ناز و نعم ثروت کے س  
 فن میں محنت و مشقت کو اس درجے تک پہنچایا کہ عربی سے داسن گرداب ہو گیا۔ اور آئین بیضا  
 اور فی الحقیقت اس فن میں وہ کمال حاصل کیا کہ شعرائے زمانہ قیام پائی تیر و سودا قاکم و کلیم اگر اس زمانے  
 میں ہوتے بیشک اس زبدۃ اہل کمال کے سامنے زانوئے شاگردی نہ کرتے۔ فی الحقیقت کہاں  
 کی علامت اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ شاگرد پر استاد کو ناز ہے۔ اور کیوں نہ ہو کہ ان کی وضع جدید نے  
 اساتذہ کی کئی طرزوں کو آب عرق سے دھو دیا۔ اور مضامین بیگانہ نے طبیعت اہل علم کو ان طرزوں سے  
 قطعاً نا آشنا کر دیا۔ اب وہ روزگار ہے کہ ہر سمت میں علم و کمال و ہنر اسی صاحب علم کا بند ہے۔ پہل چین  
 میں اگر کچھ بولتی ہے۔ یا غزلہائے عاشقانہ اس زبدۃ کمال کے پڑھ کر چاہتی ہے کہ اس کے اثر کے وسیلے  
 سے گل کو مہربان کرے۔ یا زمرہ سے قدوۃ ارباب معنی کی نقاں کا و قلعہ زبان رکھتی ہے۔

اب ان دو کلموں پر اکتفا کر کے چند شعر لکھا ہوں تاکہ حقیقت اس صاحب کمال کے کمال و  
 ہنر کی اہل ہنر پر واضح ہو جائے۔ بیت — ایں صد جلال بکثائی دیا چہ صد خیال بکثائی  
 عین ایام شباب میں بھر چل ساگی ماہ جمادی الثانی ۱۲۶۵ھ میں بمرض رعافہ و اسہال و فاقہ پائی و

دور کے خور و ساق چھوڑے کہ جن کی پردہ نش غالب مظلہ فرماتے ہیں۔

عارف کے تعلق مانند | عارف مرحوم کی زندگی، ان کی شاعری اور حضرت غالب سے ان کی قرابت

اور یہی میل جول کے متعلق جو محال بات لکھے گئے یہ آب حیات، اور غالب مصنفہ غلام رسول قمر سے اخذ کئے گئے ہیں۔ عارف کے شاگردوں کی کیفیت زوہب سید الدین احمد خاں غالب فلفٹ زوہب نبی الدین احمد خاں قمر خاں کے اس دیباچہ سے اخذ کی گئی ہے جو انھوں نے دیوان عارف پر لکھا ہے۔

خاندانی مہارت اور عارف کی ذات کا حال زوہب معظّم زمانی بیگم صاحبہ سے دریافت کر کے جمع کئے ہیں جس کی زائد سند موصوفہ خود بدست موجود ہیں ملوہ: زیر جو پڑانے مذکرے شعرا کے جن میں عارف کا ذکر متاثر تیاب ہوئے ان کے حوالے لے لے ہیں جن کی تفصیل آگے آئے گی۔

آثار اصناف میں سر سید مرحوم نے بہ سبب دوستی عارف مرحوم انکی تعریف میں بہت مبالغہ سے کام لیا ہے۔ اس لئے نام و نہایت جو سر سید نے لکھی ہے نقل نہیں کی گئی اس کا صرف تھوڑا حصہ یہاں ہے جس سے عارف کے کلام پر روشنی پڑتی ہے۔ ان تذکرہ نویسوں نے جن کے تذکروں کے حوالے دیے گئے ہیں عارف مرحوم دوران کے کلام کی جس قدر تعریف کی ہے اس سے کثرت سخن اصحاب پر واضح ہو جائیگا کہ عارف اپنے دور کے شعرا میں کس درجہ ممتاز تھے بلحاظ خاندان بلحاظ علم و فضل بلحاظ عقل و فراست ان کو ان کے ہمعصوروں نے ہر طرح سراہا ہے۔ درجہ اسے ان کی نسبت تمام کی ہے اس سے متاثر نظر ہے کہ وہ دشمن تھے اور بڑے پایہ کے۔

## تلخیص و ترجمہ

### قرآن مجید کے تراجم دنیا کی مختلف زبانوں میں

سنہ ۱۹۳۶ء میں حکومت مصر نے ارادہ کیا تھا کہ قرآن مجید کا ایک نہایت صحیح اور مستند ترجمہ اجنبی اقوام میں شائع کرے تاکہ دنیا کی مختلف زبانوں میں اب تک جو تراجم کثرت شائع ہو چکے ہیں وہ جن میں بڑی بڑی فاسٹ غلطیاں رہ گئی ہیں ان کی اصلاح کر سکے۔ اس مقصد کے لیے جامعہ اہم اور وزارت معارف دونوں کے باہمی اشتراک تعاون سے ایک مجلس بنائی گئی جس کے صدر شیخ عبد المجید نسیم مفتی مصر منتخب ہوئے۔ اس سلسلہ میں اہل مال مصر نے اپنی تازہ اشاعت میں ان تمام تراجم کی ایک فہرست شائع کی ہے جو اب تک دنیا کی مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ ہم ذیل میں اس فہرست کو بعینہ درج کرتے ہیں۔ لیکن انوس ہے کہ یہ فہرست مکمل نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں بنگالی، پنجابی اور سندھی زبانوں کے تراجموں کے ذکر کے باوجود اردو اور ہندی اور ہندوستان کے بعض فارسی زبان کے تراجموں کا ذکر بالکل نہیں ہے۔ اس لیے ہم نے اپنے علم کے مطابق اردو کے بعض مشہور تراجم کا ذکر آخر میں کر دیا ہے عجلت کی وجہ سے سنہ ۱۹۳۶ء اور مقام اشاعت درج دیے جاسکے۔ تاہم حالاً بدلتا کلا لا یتزک کلا

### انگریزی زبان

(۱) اسکندر روس (Alexander Ross) کا ترجمہ سنہ ۱۶۳۹ء میں لندن سے شائع ہوا سنہ ۱۶۸۸ء

میں اس کی مکمل طباعت ہوئی اور یہی ترجمہ سنہ ۱۸۰۶ء میں امریکہ سے اشاعت پذیر ہوا۔

(۲) ترجمہ جارج سیل (Georgos Sale) سنہ ۱۷۳۴ء میں لندن سے شائع ہوا شروع میں مترجم نے



ایک طویل مقدمہ بھی لکھا ہے۔ یہ ترجمہ یورپ میں اس قدر مقبول ہوا کہ اب تک اس کے چھپتیں ڈیشن نکل چکے ہیں۔ آخری ڈیشن سن ۱۹۲۸ء شائع ہوا۔ اس اخیر ڈیشن میں سر ڈائن راس کا ایک مقدمہ شامل ہے جو سن ۱۹۱۸ء میں لندن کے ویٹس اسکول کے صدر تھے۔ یہ ترجمہ امریکہ میں بھی آٹھ مرتبہ شائع ہو چکا ہے۔ سب سے آخری ڈیشن سن ۱۹۳۹ء میں نکلا۔

(۳) روڈول (Rodwell) سن ۱۸۶۰ء میں لندن سے شائع ہوا، پھر مندرجہ ذیل سن میں علی الترتیب اس کے مختلف ڈیشن نکلے۔

سن ۱۸۷۶ء، سن ۱۸۹۰ء، سن ۱۸۹۱ء، سن ۱۹۰۳ء، سن ۱۹۰۵ء، سن ۱۹۰۸ء، سن ۱۹۲۱ء، یہ ترجمہ سن ۱۹۰۹ء میں امریکہ سے بھی شائع ہوا۔  
(۴) ترجمہ ی۔ پیج بامر (E.H. Palmer) دو جلدوں میں اکسفورڈ سے سن ۱۸۸۰ء میں پھر لندن سے سن ۱۹۰۸ء میں اور اس کے بعد سن ۱۹۲۰ء اور سن ۱۹۲۹ء میں اس کے مختلف ڈیشن شائع ہوئے۔ امریکہ میں سن ۱۹۰۹ء میں اس کی اشاعت ہوئی۔

(۵) ترجمہ عبدالحکیم خان مہجورہ سن ۱۹۰۵ء

(۶) ترجمہ مرزا ابوالفضل سن ۱۹۱۳ء

(۷) ترجمہ محمد علی مہدی لاہور سے سن ۱۹۱۲ء، سن ۱۹۲۰ء، سن ۱۹۲۹ء میں تین ڈیشن شائع ہوئے۔

(۸) ترجمہ غلام سرور (G. Sarwar) سن ۱۹۳۰ء میں اکسفورڈ سے شائع ہوا۔

(۹) ترجمہ کپٹان (Pickthall) سن ۱۹۴۳ء میں لندن سے شائع ہوا اور سن ۱۹۳۱ء میں یو یو آر ک پبلیش

۱۰) ترجمہ عبد اللہ یوسف علی لاہور سے سن ۱۹۳۵ء میں شائع ہونا شروع ہوا اور سن ۱۹۳۷ء میں مکمل ہوا۔

سہ انگریزی زبان میں ایک اور یہ ترجمہ مولانا عبد المجاہد دین مادی اڈیٹر صدق لکھنؤ نے حال میں ہی مکمل کر لیا ہے۔ مگر اب تک طبع نہیں ہوا۔ امید ہے کہ یہ ترجمہ مصنف میں در مطالب کے اعتبار سے انگریزی کے اور ترجمہ کی نسبت زیادہ صحیح اور مستند ہوگا۔ علاوہ ان میں معلوم ہوا ہے کہ مولانا یو یو آر ک صاحب دیوبند کی انگریزی میں ترجمہ کر رہے ہیں تو قہر ہے کہ یہ ترجمہ بھی اپنا مطالب کے لحاظ سے بہتر ترجمہ ہوگا۔ انگریزی میں ایک مکمل ترجمہ مرا تھیرتا بلوی گاڑی۔ اور نواب محمد الملک دس پاروں کا ترجمہ تو مشہور ہے (مترجم)

## فرانسیسی زبان

(۱) ترجمہ ڈورویہ (Du Royer) مطبوعہ پیرس ۱۷۴۷ء - ۱۷۴۹ء - ۱۷۵۱ء - ۱۷۵۳ء میں

چھپا۔ دہائی میں مندرجہ ذیل سالوں میں اس کی اشاعت ہوئی

۱۷۸۳ء - ۱۷۸۵ء - ۱۷۸۹ء - ۱۷۹۳ء اور اسٹردم سے ۱۷۹۳ء - ۱۷۹۶ء - ۱۷۹۷ء میں علی الترتیب

تین بار چھپا۔ پھر اس ترجمہ کو انگریزی زبان میں روس (Reuss) نے اور ہولینڈ کی زبان میں گلابیا کو نے

۱۷۵۱ء میں نقل کیا۔ پھر ہولینڈ کی زبان سے اس کو لائکی نے ۱۷۸۸ء میں جرمنی زبان میں منتقل کیا۔ پھر اسی

ترجمہ کا ترجمہ ۱۷۹۷ء میں روسی زبان میں ڈیٹیر یوس کا تھیر نے کیا۔ اسی طرح روسی زبان میں اس ترجمہ کا ترجمہ

۱۷۹۷ء میں فرانکین نے بھی کیا۔

(۲) ترجمہ سیوری (Savary) پیرس میں ۱۷۸۲ء میں اور اسٹردم میں ۱۷۸۶ء میں چھپا

اس کے بعد پیرس سے سنیں ذیل میں متعدد بار شائع ہوا ۱۸۱۲ء - ۱۸۲۶ء - ۱۸۲۸ء - ۱۸۲۹ء

۱۸۹۱ء - ۱۹۲۶ء -

اس مترجم نے قرآن مجید کے ترجمہ کا ارادہ کیا تو پہلے مصر آیا اور کئی ساں یہاں مقیم رہ کر عربی زبان

میں کمال پیدا کیا۔ یہ مترجم جب اپنے ترجمہ کی مکرر اشاعت کرتا تھا تو ہر نئے ادیش کے مقدمہ میں آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ، اور عرب قبل اسلام کے حالات میں کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور کر دیتا تھا۔

یہ ترجمہ نامقبول ہو کہ خود اس کا ترجمہ ۱۸۸۲ء میں اطالوی زبان میں - اور ۱۹۱۳ء میں قتلانی زبان میں اور

۱۹۱۱ء میں ارمینی زبان میں کیا گیا۔

(۳) ترجمہ کشمیر کی (Kasimierski) یہ مترجم خود پولینڈ کا رہنے والا تھا لیکن اس نے قرآن

مجید کا ترجمہ عربی سے فرانسیسی زبان میں کیا جو ۱۷۵۲ء میں پیرس میں چھپا۔ ۱۷۹۰ء تک یہ ترجمہ میں مرتبہ

شائع ہو چکا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۲ء میں شائع کیا گیا۔ یہ مترجم مصر میں خدیو اسماعیل کے زمانہ میں

مطبع مہری کا ناظم ورائر ان میں فرانسیسی نعل کا ترجمان تھا۔ اس نے لغت میں دو کتابیں بھی لکھی ہیں ایک  
 قاموس عربی و فرانسیسی، اور دوسری قاموس فارسی و فرانسیسی۔ یہ ترجمہ فرانسیسی زبان میں سب سے زیادہ  
 دقیق اعتماد سمجھا جاتا ہے۔ ۱۸۳۳ء میں اس ترجمہ کو قسطنطنیہ زبان میں منتقل کیا گیا۔ کنگزہ نے ۱۸۴۳ء میں اٹالیوی  
 زبان میں اس کا ترجمہ چھپا۔ پھر اسی زبان میں دوبارہ ۱۹۱۳ء میں اس کا ترجمہ ہوا۔ نیکولف نے ۱۸۶۴ء  
 میں اس کا ترجمہ روسی زبان میں، اور کوئٹن نے ۱۸۹۰ء میں اس کا ترجمہ آرمینی زبان میں کیا۔  
 (۴) ترجمہ فاطمہ زاہدہ ۱۸۹۱ء

۵. ترجمہ ایڈورڈ مونٹر (E. Montier) ۱۸۶۹ء میں پیرس میں چھپا۔ یہ مترجم جنیوا کی یونیورسٹی  
 میں سامی زبان کا پروفیسر تھا۔ ولفیئر بھننادی، جبری، زبخشری، ولفیئر امام فخر الدین رازی کا درس  
 دیتا تھا۔ فردیوک وسالٹ سے اس ترجمہ کا ترجمہ اٹالیوی زبان میں ہو چکا ہے۔  
 ۶. ترجمہ مرڈوس (Mardus) ۱۸۶۲ء میں پیرس سے شائع ہوا۔  
 ۷. ترجمہ امیش و ابن دود۔ یہ ترجمہ ۱۸۵۳ء میں طبع ہوا۔ دونوں مترجم انجرائری مسلمان ہیں۔

## جبرنی زبان

(۱) ترجمہ شوگر (Schweigger) نویربرگ میں ۱۸۶۶ء میں طبع ہوا۔ بعد ازاں ۱۹۲۳ء  
 ۱۸۵۹ء ۱۸۶۳ء میں چھپا۔

(۲) ترجمہ ڈیوڈ نارٹر (David Narreter) نویربرگ میں ۱۸۶۳ء میں طبع ہوا۔

(۳) ترجمہ گرین (Meyslin) فرنگفورت میں ۱۸۶۲ء میں طبع ہوا۔

(۴) ترجمہ بولین (Boyson) آل میں ۱۸۶۳ء میں چھپا۔ یہ پہلا جبرنی ترجمہ ہے جو عربی

اس سے براہ راست کیا گیا۔ ۱۸۶۲ء میں دول (Wahl) نے تنقید و تہذیب کے بعد اس کی مکرر  
 اشاعت کی۔



(۵) ترجمہ امان (Ulmann) ششہ ۱۸۳۶ء میں کرنفیڈ میں طبع ہوا۔ پھر آٹھ مرتبہ اس کی

نوبت آئی، آخری مرتبہ ۱۸۹۶ء میں چھپا۔

(۶) ترجمہ ہیننگ (Henning) ششہ ۱۹۰۱ء میں لپزگ میں طبع ہوا۔ جرمنی میں آج کل بھی ترجمہ

ران ہے۔

(۷) ترجمہ گریگول (Grigull) ششہ ۱۹۰۱ء میں آل میں طبع ہوا۔

(۸) ترجمہ رڈکرٹ (Rückert) ششہ ۱۸۸۰ء میں فرکفورٹ میں چھپا۔ یہ مترجم جرمنی کا مشہور

مستشرق ہے جو بہترین شاغری بھی ہے۔ اس نے دیوان حماسہ اور اس کے علاوہ اور کئی عربی دورین کا ترجمہ جرمنی زبان میں کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا یہ ترجمہ قرآن یورپین زبانوں کے تمام ترجموں سے بدرجہا بہتر ہے۔

(۹) ترجمہ گرم (Grimme) ششہ ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا۔

(۱۰) ترجمہ گولڈاسمیت (Goldschmidt) برلن سے ششہ ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۳ء میں دو مرتبہ چھپا۔

(۱۱) ترجمہ لانگی (Lange) ششہ ۱۹۴۰ء میں ہمبرگ سے شائع ہوا۔

(۱۲) ترجمہ آرنلڈ (Arnold) ششہ ۱۹۴۶ء میں چھپا۔

(۱۳) ترجمہ کلاروت (Kilamroth) ہمبرگ سے ششہ ۱۹۱۰ء میں اشاعت پذیر ہوا۔

## یونانی زبان

(۱) ترجمہ پنٹائی (Pentatie) ششہ ۱۸۸۰ء، ۱۸۸۶ء، ۱۹۲۸ء میں ایٹنز سے طبع ہوا، یہ ترجمہ

اسکندریہ میں یونانی قفسل کا ترجمہ تھا۔ اور اس نے قفس میں ایک کتاب بھی لکھی ہے۔

## لاطینی زبان

(۱) ترجمہ بیلانڈر (Biblando) ششہ ۱۵۴۳ء میں چھپا۔

(۲) ترجمہ ماروس (Marosci) سنہ ۱۶۹۸ء میں چھپا۔

### پولینڈ کی زبان

(۱) ترجمہ بوشکیو (Bucraviego) سنہ ۱۵۵۶ء میں وارسا میں طبع ہوا۔

### اطالین زبان

(۱) ترجمہ اریٹابین (Aerivabene) سنہ ۱۵۴۷ء میں طبع ہوا۔

(۲) ترجمہ کوزہ (Calzo) مطبوعہ سنہ ۱۸۳۷ء

(۳) ترجمہ بنزیری (Banzeri) مطبوعہ سنہ ۱۸۸۶ء، سنہ ۱۹۱۲ء، سنہ ۱۹۱۳ء

(۴) ترجمہ ویولانتی (Vialante) دومے سنہ ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا۔

(۵) ترجمہ برانچی (Branchi) سنہ ۱۹۱۳ء میں فرانسیسی ترجمہ کے اطالین ترجمہ کی حیثیت سے

شائع ہوا۔

(۶) ترجمہ فرکاسی (Faracassi) سنہ ۱۹۱۴ء میں طبع ہوا۔ یہ مترجم میلن میں عربی زبان کا

پروفیسر تھا۔

(۷) ترجمہ فروجو (Frojo) پیری میں سنہ ۱۹۲۵ء میں چھپا۔

(۸) ترجمہ بونلی (Bonelli) میلن میں سنہ ۱۹۲۹ء میں چھپا۔ مترجم آج کل میلز میں مشرقی زبانوں

کا پروفیسر ہے اور فارسی اور ترکی دونوں زبانیں خوب جانتا ہے۔

### پرتگالی زبان

اس زبان میں صرف ایک ترجمہ کا حال دریافت ہو سکا ہے جو سنہ ۱۸۸۲ء میں فرانسیسی ترجمہ کے

### اسپینی زبان

(۱) ترجمہ ڈی رولس (De Rolos) سنہ ۱۸۳۳ء میں میڈرڈس سے شائع ہوا۔

(۲) ترجمہ اورٹیز (Ortiz) برشلونہ میں ۱۸۷۲ء میں چھپا۔

(۳) ترجمہ مرگینڈو (Murguindo) ۱۸۷۵ء میں میڈرڈ سے شائع ہوا۔

(۴) ترجمہ براوو (Bravo) ۱۹۰۷ء میں برشلونہ میں چھپا۔

(۵) ترجمہ کاتو (Cato) ۱۹۱۳ء، ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۶ء میں میڈرڈ سے شائع ہوا۔

## سروی زبان

(۱) ترجمہ کولومبراشن (Mico-Lubibratie) ۱۸۹۵ء میں بلگریڈ سے شائع ہوا۔

## ہالینڈ کی زبان

(۱) ترجمہ شوگر (Schueigger) ہمبرگ میں ۱۸۷۳ء میں طبع ہوا۔

(۲) ترجمہ گلاس ماسٹر (Glassmaster) ۱۸۵۹ء و ۱۸۷۹ء میں دوبار چھپا۔

(۳) ترجمہ زولنس (Zollens) بیویا میں ۱۸۵۹ء میں چھپا۔

(۴) ترجمہ کیئر (Keyser) ۱۸۷۰ء، ۱۸۷۸ء، ۱۹۰۵ء، ۱۹۱۶ء میں ماریم میں طبع ہوا۔

(۵) محمد علی احمدی کا ترجمہ بھی انگریزی سے ہولینڈ کی زبان میں منقل کیا گیا ہے۔

## البانی زبان

(۱) اس زبان میں صرف ایک ترجمہ معلوم ہو سکا ہے جو ایک مسلمان ا۔م۔ق نے کیا ہے۔

## عبرانی زبان

(۱) ترجمہ رکنڈرف (Reckendorf) لینز میں ۱۸۵۷ء میں چھپا۔

(۲) ترجمہ یولین ۱۹۳۲ء میں قدس میں چھپا۔

## انڈوچائنا کی زبان

(۱) ترجمہ احمد شاہ کوئیور میں ۱۹۱۸ء میں طبع ہوا۔



## ڈنمارک کی زبان

(۱) ترجمہ پدرس کوپننگن میں ۱۹۰۹ء میں طبع ہوا۔ یہ مترجم آج کل یہاں کی یونیورسٹی میں سامی زبانوں کا پروفیسر ہے۔

(۲) ترجمہ بول (Buhl) کوپننگن میں ۱۹۳۱ء میں طبع ہوا

## ارمنی زبان

(۱) ترجمہ امیر چنگیز (Amir Chingiz) ۱۹۰۵ء اور ۱۹۱۰ء میں درنہ میں طبع ہوا۔

(۲) ترجمہ لورنز (Lorenze) ۱۹۱۱ء میں آستانہ میں طبع ہوا۔

(۳) ترجمہ کوربتیان (Kourbelian) ۱۹۱۲ء میں درنہ میں چھپا۔

## رومانی زبان

ترجمہ یسوپسکل (Isopascul) ۱۹۱۲ء میں طبع ہوا۔

## آسٹریا کی زبان

(۱) زدیو دگہ یون (Szedmayer et Gedeon)

(۲) ترجمہ گرزون (Gerzon)

## جاپانی زبان

(۱) ترجمہ ساکاموٹو (Sakamoto) ٹوکیو میں طبع ہوا۔

## بویہی زبان

(۱) ترجمہ ویسل (Vesel) ۱۹۲۵ء میں پراگ میں چھپا

(۲) ترجمہ ویسل (Vysel) ۱۹۳۳ء میں پراگ میں طبع ہوا۔

## بھینی زبان

بنیادی زبان - ترجمہ ڈیوٹ و سکولف (Tomau et School) ۱۹۳۳ء میں طبع ہوا

(۱) ترجمہ پائمن چینگ (Pao Men Chen Ching) شہ ۱۹۲۵ء میں طبع ہوا۔

(۲) ترجمہ لوین جو دہوا جوڑ شہ ۱۹۲۳ء میں طبع ہوا۔

(۳) ترجمہ چوک می شنگائی میں شہ ۱۹۳۱ء میں طبع ہوا۔

(۴) ترجمہ چی چنگ شہ ۱۹۳۴ء میں طبع ہوا۔

### سوڈن کی زبان

(۱) ترجمہ کروسنسٹولپ (Cruesensloup) اشاکالم میں شہ ۱۹۳۳ء میں چھپا۔

(۲) ترجمہ ٹورنبرگ (Torenberg) لندن میں شہ ۱۹۳۴ء میں چھپا۔

(۳) ترجمہ زٹرشتین (Zellerstein) اشاکالم میں شہ ۱۹۱۴ء میں چھپا۔

### افغانی زبان

اس زبان میں صرف ایک ترجمہ کا پتہ چلا ہے جو شہ ۱۹۳۱ء میں چھپا۔

### سوائیلی زبان

(۱) ترجمہ (Dale) لندن میں شہ ۱۹۲۳ء میں چھپا، یہ مترجم زنجبار میں گرجا کا پادری ہے۔

### بنگالی زبان

(۱) اردو میں حضرت شاہ رفیع الدین کا جو ترجمہ ہے شہ ۱۹۳۹ء میں اس کو بنگالی زبان میں منتقل کیا گیا۔

(۲) ترجمہ ابن محمد عبد الحق کو مدھو میاں نے بنگالی زبان میں شہ ۱۹۰۱ء میں منتقل کیا۔

(۳) ترجمہ نعیم الدین شہ ۱۸۹۹ء

(۴) علامہ بنگال کی ایک مجلس نے مل کر ایک ترجمہ کیا جو کلکتہ سے شہ ۱۸۸۳ء میں اشاعت پذیر ہوا۔

(۵) ترجمہ گولڈساک شہ ۱۹۰۸ء و شہ ۱۹۲۰ء میں دو مرتبہ چھپا۔

### پنجابی زبان

۱۔ ترجمہ حافظ محمد باریک اللہ لاہور میں سنہ ۱۳۹۷ھ اور سنہ ۱۳۹۸ھ میں چھپا۔

۲۔ ترجمہ بدایت اللہ غزنی لاہور میں سنہ ۱۳۵۸ھ میں چھپا۔

۳۔ ترجمہ شمس الدین بخاری امرتسر میں سنہ ۱۳۱۲ھ میں طبع ہوا۔

۴۔ ترجمہ فیروز الدین سنہ ۱۹۰۳ء میں چھپا۔

### سندھی زبان

۱۔ ترجمہ عزیز اللہ مقلوی بمبئی میں سنہ ۱۲۹۳ھ میں طبع ہوا۔

۲۔ ترجمہ محمد صدیق عبدالرحمن بمبئی میں سنہ ۱۳۵۷ء میں چھپا۔

### گجراتی زبان

۱۔ ترجمہ عبدالقادر بن عثمان بمبئی میں سنہ ۱۹۰۷ء میں چھپا۔

۲۔ ترجمہ مفتاح عبدالرشید دہلی میں سنہ ۱۳۱۷ء اور سنہ ۱۳۱۸ء میں چھپا۔

۳۔ ترجمہ محمد مصطفائی بمبئی میں سنہ ۱۹۰۷ء میں چھپا۔

۴۔ ترجمہ غلام علی سنہ ۱۹۰۳ء میں طبع ہوا۔

### اردو زبان

۱۔ ترجمہ حضرت شیخ امجد مولانا محمود حسن دیوبندی (۲) ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی (۳) ترجمہ حضرت

شاہ رفیع الدین دیوبند (۴) ترجمہ مولانا عبدالحق دیوبند (۵) ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی (۶) ترجمہ مولوی نذیر احمد

دیوبند (۷) ترجمہ مرزا حیات دہلوی (۸) ترجمہ مولوی فتح محمد صاحب جالندھری (۹) ترجمہ مولانا عاشق امین میرٹھی

دہلی (۱۰) ترجمہ ڈاکٹر عبدالحکیم خان (۱۱) ترجمہ مولوی احمد رضا خان بریلوی (۱۲) ترجمہ مولانا ابرار الکلام زاد دہلوی۔

(۱۳) ترجمہ خواجہ حسن نظامی دہلوی۔

جاوی زبان :- ترجمہ نیاز پادار (۱) سائیکس میں سنہ ۱۹۰۳ء میں چھپا۔



# ادبیات

## مجھے معلوم نہ تھا

(از جناب نضال سیوہاروی)

اثرِ نالِ سوزاں مجھے معلوم نہ تھا  
 حد سے بڑھ جاتی ہے جب تلخی زہرِ غمِ عشق  
 مل سکیگا نہ کوئی چارہ گرِ حسرتِ دل  
 جاں دہیِ حسن پر شائستہ پرستش نہ ہوئی  
 عشرتِ صحبتِ دلدار و طربِ کامی شوق  
 غم کہ مومِ مسموم سمجھتا ہے جسے خندہ عیش  
 عقل کہتے ہیں جسے بخیہ گرِ چاکِ جنوں  
 نرمیِ شبِ نیمِ گل پر اُسے کرتا تھا قیاس  
 موسمِ گل جسے کہتے ہیں نشاطِ ابدی  
 زندگی ہوتی ہے مشکل سے کہیں مشکل تر  
 وہ ہر اک لمحہ کہ ہو حاصلِ دنیا کے سکون  
 مصلحت کے لیے چاہو تو سمجھ لو مختار  
 دہرہ منزلِ آفت ہے جہاں صورتِ کاش  
 میں فسوں کردہ آغازِ بہارِ ہنسِ نال

جل ہی جائینگے دل و جاں مجھے معلوم نہ تھا  
 ستمِ مرگ ہے احساں مجھے معلوم نہ تھا  
 ہے محالِ ات سے درماں مجھے معلوم نہ تھا  
 اتنی چٹیں ہے رزاں مجھے معلوم نہ تھا  
 ہیں حکایاں پریشاں مجھے معلوم نہ تھا  
 ہے خدنگِ دُنیاں مجھے معلوم نہ تھا  
 ہر وہ خود چاکِ گریباں مجھے معلوم نہ تھا  
 سخت ہے نفرتِ دوراں مجھے معلوم نہ تھا  
 وہ بھی ہے عمرِ گریزاں مجھے معلوم نہ تھا  
 جس قدر کہتے ہیں آساں مجھے معلوم نہ تھا  
 ہے یہاں حاملِ طوفاں مجھے معلوم نہ تھا  
 ورنہ مجبور ہے انساں مجھے معلوم نہ تھا  
 ہر دلی کوہ بھی لرزاں مجھے معلوم نہ تھا  
 مگر انجامِ بہارِاں مجھے معلوم نہ تھا

# بیگم اور میڈم

از جناب مولوی عزیز الحق صاحب بی بی بی ٹی (علیگ)

جو پوچھو مجھ سے بیگم اور میڈم میں ہر فرق اتنا  
محافظاتِ نسل کی یہ اور وہ جنس غیر پر اہل  
یہ خانہ دار پوری اور وہ یاز نگاہ کی رونق  
یہ ملک اپنے گھر میں اور وہ لازم کارخانہ میں  
قراس کو ہر گوبہ کی طرح بحرِ قناعت میں  
یہ صبر و حلم میں کیتا، ہر اس کو علم کا دعویٰ  
اسے شوقِ عبادت اور وہ دلدادہ عشرت  
یہ زمست میں مشعلِ پروہ نول اور کلب گھر میں  
روایاتِ مقدس کی امیں یہ اور وہ غارِ مگر  
یہ بچوں ہی سے خود تصویرِ مستقبل بناتی ہے  
یہ آہو چشم اور اسکی نظر سنگین و مصنوعی  
یہ دیوی شہرہ و عفت کی وہ ریح ذوقِ عربانی  
روحِ عشق و محبت میں بھی یہ خود دار وہ رسوا  
سمجھ میں گیا پر نرغہ روده رو سیہ کیوں سے

یہ ہی پابندِ شوہر اور وہ پابندی سے بیگانہ  
کہ اسکی گود میں بچہ ہی اسکی گود میں پتل  
کہ اسکے ہاتھ میں ڈوٹی ہے اسکے ہاتھ میں بلانا  
یہ سلسلے گھر کی حاکم اور وہ ہر مینجر کی محکومہ  
وہ ہر سو گوسے میدانِ ترقی بط کے توارہ  
کہ اس کے پاس تربیت ہر اسکی پاس ڈپلوما  
یہاں ظرف و ضو ہر تحت پر داں مینر پر مینا  
ہر تسبیح انگلی دس میں یاں وہاں پر تاش کا پتا  
زباں پر اسکی قرآن اور اسکے لب پر ہر گانا  
تماشہ دیکھتی ہر وہ تھیرا اور سینما کا  
کہ اس کی آنکھ میں کابل ہے اسکی آنکھ پر چشمہ  
یہاں توغ پر بھی آہل داں سینہ بھی آئینہ  
کہ یہ نورِ جہان بیگم ہے اور وہ ملکِ کلویٹسرا  
جب اسکے منہ میں دیاں اور اسکی سرگٹ کا دھواں

عزیز ختم کراہل نظر پر صاف روشن ہے

یہ جنت وہ جہنم یہ گلستاں اور وہ محسرا

# شؤونِ اعلیٰ

## تاریخ ہند کی ایک نامعلوم حقیقت

ابھی کچھ دنوں کلکتہ یونیورسٹی کے درجہ لائبریری ہال میں ہندوستان کی تاریخی دستاویزات کا جو سالانہ اجتماع ہوا تھا، اس میں ہندوستان کی تاریخ سے متعلق بعض بڑے دلچسپ اور محققانہ مقالات پڑھ گئے۔ انہی میں ایک مقالہ ڈاکٹر مندل ل چٹرجی لکچر ہندو یونیورسٹی کا تھا جس میں انہوں نے اس نزاع پر روشنی ڈالی ہے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں اس بات پر ہو تھا کہ آیا گورنر کو فوج کا کمانڈر انچیف کا خطاب اختیار کرنے کا حق ہے یا نہیں۔ فاضل مقالہ نگار نے اس موضوع کے متعلق اپنی تحقیق کی روشنی میں جو کچھ فرمایا اس کا خلاصہ ذیل ہے۔

”ویرلٹ (Verelst) بنگال میں ۱۷۷۹ء سے ۱۷۸۰ء تک حکومت کرتا رہا ہے، اس کا یہ زمانہ عام طور پر مورخین ہند نے نظر انداز کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ ایک نہایت اہم نزاع دور اس کے فیصلہ پر مشتمل ہے۔ گورنمنٹ آف انڈیا کی دستاویزات سے پتہ چلتا ہے کہ ویرلٹ کی گورنری کے زمانہ میں ایک مرتبہ اس کے اور کرنل ریچرڈ اسمتھ کے درمیان اس بات پر جھگڑا ہوا کہ گورنر اپنے لیے کمانڈر انچیف کا خطاب اختیار کر سکتا ہے یا نہیں؟ یہ نزاع اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ آگے چل کر اس سے بعض اہم دستوری نتائج پیدا ہوئے۔ گورنر ویرلٹ کہتا تھا کہ گورنر اپنے اعلیٰ عہدہ کی وجہ سے اس بات کا حق رکھتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو افواج کا کمانڈر انچیف کہے اور اس کے حقوق بھی رکھے۔ کرنل اسمتھ کا دعویٰ تھا کہ گورنر کو فوج کی کوئی سرکار نہیں ہے۔ اس لیے وہ نہ اپنے آپ کو کمانڈر انچیف کہہ سکتا ہے اور نہ کمانڈر انچیف کے



حقوق رکھتا ہے۔ یہ جھگڑا ۱۹۶۷ء میں زیادہ شدید ہو گیا تو بیسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے ایک منتخب کمیٹی بنائی گئی جس نے فریقین کے دلائل پر بڑے غور و فکر کے ساتھ سوچ دیا کیا اور آخر کار اپنے فیصلہ میں گورنر کا مکمل نڈر خفیف ہونا تسلیم کر لیا لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی کہ گورنر کو اس منتخب کمیٹی کے سامنے جوابدہ ہونا ہو گا۔ وہ فوج کے نام اگر کوئی حکم نافذ کرتا ہے تو ضروری ہے کہ پہلے اُس کی منظوری اس کمیٹی سے لے لی جائے اس کمیٹی نے یہ بھی بتایا کہ تمام موقعوں پر فوج کو گورنر کا استقبال منہی امتیازیات کے ساتھ کرنا چاہیے جو کمانڈر انچیف کے لیے مخصوص ہیں لیکن دوسری جانب اس کی بھی تصریح کر دی گئی تھی کہ گورنر خود کسی موقع پر فوج کی کلاں، جُڑا، کسی طرح کمانڈ نہیں کر سکتا۔

## نامہ برکبوتر

نامہ برکبوتروں سے رسل و رسائل کے سلسلہ میں کام لیا جاتا کوئی نامعلوم بات نہیں ہے لیکن اب موجودہ جنگ میں اس سے میدان جنگ کی تحقیق و دریافت کا بھی کام لیا جاتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ کبوتر کے سینہ میں ایک کیمرا لگا دیا جاتا ہے، کبوتر جب تک فضا میں اڑتا رہتا ہے وہ آواز بہتر کر رہتا ہے یہاں تک کہ جب وہ جنگ کے میدانوں کے اوپر سے گزرتا ہے تو اُس کیمرا میں اُس میدان کا پورا نقشہ منعکس ہو جاتا ہے، اور اُس کے ذریعہ یہ معلوم کر لیا جاتا ہے کہ دشمن کی افواج کہاں کہاں ہیں، کس قعدہ میں ہیں۔ اس طرح کبوتر نامہ بری کے علاوہ دشمن کی فوج کی دیکھ بھال اور ان کی نگرانی کا بھی کام انجام دیتا ہے۔

## نئی ہولناکیاں تو ہیں

آج کل جنگ میں جو توہیں استعمال ہو رہی ہیں ان کی ہلاکت خیزی ہی کیا کم تھی کہ اب امریکہ کے

ایک ماہر سائنس نے ایک نئی قسم کی توپ ایجاد کی ہے جو امریکہ کی حکومت کے زیر غور ہے۔ یہ توپ اتنی قدم بڑی اور شرم قدم اونچی ہے۔ اور اس کا وزن ایک ہزار ٹن ہے اور جس اسٹیم سے یہ چلائی جائیگی اس کی قوت ایک ہزار گھوڑوں کی برابر ہے۔ اس توپ پر یہ توپ سو میل فی گھنٹہ کے حساب سے چلیگی۔ اس میں دس درجے ہیں جن میں سے بعض توپچیوں کے لیے مخصوص ہونگے، اور اس میں آکسیجن کے خزانے بھی کافی تعداد میں محفوظ ہونگے۔ جب یہ توپ کسی ایسے منطقہ سے گزریگی جو نہ ہرلی گیسوں سے بھرا ہوا ہوگا تو اس کی تمام کھڑکیاں بند کر دی جائیں گی اور اس میں بیٹھنے والے اُن آکسیجن کے خزانوں کے ذریعہ زندہ رہ سکیں گے۔ اس منطقہ کو عبور کر لینے کے بعد یہ کھڑکیاں کھول دی جائیں گی۔

اس نئی توپ کی تفصیل معلوم کرنے کے بعد ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ اس توپ سے جو گولے پھینکے جائیں گے وہ انسانی آبادیوں اور شہروں اور عمارتوں پر کسی کچھ قیامت برپا نہیں کریں گی۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس توپ کے گولوں سے بڑی بڑی مضبوط عمارتیں دم کے دم میں راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ جائیں گی، اور پر رونق آبادیاں ویرانوں اور حسرت انگیز کھنڈروں میں تبدیل ہو جائیں گی۔ اس میں صرف گیارہ آدمی ہونگے، ایک چلا لے والا، اور دس آدمی گولے پھینکنے والے۔ اگر خود غرضی اور عالمگیر فتوحات حاصل کرنے کا جذبہ یہی رہا اور سائنس کے نئے نئے اکتشافات اسی طرح انسان کی مطلب برآری کے سامان پیدا کرتے رہے تو نہیں کہا جاسکتا کہ دنیا کا حشر کیا ہونے والا ہے

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں جو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

## فولاد کے دل اور گروے

بعض انسانوں کے دل اتنے کمزور ہوتے ہیں کہ وہ کسی سخت آپریشن کے صدمہ کو برداشت نہیں

کر سکتے۔ ایسے طبعی دلوں کے مقابلہ میں امریکہ کے ایک ڈاکٹر جون۔ ایچ۔ گیبسن (John. H. Gibbons)

نے عرصہ دراز کے ریسرچ کے بعد ایک عجیب و غریب قسم کا فولادی دل ایجاد کیا ہے جو میں منٹ پر سے کر ایک گھنٹہ تک طبعی اور اصلی دل کی طرح حرکت کرتا رہتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ بدن میں خون کا دورن بھی بدستور باقی رہتا ہے اور زندگی قائم رہتی ہے۔ اب تک اس دل کا تجربہ تیرہ بلیوں پر کیا جا چکا ہے، اور وہ کامیاب رہا ہے۔ ان بلیوں کا اصلی دل نکالنے کے بعد مصنوعی دل ان میں رکھ گیا تو اس کے بعد بھی یہ ایک سال تک اور بعض اس سے بھی زیادہ مدت تک زندہ رہیں اور بعض بلیوں نے تو اس عمل جراحی کے بعد بچے بھی دیے اس مصنوعی فولادی قلب کی وجہ سے بدن میں خون کا دورن اعتدال کے ساتھ ہوتا رہتا ہے اور خون کے دباؤ سے جو اموات ہو جاتی ہیں ان کا خطرہ باقی نہیں رہتا۔ اسی طرح فولادی گردہ بھی بنایا گیا ہے جو طبعی گردوں کی طرح کام کرتا ہے۔ ڈاکٹر جون سے پہلے فرانس کے ایک عالم کاریل اور امریکہ کے ایک ہوا باز لنڈ برگ نے شیشہ کا دل بنایا تھا جس کے ذریعہ بعض غدد کی حفاظت ہو سکتی تھی لیکن اس مصنوعی فولادی دل کی ایجاد نے اس کو بالکل بے حقیقت کر دیا ہے۔

## قبل از وقت وضع حمل کے بچے

جو بچہ مدت حمل کی تکمیل سے پہلے پیدا ہو جاتے ہیں عموماً دیکھا گیا ہے کہ بہت کم زندہ رہتے ہیں۔ اب اس معاملہ میں نیویارک کے شفا خانہ سلون نے ایک نیا اقدام کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایسے بچے پیدا ہوتے ہی اس کو فوراً اس شفا خانہ میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ جہاں ڈاکٹر اور نرسیں شب و روز سکی نگرانی کرتی ہیں۔ اس بچہ کو ایک مخصوص آدمی بند کر دیا جاتا ہے جس کے ذریعہ اس کو حرارت، رطوبت اور ہوا اسی مقدار میں پہنچی جاتی ہے جسکی ضرورت اس کو ماں کے رحم میں رہتے ہوئے ہوتی۔ سی طرز اس کو ڈاکٹر کے مشورہ کے مطابق غذا بھی ایسی مناسب اور حجم کی حالت کی رعایت کو پہنچی جاتی ہے کبھی اب بھی ہوتا ہے کہ بچہ میں خون کی کمی ہوتی ہے تو نیا خون اس کے بدن میں داخل کیا جاتا ہے۔



# تبصرے

تاریخ اسلام حصہ اول۔ از مولانا شاہ معین الدین صاحب مذوی تقطیع ۲۶۲۳ صفحہ ۳۸۷ صنف  
کتاب طباعت اور کاغذ بہتر قیمت سے ملنے کا پتہ :- دار المصنفین اعظم گڑھ۔

دار المصنفین اعظم گڑھ نے اپنی پچیس سالہ زندگی میں اسلام اور مسلمانوں کی علمی پیرایہ میں جو قابل قدر خدمات انجام دی ہیں وہ باخبر صحب پر پوشیدہ نہیں اب اس ادارہ نے رادہ کیا ہے کہ تاریخ اسلام پر ایک مبسوط سلسلہ شائع کرے جس کے متعلق اندازہ کیا گیا ہے کہ دس بارہ حصوں میں ختم ہوگا۔ زیر تبصرہ کتاب کی سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ جو دار المصنفین کے ایک پرنس اور فاضل رفیق کی تالیف ہے۔ اس کتاب میں آغاز اسلام سے لے کر امام حسنؑ کے عہد تک کی مذہبی سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اگرچہ اس میں اکثر و بیشتر وہی باتیں ہیں جو سیرۃ النبی اور اسوۂ صحابہ میں بیان ہو چکی ہیں۔ تاہم تاریخ اسلام کے سلسلہ میں ان کا ایک خاص ترتیب، اور مخصوص واقعات کی تنقیح کے ساتھ ذکر کرنا ناگزیر تھا۔ یہ کتاب دار المصنفین کے قائم شدہ معیار کے مطابق ہے۔ اختلافی واقعات کی غیر ضروری تفصیل کو نظر انداز کر کے لائق مصنف نے جن واقعات کو ضروری اور صحیح و مستند سمجھا ہے انہی کو درج کیا ہے۔ حضرت عثمانؓ کا واقعہ شہادت، پھر جنگ جمل و صفین کے واقعات نہایت پیچیدہ ہیں اور ان کے بیان میں ابن قتیبۃ الدینوری جیسے نقاد کا قلم ہی جا ہی جاوے اعتدال پر محض ہو گیا ہے لیکن ہم کو خوشی ہے کہ تاریخ اسلام کے فاضل مؤلف نے ان واقعات کے بیان میں سلامت روی اور اعتدال پسندی کے سرشتہ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے اور جو کچھ لکھا ہے سوچ سمجھ کر تحقیق و تنقید کے ساتھ لکھا ہے۔

البتہ بعض مقامات پر نابا سبقت قلم سے کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں جن کی اصلاح نہایت ضروری ہے۔ مثلاً صفحہ ۲ پر حضرت اسماعیل علیہ السلام کو سارہ کا فرزند بتانا، اجڑہ شاہ مصر کی باندی تھیں باپنی تاریخ اسلام میں ان کو بیٹی بتایا گیا ہے۔ اس کے لیے کچھ روایتیں ملتی ہیں اور بعض محققین نے اُسی کو اختیار کیا ہے لیکن حضرت اسماعیلؑ کو سارہ کا بیٹا تو کسی نے بھی نہیں لکھا۔ غالباً مصنف کو سہو ہو گیا ہے۔ اور پھر تصحیح میں بھی اس پر نظر نہیں کی گئی۔ اسی طرح حضرت علیؑ در حضرت معاویہؑ کے نزاع کے بیان میں بعض روایتیں ایسی درج کر دی گئی ہیں جو یقیناً ایک پروپیگنڈہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور جن کو فتنہ پرانہ

لوگوں نے ذاتی اغراض کے لیے اپنی طرف سے ہڑاکرشتہ کر دیا تھا۔ ہر روایتیں ادب کی کتابوں میں کثرت ملتی ہیں اور  
 نفوس تھکے کہ قدیم مورخین نے بھی ان کے اندراج میں 'مباحثہ' سے کام نہیں لیا۔ ان روایتوں کی تنقید ضروری تھی۔  
 زبان بہت صاف سلیس و رشتہ جیڑ کر کہیں کہیں اغدق و ابہام رہ گیا ہے۔ مثلاً صفحہ ۳۰۴ پر یہ لکھا ہے: "تنبی  
 صاحب تھی یہاں" کے پنے خیال میں درہونا چاہیے تھا۔ صفحہ ۳۰۹ پر ہے "محل ساسی بن گیا تھا" یہ ساسی معلوم نہیں  
 کیا ہے۔ صفحہ ۳۵۰ پر ہے "عہد رسالت کے بعد سے یہاں غالباً بجائے عہد رسالت کے عہد فاروقی ہو گا۔ لیکن یہ  
 فرد گزشتہ بہت معمولی میں جن سے شاید کسی ایک مصنف کی کتاب بھی قالی نہیں ہو سکتی۔ ان سے کتاب کی  
 اصل قیمت دو وقت میں کوئی نقص لازم نہیں آتا۔" مید ہے کہ تاریخ اسلام کے بقیہ حصص بھی جتنا اول کی طرح  
 ایسے ہی محققانہ اور اپنے مقصد میں کامیاب ہونگے۔

تفسیر سورہ و الشمس۔ ترجمہ مولانا امین احسن صاحب اسلامی تقطیع خود ضخامت ۵۵ صفحات۔ کاغذ کتابت،  
 طباعت عمدہ قیمت ۵ روپے کا پتہ۔ مکتبہ حمید یہ سرے میر اعظم گڑھ۔

مورخان حمید میں فراہمی حمد اللہ علیہ نے قرآن مجید کی تفسیر کے حوصتے بطور یادگار چھوڑے ہیں اور جو متعدد  
 حیثیتوں سے اپنی نوعیت کے ایک ہی ہیں۔ ان کے تذکرہ کی ایک جماعت ان حصص کو اردو میں ترجمہ کر کے  
 شائع کرنے کی مفید خدمت انجام دے رہی ہے۔ یہ تذکرہ سورہ و الشمس کی تفسیر ہے۔ اصل عربی میں تھی مولانا  
 امین احسن صاحب نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ حسب معمول مولانا نے پہلے سورہ کا عمود، اور اس کا سباق  
 ساق سے تعلق بیان کیا ہے پھر سورہ کا نظم اور اس کے اجزاء کا باہمی تعلق لکھا ہے۔ اس کے بعد آخرت کے  
 فاعل ہری دہشتی درمل اور اس پر ایک تاریخی شہادت پیش کرنے کے بعد یہ بتایا ہے کہ اس سورت کا مقصد قریش  
 کو ذرنا اور غوث دانا ہے۔ اسی سلسلہ میں قریش کے حالات کو ثمود کے احوال پر منطبق کیا ہے۔ پھر قوموں کے فتنہ  
 کے باب میں ایک قانون کا استنباط کیا ہے کہ وہ ہر قوم کے لیے شمع ہریت بن سکے۔ خزین لا یخاف عقبہا  
 کی تفسیر اپنے مخصوص مذہب میں کی ہے۔ ترجمہ نہایت سلیس و شستہ اور رفتہ ہے۔ مسلمانوں کو ادراہ حمیدہ کی کوششوں  
 کا پیش از میں شکر گزار ہونا چاہیے کہ وہ ان قیمتی جو ہر پاروں کو باحسن وجوہ مرتب کرے وقف عام کر رہی ہیں دیکھنا  
 ہے کہ اس "من قش فروش دل صد پارہ خورشید" کی آواز پر کتنے مسلمان ہیں جو بیک کہتے ہیں۔

کلیات و حیات اسماعیل۔ زینب فحمہ سلم صاحب سبغی تقطیع ۲۰۱۶ صفحات ۶۷ صفحات کتابت طبع

اور کاغذ بہتر مچلتی قیمت سے ملنے کا پتہ :- مکتبہ جامعہ ملیہ - نئی دہلی۔

مولانا محمد سمیع میرٹھی ہمارے ادبی کاروان رفتہ کے ایک خوش گام و تیز قدم رہبر تھے۔ بے بس میں بچپن میں ان کی ریڈیں ایک ایک اسکول میں پڑھی جاتی تھیں اور ان کی نیچرل نظمیں بچوں کی نوک زباں پر ہوتی تھیں۔ انہوں نے بچوں میں اردو ادب کا صحیح مذاق پیدا کرنے میں بے شبہ وہی کام کیا ہے جو مولانا حالی نے خفہ بخت قوم کے بڑے لوگوں کو بیدار کرنے میں کیا۔ وہ شری سے زیادہ نظم میں ایک مخصوص طرز کے موجد تھے، اور یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اردو میں نیچرل شاعری کو جدید رنگ میں پیش کرنے کی ایجاد کا سہرا انہی کے سر ہے۔ اب ان کے فاضل صاحبزادے نے ان کے تمام کلام کو یکجا کر کے حسن ترتیب کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اور اس سے پہلے ایک طویل مقدمہ میں ان کے حالات اور اخلاق و عادات پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ یہ حالات جن سے اس عہد کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کی تاریخ بھی اجمالاً معلوم ہو جاتی ہے۔ ۵۲۰ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد کلیات کا آغاز ہوتا ہے جن میں مولانا کی مثنویات، مریج خمس، مسدس، ہشتن، ترجیع بند، قصائد، قطعات، قطعات تاریخ، غزلیات، رباعیات، نظم بے قافیہ، متفرقات، اور پھر فارسی کلام غرض کہ سب ہی کچھ ہے۔ اور ۳۱۵ صفحات پر ختم ہوا ہے۔ یہ صدائیں اگرچہ پُرانی ہو چکی ہیں اور آج اردو شاعری زبان و بیان اور وسعت جہاں کے اعتبار سے کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے، لیکن جدید کے رنگ و روغن کے باوجود قدیم کی سادگی و صفائی اپنے اندر اب بھی ایک خاص کشش و درجہ ذہنیت رکھتی ہے۔ یہ ہے کہ یہ مجموعہ دھپسی کے ساتھ پڑھا جائیگا۔ فاضل مرتب نے ہم خرمادیم ثواب کے مطابق اس کتاب کی پوری مددنی اسماعیل ہائی اسکول میرٹھ کے لیے وقف کر دی ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو اس کی قدر کرنی چاہیو۔ کتاب میں آرٹ پیپر پر لکھا، ان کے بچوں اور ان کے مکانات وغیرہ کے لیے نوٹ بک ہیں۔

کر بلا کے بعد۔ مولفہ حانفہ سید عزیز حسن صاحب بقالی ڈیڑھ سالہ پیشوا دہلی۔ تقطیع ۱۳۳۸ھ ۲۲ مئی ۱۹۱۷ء ۳۶۰ صفحے کاغذ اور کتابت و طباعت بہتر قیمت پر پتہ :- میجر رسالہ پیشوا جامع مسجد اردو بازار دہلی۔

سید صاحب نے پہلے ”مظلوم کر بلا“ ایک کتاب لکھی تھی جس میں انہوں نے کر بلا کے خونی واقعات اپنے خاص انداز میں قلمبند کیے تھے۔ اب زیر تبصرہ کتاب میں انہوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کر بلا کے بعد بھی سادات بنی فاطمہ پر کیسے کیسے ظلم ہوتے رہے۔ زبان بہت صاف سلیس اور شگفتہ و رفتہ ہے۔ البتہ واقعات کے اخذ کرنے میں صواب سے کام نہیں لیا گیا۔ اس طرح کی روایتوں کے لیے عربی اور بعض کتابیں جن میں طبیب یا بس سب ہی کچھ بھرا ہوا ہے



مستند قرار نہیں دی جاسکتیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد سے ہی کچھ ایسے اختلافات پیدا ہو گئے تھے کہ بن کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے میں اصلیت سے زیادہ جہنی پردہ بگینہ سے کو دخل ہے۔ اور حد یہ ہے کہ ابن قتیبہ لدینوری جیسے شخص کی کتاب امامت و لیاقت بھی اس قسم کی لغو باتوں کے ذکر سے محفوظ نہیں رہ سکی۔ اگر ان روایتوں کو صحیح مان لیا جائے تو سخت حیرت ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے اس قدر قریب زمانہ میں بعض کاہرامت کس طرح ایسے قول و فعل کے مرکب ہو جاتے تھے جنہیں ایک پختہ ایمان مسلمان اس زمانہ میں بھی گوارا نہیں کر سکتا۔

## نور اللغات

ہماری اردو زبان کی ترقی کے ساتھ ساتھ ایک مفصل دستہ لغت کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی شکر ہے کہ ملک کے نامور اديبوں نے اس طرف توجہ کی۔ میرالشعر حضرت امیر مینائی کے بعد حضرت سید احمد دہلوی نے فرہنگ صغیر کے نام سے کسی جہد وں میں ایک مفصل لغت لکھا۔ اسکے ایک عرصہ کے بعد حضرت تیرکا کوردی نے برسوں کی تلاش تحقیق کے بعد ایک نیا ضخیم لغت تیار کیا۔ جو پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ اس میں اردو زبان کے ایک ایک حرف کے متعلق بہت خوبی و خوش اسلوبی اور تحقیق دی گئی ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ اتنا بڑا کام بے اچھے پیمانے پر ایک فرد واحد سے کیسے انجام پایا۔ بعض جگہ ایک ایک لفظ کی تشبیح و تحقیق میں کسی کسی صفحے بھرتے ہوئے ہیں۔ لہذا یہ بیان بہت سادہ لیکن عامانہ اور حکیمانہ غرض لغت کے سلسلہ میں اب تک یہ آخری اور مستند کوشش ہے۔ جو عام زبان اردو کی قدر دانی کی مستحق ہے۔

جلد اول الف، ب، صفحہ ۴۴، قیمت ۵۰ جلد دوم پ، خ، صفحہ ۴۵، قیمت ۵۰  
جلد سوم د، ذ، ق، ۶۴۲، ۵۰ جلد چارم ز، ح، ح، ۱۰۳۲، ۵۰

ملنے کا پتہ

صدر دفتر :- مکتبہ جاسمہ قول باغ - نئی دہلی

مقامی شاخ :- جامع مسجد دہلی

دیگر شاخیں :- نواری دروازہ لاہور - امین آباد لکھنؤ

پرس بنگلہ جے سنیاں بمبئی ۳

# اسلام کا اقتصادی نظام

مؤلف: ڈاکٹر محمد رحمن صاحب سیواری

اس کتاب میں اسلام کے معیشت کے اصول، قوانین کی روشنی میں اس کی تشریح کی گئی ہے کہ دنیا کے تمام اقتصادیات  
خاصوں میں بہت اسلام کا اقتصادی نظام سی یا ثابت جس نے محنت و سرمایہ کا صحیح توازن قائم کر کے اعتدال  
پر قائم پیدا کیا ہے اس وقت اقتصادی مسئلہ تمام دور کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے سرمایہ داری کی تباہ کاریوں سے  
جس کی آئی ہوئی قانون کے سامنے سب سے ہم سروس ہو سہے کہ وہ کونسا نظام سے جس اختیار کر کے ایک انسان  
و انسانوں کی طرح رہد۔ اسے قانون مل سکتا ہے آپ اگر اسلام کی اقتصادی دستوں کا مکمل نقشہ دیکھا چاہتے ہیں تو  
اس کتاب کا مفہوم، ملاحظہ فرمائیے۔ پتہ: موصوفہ پریس، کتاب سرائی، لاہور۔ قیمت مجلد ۱۲ غیر مجلد ۲۰

## سوشلزم کی بنیادی حقیقت

مترجم: سید تقی الدین صاحب شمسی احمدی

سوشلزم کی بنیادی حقیقت درمیان کی ہم قسموں سے متعلق مشہور جرمن پروفیسر کاس ڈیل کی تھ نظریہ جنہیں  
جی مرتبہ اردو میں منتقل کیا گیا ہے، ان کے ساتھ سوشلزم کے حالات درمیان کی موجودہ رت و رتی کے متعلق مترجم کی کتاب  
سے ایک ہموار و مفید مقدمہ بھی شامل ہے، کتابت جماعت کا ذخیرہ نیت عمدہ صفحات ۳۴۰ قیمت مجلد ۱۲ غیر مجلد ۲۰

## ہندوستان میں قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ

ہندوستان میں قانون شریعت کے نفاذ کی مکمل عملی تشکیل برہیل جیوتی افروز مضمون جس میں درحقیقت  
کے مقاصد کی تشریح، نفاذ کے مسائل، ان کے حل، ان کے نفاذ کے طریقہ و زمان کے تعلیمی نصاب پر نہایت مفید  
و جامع بحث کی گئی ہے۔ نیز مضمون کی تعلیم میں موجودہ محاذوں کی تمام قابل ذکر روایات پر زبردست تنقید کی گئی  
ہے صفحات ۳۸۰۔ قیمت ۳۰

میجر ندوۃ المصنفین قرول پرنٹری دہلی

## قواعد

(۱) برائے ہر نگریزی حینہ کی ۵۰ تاریخ کو ضرور شائع ہو جاتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، علاقائی مضامین بشرطیکہ وہ علم و زبان کے معیار پر پورے اُتوں برائے ہر شائع کیے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسائل ڈاک خانوں میں شائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس سارا نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دے دیں، ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بدقت بھیج دیا جائیگا۔ اس کے بعد تکایت قابل اعتنا نہیں سمجھی جائیگی۔

(۴) جو بطلب مور کے لیے آرکائیٹ یا جوابی کارڈ بھیجنے ضروری ہے۔

(۵) برائے ہر کی ضمانت کہے کہ تین صفحہ ماہر اور ۶۰۰ صفحہ سالانہ ہوتی ہے۔

(۶) قیمت سالانہ پانچ روپیہ ہر ششماہی دوا روپیہ بارہ آنے (مع محضوں ڈاک) فی پرچہ ۸

(۷) مئی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھیے۔



ندوة المستفین دہلی کا ماہوار رسالہ

# برہان

مرتب  
سعید احمد کسرا بادی  
ایم اے۔ فارسی دیوبند

ندوة المصنفين کی کتابیں

الرق في الإسلام

اسلام غیر غلامی کی حقیقت

تأیید ویدنا سعید اندامی که اسے ہر روز

کتاب کے میں حصہ میں مذہبی کی حقیقت میں سے تقویٰ، خدائی و رزق الہی پروردگار پرست کے جو تیاہی  
مذہب اور احیاء و احیاء کی امتداد پروردگار سے پہلے کہ ان تینوں میں سے ہر ایک کا ہر ایک  
موجود ہے، سہولت میں یہ کہ امتداد میں وہی و ہر ایک کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا جائے۔ ہر ایک  
پروردگار پروردگار کی بدلتا غیر جہت کی مذہبی پروردگار کا ہے۔

و بے شک اپنا سب دستِ غفران سے سلامی قلیات کو نہ رکنے سکے۔ جن حوروں کو کامیاب دین تمام حوروں  
میں میں نے ہر سند پر بی نور ثابت ہوئے۔ یورپ امریکہ کی تہذیبی حلقوں میں اس کا مفروضہ طو پر چرچا ہو رہا ہے۔  
اور رقیہ کے مومنان میں من سند میں غلط فہمی کی وجہ سے سلامی تہذیب سے بڑی نکات سورسی سے نہ جانی  
ہوئے۔ اس سند میں اس کے چلچلہ و تہذیب میں اس کے شہر پر شاہ جدید کے قاضی میں گریب میں ہیں  
سورس کے غلطے۔ اس ایک نمونہ ویانا کے سکس یوہست میں تو اس کتاب کو ضرور جیسے ہیبت خیر جلد تھا

تعلیمات اسلام اور مسیحی قوم

تأليف مولانا محمد عتيق علي صاحب قلم مولانا محمد عتيق علي

[illegible]

# برہان

شماره ۳

جلد چہارم

صفر ۱۳۵۹ مطابق مارچ ۱۹۴۰ء

## فہرست مضامین

- |     |  |  |
|-----|--|--|
| ۱۶۲ | سید احمد اکبر آبادی  | ۱۔ نظرات   |
| ۱۶۹ | مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب سیو ہاروی                          | ۲۔ معاہدہ سیو ہاروی علمی نقطہ نظر سے (تصویر کار و سرشار) |
| ۱۹۳ | جانشین احمد صاحب اہدی یار و پرنسپل ماسٹر اعلیٰ مدرسہ کالج بانی | ۳۔ پدہنی اور سلطان علاء الدین خلجی                       |
| ۲۱۳ | س  | ۴۔ تلخیص ترجمہ "ابن ماجہ"                                |
| ۲۲۱ | نہال سیو ہاروی، افق کاظمی امرتھوی                              | ۵۔ ادبیات  |
| ۲۲۳ | س  | ۶۔ شہنشاہ علیہ   |
| ۲۲۷ | "س" "ڈ" "ع"  | ۷۔ تبصرے   |



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

# نظرات

آہِ اعلیٰ مہ نظاوی جوہری!

گذشتہ ماہ فروری میں مصر اور ہندوستان کے دو بڑے علموں نے وفات پائی مصر کے مشہور  
 امام علامہ نظاوی جوہری عہدہ صریح میں ان مسلمانوں کے خواب کی سچی تعبیر تھے جو علوم جدیدہ کی خیرہ کن  
 جگہ گاہٹ سے مرعوب ہو کر ایسے جید عالم کی تلاش میں رہتے ہیں جو ان علوم کے مقابلہ میں اسلامی و  
 قرآنی حقائق کی فوقیت اس تحقیقی انداز میں ثابت کر سکے کہ بڑے بڑے ماہر علوم کو بھی مجال انکار باقی نہ  
 ہے۔ وہ جس طرح دینیات اور علوم قرآن و حدیث میں یگانہ روزگار تھے، اسی طرح ان کو جدید علوم، علم  
 نباتات، علم حیوانات، فلسفہ، سائنس، تاریخ، اور علم ہیئت و طبقاتِ ارض میں بھی بڑی دستگاہ تھی  
 پھر ان سب فضیلتوں پر مستزاد یہ کہ ان کا ذوق نہایت مستقیم، اور طبیعت انتہا درجہ سلیم تھی۔ ان کی قوت  
 فیصلہ درست، اور ملکہ تنقید صائب تھا۔ بے شبہ انہوں نے اس دور میں وہی کام کیا جو امام غزالی،  
 اور ابن رشد نے فلسفہ یونان کے مقابلہ میں اسلام کی حفاظت و حیانت کے لیے انجام دیا۔ ان  
 دونوں بزرگوں نے فلسفہ یونان کا عمیق نظر سے مطالعہ کیا اور اس میں وہ کمال پیدا کیا کہ فلسفہ کے ایک  
 ایک جزیرہ اور سند پر جاری ہو گئے۔ پھر فلسفہ کے جو اصول حق بجانب تھے ان کو اسلام کی تعلیمات پر  
 منطبق کیا، اور جو غولِ طُلُیٰل باتیں تھیں ان کا تار و پود ”تہافت الفلاسفہ“ لکھ کر اس تحقیق و کمال اور

دیدہ وری کے ساتھ کھولا کہ فلسفہ کا خلعتِ زریں ایک گداگر عقل و خرد کی گدڑی میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔  
 علامہ مظاہرِ شاہیؒ ۱۹۳۸ء میں پیدا ہوئے۔ علوم مروجہ کی تحصیل تکمیل کے بعد قاہرہ کے مدرسہ  
 دارالعلوم میں اُستاد مقرر ہو گئے۔ درس و تدریس کے شغل کے ساتھ انہوں نے تصنیفِ تالیف  
 کا مشغلہ بھی برابر جاری رکھا۔ اور متعدد قابلِ قدر کتابیں تصنیف کیں جن میں چند اہم کتابیں یہ ہیں  
 رُوحِ راح، اَصْلُ الْعَالَمِ، اَيْنَ الْاِنْسَانُ، التَّاجُ الْمَرْصُوعُ بِجَوَاهِرِ الْقُرْآنِ وَالْعُلُومِ، حُجَّالُ  
 الْعَالَمِ، الزُّهْرَةُ، السَّرُّ الْعَجِيبُ فِي حِكْمَةِ تَعْدَادِ رُوحِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، مِيزَانُ  
 الْجَوَاهِرِ فِي عَجَائِبِ هَذَا الْكَوْنِ الْبَاطِنِ، نِظَامُ الْعَالَمِ وَالْاُمَمِ، النِّظَامُ وَالْاِسْلَامُ، كَهْفَةُ  
 رَاْمَةِ وَحْيَاتِهَا، الْحِكْمَةُ وَالْحِكْمَاءُ۔ مروجہ کو دنیات کے ساتھ علوم جدیدہ کی آمیزش میں خاص  
 کماں حاصل تھا۔ چنانچہ اُن کی کوئی کتاب اس خصوصیت سے خالی نہیں ہے، اُن کا یہ نظریہ بالکل  
 صحیح ہے جس کا اظہار انہوں نے اپنی تفسیر میں جابجیا کیا ہے کہ مسلمانوں کے اخطا ط کی صل وجہ اُن کا ذہنی  
 رومانی ہو دہ۔ اول تو اُن میں تعلیم یافتہ ہی کتنے ہیں؟ اور جو تعلیم یافتہ ہیں بھی تو اُن کا مبلغِ علم اس کے  
 زیادہ نہیں کہ چند پرانی کتابیں پڑھ پڑھا کر کسی مسئلہ پر بحث کی نوبت آئے تو دو چار بزرگوں کے اقوال نقل  
 کر دیں اور بس۔ دماغی بیداری جو کائناتِ عالم اور فطرت کے عمیق مطالعہ سے اور اُس سے نتائج  
 اخذ کرنے سے پیدا ہوتی ہے اور جس کی طرف قرآن مجید نے بار بار مسلمانوں کو دعوت دی ہے۔ وہ  
 اُن سے یک قلم سلب کر لی گئی ہے۔ اب اُن کا علم جو کچھ بھی ہے محض تقلیدی ہے۔ اجتہادی نہیں  
 یہی وجہ ہے کہ اُن کے افکار مضحل، قوتِ استنباط بیکار، اور صلاحیتِ تنقید مردہ ہے۔ وہ ماضی کی حکایات  
 پارینہ سنا کر چند آنسو تو بہا سکتے ہیں لیکن زمانہ حال کے پیغام سے فائدہ اٹھا کر اپنے مستقبل کو سنوارنے اور  
 نہانے کا کوئی اہتمام نہیں کر سکتے۔ وہ دوسروں کے بنائے ہوئے زمین و آسمان میں امن و عافیت  
 کی زندگی بسر کرنے کے خواہشمند ہیں لیکن اب اُن میں خودیہ حوصلہ نہیں ہے کہ اپنی قوتِ "یُدُ اللہی" سے

کام لے کر ایک نئی زمین اور نیا آسمان پیدا کریں اور دنیا کو اُس کے سایہ میں پناہ لینے کی دعوت دیں۔ علامہ مرحوم کا یہی وہ جذبہ تھا جس سے متاثر ہو کر انہوں نے اخیر میں قرآن مجید کی ایک نہایت اہم تفسیر لکھنے کا عزم کیا۔ بحرحہ کی اور انجام کار ہمارے سال کی شب و روز کی محنت شاقہ کے بعد اس کو پچیس ضخیم ضخیم جلدوں میں ختم کر کے اُن کے رہو قلم نے دم لیا۔ اس تفسیر کے مقصد کی توضیح و شروع میں خود اس طرح کرتے ہیں:-

”میں نے یہ تفسیر اس غرض سے لکھی ہے کہ کیا عجب ہے اللہ تعالیٰ اس کو حسن قبول کے فضیلت سے سرفراز فرمائے اور عام مسلمانوں کی آنکھوں پر جوہل و نادانی کے پردے پڑے ہوئے ہیں وہ اٹھ جائیں اور وہ علوم فطریہ کو سمجھنے لگیں۔ انہیں آسمانی عجائب کے معلوم کرنے کا شوق ہو، اور جو زمین کی حیرت انگیز چیزیں ہیں اُن کی تحقیق پر وہ مائل ہوں۔ مجھ کو اُمید ہے کہ اس تفسیر کی وجہ سے مسلمانوں کی تہذیب بہت بلند ہو جائیگی اور وہ علمی و فنی دنیاؤں کے نوادر کا علم حاصل کر کے زراعت، طب، مہدیات، حساب، ہندسہ، فلکیات اور تاریخ جغرافیہ وغیرہ علوم میں کمالات پیدا کر کے علماء مغرب سے بھی سبقت لے جائیں گے، در یہ کیوں نہ ہو جبکہ علم لفظ کی آیتیں تو صرف ڈیڑھ سو ہی ہیں، لیکن علوم و فنون کی آیات سات سو پچاس سے بھی متجاوز ہیں۔“

جن اہل علم کو علامہ مرحوم کی تفسیر ”الحواسر فی تفسیر القرآن الحکیم“ کے مطالعہ کی سعادت نصیب ہوئی ہے، وہ جانتے ہیں کہ آپ نے جس مقصد کے پیش نظر اس اہم تفسیر کا آغاز کیا تھا وہ اس میں کس حد تک کامیاب ہو سکے ہیں۔ امام رازی کی تفسیر کبیر کی طرح ممکن ہے بعض لوگ اس تفسیر کی نسبت بھی یہ کہیں کہ قرآن مجید تو بنی نوع انسانی کی اخلاقی روحانی اور دینی و عملی اصلاح کی کتاب ایسی ہے جس سے فلسفہ، تاریخ، علوم عصریہ سے کیا تعلق، کہ اُس کی تفسیر میں ان چیزوں سے بحث کی جائے لیکن اصل یہ ہے کہ علوم عصریہ کی روشنی میں علامہ نے جو بحثیں کی ہیں اُن سے صرف یہ ثابت کرنا مقصود



ہر کہ قرآن مجید کس طرح کائناتِ عالم اور فطرت کے مطالعہ کی دعوت دیتا ہے تاکہ اُن کے علم کے بعد جس طرح معلول سے علت، کسی فعل سے اُس کے فاعل کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے اُسی طرح مخلوق سے خالق، اُس کے وجود، اُس کی ربوبیت اور الوہیت کی طرف ذہن کا نہ صرف انتقال ہو بلکہ اس کا اذعان و یقین پیدا ہو جائے۔ اور انسان ان تمام سلسلہ اسباب و علل سے متجاوز ہو کر اپنے وجود کو صرف اُس وراۃ اللہ ذاتِ احدیت کے ساتھ مربوط کر لے جس کی مشیت و قدرت ان تمام کُل پرزوں کو ایک خاص نظام کے ساتھ چلا رہی ہے، اور حق یہ ہے کہ دین دنیا کی تمام سعادتوں کا سرچشمہ صرف ایک یہی ذعان ہے جس کو قرآن مجید کی تمام تعلیمات کا لبِ لباب اور عطر کہا جاسکتا ہے۔ پھر تاریخی حقائق کے سلسلہ میں جو مباحث پیدا ہو گئے ہیں ضرورت ہے کہ اُن کا حل قدیم تاریخ کے تمام ذرائع معلومات کی روشنی میں تلاش کیا جائے تاکہ کلامِ الہی کی حقانیت و صداقت روز روشن کی طرح واضح اور برہن ہو جائے اسی طرح قرآن مجید نے قوموں کے عروج و زوال کے جو نفسیاتی اصول و قوانین بیان کیے ہیں اُن کی سچائی کا یقین دلانے کے لیے ضروری ہے کہ تاریخ اقوام پیش نظر ہو۔ اور اُن کے عروج و انحطاط کے اسباب کا سراغ لگانے کی کوشش کی جائے

خدا کا شکر ہے علامہ مرحوم کی یہ مساعی کامیاب ثابت ہوئیں۔ اور اُن کے کارناموں کو بارگاہِ بزدی سے خلعتِ قبول و پذیرائی حاصل ہوا۔ آج مصر و شام کے علاوہ ہندوستان، افغانستان، ایران، ترکی، جاوہ، انڈونیشیا، افریقہ اور یورپ میں کون ایسا صاحبِ علم ہے جو علامہ طنطاوی کے نام سے واقف نہیں۔ اُن کی کتابوں کے ترجمے بلادِ روس میں ترکی زبان میں، جاوہ میں ملائی زبان میں اور ہندوستان میں اُردو زبان میں کثرت سے شائع ہوئے اور گھر گھر پھیلے وہ جس طرح علم و فن میں یگانہ روزگار تھے، شعر و ادب اور خطابت میں بھی اپنے ہم عصروں میں امتیاز رکھتے تھے۔ اُن کی تحریر میں بلا کا دور تھا، جس موضوع پر لکھتے تھے، اس قوت سے اُس کے ایک ایک پہلو پر بحث کرتے تھے

کہ بڑے سے بڑے مخالف کو بھی تسلیم خم کر دینے کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہیں رہتا تھا۔ ان کا طرز استدلال نہایت سلجھا ہوا اور عمیق و منطقیانہ تھا۔

ایک حلیل المرتبت علامہ روزگار ہونے کے علاوہ آل مرحوم اپنے عہد کے زبردست اسلامی مفکر بھی تھے مسلمانوں کا انحطاط ان کے دل و دماغ کو ہر وقت بچپن رکھتا تھا اور وہ اپنی تحریر و تقریر میں برابر مسلمانوں کو اصلاح کی طرف متوجہ کرتے تھے۔ انہوں نے مصر کے رسالہ "الرسالہ" بت ۲۹۔ نومبر ۱۹۳۷ء میں "مقلۃ المفقودہ" کے زیر عنوان ایک زبردست اصلاحی مقالہ سپر قلم کیا تھا جس میں انہوں نے تمام مسلم جماعتوں اور ان کے افراد کے رجحانات و میلانات کا تجزیہ کر کے بتایا تھا کہ آج مسلمان بحیثیت ایک قوم کے کس خطرناک طریقہ پر ذہنی انتشار اور دماغی پراگندگی میں مبتلا ہو گئے ہیں اور اس سے نجات پانے کی تدبیر کیا ہے اصلاح کے سلسلہ میں علامہ مرحوم جس خاص نقطہ خیال کے پابند تھے اس کا اندازہ آپ اس مضمون کے اقتباس ذیل سے کر سکتے ہیں، فرماتے ہیں: "مثلاً آپ رمضان کو ہی لے لیجیے کیا اس وقت یہ ضروری نہیں ہے کہ کثرت ہذاں کے مسئلہ پر زمرہ غور کیا جائے کیا موجودہ جمود کے ماتحت یہ بات مسلمانوں کے لیے انتہائی شرمناک نہیں ہے کہ ایک اسلامی شہر میں رمضان کی پہلی تاریخ ہفتہ کو ہوتی ہے، دوسرے شہر میں اتوار کو، دوسرے میں پیر کو۔ پھر اس اختلاف کا اثر مسلمانوں کے تمام اجتماعی کاموں پر بھی پڑتا ہے کیا کسی کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ہڑ بڑک شریعت اسلام کی اصل روح کے بالکل خلافی ہے، میں اس مشکل کے حل کے لیے کسی نئی بدعت کی دعوت نہیں دیتا، بلکہ وہی کتنا ہوں جو قدیم فقہاء اسلام نے کہا ہے۔ فقہاء حنفیہ کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ اگر چاند کسی ایک خطہ میں بھی دکھ لیا جائے تو تمام مسلمانوں پر روزہ رکھنا واجب ہو جاتا ہے۔ تو اب ہم اس قول سے فائدہ اٹھا کر یہ کہہ کر نہ کریں کہ کسی ایک بڑے اسلامی شہر میں ایک رصد گاہ قائم کریں اور یہاں چاند دیکھنے کے بعد

اس خبر کو تمام اسلامی شہروں میں بیک وقت شائع کر دیا جائے۔ اور سب کو مجبور کیا جائے کہ وہ اس کی پابندی کریں۔ ہماری بڑی ہمتی ہے اگر ہم سائنس کی غیر معمولی ترقی کے دور میں اپنے اندر ایک جتنی پیداکرنے کے لیے اتنا بھی نہ کر سکیں۔

اس اقتباس سے جہاں علامہ مرحوم کی اصابت رائے، بلند فکری اور روشنیابی کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ علوم و فنون میں کمال مہارت کے باوجود مذہبی معاملات میں طریق سلف سے منحرف ہو کر کسی اور نئی شاہراہ کی تلاش نہیں کرتے تھے، اور ان کے نزدیک مسلمانوں کی فلاح و نجات کا انحصار اتباع سنت و قرآن میں ہی تھا۔

ہم اے جن بزرگوں اور دوستوں کو ان کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے ان سے معلوم ہوا کہ یوں بھی حضرت مرحوم اپنی عملی زندگی میں نہایت متقی اور پرہیزگار تھے اور شریعت کے ادا و نواہی کا بڑا لحاظ و احترام کرتے تھے۔

اے صد افسوس! دنیا دار اسلام کا یہ سب سے بڑا مفکر و عالم چند مہتہ بیمارہ کر گزشتہ ماہ فروری میں داعی اجل کو لبیک کہہ کر انہی صدیقین و شہداء سے جا ملا جن کے نقش قدم پر وہ عمر بھر چلتا رہا، اور جن کے اتباع میں اس کا قلم اعلا رکلمۃ اللہ میں برابر مصروف رہا۔

فأصبح في لحيد من الأرض ميتاً      وكانت بجيتاً تضيق الصمما صرّاً

لأن حسنت فيك المراثي وذكرها      لقد حسنت من قبل فيك المداخر

رحمہ اللہ رحمۃً واسعةً و امطر علیہ شایب الرافۃ والغفران ۔

حضرت مولانا معین الدین اجمیری | دوسرا حادثہ وفات حضرت مولانا معین الدین اجمیری کا ہے، جو

۱۰ محرم ۱۴۰۹ھ کو اجمیر میں پیش آیا۔ مولانا کی ذات ہندوستان کے علماء میں ایک نمایاں مقام



دیکھتی تھی وہ علم و عمل دونوں کے پیکر تھے منطق و فلسفہ میں ان کو مولانا ابوالبرکات ٹوکی مرحوم سے تلمذ  
 خاص حاصل تھا۔ لیکن عام علم منطق و فلسفہ کے برخلاف وہ دینیات اور علوم قرآن و حدیث میں  
 بھی درخورد فرماتے تھے۔ اجمیر میں کتاب و سنت کی روشنی جو کچھ نظر آتی ہے سنی کے دم سے قائم  
 تھی۔ پھر طرفہ یہ ہے کہ وہ صرف بابِ درس و تدریس اور اصحاب و عطاوارشاد میں سے ہی نہ تھے  
 بلکہ ان کا شمار ان ابطال غزیت و حریت میں تھا جو اعلیٰ کلمۃ اللہ کی خاطر کانٹوں سے بھری  
 ہوئی راہ کو دیکھ کر دلوں میں ذر خوف و ہراس محسوس نہیں کرتے، اور دل خوش ہوا ہے راہ کو پرخا  
 دیکھ کر پڑھتے ہوئے اسے اپنے لیے تختہ گل جان کر بے خوف و خطر عبور کر جاتے ہیں اور بجا ک خون  
 غلطیدن کو عاشقانِ پاک طینت کا شیوہ خوش یقین کرنے کے باعث دستِ قاتل کے لیے  
 ان کی زبان سے کہاں خندہ پیشانی، حسرت و لبیک کا نعرہ میا خستہ نکل جاتا ہے وہ جمعیتِ علماء ہند  
 کے سرگرم کارکن تھے۔ انہوں نے اس مجلس کے سالانہ اجلاس امر وہہ کی صدارت اُس بچے آشوب  
 زمانہ میں کی جبکہ ہندو تن کشمکش حریت و آمریت کی طوفان خیز یوں کے باعث ایک نہایت ہی  
 خطرناک دور سے گزر رہا تھا اور جبکہ ملک میں عام دار و گیر نے سخت اضطراب و ہیجان پیدا کر رکھا تھا  
 وہ اپنے عزائم میں پہاڑ کی طرح مضبوط تھے۔ جرم حریت کوشی کی پاراش میں جیلخانہ بھی گئے لیکن علالت  
 کے باوجود وہ ان سب تکلیفوں کو ہنسی خوشی برداشت کر گئے اور ان کی جبین استقلال و ہمت باور  
 و خوف کی ایک شکن سے بھی آشنا نہیں ہوئی مسلمانوں میں جو قحط الرجال پایا جاتا ہے، اُس کے پیش  
 نظر مولانا ایسے جامع کمالات اور پیکرِ علم و عمل کا سانچہ مرگ یقیناً بہت زیادہ محسوس ہوگا۔ مولانا کا وطن  
 اجمیر تھا۔ وہیں ایک مدرسہ معینیہ میں درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے تھے۔ اخیر عمر تک انہوں نے اس  
 گوشہ کو ترک نہیں کیا، اور انجام کار اپنے جسم کی امانت اسی سرزمین کو سپرد کردی جس کی آغوش میں کئی صدی  
 سرائی کے ہمام و ہم دامن ہو ہد اسلام کا جسد مقدس آسودہ سکون ہے اللہ تعالیٰ ان کو اپنی پیش از ہمیشہ

# معاہدہ یہودی نقطہ نظر سے

تصویر کا دوسرا رخ

(مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب بیوا روی)

برہن ماہ اکتوبر ۱۹۳۹ء میں جناب مولانا عبدالرحمن صاحب پروفیسر دہلی یونیورسٹی کا ایک مضمون ”متحدہ قومیت اور اسلام“ کے عنوان سے شائع ہوا تھا، نومبر میں اس کے متعلق ایک تنقیدی مضمون میں نے پیش کیا۔ اس کے بعد دسمبر اور جنوری کے رسالوں میں میری تنقید پر مولوی صاحب موصوف نے جوابی مضمون سپر قلم فرمایا ہے جس کا عنوان ”معاہدہ یہودی نقطہ نظر سے“ ہے۔ چونکہ یہ ہر دو مضامین ایک ہی سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں اور ابھی تک تشنہ تحقیق ہیں اس لیے آج پھر میں اس تلخ فرض کو ادا کر رہا ہوں۔ جو احقاقِ حق اور انکشافِ حقیقت کے لیے ضروری ہے، اور اس کے لیے مولوی صاحب موصوف سے قبولِ حق کا اُمید وار ہوں۔

اکتوبر کے برہن میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ دراصل اس ”مذکرہ“ کا مدار حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی مظلہ کا رسالہ ”متحدہ قومیت اور اسلام“ ہے۔ لہذا یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ تنقید سے پہلے مسئلہ زیر بحث کے متعلق اس رسالہ میں سے چند ضروری اقتباسات پیش کر دیے جائیں تاکہ حقیقتِ حال کے سمجھنے میں کافی مدد ملے۔

رسالہ مذکورہ بالا میں حضرت مولانا حسین احمد صاحب نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہندوستان سے اجنبی حکومت کے اقتدارِ اعلیٰ کا خاتمہ کرنا مذہبی نقطہ نظر سے واجب اور ضروری ہے۔ چنانچہ وہ اجنبی حکومت

کے مظالم ظاہر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

”اس سے ازیں ضروری ہے کہ جس قدر بھی ممکن ہو جلد از جلد اس سے نجات کی کوئی صورت اضیاء کی جائے اور اس کو تمام ہندوستانی قوم کے مسلمان ہو جانے تک مؤخر نہ کیا جائے۔ اگر خاص اسلامی حکومت قائم کرنے کی سرمدست طاقت نہ ہو تو اھون الصلہ ہین اور اخف البلیتین کو ضرور ضرور عمل میں لایا جائے جو کہ شرعی حکم ہے جس میں کہ زفیضہ جا ادا کرنے اور اس کے عمل میں لانے کے لیے کسی خاص ہتھیار اور خاص طریقہ جنگ کی تہہ نہیں ہے بلکہ ہر وہ عمل اور ہر وہ ہتھیار جو کہ دشمن کو زک پہنچا سکے اور اس کے اقتدار و شوکت میں ضرر رساں ہو وہ اختیار کرنا لازم و واجب ہو گا۔ مثلاً

اس شرعی حکم کی تعمیل کے لیے وہ مختلف طریقے عمل میں سے ایک طریقہ ”متحدہ قومیت“ کو بتاتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی یہ تصریح کرتے ہیں کہ اس سے مراد یورپ کی ایجاد کردہ متحدہ قومیت نہیں ہے بلکہ فرماتے ہیں:-

”مکن سے کہ یورپ نے وطنیت اور قومیت کو کسی خاص مفہوم اور کسی خاص ہیئت اجتماعیہ کے لیے استقام کیا ہو اور اس پر وہ گامزن ہو رہے ہوں اور ان مقاصد اور نصب العین کو اپنے اپنے مذہبی اداروں کے مخالف پاکر مذہب کو سلام کر بیٹھے ہوں (انی) مگر کیا یہ ضروری ہے کہ ہمارے متحدہ قومیت یا وطنیت کی طرف صرت ایسی کیفیات اور لوازم کے ساتھ ہو جو کہ ان کے یہاں ملحوظ ہو رہے ہیں اور ان پر یہ حکم صادر کیا جائے کہ چونکہ متحدہ قومیت یا وطنیت کے معنی یورپ میں یہ ہیں اور وہ مفہوم مذہب اسلام ہے لہذا یہ حرام و ممنوع ہے؟ مثلاً

اور دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:-

”مگر یہ مفہوم (مغربی متحدہ قومیت کا مفہوم) نہ عام طور پر لوگوں کے ذہن نشین ہے اور نہ



اُس کا کوئی مسلمان دیا تہ ادا قائل ہو سکتا ہے اور نہ ایسے مفہوم کی اس وقت تحریک ہے۔  
 کانگریس اور اس کے کارکن اس کے محرک نہیں ہیں اور نہ اس کو ہم ملک کے سامنے پیش  
 کر رہے ہیں۔ یہ چیز بالکل خارج از بحث ہے۔“ منہ

اس کے بعد ہندوستان میں مجوزہ ”متحدہ قومیت“ کو اس طرح ذہن نشین کراتے ہیں۔  
 ”ہندوستان میں سکونت کرنے والی قومیں اور افراد بحیثیت مسکن و وطن بہت سی ایسی چیزوں میں  
 مشترک ہیں جن کو موجودہ پرہیسی حکومت نے اپنی اغراض کے ماتحت ہمال کر دیا ہے۔ اور ہندوستان  
 کے باشندوں کی زندگی تلخ کر دی ہے بلکہ تمام ہندوستان کے رہنے والوں کے لیے فنا کا گھاٹ  
 سامنے کر دیا ہے۔ چونکہ ان مشترکہ مفادات کے منافع ہونے سے سب ہی فائدہ ہو رہے ہیں اس  
 لیے تمام ہندوستانی متفق ہو کر ان منافع شدہ حقوق کو حاصل کریں والی یہی مقصد متحدہ قومیت  
 سے ہے۔“

وہ یہ بھی صاف صاف بتاتے ہیں کہ متحدہ قومیت ”مقصد“ نہیں ہے بلکہ حصول مقصد کا ذریعہ  
 ہے۔ لہذا مختلف حالات و مقاصد کے اعتبار سے اُس پر مختلف قسم کے احکام برتے عائد ہو سکتے ہیں۔  
 ”مگر ہم کو اس امر پر غور کرنا ہے کہ وہ اسدام“ جو کہ ان اصولوں سے عبارت ہے جو کہ انسان  
 کے شعبہ ہائے حیات انفرادیہ اور اجتماعیہ سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کو خالق و مخلوق اور  
 بین المخلوقین امور کے ساتھ وابستگی ہے“ یا اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ غیر مسلموں کے  
 ساتھ مل کر روابط وطنیت یا نسل یا رنگ یا زبان وغیرہ کی بناء پر ایسی متحدہ قومیت کی  
 تشکیل کی جائے جس کے ذریعہ سے دشمنوں کو شکست دی جائے یا مفاد ہائے مشترکہ ریاست  
 اقتصادیہ، تجارتیہ، زراعیہ، حربیہ وغیرہ کو حاصل کیا جائے۔ (الیہم نے جہاں تک انصاف  
 شرعیہ کا تعلق کیا ہے۔ ہم کو واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ امر حسب مواقع کہیں فرض نہیں

واجب کہیں مستحب کہیں جائز کہیں مکروہ اور کہیں حرام ہوگا۔ منہ؟

ان تصریحات کے باوجود بھی معترض کا یہ اعتراض ہے کہ یہ غیر شرعی بات ہے اور اسلام کی ہیئت اجتماع کے لیے انتہائی ضروریات۔ تو اس کا عقلاً و نقلاً جواب دیتے ہوئے "استشہاد" کے طور پر حضرت مولانا نے زیر بحث معاہدہ پیش کر کے بتایا ہے کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسلامی معاہدے کی بنیاد پر مدینہ کے ابتدائی دور میں مسلم و غیر مسلم کو اُمت واحدہ یا غیر مسلموں کو اُمت من المومنین فرما کر اس قسم کے نئی دوروار رکھا ہے۔ چنانچہ اس معاہدہ نبوی کی زیر بحث دفعات تحریر فرمانے کے بعد فرماتے ہیں۔

"۱۔ ہری مراد قومیت متحدہ سے اس جگہ یہی قومیت متحدہ ہے جس کی بنا جناب رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مدینہ میں ڈالی تھی۔ یعنی

۲۔ ہندوستان کے باشندے خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں بحیثیت ہندوستانی اور

متحدہ وطن ہونے کے ایک قوم ہو جائیں۔

۳۔ اس پر دہی قوم سے جو کہ دم اور متک حادثہ سے سب کو محروم کرتی ہوئی فنا کر رہی ہے

جنگ کر کے اپنے حقوق حاصل کریں اور اس نظام دہے رحم قوت کو نکال کر غلامی کی زنجیروں

کو توڑ پھوڑ ڈالیں

۴۔ ہر ایک دوسرے سے کسی مذہبی امر میں تعارض نہ کرے۔

۵۔ ہر تمام مذہب کی بنیے دی قومیں اپنے مذہبی اعتقادات، اخلاق، اعمال میں آزاد

ہیں۔" (صفحہ ۱۵)

دوسرے بار بحث و استشہاد میں پیش کرنے کے بعد مقررین کو ان الفاظ کے ساتھ متنبہ فرماتے

ہیں :-

"مذکورہ بالا بیان سے واضح ہو گیا کہ مسلمانوں کا غیر مسلموں سے مل کر ایک قوم بننا یا بنانا نہ تو ان کے

نفس دین میں خلل اٹھانے اور نہ یہ امر فی نفسہ اسلامی قوانین اجتماعیہ کے خلاف ہے، بخ ص ۲۹

حضرت مولانا کے رسالہ متحدہ قومیت اور اسلام کے یہ وہ مختصر اقتباسات ہیں جن سے اصل مسئلہ پر بڑی حد تک روشنی پرتی ہے اور مولانا کے بیان کردہ حکم شرعی، ادا و حکم کے لیے مقدمات ذرائع اور اس حکم شرعی کے استشہاد کی تفصیل بھی سامنے آجاتی ہے۔ لہذا اب پروفیسر صاحب کے اعتراضات اور ان کے متعلق مناقد کے نقد و انتقادات، قابل ملاحظہ ہیں اور عدل و انصاف کے راد خواہ

اعلٰی ثواہو اقرب للثقیل انصاف کرو کہ یہی تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔

پروفیسر صاحب فرماتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ ”متحدہ قومیت و اسلام“ میں یہ روایت شرعی حکم ہی کے طریق پر بیان ہوئی ہے۔ اس لیے ہم ختم روایت پر یہ عبارت پاتے ہیں ”مذکورہ بالا بیان (اس روایت) سے واضح ہو گیا کہ مسلمانوں کا غیر مسلموں سے مل کر ایک قوم بنانا ناجائز

مطلب یہ کہ مسلمانوں اور نامسلمانوں سے مل کر ایک قوم بنانا یا نہ بنانا یہ ایک امر شرعی ہو۔

میرے نزدیک پروفیسر صاحب کا یہ مقولہ یا غلط فہمی پر مبنی ہے اور یا صاحب رسالہ کے منشاء کے خلاف، ان کے کلام کی غلط تعبیر ہے ”و جس کا نام ”توجیہ الکلام بالایرضی بہ قائمہ“ ہے۔ اس لیے کہ اس مسئلہ میں دراصل حکم شرعی ”یہ ہے کہ مسلم مفاد کے لیے جہاد اور صلح و معاہدہ“ دونوں میں سے جو چیز ضروری ہو وہ اختیار کرنا ”نہ ہی فریضہ ہے“ اور اس حکم شرعی کے ثبوت میں جہاد کے لیے آیات و احادیث جہاد اور صلح و معاہدہ کے لیے سطورہ ذیل آیت قرآنی۔

وان جنھو الاسلام فاجنھو لھا اور اگر غیر مسلم صلح و معاہدہ کے لیے جھکیں تو تم بھی

وتوکل علی اللہ (نقل) اس کام کے لیے جھک جاؤ اور بھروسہ صرف خدا پر رکھو

اور صحیح احادیث اور صلح حدیبیہ کا اسوہ حسنہ نص کا حکم رکھتے ہیں۔ اور جمہور علماء امت نے



تصریح کی ہے کہ کفار سے صلح و معاہدہ کے لیے صرف ایک بنیاد پیش نظر رکھنا ضروری ہے اور وہ مفادِ امت مسلمہ ہے۔ باقی شرائط میں امام یا اہل صل و عقد حالات و مقتضیاتِ وقت کے اعتبار سے آزاد ہیں کہ جو مقصد کے لیے مفید سمجھیں اختیار کریں۔ امام شافعیؒ کتاب الام میں تصریح فرماتے ہیں۔

فرض الله عز وجل قتال غير اهل

الكتاب حتى يسلموا واهل الكتاب

حتى يعطوا الجزية و قتال:

لا يكلف الله نفسا الا وسعها

فهذا فرض الله على المسلمين

قتال الفريقين من المشركين

وان يهادنوه۔

کتاب الام باب المهادنة جلد ۱ ص ۱۱۰

واذ صفع المسلمون عن قتال

المشركين او طائفة منهم يبعث

دارهم او كثرة عددهم او خلته

بالمسلمين او بمن يليهم منهم

جاز لهم لكف عنهم ومهادنتهم

عن غير شئ ياخذونه ريف من" کے صلح و معاہدہ درست ہے۔

امام شافعیؒ نے اس حکم شرعی کے لیے "اسوۂ رسول" میں سے جس عمل کو بطور استثناء د

استدلال پیش فرمایا ہے وہ بھی قابلِ توجہ ہے۔ فرماتے ہیں۔

یعنی حالت میں صلح و معاہدہ کرنا۔

وہا دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ناما وادعہین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح کی ہر لوگوں کو درمعاہ کیا ہر  
 قدم المدینہ یہود اعلیٰ غیر ماخرج اخذ منهم کتابا بحدیث یثربینہ فی بنی نضیر کہیں اپنی تشریف آوری کے قریب بازیا  
 اور حافظ حدیث علامہ بن قسیم بنی زاد المعاد میں اس بحث کے سلسلہ میں کہ کفار کو صلح حدیبیہ کے پیش نظر دس  
 سال سے زیادہ معاہدہ جائز نہیں، البتہ دس سال کے بعد پھر اگر ضرورت محسوس ہو تو دوبارہ بارہ بارہ اسکی تجدید کر سکتے  
 ہیں مگر ہر مرتبہ دس ہی سال کا معاہدہ ہونا چاہیو۔ اس عدم جواز کی تردید کرتے ہوئے غیر عین معاہدہ کے جواز میں تحریر فرماتے ہیں :-  
 قالوا والنبی صلی اللہ علیہ وسلم لمر وقت عقد الصلح و (علامہ) کہا ہر اور نبی اگر وہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صلح درمعاہ  
 الہدنتہ بینہ و بین الیہود لما قدم المدینہ بل میں جو کہ مدینہ میں تشریف لاتے ہی اپنے پیچھے کیا تھا کسی تہ کی قید  
 اطلق ما داموا کافین عن غیر محاربین لہم نہیں لگائی تھی بلکہ جب وہ مسلمانوں کو نہ لڑیں سوت کہ  
 اور حافظ حدیث شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے بھی اپنی کتاب "الاختیارات العلیہ" میں اس کی تائید فرمائی ہے۔  
 اور امام محمد رحمہ اللہ شاگرد رشید امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے اس مسئلہ کو اور زیادہ واضح کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں :-  
 ولان الامام نصاب ناظر او من النظر حفظ قوت اور اس یو کہ امام کا قیام مسلمانوں کے مفاد کی نگرانی کے یو کہ اور  
 المسلمین اولاً فریباً لیکون ذلک فی اللواعة بخیر نگرانیوں کے مسلمانوں کی قوت کی حفاظت جب مقدم  
 اذا كانت للمشرکین شکوت او احتاج الی ان ہر بس بسا اوقات یہ حفاظت ایسی حالت میں بصورت معاہدہ و  
 یمن فی دار الحرب لیتوصل الی قوم لهم بائ صلح با کفار کے ذریعہ ہوتی ہے جبکہ مشرکین کو شکوت حاصل ہو یا  
 شدید فلا یجوز بدامن ان یوداع من علی امام کسی ایسے کافر عربی کو (دار الحرب میں) جنگ کرنا چاہتا ہو جسکی  
 طریقہ (کتاب الجہاد جلد ۱ ص ۸۶) طاقت و قوت بہت زبردست ہو در اس کے مقابلہ کیلئے اسکو چاہو

ان تمام شرعی نقول پر غور کرنے کے بعد حسب ذیل نتائج پیدا ہوتے ہیں :-

(۱) مفاد امت مسلمہ فرض ہے جو حکم نصوص شرعیہ جہاد سے حاصل ہوتا ہے اور کبھی صلح و معاہدہ سے۔

(۲) معاہدہ و صلح کے لیے مصلحت اسلام و امت مسلمہ کے علاوہ باقی تمام شرائط جو مفید مقصد ہوں شرعاً درست ہیں۔

(۳) معاہدہ و صلح کی مختلف شکلوں کے لیے زمانہ رسالت کے اسوہ حسنہ کے ثبوت میں صلح حدیبیہ، معاہدہ یہود مدینہ، اور اس قسم کے دیگر معاہدات کو بطور سند و شہادت پیش کرنا جائز ہے اور ان سے استناد و استدلال بلاشبہ درست۔

(۴) زیر بحث ”متحدہ قومیت“ بھی معاہدہ کی ایک قسم ہے جو کسی نہیں شرعی سے نہ متصادم ہے نہ معارض اہل مذاہب تقاضائے مفاہد مسلمانان ہند و مسلمانان عالم اجنبی حکومت تسلط کی زبردست قوت کو پامال کرنے کے لیے ہندی غیر مسلموں سے اس قسم کا معاہدہ بلاشبہ درست ہے، اور اگر اس کے جواز کی شہادت و سند کے لیے کوئی عام ”معاہدہ یہود مدینہ“ کو پیش کر کوئی کا یہ استشہاد، سی صریح صحیح و درست ہے جس طرح امام شافعی اور حافظ ابن قیم وغیرہ کے لیے حلال و حرام کے مباحث میں اس معاہدہ سے سند لینا جائز سمجھا گیا اور سلف سے خلف تک امت محمدیہ نے اس کو مقبول جانا اور جمہور امت نے اس پر اتفاق کیا۔ نیز اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اگر ذخیرہ روایات میں یہ سند شہادت موجود بھی نہ ہوتی تب بھی زیر بحث ”متحدہ قومیت“ کا جواز اصل مسئلہ کے اعتبار سے بہر حال مسلم رہتا البتہ اس قسم کے معاہدہ کے ثبوت سے اس مسئلہ کو مزید تقویت و تائید حاصل ہوگی۔

اور یہ کہ اس قسم کے استدلال و استشہاد کے لیے ایسی مرسل یا منقطع روایت باتفاق جمہور علماء اسلام درست اور صحیح ہے لہذا شرعی اصطلاح میں یہ شرعی حکم نہیں ہے بلکہ اس کے لیے سند و شہادت ہے، البتہ عام بول چال میں آپ جو چاہیں اس کا نام رکھ سکتے ہیں۔

علاوہ ازیں اس کو فقط ”سیرت کی روایت“ سمجھنا بھی صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس روایت کو مشہور محدث اور امام جرح و تعدیل علامہ ابو عبیدہ قاسم بن سلام رحمہ اللہ نے کتاب الاموال میں (جو کہ سیرت کی نہیں بلکہ احکام کی کتاب ہے) اس کو متعدد سندوں سے روایت کیا ہے حتیٰ کہ اس کے بعض الفاظ پر محدثانہ حکم بھی لگایا ہے فرماتے ہیں۔



حدیث ابو عبیدہؓ قال وحدثنی یحییٰ بن عبد اللہ بن بکیر عن اللیث عن عقیل عن ابن شہاب الخ مثل ذلک بطول۔ الا انقال علی رباعیہم قال ابو عبیدہ۔ وهذا عندی هو المحفوظ

روایت کی سند بیان کرنے کے بعد ابو عبیدہ کہتے ہیں۔ یہ پہلی روایت ہی کی طرح ہے مگر اس روایت میں "علی رباعیہم" کی جگہ "علی رباعیہم" ہے۔ اور میرے نزدیک یہی (لفظ) محفوظ اور صحیح ہے۔

نیز انہوں نے "غریب الحدیث" میں بھی اس پر کلام کیا ہے اور روایت کو قابل قبول تسلیم کیا ہے۔ لہذا یہ روایت مشہور تابعی اور صاحب منازعی محمد بن اسحق کی سیرت ہی کی روایت نہیں ہے۔ بلکہ امام حدیث ابن شہاب زہری کے مراسیل میں سے ہے اور اگرچہ محدثین کے نزدیک زہری جیسے امام حدیث کے مراسیل، اصطلاح اصول حدیث کے اعتبار سے قبرے درجہ کے سمجھے جاتے ہیں، مگر زیر بحث جیسے مواقع میں بے تامل اُن سے حجاج درست ہے۔ اسی لیے امام شافعی، امام احمد اور ابن کے مشائخ نے کتب فقہ میں اس سے استناد کیا ہے، حالانکہ اُن کے نزدیک مرسل و منقطع کو "محبت" نہیں مانا جاتا (اور استناد و استشہاد اور محبت کے درمیان جو فرق ہے وہ اہل علم کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے) اور اہل بدینہ، امام مالک، اور امام ابو حنیفہ رحمہم اللہ اور اُن کے مشائخ کے یہاں تو حلال و حرام میں بھی مرسل روایت کو محبت تسلیم کیا گیا ہے بشرطیکہ وہ ثقہ، عادل "راوی" کی جانب سے روایت کی گئی ہو چنانچہ خلیف بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

واختلف العلماء فی وجوب العمل بما ہذا حالہ فقال بعضهم ما نہ مقبول وحب العمل بہ اذا کان المرسل ثقہ

اور مرسل و منقطع کے متعلق علم کا اختلاف ہے کہ اس کی کسی عمل کا وجوب ثابت ہوتا ہے یا نہیں پس بعض نے کہا ہے کہ وہ مقبول ہے اور اس کے ذریعے کسی عمل کا وجوب ہو سکتا ہے بشرطیکہ درمال و فطاع کرنے والا ثقہ اور عادل ہو

وابی حنیفہ و اہل العراق وغیرہم اور یہ مسک امام مالک، اہل مدینہ ابو حنیفہ، اہل عراق اور

والکفایہ فی علم الرجال ابومسلم ان کے علاوہ بھی دوسرے علماء کا ہے۔ الخ

اور علامہ جزائری رحمہ اللہ فرماتے ہیں :-

وامام شافعی ہل الکوفہ فان عندهم لیکن مشائخ اہل کوفہ کے نزدیک ہر ایک وہ حدیث  
ان کل حدیث ارسلہ حدیث جس میں تابعین، تبع تابعین یا ان کے بعد کے لوگوں  
التابعین واتباع التابعین او من نے ارسال و فقہاء کرنا ہو  
بعدہم من العلماء فانہ یستلزم اس کو بھی مرسل کہاجاء گا اور وہ قابلِ محبت ہے۔  
مرسل وہو محتجہ بتوجیہ النظر

درندہ شیر محمد عثمانی نے فتح بلعم شرح مسلم میں اس مسئلہ پر یہاں کہہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے  
کہ حنیفہ اسی مرسل یا منقطع کو قابلِ احتجاج قرار دیتے ہیں جو حامل ثقہ، عالم جرح و تعدیل اور امام نقل  
اور روایت کی جانب سے ہوا اس نے اپنی اس روایت کو لفظ "عن" یا "روى" جیسے صیغوں سے روایت  
نہ کیا ہو بلکہ "قال" یا "ی" درجہ کے صیغوں سے روایت کیا ہو۔ ایسی روایت بلاشبہ محبت ہے۔

اب نہ ہری کی امامت یا ایت حدیث امامت جرح و تعدیل، اور محمد بن اسحاق جیسے مسلم  
امام مغازی کی تائید کو پیش نظر رکھیے، اور حافظ حدیث ابو عبیدہ کے متعدد طرق روایت کی نقل کے ساتھ  
ساتھ اس روایت کے قبول و تسلیم کو بالفاظ فرمائیے اور فیصلہ کیجیے کہ اس روایت کو محض سیرت کی روایت  
کہہ دینا یا مرسل و منقطع ہونے کی وجہ سے احکام میں قطعاً ناقابلِ قبول کہہ دینا اصول روایت کے  
مقابل سے کہاں تک درست ہے؟

لیکن بائینہ اگر پر وفیسر صاحب کے ارشاد کو تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی یہ امر قابلِ توجہ  
ہے کہ مرسل و منقطع کو محبت تسلیم نہ کرنے کے باوجود امام شافعی، مالک، احمد بن حنبل، اور ابو حنیفہ رحمہم

ان سب ہی کو اتفاق ہے کہ کسی حکم شرعی کے لیے استناد، استشہاد اور استدلال میں، جس قسم کی روایت کو پیش کرنا جائز اور درست ہے تب ہی توفیق کے احکام میں امام شافعی، ابن تیمیہ، ابن قیم، حنبلی، ابن دین العید، مالکی اور امام محمد رحمہم اللہ جیسے ائمہ دین نے اس روایت سے استناد و استشہاد کیا ہے پس اگر مولانا حسین احمد صاحب نے بھی اس کو اسی طریقہ پر پیش فرمایا تو کیوں قابل اعتراض اور لائق مواخذہ ہے؟

یہ تمام تفصیل اُس صورت میں ہے جبکہ آپ کے اس جملہ کو ”یہ حکم شرعی ہے“ وسیع معنی میں لیا جائے۔ ورنہ تو، اصطلاح فقہ میں ”حکم شرعی“ اور ”دلیل و سند“ دو جدا جدا امور ہیں۔ محدث ابن خزم اپنی مشہور کتاب ”الاحکام“ میں تحریر فرماتے ہیں۔

”الحکم فی الدین تحریر اور ایجاب اور  
اباحتہ مطلقہ اور بکراہتہ و باختیار  
”الاحکام فی اصول الاحکام جلد ۱ ص ۴۰“

الدلیل قد یکون برہاناً وقد یکون  
اسماً یعرف بہ المسئلۃ وعبارة یقین  
بہا المراد ”الاحکام ص ۳۹“  
”دلیل“ کبھی برہان کو کہتے ہیں، کبھی ایسے نام کو کہتے ہیں  
جس سے مسئلہ پہچانا جاسکے اور کبھی ایسی عبارت کا نام  
ہو جس سے مراد کی وضاحت ہوتی ہو۔

لہذا اس جگہ بھی ”زیر بحث معاہدہ یہود“ ایسی سند اور دلیل کی حیثیت میں پیش کیا گیا ہے جو شرعی مقصد اور مراد کی مزید وضاحت کرتا، اور اس میں قوت پیدا کرتا ہے۔ وہ اس حیثیت میں نہیں بیان کیا گیا کہ اگر حسب اتفاق اس معاہدہ کا ثبوت نہ ملتا تو اصل حکم شرعی ”یعنی غیر مسلم حکومت تسلطہ کے اقتدار کے خاتمہ کے لیے وطنی غیر مسلم جماعتوں کے ساتھ صرف ملکی اور دفاعی امور میں متحدہ قومیت کے نام پر معاہدہ کرنا“ بھی ناجائز قرار پاتا۔ اس لیے پروفیسر صاحب یا دوسرے معترضین کی بحث کا رخ ایک بے محل



بحث کی بجائے اس جانب ہونا چاہیے تھا کہ وہ شرعی احکام و دلائل کے ذریعہ بیان کردہ متحدہ قومیت کو ناب ٹر ثابت کرتے، اور بتاتے کہ اب کرنے میں قرآن و احادیث صحیحہ کے خلاف لازم آتا ہے۔ نہ یہ کہ جس معاہدہ کو معاہدہ یہود یا مسلمان ہونے کو سلف سے خلف تک جمہور محدثین، مفسرین، اور فقہاء کی اُمت نے صحیح تسلیم کیا ہو اور بہت سے مور شرعیہ میں اُس سے استناد و استشہاد روا رکھا ہو، اُس کا انکار کرنا، اور تاویلات کے ذریعہ اُس کو ساقط یا اعتبار نہانا۔

اس کے بعد پروفیسر صاحب فرماتے ہیں۔

”اگر یہ روایت شہادت ہے اور سزا برعکس ہے تو پھر وہ حجت کہاں ہے؟“

اس کا مفصل جواب مولانا کی عبارت اور میرے اس مسطورہ بالا مضمون سے خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی حجت تو وہ تمام قرآنی و حدیثی نصوص ہیں جو مفاد مسلمہ کے پیش نظر ہر اُس قسم کے معاہدہ و صلح کو واجب یا کم از کم جواز قرار دیتی ہیں جن میں احکام شرعی کے خلاف کوئی شے موجود نہ ہو اور اس مخصوص قسم کے معاہدہ ”متحدہ قومیت کے لیے معاہدہ یہود“ سند، شہادت، اور وضاحت مراد کے لیے دیں گے۔ اُس لیے کہ اس روایت کو تمام محدثین، اور فقہاء اُمت نے قابل قبول سمجھا ہے اور اس کو احکام شریعت میں مستند بنایا ہے۔

سی طرح احکام صلح میں ایک مستقل حجت ”معاہدہ حدیبیہ“ بھی ہے۔ پس مفاد مسلمہ کے لیے اگر انتہائی غلو نہ صلح کی جاسکتی ہے تو اسی مقصد کی خاطر یہی اور ملکی معاملات میں فاعلی متحدہ قومیت کا معاہدہ بدرجہ اولیٰ کہا جاسکتا ہے۔ درجن بعض علماء نے صلح حدیبیہ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت کا مذہب میں کیسے جمہور علماء اسلام نے اُن کے عذر کو با اتفاق رد کر دیا۔

اس کے بعد پروفیسر صاحب نے میرے جواب کو نقل کرتے ہوئے دوبارہ پھر یہ اعتراض کیا ہے کہ حضرت مولانا غفرلہ نے معاہدہ کی جن بات کو نظر انداز کر دیا ہے وہ حضرت مولانا کے مقصد کے خلاف ہیں۔

میں نے کہا تھا کہ ”بھگت ایشیا نہیں ہے۔“ پروفیسر صاحب کا ارشاد ہے :-

”میں کتابوں ایسا ہی ہے اور یہی محل کلام ہے“

اس کے متعلق میری صرف یہی گزارش ہے کہ

ہا تو اب رہا نکمہ ان کنتم صدقین اگر آپ اپنے دعوے میں سچے ہیں تو ہیل پیش کیجیے۔

یعنی مولانا کے مقصد کے خلاف معاہدہ میں جو دفعات ہیں ان کو پیش کر کے صراحت کے ساتھ دعوے کا ثبوت دینا چاہیے تاکہ اس پر مناسب کلام کیا جاسکے۔ ورنہ ایک صاحب دیانت و تقویٰ اور صاحب علم و دُعا بزرگ پر علمی بددیانتی کا الزام لگانا کس حد تک ایک تحقیقی اور بنیاد مضمون کے شایانِ شان ہو سکتا ہے اس کے بعد ارشاد ہے :-

اس عبارت پر اپنے مطلب کی دفعات کا نام مبارک سے چن چن کر اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ بھی سمجھ

میں نہیں آتا کہ سوہویر دفعہ تک کا انتخاب ہوا اور بیچ کی دفعات نظر سے رہ جائیں بالخصوص

وہ جو اہم تر ہونے کے علاوہ دمن تبعدہ فلتحق بھرو جاحد معہہ کی تفسیر توضیح بھی کرتی ہو

مگر چوڑی ہوئی دفعات اور جزئیہ کلمے کی مستحق ہیں تو جو مذکور ہیں وہ ذیلی کلیات کیسی بنیں۔

یہ تو پروفیسر صاحب کو بھی تسلیم ہے کہ جن دفعات کو مولانا نے چن چن کر پیش فرمایا ہے وہ مولانا کے مقصد و

مراد کے ٹھیک موافق ہیں، البتہ ان کے نزدیک اس معاہدہ میں ایسی بھی دفعات ہیں جو مولانا کے مطلب

کے خلاف ہیں مگر وہ کس طرح خلاف ہیں ان کو پروفیسر صاحب نے ظاہر نہیں فرمایا، تاکہ قارئین کو یہ عموماً

بھی باقی نہ رہتا کہ کہیں یہ معاہدہ متضاد دفعات کا مجموعہ تو نہیں ہے۔ مولانا تو یہ سمجھتے ہیں کہ اس معاہدہ کی

”روح“ یہ ہے کہ ”یہود اور مسلمانوں کے درمیان“ یہ اطمینان ہو جائے کہ وہ اور مسلمان دوسروں کے مقابلہ میں

مذہبی معاملات کو مشتمل کر کے ”امۃ واحدہ“ (ایک قوم) ہیں۔ اور مدینہ کی جنگ و صلح اور دشمنوں سے

معاملات سیاسی میں ایک ہی شمار ہونگے۔ اور باقی تمام دفعات اُس وقت کے مقتضائے حال کے مناسب

رکھی گئیں جو کسی طرح بھی معاہدہ کی "روح" کے منافی نہیں ہیں۔ اس لیے بلاشبہ وہ مولانا کی بیان کردہ دفعات سے مزید ہیں نہ کہ مخالف مُراد اور زید اور مخلف کے درمیان جو فرق ہے وہ کسی عاقل سے پوشیدہ نہیں ہے، اور یہی حال جو "ومن تبعہم فلحق بہم و جاہد معہم" کی تفسیر و توضیح کا بھی ہے۔ اس لیے پروفیسر صاحب کا یہ الزام کہ مولانا ظلال کی نظر سے بیچ کی دفعات کیسے رہ گئیں، نامناسب اور بے محل ہے کیونکہ مولانا نے ان کو زیر بحث مقصد کی زائد طریقوں کے خصوصی حالات کے مناسب سمجھتے ہوئے قصداً انہیں بیان کیں۔ اس لیے کہ مقصود نقل معاہدہ نہیں ہے استشاد و استناد ہے۔

آپ خود غور فرمائیں کہ اگر خلیفہ المسلمین یا اہل صل و عقد کسی غیر مسلم طاقت سے ایسا معاہدہ کریں جو بظاہر حال مغلوبانہ ہو مگر اہل صل و عقد کے نزدیک اور خلیفہ کے نزدیک وہ مسلمانوں کی اُس وقت کی حالت کے مناسب ہو وہ بظاہر میں معترض کو جواب دیتے ہوئے وہ "صلح حدیبیہ" کی دلیل لائیں تو آپ کے رشاد کے مطابق خلیفہ سے یہ بھی مطالبہ کیا جانا چاہیے کہ وہ آئندہ سال عمرہ کرنے اور مخصوص اسلحہ کو ساتھ لے کر اور دار الحرب سے بھاگ کر دارالسلام میں آجائے وائے مسلمان کو واپس کرنے اور اسی قسم کی دوسری جزئیاتِ صلح کو جب تک اپنے معاہدہ میں شامل نہ کرے اُس وقت تک اُس کو صلح حدیبیہ کی "ن" دفعات سے منہ مانے درجہ کو دلیل ٹھہرانے کا کوئی حق نہیں ہے جو اس صلح کی "روح" میں۔ گریب ضروری ہے تو مجھے نہیں معلوم کہ یہ ضرورتِ علم کے کون سے باب میں درج ہے۔ اور اگر ضروری نہیں ہے تو صاحبِ متحدہ قومیت اور اسلام کیوں موردِ عتاب ہیں؟

اس کے بعد پروفیسر صاحب نے علمی بحث سے ہٹ کر مناظرانہ انداز میں لفظی بحث بھی چھیڑ دی ہے وہ یہ کہ میں نے پروفیسر صاحب پر یہ الزام لگا دیا کہ آپ نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ مسلمان اس معاہدہ کے وقت مدینہ میں مغلوب تھے حالانکہ میں نے "مغلوب" نہیں کہا تھا بلکہ کمزور کہا تھا، اور کمزور ہونے کی سند سہیلی کے حوالے سے بوسیدہ کی کتاب الاموال سے نقل فرمائی ہے۔



اس سلسلہ میں "لجنا طعلی اصول" میری یہ گزارش ہے کہ جبکہ ان لفظی فروق سے نفس مسئلہ پر ادنیٰ سا بھی اثر نہیں پڑتا تو خواہ مخواہ اس طوالت سے کیا فائدہ۔ مجھے تسلیم کہ آپ نے مسلمانوں کو مغلوب نہیں بلکہ "ضعیف و کمزور" لکھا تھا۔ مگر آپ نے اس پر غور نہیں فرمایا کہ اگر مسلمانوں کے ضعف کی وجہ سے سرورِ کونین خاتم الانبیاء (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اسبابِ دنیوی اور تقاضائے حالات کا کچھ نہ کرنا پڑا جن کی ایک معمولی دعا سے تمام عالم کفر و شرک درہم برہم ہو سکتا تھا تو اسی ضعف و کمزوری میں یہ تقاضائے مفاد امت مسلمہ ہندی مسلمانوں کو بھی ایسا کرنے پڑے تو سرورِ عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ عمل ان کے لیے کیوں "اسوۂ حسنہ" نہ بنے؟ آپ کو دراصل اس پر روشنی ڈالنی چاہیے تھی نہ کہ لفظی بحث "نیز" مغلوب "اور" "ضعیف" دونوں کے مفہوم میں اختلاف کے باوجود ان کے درمیان جو تماثل ہے اس کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ہر حال میرا تصور صرف اس قدر ہے کہ میں نے صرف آل اور نتیجہ پر نظر رکھی۔ لفظی تعبیر کا خیال نہ کیا۔ اگر میری رائے غلطی نہیں کرتی تو وحدتِ نتیجہ کی صورت میں اس قسم کی روایت بالمعنی بڑے بڑے محدثین کے یہاں بھی جائز ہے۔

اس کے بعد پروفیسر صاحب نے گزشتہ تحریر کا پھر اعادہ فرمایا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ سب بد منسوخ ہو چکا ہے۔

میں اس کا مفصل جواب نومبر کے بُرآن میں لے چکا ہوں، اس میں علمائے اسلام کی بقول پیش کر کے یہ واضح کر دیا ہے کہ پروفیسر صاحب کا دعویٰ باطل ہے اور علامہ ابن حزم اور شاہ ولی اللہ دہلوی جیسے ارباب تحقیق کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حق بنی قریظہ، بنی نضیر، اور بنی قینقار یہ منسوخ ہو چکا، لیکن امت مسلمہ کو جب کبھی ایسا وقت آن پڑے تو صلح حدیبیہ، "معاہدہ یہود" اور اس قسم کے معاہدے ہمیشہ ان کے لیے "اسوۂ حسنہ" رہیں گے۔ اب اس پر متنازعہ دلیل یہ پیش کرتا ہوں کہ اگر یہ معاہدہ "منسوخ ہو چکا ہے تو اس کی کیا وجہ کہ خیر القرون سے لے کر آج تک جب کبھی اس معاہدہ

سے ستاد و استشاد کی ضرورت پڑتی ہے تو شامی، احمد بن حنبل، ابن تیمیہ، محمد بن حسن شیبانی، جہم السنہ صحر  
مؤدین برابر اس کو سند میں پیش فرماتے ہیں۔ اب آپ ہی فرمائیے کہ ہم نسخ کے دعوے کو تسلیم کریں یا ان  
اعیان امت کے انکار نسخ کو۔

مذکرہ علمی میں پروفیسر صاحب کا یہ طرز عجیب ہے کہ یکے بعد دیگرے بہت سے دعوے  
کرتے جاتے ہیں مگر دلائل سے اغماض فرماتے ہیں۔ چنانچہ اس جگہ بھی نسخ کا دعویٰ ہے مگر اس کے لیے  
دلیل نذر نہ لگے چل کر تحریر فرماتے ہیں:-

”ہدایہ تھا کہ رسول اللہ نے پہلے خود اپنی قائم کردہ ”جماعت متحدہ“ کو (باسباب و وجوہ) توڑا،

اور اپنی تحریر کو منسوخ ٹھہرایا پھر قرآن نے نازل ہو کر اس نسخ پر میردام ثبت کر دی۔ انہ

غنیمت ہے کہ آپ کو یہ اعتراف ہے کہ ایسا وقت آیا ضرور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
وسلم نے مسلم و غیر مسلم کو ملٹی سیاسی معاملات میں ”جماعت متحدہ“ بنایا تھا۔ اب رہا نسخ کا معاملہ تو  
میں تسلیم ہے کہ بحق یہود مدینہ وہ منسوخ ہو چکا لیکن یہ ایک ایسا اسوہ حسنہ ہے جو اسی قسم کے حالات میں  
امت کے لیے ”اسوہ“ رہیگا۔ اس لیے یہ اپنی بنیاد و روح کے اعتبار سے منسوخ نہیں ہے جیسا  
کہ صریح حدیث کا معاملہ بافتاق جمہور امت مشرکین و عرب کے حق میں منسوخ ہو چکا مگر تا قیام قیامت امت  
مسلمہ کے حالات و مقتضیات کے لیے وہ ”اسوہ حسنہ“ رہا ہے اور رہیگا۔

ہیں وجہ مولانا مدظلہ بھی ”متحدہ قومیت“ کے اس سوہ کو مسلمانان ہندوستان کے لیے ایک نصب  
اعین اور مقصد و حیحہ نہیں سمجھتے بلکہ بحالات موجودہ مفاد امت مسلمہ کے لیے ایک ضروری طریقہ کار جانتے  
ہیں اور بس۔ اس کے بعد پروفیسر صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

”نسخ اس نامہ نبوی کا واقعی اور دائمی ہے اس لیے جہاں تک ہمیں علم ہے اس ہزار

بارہ سو برس میں کسی نے مسلمانوں اور نامسلمانوں سے امت واحدہ قائم نہیں کی“

میں کتابوں کہ اس ہزار بارہ سو سال میں کبھی بھی ایسی صورت پیش نہیں آئی جو ہندوستان کی موجودہ حالت میں مسلمانوں کو پیش ہے۔ اس لیے اس قسم کے معاہدہ کی ضرورت بھی پیش نہیں آئی اب تک اس ہزار بارہ سو برس میں علماء امت میں سے ایک عالم بھی ایسا نہیں آیا جس نے اس نامہ نبویؐ کو پروفیسر صاحب کی طرح اصل دائمی اور واقعی منسوخ مانا ہو۔ تیرہ سو سال کے بعد کائنات کے سامنے یہ پہلا عجیب ادعا ہے جو آپ نے پیش فرمایا ہے۔ اس لیے کہ نسخ کا معاملہ کتنا ہی پیچیدہ سہی اور متعلقہ جماعتوں کے حق میں یہ نامہ نبویؐ منسوخ بھی ہو چکا ہے تب بھی تمام علماء امت کا اس پر اتفاق ہے کہ ”نفس معاہدہ یا نامہ نبویؐ ہرگز ہرگز منسوخ نہیں ہے۔ پس جمہور علماء امت کے خلاف کسی کا اس معنی میں دعویٰ نسخ کرنا ناقابل قبول ہے۔ نیز تیرہ سو برس میں اس قسم کے معاہدہ کا نہ کرنا بھی اس کے نسخ کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ آگے چل کر فرماتے ہیں:-

”مطلب یہ تھا اور ہے کہ نامہ مبارک کو منسوخ نہیں مانا جاتا تو پھر مسلمانوں اور نامہ سازوں

سے جو متحدہ قومیت بنائی جاتی ہے وہ نامہ مبارک کی شروط و قیود کے مطابق تو ہونی چاہیے“

بے دلیل اور بغیر سند کے کسی چیز کو بار بار دہرانے سے وہ حقیقت کس طرح بن سکتی ہے نیز میں نے ابھی فقہاء امت کے نقول پیش کر کے ثابت کیا ہے کہ معاہدات و صلح میں ”اسوہ حسنہ“ یہ ہے کہ اُس سے مفاد امت مسلمہ مقصود ہو۔ لہذا کسی معاہدہ نبویؐ یا نامہ نبویؐ کو اس طرح استعمال کرنا ضروری نہیں ہے کہ اُس وقت کے تقاضے کے اعتبار سے جن قیود و شروط کو اس میں درج کیا گیا تھا، خواہ وہ وقت کے اعتبار سے عائد نہ بھی ہو سکتی ہوں تب بھی ان کے عائد کیے بغیر اُس کو ”اسوہ“ نہ بنایا جاسکے۔ مثلاً حدیبیہ ہی کی مثال سامنے رکھیے کہ ”صلح“ کے بارہ میں جمہور علماء اسلام نے اس کو ”سوہ تسلیم“ کیا ہے، تاہم ضروری نہیں سمجھا کہ اس قسم کی ہر ایک صلح میں اُس کی تمام قیود و شروط کا ہی ذکر رکھا جائے تب ہی اُس کو ”اسوہ“ بنایا جائے ورنہ نہیں۔



چنانچہئمہ دین میں سے جب امام شافعی نے ان تمام قیود کو ضروری نہ سمجھتے ہوئے بھی "جو کہ اس مخصوص وقت کے مطابق سے ضروری تھیں، فقط اس قید کو ضروری قرار دیا کہ" جو معاہدہ بھی ہو وہ دس سال کے لیے ہو کیونکہ حدیث کا معاہدہ دس سال کے لیے ہوا تھا، اور اگر ضرورت باقی رہے تو ہر دس سال کے بعد اس کی تجدید کر لی جائے کرے" تو دوسرےئمہ دین اور ان کے پیروں کے لیے یہ شرط نہیں مذہب نے اس کی بھی مخالفت کی اور یہ تصریح فرمائی کہ اس قسم کی قیود معاہدہ کی اصل روح نہیں ہیں ہذا صلیح کی جو شکل بھی مسلمانوں کے مفاد کے لیے مناسب ہو بشرطیکہ اسلامی احکام سے نہ ٹکراتی ہو وہ اختیار کی جائے۔ اور جب تک مناسب سمجھیں وہ اس کو باقی رکھیں۔ چنانچہ میں ابھی فقط ابن قیم رحمہ اللہ سے نقل کر چکا ہوں اور حافظ ابن قیمیہ فرماتے ہیں:-

باب اہل الذمہ (المطابق فہو عقد جائز یعمل  
 ردہام فیہ بامصالحتہ (اور صیارات العلینہ)  
 اور علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

والنبی صلی اللہ علیہ وسلم لم یوقت عقد  
 الصلح والحدیۃ بینہ و بین الیہوم لما  
 قدم المدینۃ بل اطلقہما دایموا  
 کافمن غیر محاربین لہ (والمدینۃ)  
 اور امام ابن الدین کا شافعی تحریر فرماتے ہیں:-

ان موادعہ ماں کان مطلقاً  
 عن الوقت و ماں کان موقتاً بوقت  
 معاہدہ اور صلح یہ تو غیر کسی تعین وقت کے ہوگی اور یہ  
 وقت معین کے ساتھ مقید۔

معلوم الخ (البدائع الصنائع جلد ۱ ص ۱۸۶)

یا مثلاً صحیح حدیث اور معاہدہ یہود“ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے امام اور پیغمبر خدا کی حیثیت سے کیا تھا، پس اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ ”معاہدہ“ کے لیے یہ شرط ہے کہ امام ہی کر سکتا ہے دوسرا کوئی شخص نہیں کر سکتا، تو اس کا یہ دعویٰ بھی علماء کے نزدیک باطل ہے اور وہ تصریح کرتے ہیں کہ اگر معاہدہ کی غرض پوری ہو جاتی ہو یعنی ”سفاد است مسلمہ“ تو امام کے علاوہ دوسرے مسلمانوں کا معاہدہ کر لینا بھی درست ہے۔

ولا يشترط اذن الامام بالموادعة  
 حتى لو اذعهم الامام او فريق من  
 المسلمين من غير اذن الامام جازت  
 موادعتهم لان المعول عليه كون  
 عقد الموادعة مصلحة للمسلمين و  
 قد وجد (البدائع الصالحه جلد ۱ ص ۱۰۸)

اور معاہدہ کے لیے امام کی اجازت کی شرط نہیں ہے  
 تاہم اگر کفار سے امام نے یا مسلمانوں کی ہک جاعت  
 نے امام کی اجازت کے بغیر معاہدہ کر لیا تو وہ نافذ  
 ہو جائیگا۔ اس لیے کہ معاہدہ کی جو قابل اعتناء اساس  
 ہے وہ مسلمانوں کی مصلحت ہے۔

اور جب حالت یہ ہو کہ امام کا وجود ہی نہ ہو تو اہل حل و عقد یعنی ارباب علم و دیانت اور یقین اور سیاست کا معاہدہ بھی مسلمانوں کے لیے یقیناً وہی حیثیت رکھتا ہے جو عبارت مسطورہ بالا میں موجود ہے۔ اس تمام قبیل و قال کے بعد پروفیسر صاحب یہود مدنیہ کے نسب پر بحث کرتے ہوئے میری تردید میں ارشاد فرماتے ہیں۔

”میں کتابوں کے جناب یودی صاحب نامبروہ قبائل زبورو قریطہ، بنو غنیمہ بنو قنقار جن کو چند سنہوں میں  
 کی سند پر عربی نسل قرار دیتے ہیں اور مدینہ میں صرف دو تین غیر معدودت خاندانوں کو یہودی نسل یا  
 سرائیلی بتاتے ہیں مگر قرآن کریم اس کے خلاف خبر دیتا ہے“ الخ

اور پھر قرآن عزیز سے وہ تمام آیات نقل فرمائی ہیں جو سورہ بقرہ میں یثربی اسرائیل سے شروع

ہوتی ہیں اور پھر آگے چل کر ارشاد ہے۔

”مختصر یہ کہ میں بدلتا نص قرآنی در شہادت مجہول مفسرین بنو قینقاع، بنو نضیر، بنو قریظہ کو اسرائیلی یہودی سمجھتا ہوں، جناب موسیٰ صاحب کو اختیار ہے کہ یعقوبی و سعودی جیسے مشہور مورخین کی تحقیق کو انہیں نص قرآنی و مجہول مفسرین کے مستند بیان کو۔

مجھے سخت حیرت ہے اور تنہائی تعجب بھی کہ تحقیق حق کی یہ کونسی منزل ہے جس میں تاریخی مباحث کو بھی زبردستی قرآن عزیز کا مقابل بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ قرآن عزیز کی ان تمام پیش کردہ آیات میں سے کوئی ایک آیت بھی اس کے لیے نص نہیں ہے کہ: مبرہہ قبائل صلبی رشتہ سے ضرور اسرائیلی ہیں۔

میں نے زبردستی تینوں یہودی قبائل کے متعلق یہ ضرور کہا ہے کہ گروہ عرب کے عام مورخین اور علماء و نسب کا یہی خیال ہے کہ یہ تینوں قبائل یہودی نسل، اسرائیلی ہیں جیسا کہ عام عرب مورخین کی روایات سے معلوم ہوتا ہے جن کو کتب تفسیر میں شان نزول کے موقع پر بیان کیا جاتا ہے (گر یعقوبی و سعودی جیسے اہل تحقیق کے نزدیک یہ یہودی المذہب اور صلبی رشتہ میں قحطانی نسل ہیں لہذا میں ان تمام حوالوں کے باوجود جو پروفیسر صاحب نے قرآن عزیز کی بہت سی آیات کی صورت میں پیش کیے ہیں اب تک یہ سمجھنے سے قاصر رہا ہوں کہ یہ تاریخی تحقیق آیات قرآنی سے کیسے نکراتی ہے؟

کہو کہ اس سلسلہ میں حسب ذیل امور قابل توجہ ہیں

(۱) قرآن عزیز نے کسی ایک جگہ بھی کسی یہودی قبیلہ کا نام لے کر خطاب نہیں کیا۔ بلکہ یثربی اسرائیلی کہہ کر خطاب کیا ہے، لہذا اس کا مصداق واقعات و تاریخ ہی تعین کرینگے نہ کہ نص (آیت) ۲۱ محققین و غیر محققین عام مفسرین ”یثربی اسرائیلی“ کی تفسیر میں یہودی یا اولاد یعقوب علیہ السلام کہتے ہیں۔ بنی قریظہ، بنو نضیر، بنو قینقاع کو متعین نہیں کرتے۔ حافظ عماد الدین ابن کثیر، امام محمّد بن رازی



صائب کبیر زید محمود اوسى صاحب روح المعانی، ابو حیان اندلسى صاحب البحر المحیط، جیسے طلیل القدر مفسرین کی عام روش یہی ہے۔

یٰبَنِی إِسْرَءِیْل۔ هَذَا افْتِتاحُ الْکَلَامِ  
اس کلام کی ابتداء سے یہود و نصاریٰ سے خطاب  
مع الیهود والنصارى ومناسبة  
مقصود ہے اور یہاں اس پیرائے بیان کی مناسبت  
الکلام معهم هنا ظاهرة۔ الخ  
ظاہر ہے۔

وكانت هاتان الطائفتان اعنى الیهود  
اور یہ دو گروہ یعنی یہود و نصاریٰ بل کتاب تھے جو  
والنصارى اهل کتاب مظهرین  
پیغمبروں کی پیروی اور خدا کی وحی کی قدار کے  
اتباع الرسل والاقتداء بما جاء  
دعویا دیتے تھے۔  
عن الله تعالى والبحر المحیط جلد ۱ ص ۱۳۱

فقوله یٰبَنِی إِسْرَءِیْل خطاب مع جماعۃ  
یٰبَنِی إِسْرَءِیْل۔ ان یہودی جماعتوں کو خطاب  
الیہود الذین كانوا بألمدینۃ من ولد  
ہے جو مدینہ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد  
یعقوب علیہ السلام فی ایام محمد صلی  
میں سے زمانہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں آباد تھے۔  
الله علیہ وسلم۔ (تفسیر کبیر جلد ۱ ص ۱۳۱)

(۳) جن مفسرین نے نامبرہ قبائل کے نام لے کر یٰبَنِی إِسْرَءِیْل کی تفسیر کی ہے وہ عرب مؤرخین اور علماء نساب کے مسلک کے مطابق کی ہے نہ کہ نص قرآنی سے حاصل کر کے۔

(۴) علامہ سمودی نے دفاتر الوفا میں تصریح کی ہے کہ جب مدینہ میں یہود شام سے آکر بسے ہیں تو ان کے میں سے زیادہ قبائل تھے۔

(قلت) ونقل رزین عن الشرقي ان یهود  
میں کتاہوں کہ شرقی نے رزین سے نقل کیا ہے کہ  
كانوا نیفاً وعشرین قبیلۃ الخ بعد ادول  
یہودی میں سے زیادہ قبائل شرب ہیں آباد تھے۔

تو ان تین قبائل کے علاوہ دوسرے قبائل میں سے جو باقی ماندہ یہودی تھے وہ بھی ابھی تک مدینہ اور اطراف مدینہ ہی میں آباد تھے، اور ان میں سے بعض کے نام کتب حدیث و تاریخ میں بھی مذکور ہیں۔ نیز جیسا کہ جلیل القدر مفسرین کی تفاسیر سے ثابت ہے قرآن عزیز کی ان تمام آیات میں اگرچہ خطاب اولین اولاد یعقوب (علیہ السلام) کو ہے مگر وہ ثانوی درجہ میں اس خطاب کی وسعت کے ذریعہ تمام اہل کتاب "یہود و نصاریٰ" کو بھی شامل کر لینا چاہتا ہے۔ کیونکہ ان تمام مقامات میں اس کو یہ بتانا مقصود ہے کہ یہود و نصاریٰ جبکہ نسل و خاندان یا مذہبی رشتہ میں خود کو حضرت یعقوب (اسرائیل) کی جانب منسوب کرتے، اور خاندانہ نبوت اسرائیلی سے وابستہ سمجھتے ہیں تو ان کو اپنے بزرگوں پر بے نایب نعمتائے ربانی کے پیش نظر ایک لمحہ کے لیے بھی کفرانِ نعمت اور خدا کی نافرمانی کو اختیار نہ کرنا چاہیے تھا۔

خطابی تخصیص کے ساتھ عمومی مراد کا یہ طریقہ قرآن عزیز میں بہت سے مقامات میں موجود اور عجازِ فصاحت و بلاغت میں شامل ہے۔ مثلاً پردہ سے متعلق آیات میں:-

يُنْسَاءُ الْبَنِي لَسْتُمْ كَأَحَدٍ مِنَ النِّسَاءِ لَئِي نَبِيٍّ كِي مَيُوتُمْ دَعْوَتُوهُنَّ كِي طَرَحْنَهُنَّ۔

کے ساتھ خطاب کرتے ہوئے جو احکام دیے گئے ہیں، جمہور مفسرین اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ شانِ نزول کی اس بہ خصوصیت کے باوجود احکام میں قرآن عزیز کا روئے سخن تمام مسلمان عورتوں کو عادی ہے۔ اسی طرح حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کو ان کی بدتماشی پر سرزنش کرتے ہوئے فرمایا تھا:-

هَؤُلَاءِ بَنَاتِي هُنَّ أَطْهَرُ لَكُمْ يٰ مِيرِي بَاعَصْتُم بِبَنَاتِي مِي جُتْمَارُكُم لِي عَلَال مِي۔

اہل تحقیق کے نزدیک اس "ہول" کے خدب میں صرف ان کی چند بیٹیاں داخل نہ تھیں بلکہ اپنی قوم کی تمام کنواری بیٹیاں مراد تھیں اور مقصد یہ تھا کہ بدعتِ ثؤم کو صاحبِ حسن و جمال اور باعصمت عورتوں کو چھوڑ کر ان مردوں کی جانب متوجہ نہیں ہونا چاہیے کہ یہ بہت بڑی لعنت ہے۔

پس ایسی صورت میں یبنی اسرائیل کے مصداق کے تعین میں مشہور و غیر مشہور قبائل یا قبیلے  
کثیر تعداد کی تقسیم سے قرآن عزیز کی خطابت پر مطلق اثر نہیں پڑتا، بہتہ اگر شرب (مدینہ) میں ایک خاندان بھی  
اسرائیلی موجود نہ ہوتا تو اشکال مازم آسکتا ہے۔

(۵) یبنی اسرائیل کے خطاب میں وہ اسرائیلی نصاریٰ بھی شامل ہیں جو نسبی رشتہ میں شامل  
ہونے کے باوجود غیر مشہور تھے۔

(۶) تاریخ انصاف سے خواہ ان ہر سہ قبائل کا صلیبی اعتبار سے اسرائیلی ہونا ثابت نہ ہوتا ہو  
مگر ان تینوں قبائل کو خود اپنے اسرائیلی ہونے کا دعویٰ تھا، اور تذکیر و نصیحت کے ایسے مواقع میں جبکہ  
خطاب کا حقیقی مصداق بھی موجود ہو سکتا اگر ان ہر سہ قبائل کو بھی شامل سمجھا گیا تو اس سے اصل حقیقت  
پر کیا زور پڑتی ہے۔

(۷) جو علماء انساب ان تینوں قبائل کو اسرائیلی نہیں بلکہ نجدی مانتے ہیں ان میں سے بعض  
یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ ناہمالی رشتہ سے حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں شامل ہیں، سو اگر یہ صحیح ہے  
تو قرآن عزیز کی خطابت یبنی اسرائیل میں یہ بلا تکلف داخل ہو سکتے ہیں۔ اس لیے کہ اس کی نظائر اس  
عرب میں بہت کثرت سے پائی جاتی ہیں مثلاً کعب بن الاشرف مشہور یہودی قبیلہ بنی نضیر کا فرد شمار ہوتا ہے  
حالانکہ صلیبی رشتہ سے وہ بنی نضیر کا فرد نہیں ہے، پھر کیوں اس قبیلہ میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی وجہ  
ابن اسحق سے سنیے :-

وكان من بني طي ثم احد بني بنهان ولكن امة - و قبيلة بني طي کے خاندان بنی ہنہان (صلیبی عرب) ہو تھا

من بني النضير (الهداية والهداية بن كثير طي ۴ ص ۵) لیکن اس کی ماں بنی نضیر کے قبیلہ سے تھی۔

فاتي المدينة فخالفت بني النضير فشرفت - اس کا باپ مدینہ اگر بنی نضیر کا حلیف ہو گیا، اور ان میں

فيهم تزوج عقيلة بنت ابي الحقيق - عزت پا گیا اور بنی حقیق کی بیٹی عقیلہ سے شادی کر لی۔



مگر یہ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ سورہ بقرہ کی پہلی ہی آیت "یٰٰہٰذٰلِکَ الذِیْنِ اٰمَنُوْا" کے جملہ درونگوؤں اور کافر بہ (تم سب سے پہلے) نکال کرنے والوں میں نہ ہو کہ یہاں کی تفسیر میں ہی مفسرین جن کی سند لے کر پروفیسر صاحب مہری بیان کر رہے ہیں، یہ بھی تحقیق کو قرآن عزیز کے مخالف بتانے کی ناکام سعی میں مشغول ہیں تحریر فرماتے ہیں۔

المخطاب یہود نزلت فی کعب بن الاشرف یہ یہود کو خطاب ہے اور یہ آیت کعب بن الاشرف و رؤساء الیہود۔ فارن جلد ۱ ص ۴۵ اور رؤساء یہود سے متعلق ماضی ہوئی ہے۔

کعب بن اشرف اسرائیلی نہیں ہے مگر یبنی اسرائیل کے خطاب میں سب سے پہلے داخل ہے تو اس طرح رؤساء یہود یعنی بنی قریظہ، نصیر، قینقاع وغیرہ قبائل کے سردار بھی یہی اسرائیلی نہ ہونے کے باوجود اس خطاب میں شامل ہو جائیں تو کیا اعتراض؟ نیز علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی "یبنی کی نفوی تحقیق کرتے ہوئے عام استعمال کے جواز میں تحریر فرماتے ہیں۔

انہ حقیقۃً فی الابناء الصلیبۃ کما بقی ابن کا استعمال صبی اولاد کے لیے حقیقت ہے جیسا کہ فی الاصول واستعمالہ فی لعام مجاز کتب لغات میں مذکور ہے اور عام استعمال (صبی و) (روح المعانی جلد ۱ ص ۲۲۲) غیر مجلی میں مجاز ہے۔

(۷) اس تمام شرح و تفصیل کے بعد سورہ بقرہ کی آیت "استفتح"

کا نوا میں قبل یتفتحون علی الذین کفروا اور (ابودی) میں (قرآن) سے پہلے اسی سے کافروں پر غلبہ پانے کی آرزو کیا کرتے تھے۔

کے متعلق بھی مفسرین کے قول کی وہی شرح ہے جو ہم سطور بالا میں یبنی اسرائیل کی شرح کرتے ہوئے بطور تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ لہذا پروفیسر صاحب کا یہ ارشاد:-

"یہیں ہے محبت ہے، یہاں ہے اس بات پر کہ بنو قینقاع، بنو نصیر اور قریظہ بنی اسرائیل تھے"

# پدنی اور سلطان علاء الدین خلجی

جناب شاق احمد صاحب زادہ ریٹائرڈ پرنسپل صادق ایجرٹن کالج بہاولپور

سلطان علاء الدین خلجی پر بعض مورخوں نے یہ الزام لگایا ہے کہ اُس نے چتوڑ کے قلعہ پر محض اس وجہ سے حملہ کیا تھا کہ وہ چتوڑ کی رانی پدنی کے خن کی شہرت شن کر اُس پر نادیدہ فدا ہو گیا تھا لیکن رانی کے ستی ہو جانے سے وہ اپنے منصوبوں میں ناکام رہا۔ پیشتر اس کے کہ اس الزام کی تردید کی جائے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ہر ملک و ملت کی تاریخ میں از آدم تا اس دم یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ عورت کے حسن و جمال نے جنگ کے شعلے بھڑکائے ہوں اور خون کی ندیاں بہانی ہوں۔ اس لیے اگر بہ فرض محال سلطان علاء الدین نے بھی ایک خن کی دیوی کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈالی تو کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں کی جو کسی جرم کے الزام کے ذیل میں آوے۔ جس زمانہ کا یہ ذکر ہے اُس زمانہ میں بادشاہ ایسا کیا ہی کرتے تھے۔ نہ صرف مسلمان بادشاہ ہی بلکہ ہندو راجہ اور دیگر مذاہب کے تاجدار بھی اس عیب کو ثواب سمجھتے تھے۔ لیکن جو بات قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ جہاں تک صحیح واقعات کا تعلق ہے علاء الدین خلجی نے چتوڑ پر نہ پدنی کی وجہ سے حملہ کیا نہ چتوڑ کی اُس وقت کی کسی رانی کا نام پدنی تھا۔ پارلوگوں نے مفت میں ایک فسانے کو تاریخی واقعہ قرار دے کر اور شاید کنولا دیوی گجرات کی رانی کو پدنی سمجھ کر علاء الدین پر فرد قرار داد جرم لگا دی۔ اب سے کوئی پندرہ برس ہوئے کہ اس ضمن میں میرے عزیز اور دوست مولوی احتشام الدین صاحب ایم اے دہلوی نے پنجاب کے ایک رسالہ بہارت میں ایک سلسلہ مضمون شائع کرایا تھا اور اب اس میں انہوں نے افسانہ پدنی کے نام سے ایک

کتاب بھی طبع کرانی ہے مولوی صاحب موصوف نے تاریخی حواجیات کی بنا پر نہایت تحقیق کے بعد یہ ثابت کیا ہے کہ علامہ الدین چوہدری کا نام لگایا گیا ہے بالکل بے بنیاد ہے۔ گویہ ممکن ہو سکتا ہے کہ مالوسے کے بادشاہ غیاث الدین غمی نے جو حسین عورتیں جمع کرنے کا شائق تھا کسی پدہنی کو چوڑے سے جو مالوسے کے قریب واقع ہے حاصل کیا ہو۔ در یہ واقعہ قلمتہ کہانیوں کی معرفت تاریخ تک پہنچ گیا ہو اور غیاث الدین کی بجائے علاء الدین فہمی کا نام لگایا ہو۔ یہ سب درج ہو گیا ہو۔ مجھے مولوی حسام الدین صاحب کے اس اخروی نظریے سے اختلاف ہے لیکن ان کے سبب فیصلہ سے قطعاً اتفاق ہے کہ علامہ الدین نے نہ پدہنی کی چوڑے سے چوڑے پر لکھا ہے چوڑے کی اس وقت کی رانی کا نام پدہنی تھا۔ میری رائے یہ ہے کہ یہ واقعہ کنولادیوی کے متعلق ہے۔ اور چونکہ کنول اور پدم مترادف ہیں اس لیے کنولادیوی کو پدہنی قرار دینا بالکل وجہی ہے۔ در جب سلطان نثار الدین نے ہجرت کی فتح کے لیے اپنی افواج بھیجیں تو وہ افواج چوڑے ہوتی ہوئی ہجرت پہنچیں۔ اس لیے بجائے اہلوادے کے جو ہجرت کا اس وقت دارالخلافہ تھا چوڑے کو پدہنی کا وطن قرار دے دیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بعض مورخین نے ایک افسانے کو تاریخی افسانہ سمجھ کر اس کے بعض ناموں پر تاریخی واقعہ کے درج کر دیے اور اس سے دنیا کو دھوکے میں ڈال دیا۔ یہ افسانہ بدعات ہے جو ملک محمد جالسی نے ہریان بھاکار بھاشا، شیر شاہ کے عہد میں ثنوی کی حصر میں پڑھنے والوں، سننے والوں کو خوش کرنے کے لیے لکھا تھا۔ اس افسانہ میں دستور کے موقوف ایک تاریخی واقعہ سے بے بہرہ لیکن اس کے اداکاروں اور محل وقوع کے نام ہیں دیے ہیں یا فرضی رکھ لیے ہیں۔ بعض واقعات شیر شاہ کے زمانہ کے بھی درج کر دیے ہیں۔ اور باقی سب حالات قیاسی ہیں۔ پداوت کا پلاٹ معلوم کرنے کے بعد یہ پتہ لگا کہ بہت آسان ہو جائیگا کہ سائے محلے کی اصلیت کیا ہے۔ پداوت کا قصہ یہ ہے کہ سنگھ پپ کے راجہ گندھرپ سین کی ایک حسین بیٹی ہے جو دید پُران، شاستر اور دیگر مہتمم سنسکرت کی تعلیم پاتی ہے۔ اس بڑی کا ہم سبق ایک عوط بھی ہے جس کا نام



ہیرامن ہے۔ یہ طوطا انسان کی طرح بات چیت کرتا ہے۔ اتفاق سے یہ طوطا کسی تاجر کے ہاتھ پڑ جاتا ہے جو اسے ایک عجوبہ سمجھ کر چتوڑ کے ولیعہد رتن سین کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے۔ ہیرامن طوطا اپنی رام کھانی رتن سین کو سنانا ہے اور اثنائے گفتگو میں اپنی ہم جماعت پدمنی کے حسن و جمال اور علم و فضل کی تعریف بھی کر دیتا ہے۔ رتن سین پدمنی پر عاشق ہو جاتا ہے اور فقیر بن کر اس کی تلاش میں نکلتا ہے بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کر کے دیوتاؤں کی مدد سے منتر مقصود تک پہنچ کر سنگدھپ کے قلعہ کو فتح کرتا ہے اور راجہ کو اپنے خاندان کا حال سنا کر اس کی مرضی سے پدمنی کو بیاہ کر بہت مال و اسباب سمیت واپس اپنے وطن پہنچاتا ہے۔ رتن سین کی ایک پہلی زانی بھی تھی جس کا نام مانگتی ہے۔ ددوئیہ رانیوں میں خوب لوگ جھوٹے ہوتے ہیں۔ ایک دن رتن سین کا باپ راجہ چتر سین مر جاتا ہے اور رتن سین تخت پر بیٹھتا ہے۔ اتفاقاً ایک برہمن زادہ درباری سسی راگھو سے کچھ گت خنی ہو جاتی ہے راجہ رتن سین درباری کو دیس بدر کر دیتا ہے۔ راگھو دلی پہنچتا ہے اور بدلہ لینے کے خیال سے پدمنی کے حسن کی تعریف سلطان عمار الدین سے اس طرح کرتا ہے کہ سلطان اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ پھر راگھو ان عجائبات کا ذکر کرتا ہے جو پدمنی اپنے جیہز میں سنگدھپ سے لائی تھی، یہ عجائبات حسب ذیل تھے (۱) امرت (۲) پارس (۳) سیمرغ (۴) ہنس جو موتی کہتا تھا (۵) لال شیر جو ہاتھیوں کے گلے گھیر لاتا تھا۔ چنانچہ سلطان عمار الدین پدمنی کا راجہ سے مطالبہ کرتا ہے۔ راجپوت راجہ کی غبرت قبول نہیں کرتی کہ سلطان کا حکم بجالائے۔ سلطان قلعہ کا محاصرہ کر دیتا ہے، محاصرہ طویل پکڑتا ہے۔ دونوں فریق تھک جاتے ہیں صلح کی بات چیت ہوتی ہے اور فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ سلطان پدمنی کے مطالبہ سے دست بردار ہوتا ہے بشرطیکہ راجہ پانچوں عجائبات جو سنگدھپ سے لیا ہے سلطان کے حوالہ کر دے۔

صلح کے بعد راجہ اپنے محل میں سلطان کی دعوت کرتا ہے چلیاں اور خواصیں دسترخوان پر

کھانا لگاتی ہیں۔ بادشاہ اس شش و پنج میں رہتا ہے کہ کس کھانے کے انتظام میں پدہنی بھی نہ ہو۔ مگر بعد پدہنی  
یونکر اس طرح رہنے جاتی۔ سلطان کے مخبروں نے خبر دی کہ پدہنی جہرہ کوں میں آتی ہے۔ سلطان نے جہرہ کے  
کے مقابل ایک ٹینے نصب کرایا۔ کھانے کے بعد راجہ سلطان سے شطرنج کھیلنے بیٹھ جاتا ہے، اس ٹینے  
ہے سلطان کی نگاہ گھڑی گھڑی ٹینے پر پڑتی ہے، ادھر سبیاں پدموت یعنی پدہنی سے سلطان کے حسن و  
جہوں کی تعریف کرتی ہیں۔ دہتی میں کہ وہ جہرہ کوں میں سے تم بھی دیکھو کہ کیسا "پارس کنڈن" ہے۔ یہ تعارف  
ہے کہ وہ ہمارے یہاں نہان ہے پھر یہاں موفع نہ ملے گا۔ پدموت جہرہ کے میں آتی ہے اس کا عکس اس ٹینے  
کے ٹینے کو مات کرتا ہے۔ ادھر سلطان کی نگاہ ٹینے پر پڑتی ہے اور وہ اپنی عقل و خرد کو ٹھٹھاتا ہے۔ شطرنج  
میں مات کھا لیتا ہے۔ راجہ اس مجید سے نا آشنا رہتا ہے۔ صبح و سطران رخصت ہوتا ہے، راجہ شایستہ  
کے لیے قلعہ کے دروازہ تک ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ قلعے سے بھگنے کے لیے بیچ و خم کھاتی ہوئی نصیل میں  
سے گزر رہا ہوتا ہے۔ ورنہ ہر موڑ پر ایک دروازے میں سے جانا ہوتا ہے۔ اس طرح کے کئی دروازے  
ہیں۔ ہر دروازہ پر جب سلطان پہنچتا ہے، اور راجہ رخصت ہونے لگتا ہے تو سلطان ایک پرگنہ یا قلعہ  
رہہ کو خوش کرنے کے لیے بطور انعام اس کو عطا کرتا ہے۔ راجہ شکر یہ ادا کرنے کے خیال سے دوسرے  
دروازہ تک سلطان کے ساتھ پہنچتا ہے حتیٰ کہ سب دروازے ختم ہو گئے اور راجہ، سلطان دونوں قلعہ  
سے ہر محل سے دفعہ راجہ کو سلطان کے سپاہی گرفتار کر لیتے ہیں اور حراست میں دلی لے آتے ہیں،  
جس راجہ کو مجبور کیا جاتا ہے کہ پدموت کو بوا دے۔ تب اگر راجہ پدموت کو بلانے کا خط لکھ دیتا ہے  
اس میں ہمیں مسرور ہے کہ راجہ پدموت کو منی بھیج کر اپنے دام میں گرفتار کرنا چاہتا ہے مگر پدموت اس کے  
جاں میں نہیں بھنپتی۔ راجہ کا خط پڑھ کر اس کے دورشتہ دار گورا، راجا دل یہ ترکیب نکالتے ہیں کہ ڈوبوں  
کی بات تھ جس میں ہر روں سپاہی پر دے میں چھپے بیٹھے ہوں ایک ہاڈول کے ساتھ ساتھ دلی  
بھیج جائیں، بسٹاں کو عدا کی جادو سے کہ ہاڈول میں رہی ہے اور ڈوبوں میں اس کی سیل

در لوڈی باندیاں ہیں اور حاضر ہونے سے قبل رانی قلعہ چتور کی کنجیاں راجہ رتن سین کے سپرد کرنا چاہتی ہیں اس لیے راجہ سے ملنے کی اجازت دی جائے۔ یہ سب کچھ ہو جاتا ہے، درجب راجہ کے پاس یہ ڈولیوں کا لشکر پہنچتا ہے تو ہاڈول میں سے ایک لوہا رنگلتا ہے درڈولیوں میں سے سورما پاک لوہا راجہ کی بیڑیاں کاٹتا ہے، اور راجہ کو ایک تیز رفتار گھوڑے پر سوار کر کے اس کے دفاع اور سپاہی رٹتے بھرتے شہر میں سے نکال اپنے وطن صحیح و سلامت پہنچا دیتے ہیں۔

وطن پہنچ کر راجہ کو کھبل میر کے راجہ کی حرکت کا علم ہوتا ہے اس راجہ کا نام دیو پال ہے۔ رتن سین اس پر چڑھائی کر دیتا ہے۔ دوران جنگ میں رتن سین دیو پال کے مقابل ہوتا ہے، دست بدست لڑائی ہوتی ہے ایک کا وار دوسرے پر کاری پڑتا ہے۔ رتن سین زخمی ہو کر وطن لایا جاتا ہے اور راستہ ہی میں ختم ہو جاتا ہے۔ یہ خبر سن کر سب رانیاں جن میں پدموت بھی شامل ہے سستی ہو جاتی ہیں۔ بدھرنی کے شعلے انگارے بنے اور انگٹے راکھ ہوئے ادھر سلطان ملہ رالہ دین کے لشکر نے قلعہ سر کر لیا اور سلطان پمپنی کی تلاش میں محس کے کونے کونے کو دیکھ رہا تھا کہ ایک جگہ اسے راکھ کا ایک ڈھیر نظر پڑا سلطان سمجھ جاتا ہے کہ پمپنی سستی ہو گئی، وریہ خاک سی کی ہے۔ بالیوسی سے دست افسوس لیتا ہے اور ایک مٹھی اس خاک کی لے کر ہوا میں اڑا دیتا ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ انسان کی بستی بس اتنی ہے اور اس کی ہوس اس خاک کی طرح ہوا میں بل جاتی ہے درتصہ اس بیت پر ختم ہو جاتا ہے:-

جو نہر بھیں، ستری پُرکھ بھئے سنگرام      پادشاہ گڈھ چوڑا چتور بہا اسلام

یہ قصہ پڑھنے کے بعد جس کا جوجی چاہے سن حاصل کرے۔ گر ملک محمد جاسی نے جو نتیجہ نکالا ہے اس کو مہنوں نے خود بیان کر دیا ہے جس سے پڑھنے والوں پر (جو زیادہ تر ہندو ہونے چاہئیں) کیونکہ مثنوی بھاکا (بھاشا) میں لکھی گئی ہے) تصوف کا رنگ چڑھ جاتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ چتور گڈھ سے مراد رتن سین ہے، اور راجہ رتن سین سے جو اس گڈھ میں رہتا ہے مراد جان ہے۔ دل سنگدیب کو سمجھنا



چاہیے اور پدہ منی گویا عقل ہے، مرشد میرمن طوطے کو جانا چاہیے جس نے راستہ دکھایا۔ ناگنتی یعنی راجہ کی کالی پوی دنیا کے دھندے و کاروبار میں اُن سے وہ بچا جس نے دنیا سے دل نہ لگایا۔ راگمو منجر یعنی شیطان ہے اور علاء الدین بادشاہ سے مراد حرص و ہوا ہے۔

مثنوی پر مبادت کے مندرجہ بالا پلاٹ سے صاف ظاہر ہے کہ مصنف کا مطلب ہرگز تاریخی کہانی لکھنے کا نہ تھا، اس لیے اس پر تو یہ اعتراض ہو ہی نہیں سکتا کہ تاریخی واقعات کو بدل دیا یا غلط بیانی سے کام لیا جو لوگ اس کی تاریخ سے واقف ہیں وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ملک محمد نے کہیں کی اینٹ اور کہیں کا روڑا لے کر ایک عمارت اپنی مرضی کے مطابق تیار کر دی۔ اب یہ محققین کا کام ہے کہ وہ ڈھونڈتے پھریں کہ اینٹ کہاں کی ہے اور روڑا کہاں کا۔ سنگدھپ کے راجہ اور اُس کی بیٹی کو قصہ میں اس لیے رکھا گیا کہ دور کے ڈھول سمیٹنے، لوگ سمجھتے تھے کہ سنگدھپ میں خن بھی بکثرت ہے اور دیگر عجائبات بھی تاریخی واقعات چٹوڑ کی داپسی سے شروع ہوتے ہیں۔ توں رکھو کا ناراض ہو کر سلطان علاء الدین نور جہ کی طرف سے بہکانا اور پدہ منی پر عاشق کرانا (۲)، بد فتح قلعہ کا ہونا، سلطان کا پدہ منی کو آئینہ میں دیکھ کر بیتاب کرنا، جہ کو برقرار کر کے دلی لے آنا (۳)، دلی آئے بعد راجہ سے خط لکھواتا، اور راجپوتوں کا عورتوں کے بھیس میں ڈوبیوں میں، از مقید راجہ کو قید سے بچھڑا دینا (۴)، سلطان کا دوبارہ چٹوڑ کو فتح کرنا اور پدہ منی کا سنی ہو کر سلطان کے ہاتھ نہ آنا اور سلطان کا ایوس ہو کر واپس آ جانا۔ اب ان سب واقعات پر تاریخی روشنی ڈالنی ضروری ہے۔

سب سے اول فتح گجرات اور کنولا دیوی کے واقعات پر نظر ڈال کر پدہ منی کے فسانہ سے متاثر کرنا چاہیے۔ جہاں میں یعنی ۱۹۳۸ء میں ایک پریس پر فیسر صاحب نے جن کا نام مشتر ہے گجرات اور کاٹھیاواڑ کے متعلق ایک تاریخ لکھی ہے جس میں خاص طور پر اس سلسلہ میں مسلمانوں کی آمد اور فتوحات کا ذکر ہے۔ پروفیسر صاحب موصوف نے علاوہ فارسی مورخین کے ہندی کی پرانی کتابوں سے بھی معلومات

خاندان کی ہیں۔ فتح گجرات کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ رانا کرنا دھیا گجرات کے سب راجاؤں کا سردار تھا اس کا دار السلطنت اہلوادھ پتن تھا جس کو فارسی تواریخ میں ہنر والہ یا صرف پتن بھی لکھا گیا ہے۔ دو برہمن زادے جو آپس میں بھائی تھے اس کے معتبر وزیر تھے۔ ایک کا نام مادھو تھا دوسرے کا نام کیشو۔ رانا کو خبر ملی کہ مادھو کی بیوی کنولا دیوی اس قدر حسین ہے کہ وہ پد منی کہلاتی ہے جب رانا نے اپنے وزیروں سے کنولا دیوی کو پیش کرنے کا مطالبہ کیا تو انہوں نے انکار کیا۔ رانا نے کیشو کو قتل کر دیا، مگر مادھو بچ کر نکل گیا اور وہی پہنچ کر سلطان علاء الدین کے دربار میں حاضر ہوا۔ اور کنولا دیوی کے حسن و جمال کی تعریف کر کے سلطان کو اس کی طرف راغب کیا اور گجرات کی دولت کا مانج دیا اور ہر طرح کی امداد کا وعدہ کیا بشرطیکہ سلطان رانا کو کبھی کردار پر پہنچا دے سلطان نے ایک لشکر جبار روانہ کر دیا۔ اہلوادھ پتن پر قبضہ ہو گیا، راجہ کرن دکن کی طرف بھاگ گیا۔ کنولا دیوی سلطان علاء الدین کی فوج کے ہاتھ آئی، اور عزت و احترام دلی پہنچائی گئی، اور جب وہ مسلمان ہو گئی اور سلطان سے شادی کرنے پر راضی ہو گئی تو سلطان علاء الدین نے کنولا دیوی سے نکاح کر لیا۔

مندرجہ بالا واقعہ ایسا ہے جس کو سب مورخ بالاتفاق صحیح مانتے ہیں، لیکن کنولا دیوی کا مادھو وزیر کی بیوی ہونا اور رانا کا زبردستی اس کو اپنی رانی بنانا اور مادھو کا دلی جانا ایسے واقعات ہیں جو پروفیسر صاحب مدد نے ہندوؤں کی کتابوں سے اخذ کیے ہیں۔ پرمات میں بھی ایک برہمن زادہ جس کا نام رگھو تھا چتوڑ کے راجہ سے خفا ہو کر سلطان علاء الدین کو پد منی کے حسن کا بلج دے کر چتوڑ پر چڑھائی کر رہا ہے۔ کنولا دیوی بھی پد منی کہلاتی ہے، لہذا یہ نتیجہ نکالنا کچھ غلط نہ ہوگا کہ گجرات کے واقعہ کو ملک محمد جاسی نے کچھ بدل کر لکھ دیا اور اہلوادھ سے کی جگہ چتوڑ کو رکھ دیا۔ قصے کو دلچسپ بنانے کے لیے ایک اور واقعہ کو یہاں چسپاں کر دیا یعنی بہار کے مضبوط قلعے رہتاس پر جس جیلے سے شیر شا نے قبضہ کیا اس کو چتوڑ کے راجپوت سورماؤں گورا اور بادل سے منسوب کر دیا۔ یہ سچا تاریخی واقعہ ہے

کہ جب شیرشاہ پر ہمایوں نے بنگاں میں حملہ کر دیا تو شیرشاہ کو کسی ایسی جگہ کی ضرورت ہوئی جہاں وہ اپنا  
 زروں اور اپنے اہل و عیال حفاظت سے رکھ سکے اور اگر ضرورت ہو تو خود بھی پناہ سے سکے۔ اس  
 علاقہ میں اُس کا قلعہ اس قدر مستحکم تھا کہ ہر دست سے ہر دست حملہ آور بھی اُسے سر نہیں کر سکتا تھا۔  
 سینے میں قلعہ کا ایک ایک راجہ تھا۔ شیرشاہ کسی طرح جنگ کر کے اس قلعہ پر قبضہ نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ  
 اُس نے بہ تدبیر نیکائی راجہ کو ایک دستہ اور عازانہ خط لکھا کہ ہمایوں میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ میں  
 مصیبت میں گرفتار ہوں۔ یہ تو مجھے فکر نہیں سپاہی بچہ ہوں آخرت تک لڑتا رہوں گا مگر مجھے اپنے اہل و  
 عیال کا خیال ہے کہ یہ دشمن کے ہاتھ نہ پڑ جائیں اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ ان کو آپ کی حفاظت  
 میں آپ کے قلعہ میں رکھوں اور اپنے خزانوں کو بھی آپ کے سپرد کر دوں۔ اگر میں کامیاب ہوا اور زندہ  
 رہا تو آپ کا احسان عمر بھر نہ بھولوں گا مگر اگر تو میرے خزانہ پر آپ قبضہ کر لیں اور میرے اہل و عیال کی  
 دہائی بھی آپ ہی کریں تو سپردم ہو جائیوں خواہ میں راجہ تو دانی حساب کم و بیش را۔

راجہ اہل و عیال کی حفاظت کی ذمہ داری تو خواہ مخواہ کیوں بیتا لیکن خزانوں کے ہاتھ آنے  
 سے رنج میں آگیا۔ اور شیرشاہ کو اجازت دیدی کہ آپ سنگاٹ کو معہ مال و زیور کے قلعہ میں بھیج دیں۔  
 چنانچہ شیرشاہ خود تو ایک لشکر جہاز سے کر قلعہ کے ایک دروازہ کے پاس کھڑا رہا اور ہزاروں ڈوہوں اور  
 پکبان درمہ ڈوں چند سپاہیوں کے ساتھ زوسامان اور خزانہ کے خالی صندوق وغیرہ قلعہ کے  
 اندر داخل کر دیے۔ جو نہی یہ لوگ قلعہ کے اندر پہنچے ڈوہیوں میں سے مسلح فوجی نکل پڑے اور قلعہ والوں  
 کو یہ تیغ کرنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی قلعہ کا وہ دروازہ کھول دیا جہاں شیرشاہ فوج لیے منتظر کھڑا تھا چنانچہ  
 شیرشاہ کی ساری فوج قلعہ میں داخل ہو گئی اور ان کی آن میں قلعہ پر قبضہ ہو گیا۔

پندرہ دن شیرشاہ کے عہد میں لکھی گئی ہے۔ شیرشاہ کی فتوحات کے قصے اس زمانہ میں زبان  
 زد خاص عام ہو گئے چنانچہ ڈوہیوں میں فوج کو کسی حیل سے بھیجا ملک محمد جاسی نے اپنی مثنوی میں درج



کر دیا اور راجہ رتن سین کو علاء الدین کی قید سے چھڑانے کے لیے استعمال کر لیا۔ پداوت میں علاء الدین کا کام رہتا ہے اور پدمنی سستی ہو جاتی ہے۔ یہاں ملک محمد جانشی ایک اور تاریخی واقعہ کو کام میں لاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب سلطان بہادر شاہ والی گجرات نے سنہ ۹۳۵ھ میں راجہ رائے سین پر چڑھائی کی تو راجہ ہار مان لیتا ہے اور شاید مسلمان بھی ہو جاتا ہے لیکن اس کی رانی درگاوتی جو چتوڑ کی بیٹی ہے، درجن کا باپ وہ اولوالعزم رانا سا نگا ہے جس نے ایک دفعہ بابر کو بھی ہار دیا تھا، قلعہ بند ہو جاتی ہے اور ہایوں کو رکھی بھیج کر اپنا منہ بولا بھائی بناتی ہے اور پیغام بھیجتی ہے کہ بھائی ہونے کی لاج رکھ لو اور مجھے اس موزی کے پنجے سے چھڑاؤ۔ اللہ کی شان دیکھیے کہ رانا سا نگا بابر سے لڑتا ہے اور اس کی بیٹی بابر کے بیٹو سے مدد مانگتی ہے اور ہایوں کی اسلامی رواداری اور شان دیکھیے کہ وہ فوراً لشکر تیار کر کے اپنے باپ کے جانی دشمن کی بیٹی کی جان بچانے کے لیے رائے سین کی طرف روانہ ہو جاتا ہے اور کس کے مقابلہ میں ایک مسلمان بادشاہ کے مقابلہ میں۔ لیکن بہادر شاہ گجراتی بھی کچھ کم نہ تھا پیشتر اس کے کہ ہایوں مدد کو آسکے بہادر شاہ نے رائے سین کے زبردست قلعہ کو سر کر لیا اور قلعہ میں داخل ہو کر رانی درگاوتی کی تلاش شروع کر دی لیکن رانی درگاوتی نے جب دیکھا کہ دشمن قلعہ میں داخل ہو رہا ہے تو وہ چتا میں بیٹھ کر دوسری رانیوں سمیت جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گئی۔ چنانچہ بہادر شاہ گجراتی کو رانی درگاوتی تو نہ ملی ایک راکھ کا ڈھیر ملا جس سے اس کی ساری امیدیں پر پانی پھر گیا۔

سندرجہ بالا واقعہ پداوت میں پدمنی کے متعلق درج کر دیا گیا ہے۔ اس میں ایک اور بات بھی نکلی یعنی یہ کہ درگاوتی چتوڑ کے رانا کی بیٹی ہے۔ پدمنی کو بھی فرشتہ نے راجہ چتوڑ کی بیٹی لکھا ہے۔ لیکن فرشتہ تفصیل کے ساتھ سارے واقعہ کو نہیں لکھتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ فارسی تواریخ میں پدمنی اور علاء الدین کے عشق کی داستان کا واقعہ پداوت ہی ہے جو ایک مسلمان کی لکھی ہوئی تھی مگر چونکہ ہندی میں تھی اور مسلمان مورخ اصل کتاب کو تو سمجھ نہیں سکتے تھے، اس لیے اس کے شدیدہ حاتم

دریغ تاریخ کر دیتے تھے۔ یا اس قصہ کو ایسا دلچسپ سمجھتے کہ تاریخ میں اس کا ذکر بے جا نہ سمجھتے۔

اب اس واقعہ کے متعلق جو بیان تواریخ میں پایا جاتا ہے اس پر بھی ایک نظر ڈالنی چاہیے۔ سب سے اول فرشتہ کو بھیجے۔ ابونقاسم فرشتہ نے اپنی تاریخ جہانگیر کے زمانہ میں مکمل کی، یعنی پدموات کے لکھے جانے کے دو یا ڈھائی سو برس بعد۔ اور عہد علانی کے تقریباً پانچ چھ سو برس بعد۔ تاریخ فرشتہ بعد اول مطبوعہ نو لکھنؤ پریس کے صفحہ ۱۱۵ پر راجہ رتن سین درپدنی کے متعلق ذیل کی عبارت درج ہے۔

راجہ رتن سین راجہ قندچٹور کہ تا آن وقت در صلب بود بدوش غیر مقرر نجات یافت و شرح

اس چنین ست کہ پس از تے کہ راجہ در قید بود بسمیع پادشاہ بوسے پیغام داد کہ خلاصی تو

منحصر در احضار آن جمیل است۔ رائے قبول نموده کساں بطلب اہل و عیال خود...

فرستادہ ازل میں یہ مقصود پادشاہ حاصل نہایہ۔ اما راجہ تان خویشت راجہ از اس پیغام

دنگیر گشتہ سرزنش بسیار کرد و خود خواستند کہ قدر سے زہر در خوردنی کردہ نزدہ او بفرستند کہ

نماوں کردہ رخت بنام نیستی کشد... دختر رائے دغا لیا پدمنی کہ بغیر عقل مشہور خویشت

و قبیلہ بود آن رائے را نہ پسندیدہ گفت... کہ پالکی بسیار پڑا ز مردمان کار با جملہ تے از

پیادہ دسوار و نہ دہلی کشید و آوازہ انگنبد کہ حسب حکم پادشاہ زمان راجہ متوجہ جھنورند

و چوں بحوالی شہر برسد وقت شب بمجورہ در آمدہ راہ عبس خانہ راجہ را پیش گیرند و جسد

راجہ تان تبہنا علم کردہ بدرون و شاق و آئند و سر سرکش نے کہ قدم مخالفت پیش گزارند

حد کردہ یہ راجہ بر اسپ بادرفق رسد زندہ برق ساں رہہ مانک خود پیش گیرند۔ اہل رائے

آن رائے ر پسندیدہ بدن عمل نمودند... و رائے بہر عنوان کہ توانست بہشت بسیار

خود بر کوہست کہ اہل و عیال اہل و عیال را بیاوردند رسانید دین دولت تدبیر و خیر خوب بستر

و عقوبت پادشاہ نجات یافتہ... حوالی و حواشی قلعہ متور را شروع در تاخت و تاراج نمود

پادشاہ بمقتضائے صلاح وقت قلعہ را زخضرخان گرفتہ بخوابہ زادہ رائے ... کہ در لازمیت پادشاہ  
بود ... عنایت فرمودہ او ... تاجیات پادشاہ بر جادہ عبودیت مستقیم بود۔

فرشتے کے اس بیان سے انوں کو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پمینی اُس کی بیٹی تھی یا بیوی۔ صلاح تو یقینی  
بیٹی نے دی ہے۔ دیگر مورخین نے یہ تو نہیں لکھا کہ پمینی بیٹی تھی مگر یہ اشارہ ضرور کیا ہے کہ یہ صلاح  
پمینی نے دی تھی۔ پداوت میں گورا اور بادل راجپوتوں نے یہ صلاح دی تھی۔ اس بیان میں پمینی  
کے سستی ہونے کا کہیں ذکر نہیں ہے لیکن تفصیل موجود ہے کہ قلعہ چٹور فتح ہونے کے بعد خضرخان لبیدہ  
کو دیا گیا اس کے بعد پھر رائے کے کسی عزیز کو دے دیا، لیکن رتن سین کو نہیں دیا۔ اُن تو رنج میں بھی  
جن میں پمینی کا ذکر نہیں ہے قلعہ خضرخان کو دیے جانے کا ذکر موجود ہے۔

اب ایک ہندو مورخ کا بیان بھی ملاحظہ ہو۔ خشی سجان رائے بھنڈاری مصنف خلاصۃ  
التواریخ نے اس قصہ کو یوں شروع کیا ہے:-

”چوں سلطان شنید کہ رائے رتن سین مرزا بن چٹور پداوت نام نازمیں در شہستان خود را  
... سلطان ... کسان خود را بطلب آں نازمین ... نزد رائے رتن سین عزت دو رنج  
کہ رائے ... تنہا بجن و مشاق و قسب مالا یطیق در سنگدہ پب بکس آں دلفریب رسدہ و  
رادر عقد ازدواج آوردہ ... از اجتماع پیغام سلطان آتش خشم در ہنادر فرستادہ اسے سلطان  
را استحقاق نمودہ خصمت گردانید“

اس کے بعد سلطان کی ناراضگی اور لشکر کشی اور محاربے کا ذکر ہے پھر لکھا ہے ”کایں از پیش رفت  
با ضرور صلح در میان آمد و ملاقات یکدگر اتفاق افتاد۔ اس کے بعد دعوت کا ذکر ہے اور سلطان کا اپنے  
عہد و پیمان بھول کر رائے کو قید کر کے دہلی لے آنے کا حال لکھا ہے پھر لکھتے ہیں کہ ”دورانی او (راجہ) بڑا  
پداوت منحصر داشت آن زن کہ بتدبیر صائب ... گوئے سبقت از مردان کارداں سے برد چنانچہ



میں نے وہ تدابیر بتائیں جن کا ذکر تاریخ فرشتہ میں ہے۔ کہ دہلی پہنچ کر سلطان سے یہ بہانہ کیا جاوے کہ چوں در عقیدہ ناکحت رائے رتن سین ہستم... تا آنکہ رائے اجازت نہ دےد بموجب امر شریعت غراب سلطان صاف مستم۔ رائے را در اینخا بفرسید تا اذوا اجازت بگیرم و در مشکوئے معلی شرف شوم" جب یہ چال پوری ہو جاتی ہے تو راجہ دہلی سے نکل بھاگتا ہے۔ خود بھنڈاری کے الفاظ یہ ہیں "چون آتش کارزار مشتعل شد.... رائے رتن سین قابو یافتہ از جنگ گاہ برآمدہ بمکن خویش را ہے گیر و بخیریت و سلمتی بچتور رسید.... سلطان از سنوح این سانحہ غریبہ از مواصلت اس نازمین محروم گشتہ دست تحیر بدین تفکر گزید۔ سلطان بعد وقوع این امور در خود قوت ندیدہ کہ انتقام از رائے رتن سین بگیرد و بتخیل قلعہ چتور شکر کشد و نیز با وجود قدرت عمدتاً غافل کرد" بقول فرشتہ چتور فتح ہو گیا تھا اور رائے رتن سین پناہوں میں جا چھپا تھا لیکن خلاصۃ التواریخ نے راجہ کو واپس چتور پہنچوادیلا اور سلطان کو ایسا کمزور ثابت کیا ہے کہ پھر اس میں چتور پر حملے کی ہمت ہی نہ رہی لیکن پدمنی کے سنی ہونے کا اس میں بھی کچھ ذکر نہیں ہے۔ بہت سنگدھپ کا ذکر ضرور ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ اس تاریخ میں پداوت کا بھی ذکر ہے چنانچہ لکھتے ہیں کہ "اس قصہ رائے در اطراف و ممالک معروف و مشہور است و کتابے مٹھی بہ پتار مشتمل بر قصہ رائے رتن سین در فرس و ہند درست شدہ" اس کے معنی یہ ہوئے کہ مصنف نے اس قصہ کو پڑھا ہے اور اس میں سے کچھ قصہ اپنی تاریخ میں درج کر دیا ہے۔ چنانچہ سنگدھپ کا بھی صاف طور پر ذکر کیا گیا ہے لیکن صاحب تصنیف خلاصۃ التواریخ اور نگ زیب بادشاہ کے عہد میں اپنی تاریخ لکھ رہے ہیں جو تاریخ فرشتہ سے بھی کئی سو برس بعد کی تصنیف ہے۔

مندرجہ بالا مورخوں کے علاوہ مولوی ذکار اللہ صاحب نے بھی اپنی تاریخ ہند میں پدمنی کا قصہ لکھا ہے لیکن یہ بھی لکھ دیا ہے کہ "اس کی شان تاریخی واقعہ کی نہیں افسانہ معلوم ہوتا ہے" اسی طرح بقول مولوی احتشام الدین صاحب مؤلف تاریخ ترکستان ہند نے بھی اس قصہ کو نقل کیا ہے

اور اعتراض کیا ہے کہ یہ امر سلطان کی شان سے بعید معلوم ہوتا ہے کہ غیر کی زوجہ پر نیت بد کرے مولوی محمد حسین آزاد نے قصص ہند میں اس قصہ کو خوب نکمرچ نگا کر لکھا ہے، مگر آزاد کسی معنوں میں مورخ نہیں کہلائے جاسکتے مورخوں کے خوشہیں ضرور ہیں۔ سب سے زیادہ مفصل طور پر یہ قصہ ٹاڈ صاحب نے اپنی معروف کتاب "تاریخ راجستان" میں درج کیا ہے۔ ٹاڈ صاحب نے بہت سے واقعات کھمان راسا سے اخذ کیے ہیں۔ کھمان راسا راجپوتوں کی اس قسم کی تاریخ ہے جس میں گھریلو روایتوں بازاری قصے کھانیوں، درباری کیشیروں اور بھاٹوں کی حکایات اور سنسنے سنسنے قدیم زمانے کے جنگ کے حالات جمع کر لیے گئے ہیں۔ ٹاڈ صاحب خاص طور پر سلمان مورخوں سے دور بھاگتے ہیں اور ان کی تاریخ کا دار و مدار محض راجپوتی بیانات پر ہے۔ جس کو وہ بہت زیادہ مستند مانتے ہیں۔ اور تمام انگریزی متاخرین نے ٹاڈ صاحب ہی کے بیان پر اپنی معلومات کو منحصر رکھا ہے۔ واقعہ زیر بحث کے متعلق ٹاڈ صاحب نے قصہ پداوت اور تواریخ کے بیان سے کئی ضروری باتوں میں سخت اختلاف کیا ہے۔ مثلاً دھنوں نے چوڑ کے راجہ کا نام لکھم سی لکھا ہے اور اُس کے چچا بھیم سی کو پد منی کا شوہر بیان کیا ہے۔ علاوہ ازیں ٹاڈ صاحب کے بیان کے مطابق سپاہیوں کا ڈولہیوں میں جانا اور راجہ کو پچالانا دہلی میں نہیں بلکہ چوڑ کے میدان جنگ ہی میں واقعہ ہوا۔ جہاں سی پچا کر راجہ کو قلعہ میں پہنچا دیا گیا۔

ستی کے متعلق ٹاڈ صاحب نے جو تفصیل دی ہے اُس کا مطلب یہ ہے کہ اول راجہ نے اپنے سائے کنور لڑائی پر بھیجے جب وہ سب کٹ کر مر گئے تو اپنے ولیعهد کو ایسی جگہ بھیج دیا کہ اُس پر آنچ نہ آئے پائے تاکہ راجہ کے قتل ہونے کے بعد بھی راجہ کی نسل قائم رہے اور قلعہ کو پھر موقع پا کر فتح کر لیں۔ اس کے بعد راجہ خود جنگ میں کود پڑا لیکن موت کے منہ میں جانے کے قبل اُس نے اپنی تمام رانیوں کو ایک تہ خانے میں جمع کیا جہاں ایک زبردست چٹا جلائی گئی وہ رانیاں اُس

چتا میں جل کر خاک سیاہ ہو گئیں، درتہ خانہ کا دروازہ بند کر دیا گیا۔

ایک دہائی بات ٹاڈ صاحب نے لکھی ہے، اور وہ یہ کہ جب جنگ کا سلسلہ جاری تھا اور روز ہزاروں رچپوت سلطان علاء الدین کی فوج کے ہاتھوں قتل ہو رہے تھے تو ایک دن جب راجہ ذرا آرام کرنے کے لیے لیٹا ہوا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اپنے اہل و عیال کی جان کس طرح بچائے بارہ میٹوں میں سے ایک کنور تو نسل قائم رکھنے کے لیے رہ جائے کہ یکایک اُس نے ایک آواز سُنی کہ ”میں بھوکے ہوں“ رانا نے جس طرف سے آواز آئی تھی اُدھر دیکھا تو چوڑکی مانی ہوئی دیہی کی صورت نظر آئی۔ رانا نے جل کر کہا کہ میرے قید کے ہزاروں سورا، تو تیری بھینٹ چڑھ چکے اب بھی تیرا پیٹ نہیں بھرتا دیوی نے جواب دیا کہ مجھے تو راجا کے کنوروں کی بھینٹ چاہیے، در یہ کہہ کر غائب ہو گئی۔ راجہ نے سرداروں سے ذکر کیا وہ نہ ملنے آخریہی کے نمودار ہونے کے وقت آدھی رات کو سب سرداروں کو جمع کیا۔ حسبِ عادت دیہی آئی اور اُس نے کہا ”ہزاروں لچھ (مسلمان) مار کے بائیں مجھے کیا مجھے تو کنور چاہئیں۔ اگر تم چوڑ میں اپنا راج رکھنا چاہتے ہو تو روز ایک کنور کو گدی پر بٹھاؤ، چنور، چھترور، موچھل اُس کے سر پر پھر دو، تین دن تک اُس کا حکم بجالاؤ، چوتھے دن اُس کو دشمن سے لڑنے کو اور موت کے گھاٹ اُترنے کو بھیجی اسی طرح گیا رہ کنور میری بھینٹ چڑھاؤ تو بچو گے ورنہ تمہاری راجدانی چھوٹے کے ہاتھ میں چلی جائیگی چنانچہ بقول ٹاڈ صاحب وہم پرست راجپوتوں نے اس پر عمل کیا اور چوڑ کو ہمیشہ کے لیے سمانوں سے محفوظ کر دیا۔

یہ واقعہ صرف ٹاڈ صاحب ہی نے بیان کیا ہے کسی اور مورخ نے اس کا ذکر نہیں کیا نہ ٹک محمد جاشی کو س کی سوچھی، ورنہ اس کے افسانے میں ایک مزید لطیف پیدا ہو جاتا لیکن ٹاڈ صاحب کا بیان بھی کچھ فائنٹ سے کم نہیں ہے۔ ان کو جہاں کہیں بھی کوئی بات مسلمانوں کے خلاف مل گئی اُنہوں نے فوراً اس کو رقم کر دیا۔ انگریز مورخوں کا یہ سامرِ ظہور ہے کہ وہ مسلمانوں کی حکومت کا تاریک پہلو دکھانے



ہیں اور اس میں بھی وثوق کی کوئی بات نہیں ہوتی۔ یہ پریگنڈا سٹنڈ سے سچ تک برہمچل آ رہا ہے۔ بہر حال ٹاڈ صاحب کا یہ خیال کہ علاء الدین چتوڑ کو فتح نہ کر سکا اور وہاں راجہ کا راج برابر رہا کیونکہ راجہ نے رسی کی بھینٹ پوری کر دی تھی محض ایک من گھڑت قصہ ہے اور تاریخی واقعات اس کی تردید کرتے ہیں۔

اس وقت تک جن مورخوں کے حوالے زیر بحث رہے ہیں ان کی تاریخ چتوڑ کی فتح کے کئی کئی سو سال بعد لکھی گئی ہیں جیسا اس سے قبل ذکر ہو چکا ہے، ظاہر ہے کہ اس طویل عرصہ میں تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ کچھ روایات و قصص و توہمات بھی شامل کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن زیادہ قابل اعتبار وہ مورخ ہونے چاہئیں جنہوں نے چشم دید واقعات درج کیے ہیں اور جو نہ صرف سلطان علاء الدین کے زمانہ میں تاریخ لکھ رہے تھے بلکہ جن کا تعلق خود سلطان سے ایسا قریب کا تھا کہ وہ سنی سنائی باتیں درج کتاب نہ کرتے تھے بلکہ بہت سے حالات اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے۔ عہد علانی کے ایسے دو مورخ ہیں:- اول مولانا ضیاء الدین برنی مؤلف تاریخ فیروز شاہی کوئیلمیہ۔ یہ علاء الملک اس زمانہ کے مشہور و معروف کو توال دہلی کے بھتیجے تھے اور علاء الملک پر سلطان علاء الدین کو بہت اعتماد تھا اور سلطان نے علاء الملک کو اپنے مقربین کے زمرے میں رکھ چھوڑا تھا چنانچہ وہ علاء الدین کی ان محفلوں میں بھی شریک ہوتا تھا جن میں سب آپس میں بے تکلف ہوتے تھے اور حفظ مراتب کا بھی بہت کم خیال رہتا تھا۔ ایسے چچا کے بھتیجے کو تاریخ لکھنے کے ایسے وسائل موجود تھے جو ٹاڈ صاحب کو حشر تک میسر نہیں ہوتے گروہ اس زمانہ میں پیدا بھی ہو جاتے۔ تاریخ فیروز شاہی میں چتوڑ کی محم کا حال مؤلف نے نہایت تفصیل اور شریح کے ساتھ دیا ہے اور اس تفصیل میں تقریباً دس بارہ صفحے بھرے ہیں لیکن بائیمہ نہ اس میں رانی پدمنی اور راجہ رتن سین کا ذکر ہے، نہ سلطان کی ناکامی اور چتوڑ کا راجپوتوں کے قبضہ میں

رہنے کا ذکر ہے۔ برخلاف اس کے چوڑی پر چڑھائی کرنے کا جو اصلی موجب ہے اس کا مفصل ذکر ہو جس کو مولف تاریخ فرشتہ نے بھی اپنی تاریخ میں درج کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ سلطان کو جب گجرات میں نہ صرف ہندوؤں، بلکہ سرکش مسلمان مغلوں کے مقابلہ میں جا بجا فتوحات ہوئیں تو اس کے دماغ میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ میری افواج کبھی ہار ہی نہیں سکتیں۔ چنانچہ اُس نے سکندر ثانی کا لقب اختیار کیا اور اپنی بے تکلف مجلسوں میں جن میں اس کے خاص خاص معتمد رشتہ دار اور دوست ہی جاسکتے تھے جن میں سے عمار الملک بھی تھے، اکثر شراب کی ترنگ میں یہ کہا کہ میری فوجی طاقت اب سکندر کی سی ہے اور اگر میں چاہوں تو دنیا بھر کو فتح کر سکتا ہوں پھر یہ کہنا شروع کر دیا کہ جس طرح پیغمبر اسلام نے ایک مذہب نکال کر دنیا بھر کو فتح کر لیا تو کیوں میں بھی ایک نیا مذہب نہ نکالوں اور اس طرح دنیا کو فتح کروں۔ اپنے سب بادہ پیما دوستوں سے ہر محفل میں یہی سوال کرتا تھا کچھ خوشامدی ہاں میں ہاں ملا دیتے تھے کچھ ٹال دیتے تھے لیکن عمار الملک کو تو اس نے ایک دن بہت کر کے جواب دے ہی دیا اور کہا کہ کوئی مذہب بغیر وحی آنے کے سچ نہیں ہو سکتا، میں بے تہائے جھوٹے مذہب کو فروغ نہیں ہو سکتا خاص کر اسلام کے مقابلہ میں۔ چنانچہ چنگیز وراس کی کافراؤں نے اسلام کو مٹانے کی بہت کوشش کی مگر آخر میں اُس کی اولاد نے جب اسلام قبول کیا تب ہی اُن کو کامیابی ہوئی تو اس خیال خام کو تو دل سے نکال دو۔ لیکن یہ درست ہے کہ اس دولت و قوت کو جو فتح گجرات و دکن سے آپ کو حاصل ہوئی ہے آپ کسی نیک کام میں لگائیں۔ باہر کی دنیا مثل ماوراء النہر ایران توران اور بوزان چین تو آپ بعد میں فتح کیجیگا پہلے ہندوستان کے غیر مفتوح علاقے پر تو قبضہ کیجیگا مثال کے طور پر قلعہ چوڑو رتنمبور میں اس کے بعد اور بہت حصہ ہندوستان کا پڑا ہے اس کو فتح کیجیے سلطان باوجود خود سر ہونے کے عقل کی بات مان لیتا تھا، چنانچہ اُس نے کو تو اس

کی یہ صلاح جو حقیقی خیر خواہی پر مبنی تھی مان لی اور فوراً تھنورا اور چٹوڑ کے قلعوں پر چڑھائی کر دی۔ اگر رانی پدمنی کے حسن و جمال کی داستان صحیح ہوتی تو اس کا ذکر ایسی محفل میں جہاں مینا وے کا دور چل رہا ہو ضرور آنا چاہیے تھا اور اگر یہ واقعہ ہوتا تو ضیاء برنی ضرور اس کا ذکر لکھتا اس وجہ سے کہ اُس وقت کے بادشاہ چور نہ تھے کہ کسی سے ڈرتے کہ ایک رانی سے شادی کرنے کا کوئی ذکر نہ کرے بلکہ اگر وہ ایسا کرتے تھے تو علی الاعلان کرتے تھے ورنہ دوسرے مورخ تو خواہ لکھیں یا نہ لکھیں وہ خود اپنے سوانح میں اپنے سب اعمال بلا کم و کاست لکھ دیتے تھے جیسا کہ جہانگیر کی تزک سے ظاہر ہے۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں ہے کہ اگر پدمنی کا واقعہ سچا ہوتا تو ضیاء برنی اس کو چھپاتا۔

اب اس زمانہ کے دوسرے نہایت معتبر مورخ کو نیلیجے۔ امیر خسرو کو دلی شہر میں کون نہیں جانتا اور اُن کی پسندیاں کہہ کر نیاں۔ دوسرے گیت اور لطیفے تو سائے ہندوستان میں مشہور ہیں اور دلی میں ہر سال اُن کے مزار پر عرس ہوتا ہے۔ کیونکہ اُن کی سب خوبیوں پر پانی پھیر کر ہل تصوف نے ان کو محض حضرت نظام الدین اولیاء کا محبوب بن کر ان کی قبر کی پرستش شروع کرادی ہے، اور ان کو بھی دلی کا رتبہ دے دیا ہے۔ امیر خسرو جہاں حضرت نظام الدین کے محبوب تھے وہاں اپنی ذاتی اور داغی اوصاف و خوبیوں کی وجہ سے سلطان علاء الدین کے بھی محبوب ہو گئے اور سلطان کے مقرب خاص بن گئے۔ چنانچہ وہ ہر جگہ سلطان کے ساتھ ساتھ پھرتے تھے ہم چٹوڑ کے ذکر میں وہ خود فرماتے ہیں کہ میں کہ ہڈ ہڈ اس سلیمان (یعنی سلطان علاء الدین) کا ہوں (ہم چٹوڑ میں) ہمراہ رہا اس ڈر سے کہ خیر حاضری کی صورت میں کیا جواب دے سکو نکاح چٹوڑ کی فتح اور فتح کے بعد اس قلعہ کے خضر خاں و بعد سلطان کے حوالے کیے جانے اور اس کا نام خضر آباد تبدیل ہونے کا مفصل حال امیر خسرو نے چشم دید اپنی



نثر کی کتاب خزان لفظوں میں لکھا ہے لیکن کہیں نہ پدہنی کا ذکر ہے نہ اس کے سنی ہونے اور نہ سلطان کے ناکامیاب ہونے اور راجہ کو دھوکے سے قید کرنے کا ذکر ہے جو کہ متاخرین مورخوں نے اس آب تاب سے بیان کیے ہیں۔ میر خسرو نے چتوڑ پر چڑھائی کی تاریخ اس طرح نکالی ہے

دستان فتح چتوڑ است ایں کاسن ست از بندی بر زمین

یعنی بدوشنبہ ہفت از جماد ہفت صد و دہشتہ در شمار

ورس کے بعد اس چڑھائی کا جو بیان خزان لفظوں میں درج ہے اس کا ترجمہ یہ ہے :-

”اس تاریخ ہجری ۸۵۷ (سلطان علاء الدین خلجی) نے دہلی بندہ وادہ ہرزم خیر چتوڑ بجائے

جئے کا حکم دیا اور علم ہلال قلم کو پیشتر روانہ فرمایا چتوڑ پہنچ کر حکم دیا کہ لشکر قلعہ کے طرف کو

بہتے باد کی طرح خیموں سے گھیرے جیسے ابرار اس کو سے لپٹا ہوا نظر آتا ہے ....

سپاہ مورسلہانی زرد سے داد دی پہنچے ہوئے .... جدوجہد میں خسرو ف بھی یہاں

تک کہ محرم کے وسط میں .... بروز

دوشنبہ و زخمی سر کے وادہ و نہجرت رسوں شدہ ہفت صد و سہ سال

سلیس عہد تخت باد پر سوار ہوا اور اس قلعہ کے اوپر جہاں پرندے کا پر مارا مچاں تھا

پہنچ گیا :-

جو ذکر راجہ کے مان پانے کے متعلق امیر خسرو فرماتے ہیں :-

”ہرست کا زمانہ تھا کہ درویش بکروبر کا برچتر سفید اس بند پہاڑ کی چوٹی پر نمودار ہوا

اور وہ درویش کا کندہ راجہ جس پر بادشاہ کے غیظ و غضب کی بجلی گری تھی سرو پا سوختہ

ایک شرر کی طرح شگین دروازہ سے نکل پڑا اور اپنے تئیں پانی میں سے مارا یعنی جہان شاہ

نے دوسرے درویش عتقاد نسخہ یہ ہے :- بدوشنبہ و ہفت از دوم جماد - تاریخ عام ہفت صد و دہشتہ در شمار

کی طرف دوڑ کر پناہ لی اور برق شمشیر سے امان پائی۔

قلعہ پر قبضہ ہونے اور راجہ کے امان پانے کے بعد قلعہ واپس راجہ کو نہیں دیا گیا ہے بلکہ امیر

خسر و صاف الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں -

اُس محل نگزار اعظم سلطنت کے خضر خاں کے حوالہ کیا گیا۔ اور خضر آباد اُس کا نام رکھا۔ ..  
 .... اور جب مراتب خضر خانی کی ترتیب اور خضر آباد کے انتظامات سے فراغ کلی حاصل ہو گیا  
 تو سمند دولت کی لگام فتح و فیروزی نے تھم لی اور راجہ کی کہ سبزگانِ رکاب کو سبز سیری  
 (دلی) کے سبزہ سے شکم سیری کا حکم دیا جائے چنانچہ بعد عشرہ محرم عظیم خلافت محمدی حسن  
 اتفاق کے ساتھ جملہ ہنود کے سرغنہ کو مقبور کر کے مدینہ لاہم دہلی کی طرف واپس  
 روانہ ہوا۔

مندرجہ بالا دو مستند مورخوں اور چشم دید گواہوں کے مقابلہ میں کسی ایسے مورخ کے بیان کو  
 ترجیح نہیں دی جاسکتی جس کی تالیف عہد مدائی کے صدیوں بعد لکھی گئی ہو خواہ وہ بوالقلم فرشتہ  
 جیسا مشہور مورخ ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے یہ باور کرنے میں کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا کہ سلطان  
 علاء الدین غلامی پر جو الزامات لگائے گئے ہیں کہ اُس نے راجہ کی خوبصورت رانی کو چھیننے کے لیے  
 چتوڑ پر حملہ کیا اور پہلی دفعہ ناکام رہا (۲) اور راجہ کو حیلہ سے قید کر کے دلی لے آیا اور ذیت دی۔  
 (۳) راجہ راجپوتوں کے ساتھ ڈولیوں میں عورت بن کر آنے کے بہانے سے قید سے نکل بھاگا۔ (۴)  
 سلطان نے دوبارہ حملہ کیا اور کامیاب ہوا (۵) مگر رانی پد منی جل کر خاکستر ہو گئی وغیرہ وغیرہ سب  
 دستارِ پادشاہی ہیں اور اگر اس کی کوئی وجہ ہو سکتی ہے کہ کیوں مورخوں نے ان کو درج تاریخ کیا  
 تو یہی ہو سکتی ہے کہ ملک محمد بن نسیم نے مثنوی پداوت ہندی زبان میں اس خوبصورتی سے لکھی کہ

لے ترجمہ از افسانہ پد منی موافقہ مورخ اعظم امین صاحب دہلوی - ایم سی -

ستاخرین اس کو صحیح تاریخ پر مبنی سمجھنے لگے۔ اور راقم حروف کی رسے میں اصل پدمنی گجرات کی رانی  
 کنولا دیوی تھی جس کی بیٹی دیو دیوی اور حضرت خاں کے عشق کی داستان حضرت امیر خسرو نے نظم کی  
 ہے اور جس کے متعلق کسی مروج کو خدات نہیں ہے۔ اگر عہد علانی کے مروج چتوڑ کی پدمنی کے  
 عشق کی داستان کہنے سے ڈرتے تو پھر امیر خسرو نے دیوں دیوی کے حسن و عشق کے قصہ کو کیوں  
 اپنی نظم میں حشت زبام کر دیا۔ اگر پدمنی کے نہ سنے کی بھی کوئی تاریخی حقیقت ہوتی تو امیر خسرو کا  
 دل فرض تو یہ تھا کہ اس پر نظم لکھتے۔ بہر حال خواہ مک محمد جاسی نے کنولا دیوی کو پدمنی اور  
 گجرات کے در اسطنت پٹن کو چتوڑ گڈھ بنایا یا نہیں اس میں ہرگز شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ  
 چتوڑ گڈھ میں نہ پدمنی تھی اور نہ اس کی وجہ سے قصہ پردھاوا ہوا گیا۔

---



# تلخیص و ترجمہ

## ابن ماجہ

نویں صدی ہجری کا مشہور امیر البحر عرب

ابن ماجہ فلسطین کے ریڈیو اسٹیشن سے ۱۰ جنوری ۱۹۳۳ء کو قدری عاصف طوفان نے ایک پُر از معلومات تقریر شریک کی جس کو مفسر کے رسالہ "المقطف" نے اپنی تازہ اشاعت میں شائع کیا ہے، ہم ذیل میں اس کا تلخیص ترجمہ پیش کرتے ہیں۔

"عربوں نے سمندر سے متعلق علم میں وہ کمال پیدا کیا جو ان سے پہلے کسی قوم کو حاصل نہ ہو سکا۔ انہوں نے اتنا ہمدردوں میں اپنے بڑے بے خوف و خطر ڈال دیے اور ان کے مدد و جزر کی ذرا پروا نہ کی۔ بحر ہند اور بحر کابل میں ان کے جہاز دوڑتے پھرتے تھے جس قوم کا یہ حال ہو اس میں بڑے بڑے ماہرین جہاز رانی کا پیدا ہونا ایک بالکل قدرتی امر ہے۔ چنانچہ عربوں میں ایسے ماہرین فن کی کمی نہیں ہے جنہوں نے جہاز رانی میں انتہائی کمال پیدا کیا۔ مدتوں کی مباحث میں سمندر کا گوشہ گوشہ چھان مارا، اس سے متعلق طبیعیاتی اور جغرافیائی قیمتی معلومات ہم پہنچی ہیں۔ طرح طرح کے کامیاب آلات ایجاد کیے، اس موضوع پر کثرت سے کتابیں تصنیف کیں جو آج بھی مغربی جہاز رانوں کے لیے لائٹ ہاؤس (دنیارہ روشنی) کا کام دے رہی ہیں۔ انہی عرب محققین بحریات میں ابن ماجہ بھی نام و نسب اور ذاتی حالات | ابن ماجہ نویں صدی ہجری کی ایک مشہور شخصیت ہے اس کا نام شہاب الدین احمد اور والد کا نام ماجہ تھا، اس نے خود اپنے لیے شاعر لقبیتیں کا لقب اختیار کیا تھا۔ حریم شریفین

کی زیارت سے بھی مشرت ہوا۔ عام طمید پر سیریل، سودا (سانپ بچہ) کے نام سے معروف تھا۔ ابن جبرہ جس خاندان میں پیدا ہوا، اُس کے اکثر و بیشتر افراد جہاز رانی کے فن میں شہرت رکھتے تھے۔ چنانچہ اُس کا باپ ماجد ابن محمد بن معلق اسعدی دونوں بہت مشہور جہاز رں تھے، بلکہ دادا نے تو ایک کتاب بھی تصنیف کی جس میں بحر اہمر میں جہاز رانی کی نسبت بہت مفید ہدایات و معلومات جمع کر دی تھیں۔ محمد بن معلق کے بعد ابن ماجد کے والد ماجد نے اپنے ذاتی تجربوں کی روشنی میں اس کتاب پر کچھ اور اضافے کیے جن کے باعث ان کی اعتبار سے کتاب کی قیمت کہیں زیادہ بڑھ گئی۔ انصاف پسند یورپ نے عرب اور خصوصاً ابن ماجد کی اس فضیلت کا برملا اعتراف کیا ہے۔ فرانسسی پروفیسر قرن کنتلے "پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی میں پرتگالی جہاز رانی کی کامیابی کا سہرا عربوں کے سر ہے"۔ اس پروفیسر نے عربوں کی جہاز رانی کی تاریخ کا عمیق مطالعہ کیا تھا۔ اور اس کو ابن ماجد کے ساتھ اس درجہ چسپی تھی کہ اُس نے ابن ماجد کی کئی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ اُن پر حواشی لکھے اور اُن سب تاویفات کا مجموعہ کجائی طور پر شائع کیا جس کا نام خود اُسی نے یہ تجویز کیا "مولفات ابن ماجد جو متلاطم سمندروں کا خیر تھا اور جو اسکوڈی گاما جس نے زمین کے گرد چکر لگایا اس کا نانا تھا" علماء مغرب کے نزدیک اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ واسکوڈی گاما نے اپنے بیڑے کو فریقہ کے مشرقی ساحل مالندی سے ہندوستان کے بندرگاہ کالیکٹ تک پہنچانے اور اس طرح زمین کے گرد چکر لگانے میں ابن ماجد کی معلومات و ہدایات کو بہت کچھ استفادہ کیا تھا۔ تصنیفات ابن ماجد جیسا کہ ابھی بیان ہو چکا ہے۔ ابن ماجد نے علم بحر میں کئی کتابیں تصنیف کی ہیں جو علمی اور تاریخی لحاظ سے بہت زیادہ قابل قدر ہیں اُس کی ایک اہم کتاب جس کا نام "کتاب الفوائد فی معرفۃ علم البحر والقواعد" ہے دمشق کی مجلس علمی کی کوششوں کی ہدایت

دار لکشب العربیۃ النظارہ میں اب تک محفوظ ہے۔ اس مجلس کے مشہور علمی رسالہ "المجمع العلمی العربی" کی پہلی جلد میں ابن ماجہ کی اس کتاب سے متعلق ایک مفید مضمون بھی شائع ہوا تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ یہ کتاب دو سو صفحوں کی ہے اور ہر صفحہ میں ۲۳ سطریں ہیں۔ اور اس میں اس سے بحث کی گئی ہے کہ سمند میں جہاز رانی کے اصول کیا ہیں، اُن کا چاند کے منازل سے کیا تعلق ہے، ہوا کی کارِ ع کس طرح پہچانا جاسکتا ہے۔ قبلہ کی شناخت کیونکر ہوتی ہے۔ اور ان سب چیزوں کا اثر جہاز رانی پر کیا ہوتا ہے۔ اور مسافر جن شہروں میں جانا چاہتے ہیں، اُن کی سمت منازلِ قمر سے کس طرح معلوم ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں ابن ماجہ نے مختلف ستاروں کے نام شمار کرائے ہیں اور پھر بتایا ہے کہ ان میں سے ہر تارہ کس طرح مسافروں کو اُن کی منزلِ مقصود کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔

آخر میں ابن ماجہ نے یہ بڑی دلچسپ بات کہی ہے کہ میں نے اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہے، وہ کوئی نئی چیز نہیں ہے، بلکہ محمد بن پہلے (عرب کے) تین مشہور امیر البحر جس کو دریافت کر چکے تھے البتہ محمد میں اور اُن میں فرق صرف اتنا ہے کہ اُنہوں نے جو کچھ بتایا وہ صرف اُن کے عمیق غور و فکر کا نتیجہ تھا، اور میں نے بذاتِ خود ان سب کا علمی تجربہ کیا ہے۔ پھر ایک عجیب بات یہ ہے کہ ابن ماجہ نے اپنی بحث کو صرف سمندروں تک محدود نہیں رکھا بلکہ اُس نے بحرِ ہند اور بحرِ چین کے ساحلوں پر جو بعض درے اور سرحدیں واقع ہیں اُن کی نسبت بھی مفید معلومات بہم پہنچائی ہیں اور جنگلوں اور خشکیوں کی شکل اور ہندوستان کے مغربی ساحل کی بندرگاہوں کی کیفیت اور دس بڑے بڑے مشہور جزیروں کی جغرافیائی حالت بھی تحریر کی ہے۔ ساتھ ہی بحرِ احمر کی نسبت مفصل معلومات بہم پہنچائی ہیں جن سے بحرِ احمر کی بندرگاہوں، اُسکی گہرائیوں، اُس کی کھلی اور پوشیدہ چٹانوں پر روشنی پڑتی ہے۔

ابن ماجہ شاعر بھی تھا۔ چنانچہ اس کتاب میں بھی اُس نے اپنے چیدہ چیدہ اشعار لکھ دیے ہیں۔



جن میں اُس نے علم البحر کی انیمیت پر بہت زور دیا ہے۔ اور بعض اشعار میں تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ جو شخص اس علم میں مہارت حاصل کر لیتا ہے اللہ تعالیٰ اُس کو سر ملندی عطا فرماتا ہے۔ اور جو اس سے بے بہرہ رہتا ہے وہ ذلیل و خوار ہوتا ہے۔

اس کتاب کے علاوہ ابن جہد کے اور مختلف رسالے ہیں جن میں سے اکثر مشہور منظوم ہیں، ان میں سے ایک رسالہ کا نام "حکمیۃ الاختصار فی علم البحار" ہے۔ اس رسالہ میں ان عند متوں کا ذکر ہے جن پر علم تمام امرا و بحار کے لیے ضروری ہے اور جن سے خشکی کا قرب دریافت ہوتا ہے۔ پھر قمر کے منازل، ہواؤں کے رخ، اور بحری، ردی، قطبی اور فارسی سین کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، در عرب، جزیرہ سیام، جزیرہ نمائے ملایا، بلاد حبش کے اطراف، ہندوستان کے مغربی ساحل، کارو منڈل کا ساحل، بنگاں، جزیرہ پلیتوں، جاوہ، چین، ذرموسا، جزیرہ اے جاوہ کے ساحل، سہارا، کان، مدغاسکر، یمن، حبش، صومال، عرب اور کرمان کے جنوبی ساحل ان سب میں جہاز کے راستے بیان کیے ہیں، اور یہ بھی بتایا ہے کہ عرب، در ہندوستان کی سرحدوں کے درمیان اس قدر مسافت کا فاصلہ ہے۔

ن دو کتابوں کے علاوہ ابن جہد کا ایک رسالہ ہے جس کا نام "المعربہ" ہے، اس میں فلیح ربی سے بحث کی ہے۔ ایک رسالہ میں یہ بتایا ہے کہ مختلف سمتوں میں قبلہ کی شناخت کس طرح کی جاسکتی ہے، اس کے لیے اپنے بیان کے مطابق اُس نے چار آسان اصول بیان کیے ہیں (۱) یہ کہ نہ منظمہ کا طول البلد و عرض البلد معلوم کیا جائے اور پھر جس شہر میں مسافر موجود ہو اُس کا طول البلد و عرض البلد معلوم کرے (۲) دوسرا طریقہ خط سرطان کے ذریعہ دریافت کرنا ہے (۳) قطب کا کے ذریعہ یہ گنا کرنا (۴) کعبہ کی چاروں سمتوں کا معلوم کرنا، ایک رسالہ میں عرب کے ان حصوں سے بحث ہے جو صیغ فارس پر واقع ہیں۔ ایک رسالہ میں یہ بتایا ہے کہ "بنات النعش" سے منزل مقصود کی

سمت معلوم کرنے میں کس طرح مدد لیا جاسکتی ہے۔ ایک قصیدہ میں سمندر کی بہت سی نامعلوم چیزوں کا ستاروں کا، بروج کا، آسمانوں کا اور قطبوں کا بیان ہے۔ ایک رسالہ میں عرب اور ہندوستان کے میدانوں کا ذکر ہے۔ ان کے علاوہ چند اور قصائد ہیں جن میں مختلف ستاروں مثلاً شعلی، نسری، شمیل، اور سماکین سے جہات معلوم کرنے کی حقیقت و کیفیت کا تفصیلی بیان ہے۔ بعض قصیدوں میں ہندوستان کے مغربی ساحل اور عرب کی بندرگاہوں کا ذکر ہے اور ان میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ بعض شمالی ستارے جہاز رانی میں کس طرح رہنمائی کرتے ہیں۔ بعض قصیدوں میں سمندر میں جانوروں کی تفصیل ہے اور اس سلسلہ میں مینگوں اور مچھلیوں اور ان کی چند در چند انواع و اقسام کی نسبت بڑی دلچسپ معلومات ہیں۔ بعض قصائد سمندروں کی گہرائیاں، ان کی چٹانیں، اور خشکی کی علامتوں کے ذکر پر مشتمل ہیں۔ بعض قصیدے علم الفلاک اور فن جہاز رانی کے بعض دقیق مسائل کی تحقیق کے لیے مخصوص ہیں۔

ابن ماجہ کی تصنیفات و تالیفات کا یہ اجمالی خاکہ معلوم کرنے کے بعد ہر شخص جان سکتا ہے کہ وہ ہمارے فن کے اعتبار سے کس پایہ کا انسان تھا۔ مگر انہوں نے کس کس کی اکثر تصنیفات گمنامی کے گوشے میں پڑی ہوئی ہیں۔ اور بعض تو بالکل ہی ناپید ہیں جو کچھ دستیاب ہو سکتی تھیں وہ علماء و محققینِ فرنگ کی کوششوں کے صدقہ میں اب تک محفوظ ہیں۔ ان محققین نے ابن ماجہ کی ممکن الوصول تصنیفات کا مطالعہ ہی نہیں کیا بلکہ علمی طور پر اس کی آراء و نظریات سے غیر معمولی فائدہ اٹھایا۔ پندرہویں صدی عیسوی سے، بیسویں صدی کے وسط تک ابن ماجہ کے تجربات مشرق و مغرب کے جہاز رانوں کے لیے شمع ہدایت کا کام دیتے رہے ہیں۔ انگریز برٹن نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ۱۸۵۳ء میں عدن کے جہاز رانوں کا یہ دستور تھا کہ سفر شروع کرنے سے قبل وہ ازراہ تنظیم و تکریم ابن ماجہ کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے فاتحہ پڑھتے تھے، برٹن کا خیال ہے کہ

قطب نما کی ایجاد کا سہرا بھی ابن ماجہ کے سر ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ نویں صدی ہجری یا پندرہویں صدی غیسوی کے آخر میں قطب نما کا استعمال عام طور پر بہت معروف تھا، اس لیے غالباً صحیح یہ ہے کہ قطب نما کی ایجاد تو ابن ماجہ سے پہلے ہی ہو چکی تھی البتہ ابن ماجہ نے اپنی مہارت فن کی وجہ سے اس کا صحیح طریق استعمال دریافت کیا۔ اُس کے اصول منبٹا کیے۔ ورنہ اس پر اپنی تائیدات میں تفصیل سے بحث کی۔

چند اور عرب جہ زراں ابن ماجہ کے مدوہ غریبوں میں کثرت سے اور بھی صد حسب تصنیف دریافت کیا۔ جہ زراں ہوسے میں جن پر منفصل ذکر کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب بنجائے۔ یہاں ان میں سے چند مشہور جہ زراؤں کے نام لکھ دینا ہی کافی ہو گا وہ یہ ہیں: محمد بن شاذان، سہیل بن ابان، بیث بن کمدان، سہون مری، عبدالعزیز بن حمد لمغربی، موسیٰ القندرائی، میمون بن غیل وغیرہم۔ فوس اور سخت فوس ہے کہ تاریخ اسلام اپنے دامن میں علم و فن کے کیسے کیسے جوہر رکھتا ہے۔ گرنہ یہ رکھتی ہے کہ غیرو جانب ان کے انکار و نظریات سے تہذیبی و تمدنی زندگی میں دن و رات جو گنی ترقی کر رہے ہیں لیکن جن بزرگوں کی مشیت خاک سے تاریخ اسلام کا عظیم الشان مینارہ قائم ہو۔ خود ان کی ولد و آج ان کے کارناموں سے یکسر غافل و بے خبر ہے۔ فوا اسفند یا و یلت ۵ !

## اسلام کا تاریخ یورپ پر انقلابی اثر

فرانس کے مورخ ہنری بیرن کا انتقال ہو گیا اور افسوس ہے کہ وہ اپنی دو اہم کتابیں "تاریخ یورپ" و "محمد اور شرق و غرب" مکمل نہیں کر سکا۔ البتہ ان دونوں کے اہم حصے مکمل ہو چکے ہیں پہلی کتاب میں اُس نے ۱۵۵۹ء تک کی تاریخ یورپ قلمبند کی ہے۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ گزشتہ



جنگ عظیم میں وہ چونکہ جرمنی میں قید تھا اور یہ کتاب اُس نے اُسی حالت میں لکھی تھی۔ اس لیے کتابوں کا حوالہ نہیں دے سکا۔ محض اپنی حافظہ اور مطالعہ کی یادداشتوں سے ہی اُس نے یہ حصہ لکھا ہے۔ یہی دوسری کتاب جو آج میں انگریزی زبان میں شائع ہوئی ہے اُس میں اُس نے یہ ثابت کیا ہے کہ تاریخ یورپ کا عظیم الشان انقلاب اسلام کا مرہون احسان ہے۔ اور یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ عہد متوسط اور عہد حاضر کی ترقی ظہور اسلام کا ثمرہ ہے۔

شہنشاہیتِ روم کے سقوط پر تاریخ یورپ کا ایک دور ختم ہو جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اُس کے بعد جو دوسرا دور شروع ہوا، اُس کا نقطہ آغاز کیا ہے؟ اکثر مورخین کا خیال ہے کہ اُس کا باعث جرمن قبائل کا وہ اقدام تھا جس نے رومیوں کی شہنشاہیت کا خاتمہ کر دیا لیکن ہنری بیرن کی رائے ہے کہ جرمن قبائل اس درجہ ذلیل و حقیر زندگی بسر کرتے تھے کہ وہ خود اپنے آپ کو غلام اور رومیوں کو اپنا قابض سمجھتے تھے۔ اس لیے اُن کے خیال میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ وہ رومیوں کا مقابلہ کر سکیں گے۔ البتہ صرف مسلمان تھے جو اپنے متعلق اس بات کا یقین رکھتے تھے کہ وہ زندگی کے تمام شعبوں میں اور خصوصاً دینی اعتبار سے رومیوں سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ اُن کے اس احساس برتری نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ شہنشاہیتِ روم کا مقابلہ کریں اور اُن کی سطوت و بادت کا قلع قمع کر کے رکھ دیں۔

جرمن اور اسلامی قبائل کا یہ فرق اس قدر واضح ہے کہ اُسے کسی حالت میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ رومیوں کی بارگاہ سے جرمن امراء کو جو بڑے بڑے خطاب غلط ہوتے تھے جرمن اُن پر فخر کرتے اور خوشی کے مارے پھولے نہ ساتے تھے۔ ان کے برخلاف مسلمان تھے جو اس قسم کی رشوتوں سے طبعاً نفرت کرتے تھے اور سرکاری خطابات و اتفاقات کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جرمنوں کا عقیدہ تھا کہ خود اُن کے پاس کوئی مستقل تہذیب و تمدن اور کلچر نہیں ہے جو کچھ

رومیوں کے صدقہ میں نہیں حاصل ہے۔ لیکن مسلمانوں کو یقین کامل تھا کہ خود وہ ایک مستقل  
 شریعت، مکمل نظام زندگی، زندہ کچھ، اور شاندار تہذیب و تمدن کے علمبردار ہیں۔ اس لیے حکومت  
 انہی کو کرنی چاہیے نہ کہ کسی اور کو، جرموں کے حدود روم میں داخل ہونے اور وہاں قیام پذیر  
 ہونے کا نتیجہ زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ روم کا دار السلطنت روم کے بجائے بازنطین بن گیا اور اس  
 کی مادی و عقلی زندگی پر ابک طرح کا جہود طاری ہو گیا، لیکن مسلمانوں کے لشکر رومیوں کی مملکت تک  
 برابر آتے رہے، یہاں تک کہ انہوں نے روم کو تحس تحس کر کے رکھ دیا۔ اور اب ایک نئی حکومت  
 درنئی تہذیب نے جنم لیا۔ مشرقی اور جنوبی جانب سے جب یورپ کا محاصرہ کر لیا گیا تو یہاں  
 کے بادشاہوں نے شہر یورپ کا رخ کیا۔ جہاں بڑے بڑے معرکے ہوئے۔ اور وہ عظیم الشان  
 واقعات ظاہر ہوئے جنہوں نے تاریخ یورپ کی ہیئت ہی بدل دی۔ روم یورپ کا جنوبی حصہ  
 تو ہیں اس زمانہ میں بوانیہ کے واقعہ کے علاوہ کوئی اور واقعہ پیش نہیں آیا جس میں شارل ماٹل  
 نے اندلس کے لشکر پر حملہ کیا تھا۔ پس گراسام کا ظور نہ ہوتا تو روم کی موکیت بدستور قائم رہتی،  
 اس کا مرکز مغرب سے مشرق کی طرف منتقل ہو جاتا۔ بحر ابض، بحر روم کہلاتا، اور وہ قومی بنیادیں  
 نہ ہوتیں جن کے باعث یورپ کی جدید حکومتیں وجود میں آئیں، اور نہ فکر و نظر میں وہ وسعت اور  
 ترقی ہوتی جس کی بنیاد پر آج مغرب کی جدید تہذیب قائم ہے۔

(الامال مصر فردی مشتمل)

# ادبیات

## ثمرات

«از جناب نعال سیواری»

باز برق طور بر سرِ برقِ غریباں ہم فلک  
الترام ناظر و منظور سے ہے زیبِ دہر  
سرنگوں بیٹھے ہوئے کیا ہو نفس کوئے اُڑو  
آئی اور اس رنگِ سحرِ آفاق میں آئی بہار  
کون ہے ناواقفِ رنجِ بچن اس دہر میں  
اپنے بیروں سے سرگرم تکلم جو کبھی  
بُعدِ منزل سے خطر کیوں بُعدِ منزل کچھ نہیں  
غیر کو کس مُنہ سے الزام تب ہی دیکھو  
کیا یہ لازم ہے کسی کی انجمن کا رخ کر دو  
اور ہی کچھ شان ہے تیرے قتیلِ حُسن کی  
ہے لبِ ہنگامہ حاضر پہ اک تاریخِ نو  
وہ تجلی کا جہاں کہتا ہے تو جس کو بہشت  
کامرا نہیں ہے جوئے شیرِ نامکن نہیں  
دیدہ مشتاقِ دا، اک عمر سے ہر لے نہال  
لے کہ تجھ سے ہر فروزاں مردِ مہ کی انجمن  
انجمن سے آئینہ ہے آئینہ سے انجمن  
اتنی ہمت کیا نہیں ہر لے اسیرانِ مہن  
تختہ گلزارِ جنت بن گئے کوہِ وِ دمن  
دیکھ چشمِ غور سے لے واقفِ رنجِ دمن  
اے جیاتِ عاشقاں، لے شاید شیریں  
گامزن ہو، گامزن ہو، گامزن ہو، گامزن  
بن گئے دزدِ چمن خودِ حسنِ زادِ ان چمن  
دل کہ صد رنگِ تخیل سے ہر خود اک انجمن  
ورنہ کہنے کے لیے ہر لالہ بھی خونیں کفن  
چھوڑ بھی لے قصہ خواں ذکرِ روایاتِ کفن  
ہر کسی خورشید و ش کی ایک چھتی سی کن  
چاہتی ہے سختی کُسا رُضِ سرب کو کفن  
کاش آجائے چمن کی سمت وہ رشکِ چمن



# تجلیاتِ افق

(از خباب میرافق صاحب کاظمی امر دہوی)

مقامِ عشقِ خبر کے سوا کچھ اور نہیں	مدِ عقلِ نظر کے سوا کچھ اور نہیں
جگر میں تابِ جگر کے سوا کچھ اور نہیں	نظر میں ذوقِ نظر کے سوا کچھ اور نہیں
بشر کی ذات میں شر کے سوا کچھ اور نہیں	کسی کا اُنس ہی انساں بنائیگا ورنہ
یہ اک فریبِ نظر کے سوا کچھ اور نہیں	سراپِ دہر سے کیا تشنہ کام ہو سیراب
نظر میں قصِ شر کے سوا کچھ اور نہیں	یہ برقِ حسنِ ہر یار ب کہ نکس شدلہ شوق
قمر میں نورِ قمر کے سوا کچھ اور نہیں	کبھی نہ دل سے بچھے روشنیِ محبت کی
مری نظر میں سحر کے سوا کچھ اور نہیں	نظرِ فریب ہے ہر منظر حسینِ سیکن
تری نظر میں خطر کے سوا کچھ اور نہیں	خطر ہے عشق کے رہبر کا فرشتہ پا، انداز
علاجِ قطعِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں	بجا کہ تیرا سفر صد سقرِ بدِ امان ہے
یہ ایک راہِ گزر کے سوا کچھ اور نہیں	نہ ڈال رختِ قامتِ جہنمِ فانی میں
یہاں تو دامنِ تر کے سوا کچھ اور نہیں	سہیم کوثر و تسنیم و سببِ سہیج

دبِ فنک میں لگا گرمیِ نول سے افق

کہ روحِ شعرا اثر کے سوا کچھ اور نہیں

# شئونِ علیہ

## ریڈیم کی کان کی دریافت

### دائرہ قطب شمالی میں

ریڈیم دنیا کا سب سے زیادہ قیمتی معدن ہے۔ پہلے ایک گرام ریڈیم کی قیمت چودہ ہزار پونڈ تھی وہ جس قدر قیمتی ہے، اتنا ہی کمیاب بھی تھا، سنہ ۱۹۳۸ء تک تمام دنیا میں صرف تین سو گرام موجود تھا۔ بیس سال تک مسلسل اُس کو دوسری مخلوط معدن سے پاک صاف کر کے حاصل کرنے کی زبردست کوششیں کی جاتی رہیں لیکن پھر بھی وہ ۲۵ گرام فی سال سے زیادہ حاصل نہ کیا جاسکا۔ حالانکہ شفا خانوں میں اس کی بڑی ضرورت محسوس کی جاتی تھی۔ کیونکہ مسک سرطان کی بیماری کے لیے یہ اکیر کا حکم رکھتا ہے۔ لیکن اب اس کی مقدار ۲ گرام فی سال سے بڑھ کر ڈیڑھ سو گرام فی سال ہو گئی ہے۔ اور اس بنا پر اس کی قیمت بھی گھٹ کر فی گرام پانچ ہزار پونڈ ہو گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت تمام دنیا میں آٹھ سو گرام ریڈیم موجود ہے۔

ریڈیم کی کان کی دریافت اور اس کثرت سے اُس کی دستیابی کا سہرا ایک خاتون میڈم کوری اوران کے خاوند کے سر ہے۔ سائنسی دونوں نے بڑی محنت و مشقت کے بعد ریڈیم کی عجیب و غریب اور نفسِ معدن کا پتہ لگایا۔ لیکن اس سلسلہ میں امریکہ کے بلند بہت نوجوان گلبرٹ ٹاہین کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ نوجوان پندرہ برس کی عمر میں ہی اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر دائرہ قطب شمالی میں پہنچا اور وہاں سونے چاندی کی کانوں کی تحقیق شروع کر دی۔ یہاں تک کہ بیس سال کی لگاتار جدوجہد کے بعد وہ ایک ریڈیم کی کان کے معلوم کر لینے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ اس مدت میں

اس کو بڑے بڑے خطرات سے مقابلہ کرنا پڑا۔ شدید سردی اور ہلکت آفریں بھوک کی مصیبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ دیکھیں، مرتبہ تو ایسی حالت ہوئی کہ اُسے اپنی زندگی سے مایوسی ہو گئی لیکن ان سب کے باوجود اُس کا حوصلہ پست نہیں ہوا۔ اور وہ برابر اپنا کام کرتا رہا، یہاں تک کہ عروس کا مرانی نے شوق بھنگا دیا۔ اس نے اپنی آغوش توجہ واکردی۔ اس نوجوان کا پورا واقعہ اڈا گرا لٹا۔ اس نے اپنی کتاب میں لکھا ہے جس میں اُس نے ریڈیم کے معدن کی دریافت کی پوری تاریخ قلمبند کی ہے۔

سنہ ۱۹۰۲ء میں یہ معلوم کیا گیا کہ کنیڈا کی شمالی جانب میں ریڈیم کی ایک معدن ہے۔ اسی نامہ میں حکومت امریکہ کے ایک محقق جیا لوجی نے میڈم کوری کی تحقیق کا اعلان کیا تھا۔ اس بنا پر گلبرٹ لائبن بھی پہلے شمالی جانب میں کئی بار گیا لیکن آخر کار وہ جنوبی سمت میں جا پہنچا۔ جہاں اُس کو مختلف نفیس معدنی چیزوں مثلاً سونا، چاندی اور تانبہ کی لابی لابی پتلیاں ملیں۔ اُس نے تقریباً ایک سوٹل (پونڈ) پتلیاں اٹھا لیں۔ پھر ان کو صاف اور محلول کیا تو ان میں وہ معدن بھی نکلا جس سے ریڈیم حاصل کیا جاتا ہے۔ اب اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی، کیونکہ اُس کا یہ استکشاف عہد جدید کا عظیم الشان کارنامہ تھا۔

ریڈیم حاصل کرنے کے لیے تیس نہایت سخت کیمیائی عمل کیے جاتے ہیں جو خاص خاص علم کیمیا کے ماہر ہی کر سکتے ہیں۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک گرام ریڈیم دس ٹن معدن میں سے نکلتا ہے اور اس دس ٹن کی تحمیل پر تقریباً ساٹھ ٹن کیمیائی اشیاء خرچ ہو جاتی ہیں۔ اس مقصد کے لیے گلبرٹ لائبن نے کنیڈا میں ایک کیمیائی مشین قائم کی جہاں وہ ریڈیم کا معدن خام اس کی کان سے نکال کر لے آیا تھا۔ اور یہاں میڈم کوری کے ایک شاگرد اریسل ہرڈشون کی مدد سے کیمیائی مشین کے ذریعہ معدن خام کی تحلیل کے بعد ریڈیم نکال لیتا تھا۔ اس سے قبل خیال تھا کہ بیجیم میں ریڈیم کی سب سے بڑی کان ہے لیکن لائبن کے اس کارنامہ نے کنیڈا کے مقابلہ میں



بلجیم کو شکست دینے والی دیکھی۔ کینیڈا سے سال بسال ریڈیم جس تعداد میں حاصل ہوا اس کی روداد یہ ہے  
 سنہ ۱۹۳۳ء میں تین گرام، سنہ ۱۹۳۵ء میں آٹھ آٹھ گرام، سنہ ۱۹۳۶ء میں ۱۵ گرام، سنہ ۱۹۳۷ء  
 میں ۲۴ گرام، اور سنہ ۱۹۳۸ء میں ۷۰ گرام اور سنہ ۱۹۳۹ء میں ۱۰۸ گرام۔ اس افراط کی وجہ سے اب ریڈیم  
 کی قیمت فی گرام پانچ ہزار پونڈ ہے۔

## مردہ ہڈیوں کی زندگی

مغربی طب کی حیرت انگیز ترقیوں کی ایک نمایاں مثال یہ ہے کہ اب وہ مردہ ہڈیوں کو  
 زندہ ہڈیوں کی شکل میں منتقل کر دینے میں بھی کامیاب ہو گئی ہے۔ یعنی اگر کسی انسان یا حیوان کی کوئی  
 ہڈی ٹوٹ جائے اور وہ بالکل زکار رفتہ ہو جائے، تو اس کی جگہ کسی مردہ انسان یا حیوان کی ہڈی  
 کاٹ کر اس ہڈی کی جگہ رکھ دی جاتی ہے اور پھر وہ بالکل عصبی ہڈی کی طرح کام کرتی ہے۔ یہاں تک  
 کہ اس میں نشوونما بھی ہوتا ہے اور انسان و حیوان کی قوت یا صحت پر اس کا کوئی مضراثر نہیں ہوتا۔  
 عمل جراحی سے قبل مردہ ہڈی کو جوش دیے ہوئے پانی اور دوسری کیمیائی چیزوں کے ذریعہ جراثیم  
 سے پاک و صاف کر لیا جاتا ہے۔

اس تجربہ کی وضاحت کرتے ہوئے بریٹن کی یونیورسٹی کے ایک ماہر سرجری (جراح) نے  
 بیان کیا کہ ایک بچے کے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی، ہم نے اس کو نکال کر اس کی جگہ ایک سیل  
 کی ہڈی لگا دی تو اس کے بعد بچے کے نشوونما میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا اور وہ جون ہو کر اتنا  
 قوی اور مضبوط تھا کہ بڑی بڑی بھاری اور بوچھل چیزیں اپنے ہاتھ سے بے تکلف اٹھا لیتا اور انہیں  
 پھینک سکتا تھا۔ اسی طرح ایک عورت کی پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی، ہم نے اس کو خارج  
 کر کے اس کی جگہ ایک پہاڑی کرے کی ہڈی رکھ دی تو اس کے بعد اس عورت کے پاؤں میں

لنگ یا کوئی اور نقص پیدا نہیں ہو۔۔۔ وہ حسب سابق خوب چلتی پھرتی اور دوڑتی کودتی تھی اور کوئی شخص شناخت نہ کر سکتا تھا کہ اُس کی پنڈلی میں انسانی ہڈی کے بجائے ایک بکرے کی ہڈی لگی ہوئی ہے۔

### چند اور ترجمہ قرآن مجید

برائن کی شاعت گزشتہ میں تراجم قرآن پر جو مستالہ شائع ہوا تھا اُس کو ملاحظہ فرما کر ہمارے محترم مولانا عبد الماجد صاحب دریا بدی اڈیٹر صدق لکھنؤ نے ایک والا نامہ ارسال کیا ہے جسے ہم ذیل میں بعد شکریہ درج کرتے ہیں۔

”انگریزی میں آخری اور تازہ ترین ترجمہ ایک پادری ڈاکٹر بل (Bell) کا ہے جو ابھی دو جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ایک منتخب ترجمہ (Selections from the Holy Quran) لین (Lane) کے قلم سے اور سورہ آل عمران کا ترجمہ (مع ترجمہ بیضاوی) مارگولیس کے قلم سے ہے۔ غلام الملک کا ترجمہ ۱۶ پاروں تک تیار شدہ موجود ہے، پارہ اول کا ترجمہ بہت مدت ہوئی قادیان سے نکلا تھا۔ شیعی مدرسۃ الوداعین لکھنؤ بھی ایک ترجمہ کر رہا تھا سورہ بقرہ تک شائع بھی ہو چکا ہے (۲۱) اردو میں تراجم ذیل کا اضافہ فرمائیے۔ ترجمہ از سرسید احمد خاں، ترجمہ مولانا ثناء اللہ امرتسری، ترجمہ مولوی محمد علی احمدی لاہوری، ترجمہ مولانا فتح محمد تائب لکھنوی، متعدد شیعہ تراجم، تراجم مندرجہ تفاسیر مترجمہ مثل اردو ترجمہ تفسیر کبیر ابن کثیر، تفسیر قادری وغیرہ (۳) فارسی میں:۔ ترجمہ ملا حسین واعظ، ترجمہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، ترجمہ منسوب بہ شیخ سعدی، ترجمہ سورہ منکفہ از حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی، ترجمہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی۔

## تبصرہ

دفتر دیوانی و مال و ملکی سرکار عالی | تقطیع کلاں، ضخامت ۲۸۱ صفحات، کاغذ نفیس آرٹ پیر قیمت  
۴۴ روپے کا پتہ :- دفتر مذکور حیدرآباد دکن۔

ریاست حیدرآباد دکن کا دفتر دیوانی اس اعتبار سے نہایت اہم ہے کہ وہ مختلف مالی و ملکی شہوں  
کو حاوی ہے بلکہ پہلے تو تمام کاروبار ریاست کا انصرام دفاتر دیوانی و مال ہی سے ہوتا تھا، نواب سرسالا  
جنگ مختار الملک بہادر نے اپنے عہد وزارت میں جدید نظم و نسق کی بنیاد ڈالی اور مختلف محکمے اس سے  
الگ کر دیے لیکن پھر بھی عطاے جاگیر و انعام و اجر اے اسناد و تصدیق اسناد و معاش وغیرہ کا تعلق  
بدستور باقی رہا، اس اہمیت کے باوجود ایک زمانہ سے دفاتر کا انتظام نہایت ناقابل اطمینان ہو گیا  
تھا، اس لیے ان کو بھی سرکاری گزرائی میں لے لیا گیا، اور چند اور شعبے مثلاً دفتر استیفا و مال اور دارالانصار  
وغیرہ بھی انہی میں ضم کر دیے گئے۔ ان دفاتر کی عظیم الشان خصوصیت یہ ہے کہ ان میں وہ پیش بہا بلکہ  
بے بہا نایاب تاریخی خزانہ موجود ہے جو قدامت و نوعیت کے لحاظ سے بے نظیر ہے اور جس سے نہ  
صرف مملکت آصفیہ یا دکن کی بلکہ تمام ہندوستان کی تاریخ کے لیے بھی بالکل صحیح قابل اعتماد اور نہایت  
وافر مواد مہیا ہو سکتا ہے، اور صرف یہی نہیں بلکہ تحقیقات کا ذوق رکھنے والے اصحاب کے افادہ کے  
لیے ایسی کتابیں بھی فراہم کر لی گئی ہیں جن سے نہ صرف یہ کہ کاغذات کی ترتیب و تہذیب میں  
بدولگی بلکہ حوالوں وغیرہ کے تعین میں بھی سہولت ہوگی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اب تک ہندوستان  
کی تاریخ، دفتری اصطلاحات اور فارسی لغات کی منتخب قلمی اور مطبوعہ کتابیں جمع ہو چکی ہیں جن  
میں بعض ایسی نایاب ہیں کہ دنیا کے کسی کتب خانہ میں ان کا موجود ہونا ثابت نہیں ہے۔



جڑی سرس کی بات ہے کہ ان کتابوں کی مفصل فہرست مرتب کی جا رہی ہے جو عنقریب شائع ہوگی اور ان کے علاوہ مختلف اقسام کے کاغذات کی جلدیں بھی یہ ترتیب ہیں ان کاغذات کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یہ صد اخوات پر منقسم ہونگے۔

زیر تبصرہ کتاب میں انہی کاغذات میں سے چند ایک کے نوٹ و عمدہ آرٹ پیپر پر شائع کیے گئے ہیں جو علی حضرت شاہ گارین عالی متولی مدظلہ العالی کے دور سے لے کر شاہجہاں بادشاہ کے عہد تک کے مختلف عنوان احکام، نامجات، اور فرامین وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ دفتر کا یہ کارنامہ بے شبہ علمی و تاریخی اعتبار سے حد درجہ قابل قدر ہے، اور میں امید ہے کہ وہ جلد اپنے وعدوں کی تکمیل کر کے ارباب علم و تحقیق کو زیادہ مہمون کرے گا۔

**تاریخ جنوبی ہند** | از جناب محمود خاں صاحب محمود - ضخامت ۲۰۔ کتابت طبع و عت اور کاغذ بہتر قیمت سے علاوہ محصل ڈک - پتہ :- مولوی محمد سحاق پشردا لک سلم بکٹ پونیواریٹ بنگلور سٹی۔

ہندوستان کے مؤرخین نے شمالی ہندوستان کی تاریخ جس شرح و بسط سے لکھی ہے جنوبی ہند کی تاریخ پر انہوں نے کچھ زیادہ توجہ نہیں کی، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ سلطان محمود غازی کے بعد سے مغلیہ عہد سلطنت تک جو اسلامی حکومتیں ہندوستان میں قائم ہوئیں ان کی سیاسی سرکردگیوں کا سنہ شمالی ہند کی طرف ہی رہا لیکن مسلمانوں کے ہندوستان میں سب سے پہلے قدم جنوبی سمت میں ہی میں آئے حضرت عمر حضرت عثمان در حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے عہد مبارک میں یہاں برابر رہکاری مشین سے مسلمانوں کے دفاتر قائم رہے۔ یہاں تک کہ حجاج بن یوسف ثقفی کے زمانہ میں محمد بن قاسم کے انھوں نے سندھ پر مستقلاً فاتحانہ قبضہ ہو گیا۔ اس لیے ایک مورخ کے لیے ہندوستان کے ساتھ مسلمانوں کے سیاسی تعلق پر بحث کرتے وقت جنوبی ہند کی تاریخ کو ہمیشہ نظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اب تک اس موضوع پر اردو زبان میں کوئی مفصل کتاب موجود نہیں تھی ہم کو

خوشی ہے کہ محمود خاں صاحب محمود نے جو اپنی کئی مستبرول کتابوں کی وجہ سے اردو کے اہل قلم میں کافی روشناس ہو چکے ہیں۔ یہ کتاب لکھ کر ایک بڑی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

فاضل مصنف نے اس کتاب کو پانچ سال کے مسلسل مطالعہ کے بعد تحقیق و کاوش سے مرتب کیا ہے۔ شروع میں جنوبی ہند کی جغرافیائی حالت، قدیم تاریخ، اور یہاں کی قدیم قوموں کے حالات اس کی معاشرت، رسم و رواج اور ان کے طرز حکومت وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ پھر جنوبی ہند پر مسلمانوں کے حملوں اور یہاں کی اسلامی سلطنتوں کا حال لکھا ہے۔ اس کے بعد وجیا نگر کی مفصل تاریخ ہے جس میں خاندان وجیا نگر کے حکمرانوں کے تفصیلی حالات درج ہیں، پھر خاندان تلودا اور اس کے راجاؤں کا تذکرہ ہے پھر خاندان ارادید۔ جنوبی ہند میں مغلوں کی آمد، مرہٹے اور مسلمان خاندان انوری، ارکاٹ کی جنگ وغیرہ کا مفصل بیان ہے۔ اس کتاب یہاں پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد جو ضمیمے ہیں وہ خود ایک مستقل تصنیف کا حکم رکھتے ہیں۔ اس میں سلطنت فدادا کے قیام، وپرگالیوں، دچوں، انگریزوں اور فرانسیسیوں کے یہاں آنے کا ذکر ہے۔ کتاب میں متعدد مقامات کے فوٹو اور کئی ایک نقشے بھی ہیں

اس کتاب میں لائق مصنف نے صرف واقعات کے بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اصول فلسفہ تاریخ سے کام لے کر نتائج و اسباب کے بیان کرنے میں بڑی دیدہ ریزی سے کام لیا ہے۔ متعدد غلط تاریخی روایتوں پر تنقید کی ہے۔ اور جو کچھ لکھا ہے حوالہ اور سند کے ساتھ لکھا ہے۔ زبان سہل اور سلیس ہے لیکن معلوم نہیں فاضل مصنف فاعل کے ساتھ لفظ ”نے“ کا استعمال ہر جگہ کیوں ضروری سمجھتے ہیں۔ اور بعض جگہ وہ ضمیر متکلم کے ساتھ غائب کا صیغہ لکھنے میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ مثلاً دیرا چھپ

”میں نے یہ بھی لکھ آیا ہے“ ص ۲۹۷، ۲۹۸۔ بہر حال کتاب پر از معلومات، مفید اور اردو لٹریچر میں قابل ستائش اضافہ ہے۔ اس کا مطالعہ ہندو اور مسلمان اور تاریخ کے عام طلباء سب کے لیے سودمند ہو گا۔

قومی نظمیں | مرتبہ محمود علی خاں صاحب جامع تقطیع چھوٹی ضخامت ۵۶ صفحات کا فہرہ کتابت اور طباعت

بہتر قیمت ۴ روپے :- مکتبہ جامعہ دہلی ونئی دہلی۔

اس مجموعہ میں ہندستان کے مختلف نامور شاعروں کی چند بہت سلیس و عام فہم دعائیہ نظمیں اور قومی گیت شامل ہیں جو قومی اسکولوں میں بے تکلف پڑھے جاسکتے ہیں اور اگر ان میں سے بعض کو دیہاتوں میں رائج کیا جائے تو وہاں بھی کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر صاحبان کے لیے اسکول میں روزانہ لڑکوں سے پڑھوانے کے لیے اس مجموعہ میں سے اپنے منہ کے مطابق کسی نظم کا انتخاب کر لینا بہت آسان ہے۔

**مغلوں کا مد و جزر** | از خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی بی اے۔ تقطیع چھوٹی ضخامت ۶۸ صفحات کتاب طباعت اور کاغذ بہتر قیمت ۶ روپے :- مکتبہ جامعہ دہلی ونئی دہلی۔

اس کتاب میں پانچ مستند اور قدیم تاریخی کتابوں سے مدرسے کے ایک مسلسل افسانہ کی شکل میں یہ دکھایا گیا ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے مغلوں نے ایشیا کے ایک بڑے حصہ پر مدت دراز تک حکومت کی اور پھر وہ کیا سبب پیش آئے جن کی وجہ سے حکومت کا تخت و تاج اُن سے چھن کر دوسری قوموں کے قبضہ میں چل گیا۔ زبان نہایت شگفتہ اور سلیس، انداز بیان چست اور پر جوش ہے۔ خواجہ صاحب دہلی کے نوجوان ادیبوں میں امتیاز خاص رکھتے ہیں۔ اور دہلی کی ہمسالی زبان میں بڑے کام کی باتیں کہہ جانے کا انہیں خاص ملکہ ہے۔

**عصر نو** | از محمد صادق صاحب ضیاء الدینی بی اے ال بی تقطیع چھوٹی ضخامت ۷۴ صفحات کتاب طباعت عمدہ کاغذ متوسط قیمت ۴ روپے :- مکتبہ انصاریا ادب و فنر شاعر آگرہ

آج کل نوجوانوں میں اردو شاعری سے متعلق جو جدید رجحانات بکثرت پیدا ہو رہے ہیں یہ کتاب اُن کی آئینہ دار ہے چنانچہ اس میں کچھ نظمیں اسی قسم کے نئے عنوانات پر ہیں لیکن اکثر نظموں میں غلط محبت پیدا ہو گیا ہے اور فلسفیانہ و منطقیانہ استدلال کے بجائے جذبات سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔ مثلاً سراپا داری



کے زیر عنوان جو نظم ہے اُس میں سرمایہ داری کے عظیم و ملک نقصانات بیان کرنے چاہئیں تھے لیکن ایسا نہیں کیا گیا بلکہ صنف نازک، نوجوان، مزدور اور جمہور دوست "کو دنیا کے لیے سرمایہ سکون و انبساط بتانے پر ہی قناعت کر لی گئی ہے۔ اس کے علاوہ یہ مسئلہ ایک مستقل بحث کا طلبگار ہے کہ "صنف نازک" بھی سرمایہ دارانہ اور ڈکٹیٹرانہ ذہنیت کی مالک ہوتی ہے اور اس لیے مزدور کے ساتھ اُس کا جوڑ کہاں تک مناسب ہے، "بہر حال ضیا صاحب ہونا رشتہ معروضی معلوم ہوتے ہیں اُن کا کلام جدت طرازی، تعمیل بلند، اور سلاست بیان سے عاری نہیں ہے۔ شروع میں انور مختار صاحب وکیل کا ایک طویل مقدمہ ہے جس میں انہوں نے ضیا صاحب کے کلام پر مختصر تبصرہ کیا ہے اور عصر نو کی خصوصیات پر روشنی ڈال کر عہد حاضر کے اکثر نوجوانوں کی ترجہانی ہے۔

۱۱) صبر بادشاہ زادہ	تفلیح خورد، ضخامت ۲۲ صفحے کتابت طباعت اور کاغذ بہتر قیمت فی
۱۲) ٹھوڑی تارا ماتھی چاند	کتاب کی ۲ سرٹنے کا پتہ :- کتب خانہ علم و ادب اردو بازار جامع مسجد دہلی۔
۱۳) نعل شاہزادہ	یہ چاروں کتابیں مختصر افسانے ہیں جو دہلی کے نوجوان ادیب سید اشرف صاحب
۱۴) شہزادہ نے نواز	صباحی منشی فاضل کے چکیدہ قلم میں۔ ان کہانیوں میں اگرچہ ہیرو اور جنوں

کے دور از عقل و قیاس تھے بیان کیے گئے ہیں لیکن زبان اتنی شیریں اور نکسالی ہے کہ انہیں بار بار پڑھ کے بھی سیری نہیں ہوتی۔ ہمیں بڑی مسرت ہے کہ اب خاص دہلی میں ایسے نوجوان پیدا ہو رہے ہیں جو حقیقت دلی کی نکسالی اردو لکھنے پر بدرجہ اتم قادر ہیں۔ اس خاص صفت کے لحاظ سے سید اشرف صاحب کو مرزا فرحت اشتریک ثانی بے تاؤل کہا جاسکتا ہے۔ دلی کی نکسالی زبان اور اردو کے خاص محاوروں کا لطف لینے اور اُن سے واقفیت حاصل کرنے کا ذوق رکھنے والے اصحاب کو ان چاروں کتابوں کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ صباحی صاحب اگر ہیرو اور جنوں کے قصوں کے بجائے ہندوستانی معاشرت و تمدن پر اسی انداز میں مضامین لکھیں تو اردو پر یقیناً یہ اُن کا بڑا کرم ہوگا۔

**پیشوں والوں کی سیر** | درجناب مرزا فرحت الشریک صاحب دہلوی تقطیع خورد طباعت کتابت  
اور کاغذ عمدہ ضخامت ۵۴ صفحے قیمت درج نہیں۔ پتہ:۔ کتب خانہ علم و ادب اردو بازار جامع مسجد  
اردو کے مشہور جادو نگار دیب مرزا فرحت الشریک دہلوی کا یہ مضمون غالباً سب سے پہلے نگار  
لکھنؤ کے کسی خاص نمبر میں شائع ہوا تھا۔ اب کتب خانہ علم و ادب نے اس کو ایک مستقل کتابی  
شکل میں بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ مضمون کی عمدگی فصاحت و بلاغت اور طرز بیان کی لطافت  
و خوبی کے لیے مرزا صاحب کا نام ہی کافی ضمانت ہے۔ دراصل یہ اردو ادب کے وہ شہ پائے ہیں  
جو کسی قیمت پر بھی گراں نہیں۔

**سیاسیات کی پہلی کتاب** | از پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم اے تقطیع چھوٹی۔ کتابت طباعت  
عمدہ اور کاغذ متوسط قیمت ۴ روپے۔ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی، نئی دہلی، لاہور و لکھنؤ۔

اس کتاب میں سیاسیات کے مبادیات کو آسان اور عام فہم زبان میں سمجھانے کی کوشش  
کی گئی ہے۔ راقی مصنف خود معاشیات کے ایم اے اور استاذ ہیں اور پھر انہوں نے اس کی ترتیب  
میں بہت کچھ پروفیسر محمد حبیب علی گڑھ کے لکچروں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اس بنا پر کتاب اپنے  
موضوع پر بڑی حد تک کامیاب ہے کتاب تین ابواب پر منقسم ہے۔ پہلے باب میں ریاست کی  
تعریف، دوسرے میں ریاست کی ابتدا کے بارے میں نظریے اور تیسرے باب میں ریاست کے  
اقتدار اسلی اور افراد کی آزادی پر بحث ہے۔ اردو زبان کو ایسی پُر از معلومات کتابوں کی بڑی  
ضرورت ہے۔ اردو خواں طبقہ کو اس کی قدر کرنی چاہیے۔

**علماء ہند کی شاندار ماضی** | از مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی ضخامت حصہ اول ۱۷۱، حصہ دوم  
۱۸۳، حصہ سوم ۲۷۲، حصہ چارم ۷۱، و حصہ پنجم ۲۲۳ صفحات کتابت طباعت

اور کاغذ متوسط قیمت مکمل سٹ کی ہے۔ پتہ:۔ کتب خانہ فخریہ شاہی کمپنی امرتسر گیٹ مراد آباد

علماء پر بھی ناواقف لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ان سے مولے درس و تدریس اور مسجد کی امامت کے کوئی اور کام نہیں ہوتا اور نہ یہ اس کے اہل ہیں۔ مولانا محمد میاں نے اس اعتراض کا جواب دینے کے لیے اس کتاب میں بہت تفصیل کے ساتھ دلائل پیرایہ میں یہ ثابت کیا ہے کہ مجدد الف ثانیؒ کے زمانہ سے اب تک علماء نے ہندوستان کی تاریخ بنانے اور یہاں کی سیاسی فضا میں انقلاب پیدا کرنے کے سلسلہ میں کیسے کیسے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، اور کس طرح انہوں نے بروقت موقع کی نزاکت و ضرورت کو محسوس کر کے مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کی ہے۔ پہلا حصہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے، دوسرا حصہ حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہما کے حالات کے لیے مخصوص ہے۔ تیسرے میں حضرت سید احمد صاحب شہیدؒ، مولانا اسماعیل شہیدؒ اور ان کے دوسرے ساتھیوں کے حالات و سوانح میں ہے۔ چوتھے حصہ میں ۱۸۵۷ء کی خونی داستان اور اس کے اسباب و نتائج معتبر ذرائع سے مدلل کر تحریر کیے گئے ہیں اور پانچویں حصہ میں تحریک دارالعلوم دیوبند پر روشنی ڈالی گئی ہے جس میں بتایا ہے کہ یہ تحریک ملک و قوم کی کن اہم ضروریات و دواعی کے ماتحت شروع ہوئی اور اس نے ملک و قوم کی کیسی عظیم الشان خدمات انجام دیں۔

کتاب محنت و کاوش سے لکھی گئی ہے، لیکن انداز موز خانہ کے بجائے زیادہ تر خطیبانہ ہے ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے سلسلہ میں مولانا احمد امجد صاحب فیض آبادی کا تفصیلی ذکر معلوم نہیں کیوں نہیں کیا گیا۔ حالانکہ اس معرکہ میں انہوں نے بڑی بہادری اور پامردی کا ثبوت دیا تھا۔ اس کے علاوہ مقرر بھی ایسے پرجوش تھے کہ اگر وہیں ان کی تقریر سننے کے لیے دس دس ہزار ہندو مسلمانوں کا مجمع ہوتا تھا۔ پھر کتاب کے نام میں "ماضی" کو مؤنث قرار دے کر "علماء ہند کی" شاندار ماضی" لکھا گیا ہے۔ حالانکہ "ماضی" مذکر ہے۔ اور بجائے "کی" کے "کا" ہونا چاہیے تھا۔ تاہم مجموعی حیثیت سے فاضل مصنف کی محنت بہت زیادہ قابلِ داد ہے۔ اور غالباً ان دو سالوں کی مدت میں "سیرت سید احمد شہید"



کے بعد یہ دوسری کتاب ہے جس کے پڑھنے سے ایمان میں حراست، قوتِ عمل میں جوش اور اسلامی جذبات و حیات میں گرمی پیدا ہوتی ہے۔ اور علماء ہند کی زندگی کا ایک نہایت اہم اور روشن رُخ سامنے آجاتا ہے۔ علماء ہند کے حالات کے استیعاب میں جو کمی رہ گئی ہے اُن کی خدمات کا بھی ذکر کر دیا جائیگا۔

**خاکسار تحریک مذہب و سیاست کی روشنی میں** | از مولانا محمد منظور نعمانی، ڈیٹر الفرقان بریلی

تقطیع کلاں کتابت طباعت اور کاغذ بہتر ضخامت ۲۰ صفحات قیمت ۸ روپے: دفتر الفرقان بریلی۔  
خاکسار تحریک عہد حاضر میں مسلمانانِ ہند کے لیے سب سے بڑا فتنہ ہے۔ اس کی ظاہری ٹیپ ٹاپ ایسی دلفریب ہے کہ بعض سادہ لوح اور حقیقتِ حال سے بے خبر مسلمان بری طرح اس کا شکار ہو جاتے ہیں مولانا نعمانی نے اسی کی قلمی کھولنے کے لیے یہ کتاب تصنیف کی ہے جس میں مذہبی اور سیاسی دونوں پہلوؤں سے اس تحریک کی رکاکت و مضرت پر تفصیلی اور مدلل بحث کی ہے اور خود بانی تحریک کے اقوال و افعال اور اُس کی تحریروں سے ثابت کیا ہے کہ اس تحریک کی بنیاد منسطف، کمزور، بھوٹ، دروغ گوئیوں، اور تہمت تراشیوں پر قائم ہے جو نوجوان اس تحریک کے درزشی اور نام نہاد تنظیمی پروگرام سے مرعوب ہیں انہیں اس کتاب کے مطالعہ سے وضع ہوگا کہ خاکسار تحریک گویا ہر جموں کو موزوں اور مضبوط بنانا چاہتی ہے مگر دراصل وہ اسلامی روح کو درپردہ کس طرح مضمحل کر کے اس میں زہریلے جراثیم پیدا کر رہی ہے۔ خاکسار تحریک کے اس شور و غل کے زمانہ میں مسلمان کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا ضروری اور از بس مفید ہوگا۔

**حج کی کتاب** | از مولانا محمد صدیق صاحب نجیب آبادی۔ پاکٹ سائز ضخامت ۲۸ صفحات

کتابت طباعت اور کاغذ متوسط۔ مدرسہ صدیقیہ پھانک جیش خاں دہلی سے مفت ملتی ہے۔ بیرونی اصحاب کو محضوں ڈک بھیجا چاہیے۔ اس کتاب میں حج عمرہ اور زیارت مدینہ طیبہ کے ضروری

در صحیح سند مع ماثرہ دعاؤں اور ادراج و عمرہ کی ترکیبوں کے عام فہم اور سلیس زبان میں لکھے گئے ہیں حاجیوں کے لیے اس کتاب کو اپنے ساتھ رکھنا فائدہ مند ہوگا۔

**برگ سبز** | تالیف خواجہ احمد الدین صاحب امرتسری۔ تقطیع ۲۰/۳۰ صفحات ۲۸۔ کتابت طباعت متوسط قیمت ۲ روپے :- دفتر امت مسلمہ امرتسر۔

امرتسر میں اہل قرآن کی ایک انجمن "امت مسلمہ" ہے، اس انجمن کا ماہوار رسالہ "البیان" کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب اسی رسالہ کے ستمبر نمبر کی جگہ شائع کی گئی ہے۔ یہ ٹریکٹ علم میراث پر ایک عقلی مقالہ کی حیثیت سے شائع کیا گیا ہے۔ تقریب کی سطروں میں ظاہر کیا گیا ہے کہ اس مضمون کا اصل مسودہ جناب حافظ محمد اسلم صاحب جیرا چوری کے پاس ۱۰ سال سے رکھا ہوا تھا، کیونکہ یہ مضمون دراصل حافظ صاحب موصوف ہی کی تحریک سے لکھا گیا تھا۔

مضمون کا عنوان اگرچہ "علم میراث پر ایک عقلی مقالہ" ہے تاہم جہاں تک بحثوں کی روح کا تعلق ہے وہ یہ ہے کہ جمہور امت نے مسائل میراث کو قرآن و سنت کی روشنی میں اب تک جس پنج سے سمجھا تھا وہ سزا سر غلط ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے "لوگوں کی عادت ہے کہ وہ صرف اپنے فرضی ذوی الفروض اور تعصبی عصباب اور وہی اولوالارحام کی من گھڑت اصطلاحات کو ہی اپنے دلائل بناتے ہیں" صفحہ ۳۳۔ دوسری جگہ ارشاد ہے "عصبات بھی جن کو صل حقداروں سے الگ نکال کر دیا جاتا ہے سزا پابا ہل ہیں" صفحہ ۳۰۔ ایک اور موقع پر تحریر ہے "پس ماں، باپ، بیٹیا وغیرہ سب اولوالارحام ہیں مگر لوگوں کی عام اصطلاح یہاں بھی الٹی ہے۔ ان کے نزدیک اولوالارحام وہ ہیں جو نہ ذوی الفروض ہوں اور نہ عصبات الخ" صفحہ ۳۷۔

غرض کہ تمام رسالہ اسی رنگ کے مناظر، حلوں، طعنوں اور تعلیوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہمارے خیال میں ایسے انداز تحریر کے لیے اس دور کے علمی اور سنجیدہ طبقوں میں کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ اختلافی مسائل

کے بجائے اگر بحث کا مرکز ان مسئلوں کو قرار دیا جاتا جن کی تشریح کے بعد میراث کے بظاہر بہت سے غیر معقول مسئلے عقل کی ترازو میں پورے اتر سکتے تو یہ خدمت یقیناً بہت زیادہ قابل قدر ہوتی۔ مثلاً یہ سوال اس زمانہ میں خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اسلام نے لڑکیوں کا ورثہ لڑکوں سے کم کیوں رکھا اس اصولی مسئلہ کی تفصیل اگر اس طرح کی جاتی کہ قدرت نے مرد پر مہر، نان و نفقہ، رہائش کے مکان، بچوں کی تعلیم و تربیت وغیرہ کی جو عظیم الشان ذمہ داریاں رکھی ہیں ان سب کو گراسے رکھا جائے تو صاف معلوم ہو جائے کہ میراث کے حق کی یہ زیادتی حقیقت میں زیادتی نہیں بلکہ قدرتی مساوات کی بہترین صورت ہے۔ تو یہ رسالہ اسلامی تعلیمات کے سمجھنے میں مدد دے سکتا تھا لیکن اس کے بمقابلہ ہاں کیا ہو؟ یہ ہے کہ پوتے بیٹوں کی طرح خدائے تعالیٰ کی نعمت میں "یعنی بیٹوں کی موجودگی میں پوتوں کو اسی طرح حق ملیگا جس طرح بیٹے ہونے کی صورت میں" جس طرح باپ کے ساتھ حقیقی اور پوری بھائی وارث نہیں ہو سکتے، اسی طرح ماں کے ساتھ حقیقی اور مادری بھائی حصہ نہیں پاسکتے جو اصحاب مناظرہ تحریریں پڑھنے کے عادی ہیں ان کے لیے اس رسالہ کا مطالعہ مفید ہو گا کیا بعید ہے اس مضمون کو پڑھ کر ان کی رگ حمیت بھی جوش میں آجائے، اور وہ مولف کے اس چیلنج کا جواب دے سکیں "جو صاحب کمترین کی تردید میں قلم اٹھائیں سپہ اسی طرح اپنے قواعد کو معقول اور با اصول ثابت کر لیں۔"

**موتی** از سید یوسف صاحب بخاری دہلوی۔ تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۰ صفحات۔ کتابت طباعت اور کاغذ بہتر قیمت ۱۲ روپے۔ مکتبہ جہاں نما اردو بازار جامع مسجد دہلی سید صاحب نے یہ کتاب سنہ ۱۳۳۵ھ میں لکھی تھی ملک میں عام پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی گئی تھی۔ اب اس کا دوسرا ڈیشن بڑی آب و تاب سرشائع ہوا ہے۔ اس میں ایک سو سترہ علمی، ادبی، معاشرتی، صنفی اور صنعتی و حرفتی عنوانات پر مشرق و مغرب کے مشہور فدا سلف و حکماء کے اقوال کا انتخاب درج کیا گیا ہے جس سے مختلف چیزوں کے متعلق مختلف حکماء



کے انکار و آراء ایک وقت پیش نظر ہو جاتے ہیں۔ زبان صاف اور سلیس ہے۔ شروع میں فاضل مصنف نے فلسفہ اقوال پر ایک فصلانہ مقدمہ لکھ کر اس کتاب کی اہمیت کو اور وقیع بنا دیا ہے، رد و رد انگریزی کے متعدد اخباروں، رسالوں اور انشاپردازوں کی آراء بھی اس ڈیٹیشن میں شامل کر دی گئی ہیں۔ لیکن جناب مؤلف کا فلو جس لباس میں ہے اُس سے شبہ ہوتا ہے کہ غالباً وہ مشرقیت کے مقابلہ میں مغربی تعلف سے زیادہ مرعوب ہیں۔

## بہشتی زیور مل و مکمل و رشی بجا نشیہ جدیدہ کا بہترین ایڈیشن

عربی عبارتوں حوالوں اور قدیم و جدید ضمیموں کا ہمیشہ مجبوعہ

تصدیق فرمودہ حضرات علماء دیوبند

جہں تک کتاب کی تسہیل، ترتیب کی دلنشینی اور کتابت و طباعت کی عمرگی کا غلق ہی پورے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ اب تک بہشتی زیور کا کوئی ایڈیشن اس پایہ کا شائع نہیں ہوا۔ تحشیہ فی ص طور پر بعض ذمہ دار حضرات علماء دیوبند سے کرایا گیا ہے۔ تصحیح کے اہتمام میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا۔ تمام مسائل کے صحیح ماخذ عربی عبارات اور حضرت مؤلف مدظلہ العالی کے بعض نہایت ہی ہم در جدید اضافات و فوائد کو قابل رد کتابت کے ساتھ مزین کیا گیا ہے۔ اور ب یہ کنا بالکل بجا ہے کہ بہشتی زیور یک علمی، مذہبی، نقی اضافی، اقتصادی و طبی معلومات کا عجیب و غریب بکہ راثانی ذخیرہ بن گیا ہے جس سے ہر سلمان مرد و عورت گھر بیٹھے ایک زبردست اور جامع معلومات عالم کا کام سے سکتا ہے۔ کتاب کا طبی حصہ، ورمیات کا بیان اس قدر مفید ہے کہ اسے پڑھ کر شخص اچھا خاصہ طبیب اور عامل بن سکتا ہے اور اس پر بچوں کا خودی علاج کر سکتی ہیں۔

نیچر مکتبہ برہان۔ قروں باغ۔ نئی دہلی

قیمت قسم اول سے، قسم دوم سے۔

# قرآن مجید کی مکمل ڈکشنری

دو سو سے پہلی کتاب ہیں جس میں قرآن مجید کے تمام لفظوں کو بہت ہی سہل و روشن ترتیب کے ساتھ جمع کیا گیا ہے۔

کے ساتھ ہر لفظ کی سہل و سہج تشریح بھی کی گئی ہے۔ یہ کتاب بے مبالغہ ہو کہ لغت قرآن پر دو زبان میں اب تک ایسی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ کتاب عام پڑھنے لکھنے والوں کے علاوہ انگریزی دان اصحاب کے لیے خاص طور پر مفید ہے۔

میں مکتبہ برائ دہلی

## مذہب اور سیاست کا آئینہ

اسلام کا دینی فلسفہ اسلامیہ کا خادم آزادی کا علمبردار اور بلند پایہ

صحافت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

بہر جماعت کے اپنے کاموں کی عکسین اور غلط روی پر برہنہ شمشیر بن کر  
کلمہ پیمانی کرتا ہے۔

عربی اخبارات کی اہم خبریں ہندوستان میں سب سے پہلے شائع کرتا ہے۔

گفتار کی تہائی۔ ذاتی مناقشات اور انفرادی جھگڑوں سے پرہیز کرتا ہے۔

ہر مسئلہ پر پُر مغز مقالات، پختہ خیالات اور لطیف فکارات پیش کرتا ہے۔

اس کا مسلسل مطالعہ آپ کو دین کا پر جوش حامی، اسلام کا سچا پی

سیاست کا مبصر اور فہم و فراست کا مالک بنا دیتا ہے۔

ہفتہ میں دو بار ٹھیک وقت پر شائع ہوتا ہے

آج ہی پتہ ذیل پر ایک کارڈ لکھ کر نمونہ مفت طلب کیجئے

تشریح چند اخبار

سب لائن بچہ روپے ۵

شستہ سہ ماہی ساڑھے تین روپے ۵

سہ ماہی دو روپے ۵

برما کیلئے

سالانہ آٹھ روپے ۵

شستہ سہ ماہی ساڑھے چار روپے ۵

نوٹ: مندرجہ بالا تمام قیمتیں نقد پر ہوتی ہیں۔

میں مکتبہ برائ دہلی

# چند اہم کتابیں

**نقوس سیامانی** | ہندوستان کے بانیہ ازادیب و مفکر علامہ سید سلیمان ندوی کی تازہ ترین، اہم کتاب۔ علامہ موصوف نے ہندوستانی زبان و ادب کے متعلق اب تک جتنی تقریریں اور خطبے دیے ہیں ان سب کو اس مجموعہ میں جمع کر دیا گیا ہے۔ ہندوستان میں ہندوستانی، ہماری زبان کا نام اور ہماری زبان میں مسیویں صدی میں، اردو انسائیکلو پیڈیا، زبان اردو کی ترقی کا مسئلہ وغیرہ جیسے اہم عنوانات پر اس مجموعہ میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کی گئی ہے قیمت مجموعہ سے یورپ کی حکومتیں | مصنفہ نجم الدین جعفری بی سے ایل ایل ڈی و مظہر نفیری بی سے رازن ہندوستان میں سیاسی بیداری بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے اور ہر خواص عوام ایسے سیاسی لٹریچر تلاش میں رہتی ہیں جو ان کی سیاسی تربیت کر سکیں جو بجاۓ خود اختیاری اور فیڈریشن سکیم سامنے ہوتے ہوئے ہندوستانیوں کو یورپ کی حکومتوں کے طرز حکمرانی سے باخبر ہونے کی سخت ضرورت ہے۔ اس کتاب میں برہانینہ فرانس، ٹی، سوئٹزر لینڈ اور جرمنی کے نظام حکومت پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ ہر ملک میں حکومت کے مختلف شعبے کس طرح زرائع حکمرانی سے عہدہ براہوتے ہیں۔ ہر ملک کے تذکرہ حالات سے پہلے اس کی سیاسی ارتقا کی تاریخ بھی بیان کر دی گئی ہے۔ ضخامت ۲۲۵ صفحات، مجلد نمبر ۱۔

**معابدہ عمرانی** | انڈین ٹراک روسو۔ مترجمہ ڈاکٹر محمد حسین خان صاحب بی سے (جامعہ ایم سے پی ایچ ڈی) (ایڈیٹر برگ، حریت، اخوت اور مساوات جس کا روحانی پیام دنیا کو اسلام نے پہنچایا تھا اس کی سیاسی تبلیغ یورپ میں روسو کے معابدہ عمرانی نے کی۔ روسو کا کمال یہ ہے کہ اس نے بہت مدت دن کے دقیق مسائل باتوں باتوں میں سمجھ دیے ہیں۔ اس کی یہ کتاب جو معنوی حیثیت سے فلسفہ سیاست کی اہم کتاب ہے زبان اور طرز بیان کے لحاظ سے سہل ہے قیمت مجلد نمبر ۱۔

**پستالوزی** | از ڈاکٹر قاضی عبد العزیز صاحب بی سے (جامعہ ایم سے پی ایچ ڈی) (برلن، جس طرح یورپ کے عہد جدید میں کوئیس نے جغرافیہ کا نقشہ اور کانٹ نے فلسفہ کا استیلا کر دیا، اسی طرح پستالوزی نے تعلیم کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اس کتاب میں پستالوزی کی زندگی، اس کے فلسفہ تمدن، اس کے تعلیمی نظریے اور تعلیمی کارنامے اور ان کی تفصیل سب زبان اور دلکش انداز بیان میں ملاحظہ فرمائیے۔ قیمت مجلد نمبر ۱۔

صدر دفتر :- مکتبہ جامعہ۔ نئی دہلی مقامی شاخ :- جامع مسجد دہلی

دیگر شاخیں :- ۱۔ لاہوری دروازہ۔ لاہور۔ ۲۔ امین آباد۔ لکھنؤ

۳۔ پرنسپلنگ سب سے ہسپتال۔ بمبئی ۴۔



# ہندوستان کا مشہور ترین

خالص ادبی، علمی، فنی اور اصلاحی

## ماہنامہ شاعر اگر

اگر آپ اردو میں اجتہاد، اختراع، علو اور بلندی، محو تنقیدیں، بلند پایہ، ادبی، تاریخی، اصلاحی مضامین، ادب میں اصنافِ خیر، میحانِ انجیر، رُوح کو تریا دینے والی نظمیں، دھچپ اور تہریر متزل جلتے وٹے افسانے، صنفِ نازک کے آزادانہ خیالات و رجحانات اور ہندوستان کے تمام واقعی شعرا کا تازہ ترین کلام دیکھنا چاہتے ہیں، تو آج ہی ماہنامہ شاعر اگر کے خریدار ہو جائیے جو جس سال سے اردو کی بیش بہا خدمات انجام دے رہا ہے اور جس کا ہر پرچہ ادب کا ایک شاہکار ہوتا ہے۔ یہ صرف "شاعر" کے معیار اور حسن مضامین کی وجہ سے کہ نمونہ دیکھنے کے بعد کوئی صاحبِ ذوق اس کا خریدار ہوئے بغیر نہیں ہو سکتا۔ لکھائی چھپائی کا عمدہ ترین قیمت سالانہ تھے، نمونہ فی پرچہ ۴۔

نو کا پتہ:- مینجر "شاعر" قصر الادب اگر

# رسالہ "تصویر" رامپور

ایک کم قیمت، ماہنامہ ہے۔ لیکن اس میں ہندوستان کے مقتدر ادیبوں کے مضامین درج ہوتے ہیں۔ "تصویر" کی ضخامت ہر ماہ ۸۰ صفحات ہوتی ہے۔ "تصویر" سال میں ایک خاص نمبر مفت پیش کرتا ہے۔

"تصویر" کے افسانے، غزلیں، نظمیں، اور تاریخی مضامین پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ "تصویر" ہر اعتبار سے لا جواب ہے۔

"تصویر" کی یہ خود پرستی نہیں بلکہ حق پرستی ہے کہ (۱۰۰۰) سالانہ صفحات کے مقابلہ میں اس کا دو روپیے چار آنہ سالانہ چندہ کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتا اگر آپ نے

اب تک بھی اس کی خریداری قبول نہیں فرمائی ہے تو اب پہلی فرصت میں خریداری کا آرڈر دیجئے۔ اس کے مطالعہ سے آپ مسرت انگیز کیفیات محسوس کریں گے

پتہ:- دفتر رسالہ "تصویر" رامپور اسٹیٹ یو پی



# قواعد

(۱) ہر انگریزی مہینہ کی ۵ تاریخ کو مندرجہ ذیل ہو جائے گی۔

(۲) مذہبی، تعلیمی، تحقیقی، اخلاقی معنائیں بشمول مسکدہ و سیکرڈریز کے معیار پر پورے نہیں اُتریں اور ان میں شائع کیے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاک خانوں میں مندرجہ ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ تاریخ تک دفتر کو حذر دے دیں۔ ان کی خدمت میں رسالہ دوپہر دو بجت ہی بھیجا جائیگا۔ اس کے بعد تکایت قابل عمل نہیں سمجھی جائیگی۔

(۴) جب صاحب مور کے لیے آرکائیو یا جوابی کارڈ بھیجنے ضروری ہے۔

(۵) جرائد کی صورت کہ جسے ہم سنی صفحہ پر درج ۶۰۰ صفحے پر نہ ہوتی ہے۔

(۶) قیمت سامانہ پانچ روپے۔ پیشکش ہی دو روپے یا آٹھ روپے (مع محصول ڈاک) لی پر پھر ۸

(۷) سنی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھیے۔



ندوة المصنفین دہلی کا ماہوار رسالہ

# برہان

مرتبہ  
سعید احمد کبر آبادی  
ایم کے۔ فارمیل دیوبند

# ندوة المصنفین کی کتابیں

## الرق فی الاسلام

### اسلام میں غلامی کی حقیقت

تالیف مولانا سعید احمد اکبر۔ اسے مدتیہ برہان

کتاب کے اس حصے میں غلامی کی حقیقت، اس کے تصدیقی، اخلاقی اور نفسی پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد بتایا گیا ہے کہ غلامی انسانوں کے خیر و فخر و خوشی کی تباہ کن چیز ہے۔ اسلام سے پہلے کن کن قوموں میں یہ رواج پایا جاتا تھا اور اس کی صورتیں کیا تھیں، عام نے اس میں کیا اصلاحیں کیں اور ان اصلاحوں کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا نیز مشہور مصنفین یورپ کے یہاں تدریس کی جاکت خیر اجتماعی غلامی پر مبسوط تبصرو کیا گیا ہے۔

یورپ کے رابن تائیل و تبلیغ نے اسلامی تعلیمات کو بدنام کرنے کے لیے جن حربوں کو کام لیا ہے ان تمام حربوں میں سیوری کا مسند بہت ہی موثر ثابت ہوا ہے۔ یورپ امریکہ کے علمی و تبلیغی حلقوں میں اس کا مخصوص طور پر چرچا ہوا اور بد بد ترقی یافتہ ممالک میں اس مسئلے میں غلط فہمی کی وجہ سے اسلامی تبلیغ کے لیے بڑی رکاوٹ ہو رہی ہے، بلکہ مغربی قہر و غلبہ کے باعث مسلمانوں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس کا اثر پذیر ہے۔ انش و جدید کے قالب میں اگر آپ اس باب میں اسلامی نقطہ نظر کے ماتحت ایک محققانہ و یگانہ بحث دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ضرور دیکھیے۔ مجدد سے غیر مجملہ بخار

## تعلیمات اسلام اور مسیحی قوم

تالیف مولانا محمد طیب صاحب مستم دار العلوم دیوبند فقیہ اعزازی

مولف نے اس کتاب میں مغربی تہذیب تمدن کی ظاہر آرائیوں کے مقابل میں اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کو ایک نئے منصفانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ تعلیمات اسلامی کی جامعیت پر بحث کرتے ہوئے دلائل و دلائل کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ موجودہ عیسائی قوموں کی ترقی یافتہ ذہنیت کی مادی جدت طرازیوں اسلامی تعلیمات ہی کے ذریعے ہی حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ اسی کے ساتھ موجودہ تمدن کے انجام پر بھی بحث کی گئی ہے اور یہ کہ آج کی ترقی یافتہ عیسائی قومیں آئندہ کس نقطہ پر ٹھہرنے والی ہیں۔ کتاب کے علاوہ بہت سے مختلف ضمنی مباحث آگئے ہیں جن کا اندازہ کتاب کے مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ کتاب کا قیمت تقریباً ۵، ۶ قیمت غیر مجملہ عامہ سنہری جلد پکار

# بُرْہان

شمارہ ۴

جلد چہارم

ربیع الاول ۱۳۵۹ھ مطابق اپریل ۱۹۴۰ء

## فہرست مضامین

۲۴۲	سعید احمد	۱۔ نظریات
۲۴۹	"	۲۔ عبداللہ بن مبارک
۲۶۱	مولانا حفص الرحمن صاحب بیولہ روی	۳۔ معاہدہ یہود علی نقطہ نظر سے
۲۹۱	قاضی عبدالصمد صاحب صا ر م	۴۔ جمع قرآن پر ایک نظر
۳۰۱	" ز "	۵۔ تحفہ ترجمہ "اسوۂ حسنہ"
۳۰۵	جناب احسان دانش، جناب نبال بیولہ روی	۶۔ ادبیات
۳۰۸	" س "	۷۔ شئون علمیہ
۳۱۳	" س " " م "	۸۔ تبصرے



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

# نظرات

## خواتین اسلام کی بیداری

آج ہر طرف ایک شور و غل مچا ہوا ہے کہ اب مسلمان خواتین کی حالت وہ نہیں رہی جو پہلے تھی۔ ان میں جہالت اور رسوم پرستی منقرض ہوتی جاتی ہے اور اس کی بجائے علم و ادب کی روشنی، روشن دماغی اور آزاد خیالی کی حرارت پیدا ہو رہی ہے۔ اس حالت کی تبدیلی پر یہ ظاہر مرد بھی خوش ہیں اور عورتیں بھی مسرور، لیکن یہ کوئی نہیں دیکھتا، اس پر کوئی غور نہیں کرے کہ مسلمان خواتین کی بیداری واقعی اور اصلی بیداری ہے یا یہ ہلاکت و تباہی کا پیغام ہے! کوئی پوچھے آج کل مسلمان خواتین کی بیداری کی پہچان کیا ہے؟ نو اس کا جواب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے سیاسی جلسوں کے پلیٹ فارموں پر نظر نہیں آتی تھیں، سیرگاہوں میں انہیں کوئی نہ عجباب دے بے نقاب مصروف گلشن خرامی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ تھیں وہ سینماؤں میں وہ انہیں در انہوں نے نظر نہ آتی تھیں، اجانب و اغیار کی محفلوں میں انہیں بیا کا ذب کشائی کرتے ہوئے مجھک محسوس ہوتی تھی۔ کاجوں اور اسکولوں میں ان کی چل پہل نہ تھی۔ اخباروں میں ان کے نوٹڈ شائع نہ ہوتے تھے۔ ادبی رسالوں میں ان کی قلمی شوخ نگاریاں پڑھنے والوں کے دل و دماغ پر برقی پاشی نہ کرتی تھیں۔ وہ صرف گھر کی ملکہ ہو کر رہنا جانتی تھیں! انہیں اپنے کمارت نسوانی کی جلوہ گاہ بنانے کے لیے گھر سے باہر کسی اور میدان کی جستجو نہ تھی۔ لیکن آج حالات نے پٹا کھایا ہے، زمانہ آزادی کا ہے، مذہب و اخلاق کی قید و بند ہی کوئی برداشت

نہیں کر سکتا ہے تو عورتیں ہی کیوں گھروں میں بند ہو کر رہیں وہ بھی آخر مردوں کی طرح انسان ہیں انہیں بھی حق ہے کہ گلزارِ بہت و بود کا ایک ایک پھول بہ نظرِ عین دیکھیں اُس کی مست کُن بو سے قوتِ شامہ کی تواضع کریں، اور اُن عالمِ ہمہ تن ایک میکہ شعرِ موسیقی ہے، عورتوں کو بھی نظرۃً یہ حق ہونا چاہیے کہ اُس کے نغمائے ساموہ نواز سے کیفیت و سرور حاصل کریں۔ ان خیالات کی پختگی کا نتیجہ یہ ہے کہ اب وہ ”دورِ محمود و جیل“ خوب پریشاں ہو کر نکلا ہوں سے غائب ہوتا جا رہا ہے۔ اور بیداری کا اثر جتنا جتنا غالب ہوتا جاتا ہے عہدِ حریت و آزادی کے اثرات زیادہ نمایاں ہوتے جا رہے ہیں۔ آج مسلمان عورت کو تنگ خیالی و تنگ نظری کا طعنہ کون دے سکتا ہے! اب پیٹ فارمل پر اُن کی ”دھواں دھار“ تقریریں ہوتی ہیں، اور پس پردہ نہیں بلکہ کھلے اسٹیج پر سب کے سامنے کاجوں کی رونق اُن کے دم سے ہے۔ گلوں میں اُن کی خوش باغلاتی اور خوش تقریری کے چرچے ہیں۔ سینماؤں اور ٹیلیوژنوں کے دیکھنے کا کیا ذکر، انگلیڈ کے سابق وزیرِ اعظم کی لڑکی یا ہولم بکرمیں ہو سکتی ہے تو شریف گھرانوں کی تعلیم یافتہ مسلمان خواتین اس فخر سے کیوں محروم رہیں ناچ گھروں میں انہیں نہ کیا جاسکتا ہے۔ پارکوں میں وہ نہایت بیا کی اور دیدہ دلیری کے ساتھ خرام کرتی ہوئی نظر آ سکتی ہیں فوٹو اُن کے چھپتے ہیں، مشاعروں میں شوخ غزلیں وہ سناتی ہیں۔ غرض یہ ہے کہ تَن مسلمان خواتین موجودہ تہذیب و تمدن کی اُن تمام نعمتوں سے بہرہ اندوز ہو رہی ہیں جو اب تک صرف خواتینِ تنگ کا حصہ تھیں یا کچھ تھوڑا بہت اُن کا اثر ہندو خواتین میں بھی پایا جاتا تھا۔ اُن نے اپنا اپنا حصہ اسلام کی بیداری!



اس میں شبہ نہیں اس دورِ تفرنج میں بھی ایسی نیک دل مسلمان خواتین کی کمی نہیں ہے جو واقعی ”آئیڈیل مسلم خاتون“ کہی جاسکتی ہیں۔ اور جنہیں صحیح معنی میں بیدار دل و بیدار مغز کہا جاسکتا ہے۔

لیکن مشکل یہ ہے ان غریبوں کو مسلمان خواتین کی نمائندگی حاصل نہیں۔ وہ گوشہ گنمی میں پڑی ہوئی ہیں اور انہیں مسلم سوسائٹی میں کوئی وقیع درجہ میر نہیں۔ جب کبھی مسلمان خواتین کی بیداری کا ذکر کیا جاتا ہے تو مثال میں وہ خواتین پیش کی جاتی ہیں جو مسلمان ہونے کے باوجود جدید تہذیب تمدن کی خصوصیات سے پورے طور پر بہرہ مند ہو رہی ہیں، اور جن کے حسن بھجواب کا شہرہ ہندوستان کی حدود سے گذر کر امریکہ و یورپ تک پہنچ چکا ہے۔ اس بنا پر نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ آپ کے نزدیک مسلمان خواتین کی بیداری کا مفہوم اس سے زیادہ نہیں ہے کہ وہ اسلامی وضع قطع، اسلامی آداب معاشرت، اور اسلامی طریقہ بود و ماند چھوڑ کر مغربیت کے رنگ میں رنگی جا رہی ہیں، اور ان کا سیدھا عمل درودن خانہ کے بجائے بیرون درختا جا رہا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ مسلم خواتین کی یہ حالت کیا واقعی ان کی بیداری کی دلیل ہے۔ کیا دراصل ان کی اس تبدیلی پر یہیں خوش ہونا چاہیے جیسا کہ عمر، آج کل کے مردانہ اور زنانہ جلسوں میں اس کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یا یہ صورت حال پوری قوم کی روحانی و اخلاقی موت کی نشانی ہے۔ اور اس لیے اس پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ بعض لوگ عورتوں کی حمایت میں تقریر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کبا عورتیں مردوں سے کم ہیں جو ایک چیز مرد کے لیے تو جائز ہو اور عورت کے لیے ناجائز۔ اس قسم کے صحاب کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارے نزدیک ضابطہ اخلاق و مذہب کی پابندی کے لحاظ سے مرد و عورت میں کوئی فرق نہیں ہے شریعت اسلام نے جن بُری باتوں کو مرد کے لیے ممنوع قرار دیا ہے وہ عورتوں کے لیے بھی ممنوع ہیں، اور جو افحاح سنہ مرد کے لیے مستحسن سمجھے گئے ہیں وہ عورتوں کے لیے بھی مستحسن ہیں۔ نہوٹ بونا، غیبت کرنا، شراب خوری، زنا کاری، غداری و بے وفائی کی حرمت میں مرد و عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ مرد کے لیے جس طرح اجنبی عورت پر بُری نگاہ ڈالنا حرام



ہے۔ عورت کے لیے بھی جائز نہیں کہ وہ کسی اجنبی مرد کو بڑی نیت سے دیکھے۔ یہی حال تعلیم اور معاشرت کا ہے۔ جدید تعلیم اپنے مخصوص ماحول اور نصاب کے ساتھ جس طرح مردوں کے لیے مضر ہے۔ عورتوں کے لیے بھی اتنی ہی بلکہ اُس سے زیادہ نقصان رساں ہے۔ اسی طرح مغربی معاشرت مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے تباہ کن ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ کثیر زیادہ اُجلا اور صاف ہوتا ہے تو ایک معمولی سادہ عورت بھی اُس میں بہت زیادہ نمایاں ہو کر اُس کی حیثیت کو بگاڑ دیتا ہے۔ عورت فطرۃً آئینہ تمثال ہے اور غالباً اسی بنا پر زبان نبوت نے اُس کو فتوا پر (آگینے) کہا ہے۔ اور اگر بڑی میں اُسے ”صنفِ لطیف“ (Fair Sex) کہا جاتا ہے۔ اس لیے اگر اُس میں ذرا سی بھی بد اخلاقی اور بد تمیزی پیدا ہوتی ہے تو وہ مردوں سے زیادہ اس کو بد نما کر دیتی ہے اور اُس کی اصلی شرافت و نجابت کو مسخ کر کے طبقہ اراذل میں شامل کر دیتی ہے۔

پس اگر کوئی مصلح یہ کہتا ہے کہ جدید تعلیم اور جدید تہذیب مسلمان عورتوں کے لیے زہرِ لہلہ ہے تو اُس کے معنی یہ ہرگز نہیں ہو سکتے کہ یہ چیزیں عورتوں کے لیے ممنوع اور مردوں کے لیے جائز ہیں اور نہ اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہو سکتا ہے کہ عورتیں مردوں سے کم مرتبہ اور اُن سے فروتر ہیں۔ اس عام مانعت میں مرد و عورت کے فرق راہِ امتیاز مراتب کا سواں، کھانا سراسر بے محل و بے موقع ہے

جہاں تک اصل تعلیم کا تعلق ہے اس سے کوئی سلیم الفطرت انسان انکار نہیں کر سکتا کہ وہ مرد و عورت دونوں کے لیے ضروری اور لازمی ہے۔ اسلام جو دینِ فطرت ہے وہ اس ضرورت سے کس طرح انکار کر سکتا تھا لیکن یہ ضرور ہے کہ تعلیم تعلیم کے مقصد کے ماتحت جو جس سے پاکیزہ اخلاق پیدا ہوں، اچھے بُرے کی تمیز ہو، زندگی کو کامیاب طریقہ سے بسر کرنے کی راہیں معلوم ہوں۔ اور جس سے

ایک انسان حقیقی انسانیت کے مرتبہ عظمیٰ سے شرف اندوز ہو سکے جو تعلیم اس مقصد کے حاصل کرنے کا قوی ذریعہ بن سکتی ہے وہی سچی اور اصلی تعلیم ہے اور اس کے امتحان و وجوب میں مرد و عورت کا کوئی فرق نہیں ہے۔ اس چونکہ تعلیم کا تعلق انسانی زندگی کے وظائف و اعمال سے ہے اس لیے تعلیم شروع کرنے سے قبل یہ معلوم کر لینا ضروری ہوگا کہ طبعی قوی، فطری استعداد، اور اسباب ممکنہ و حاصلہ کے اعتبار سے مرد کے وظائف زندگی کیا ہیں، اور عورت کے کیا! اگر آپ ان وظائف زندگی میں فرق و امتیاز نہیں کرتے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ آپ مرد اور عورت کے عورت ہونے سے نکار کر رہے ہیں، یہ انکار آپ کی فطرت، نشانی کی کھلی دلیل ہے اور اب اس انکار کی بنیاد پر آپ کے جتنے مطالبات اور دعاوی ہونگے وہ سب غلط اور بے بنیاد قرار دیے جائینگے۔ عورت اور مرد کا صنفی اختلاف و امتیاز تو بڑی چیز ہے آپ ایک صنف کے تمام افراد کے لیے یکساں حکم نہیں لگاتے۔ بہتر ہے بچے جو طبعاً صفت و حرمت کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ آپ تسلیم کرتے ہیں کہ ان سے لڑ بچہ میں علی مہارت و قابلیت کی توقع نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح جو بچہ فطرۃً لڑ بچہ کا ذوق رکھتے ہیں ان کو سائنس اور کیمیا کی، علی القیسم دانا، دقت کو بے کار اور ضائع کرنا ہی پس جب آپ خود مردوں کی صلاحیتوں اور استعدادوں کے اختلاف کو نظر انداز نہیں کر سکتے تو مرد و عورت کے صنفی اختلاف کو کس طرح نظر انداز کر سکتے ہیں۔

اسلام کا طرز تیار یہی ہے کہ اس نے کسی حالت میں بھی فطرت کی صحیح صلاحیتوں اور ان کے باہمی اختلاف کو ناقابل اعتدال قرار نہیں دیا۔ اسلامی نقطہ نظر کے ماتحت تعلیم جس طرح مرد کے لیے ضروری ہے اسی طرح عورت کے لیے بھی لیکن دونوں کی تعلیم کا مقصد جدا جدا ہے۔ مرد کی تعلیم کا مقصد ہے کہ وہ اپنے فرائض و وظائف زندگی سے واقفیت بہم پہنچائے۔ اور نہ صرف واقفیت بلکہ اس

میں اخلاق اور کیرکٹر کی ایسی مضبوطی پیدا ہو جائے کہ وہ بے تحلف اچھے اعمال کو اختیار اور برے اعمال کو ترک کر سکے۔ ٹھیک اسی طرح عورت کی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے وظائف و فرائض زندگی سے آگاہ ہو اور اُن کو صحیح طور پر بجالانے کی اخلاقی قوت اُس میں پیدا ہو جائے۔ اس مرحلہ پر ضروری ہے کہ آپ پہلے عورت کے فرائض و وظائفِ حیات کی تحقیق و متقاع کر لیں اور پھر اس کی روشنی میں اُن کے لیے ایک مکمل نصابِ تعلیم و طریقہ تعلیم کی تعیین کر دیں۔ یہ حقیقت فراموش نہ ہونی چاہیے کہ نصابِ تعلیم کی تعیین بھی ایک نہایت ضروری امر ہے، ورنہ اندیشہ ہے کہ طریقہ تعلیم کے ناقابلِ اطمینان ہونے کے باعث تعلیم پر ایسے نتائج مرتب ہو جائیں جو تعلیم کے مقاصد کے سراسر خلاف ہوں۔ اور بجائے کعبہ کی طرف رہنمائی کرنے کے ترکستان کی سمت لے جائیں۔

تھوڑی دیر کے لیے سنجیدگی اور متانت سے اس مختصر گزشتہ پر غور کیجیے اور پھر بتائیے کہ آج جو کچھ ہو رہا ہے کیا واقعی وہ مسلمان خواتین کی بیداری سے تعبیر کیے جانے کا مستحق ہے۔ مرد کی تعلیم کا مکمل یہ ہے کہ وہ بجا طور پر مردانہ اوصاف و شمائل سے آراستہ ہو۔ ٹھیک اسی طرح عورت کی تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ بالکل صحیح معنی میں مکمل عورت ہو۔ لیکن آج ہماری بچیوں کو انگریزی سکولوں اور کالجوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے کیا وہ اُن کی تکمیل نہایت کر سکتی ہے؟ نتائج ہائے سامنے ہیں، ہر شخص دیکھ رہا ہے کہ غصوں ماحول میں انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے جو اثرات لڑکیوں پر مترتب ہو رہے ہیں وہ اسلامیات اور شریعت تو کجا خود اُن کے جوہرِ نسائیت کو بُری طرح پا ل کر رہے ہیں۔ شاید لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ عورت و مرد کی اجتماعی زندگی کا دار و مدار صنفی جذب و انجذاب پر ہے، اور یہ جذب و انجذاب اُسی وقت باقی رہ سکتا ہے جب کہ صنفی اختلاف و تباہی کے مطابق دونوں کو ایک مخلوط سوسائٹی میں منظم نہ کیا جائے۔ ورنہ اگر مقناطیس لہے سے الگ اور دور نہیں ہے تو پھر نہ مقناطیس کی قوت جذب کا اظہار ہو سکتا ہے اور



نلوہے کی قوت الجذب کا۔ آج یورپ خانگی زندگی کے اعتبار سے جو بہ بدلتا حال ہے۔ غور کیا جائے تو اس کا محاسبہ یہی ہے کہ اس نے اس نفیاتی حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ اب وہاں عورت اور مرد دونوں اس طرح ملے جلے رہتے ہیں کہ دونوں صفتوں کا باہمی جذب و الجذب بالکل فنا ہو کر رہ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ میں اب مردوں کا ایک ایسا طبقہ بھی پیدا ہوتا جاتا ہے جو شادی کو انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اس طبقہ کا خیال ہے کہ شادی تو مرد کی عورت سے ہوتی ہے۔ اور جب عورتیں عورتیں ہی نہ رہیں تو پھر مرد شادی کس سے کریں۔ عورتوں کی اس آزادی مغرطہ کے باعث یورپ کے فلاسفہ عجیب غریب قسم کی خیالات رانیاں کر رہے ہیں۔ ایک فلسفی نے پنا خیال ظاہر کیا ہے کہ اب وہ زمانہ جلد آئیں گا جبکہ مردوں میں زمانہ اوجھٹ پیدا ہو جائیگا۔ یہاں تک کہ دائرہ بیاہن کی بجائے عورتوں کے نگہ کرنگی۔ سرس انگریزی میں جو اے دن معاشرتی نادرل درکت ہیں شائع ہوتی رہتی ہیں ان کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہو گا کہ تحریک آزادی نسواں کے باعث عورتوں کی آزادی مغرطہ کس طرح پورپ کے لیے وبال بنی ہوئی ہے۔



عربی کا ایک مقور ہے السعید من عطف لغيره۔ خوش نصیب وہ ہوتا ہے جو دوسروں کو دیکھ کر نصیحت حاصل کرے۔ تو کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ مسلمانوں کے ارباب فکر زہرادر ترقی میں اقیانوس پیدا کریں۔ آخر کیا غضب ہے کہ مسلمان خواتین منہ تعلیم، منہ تربیت، اور غلط طریقہ معاشرت کے اثر سے ہلاکت و بربادی کی طرقت تیزی سے روڑی میں آ رہی ہیں۔ اور اپنے ساتھ تمام قوم کی قومی نجات و شرافت کو غرق کبے دے رہی ہیں۔ لیکن پھر بھی آپ کی آنکھ میں سی دیکھیں کہ اس تبدیلی کو بیداری کی تعبیر کر رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مذہب کا سچا درویش منہ حضرت پورے جوش و خروش سے نہیں زندہ تعلیم کا پور نظام غیر اسلامی سیادت کے پنجہ کی کال کر اپنے قبضہ میں۔ مغرب زدہ خواتین کا جواب ان پر ڈھ اور جاہل خواتین نہیں ہو سکتیں، بلکہ ان کا صحیح جواب وہی خواتین مسلمان ہوتی ہیں جو اعلیٰ تعلیم کے ساتھ سدھی و صنع و قطع اور اسلامی طرز معاشرت کی پابند ہوں۔

# حضرت عبداللہ بن مبارک

ذیل کا مضمون ڈیڑھ سو سال کی نئی کتاب "غلام اسلام" سے ماخوذ ہے جو برلن سائنس کے تقریباً پانچ سو صفحات پر غریب "مذہب المصنفین" کی طرف سے شائع ہونے والی ہے۔ اس مضمون کو اصل کتاب کی نوعیت و کیفیت کا اندازہ ہو سکیگا۔

نام و نسب | ابو عبد الرحمن کنیت، عبد اللہ نام، والد کا نام مبارک تھا، جو بنو خنظلہ کے ایک شخص کے غلام تھے۔ مبارک اپنے آقا کے نہایت مطیع و فرمانبردار غلام اور پرہیزگار و متقی تھے۔ اور اس درجہ دیا نندار تھے کہ ایک عرصہ سے اپنے آقا کے باغ میں اس کی حفاظت کا کام کرتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ ترش اور شیریں انار میں امتیاز نہیں کر سکتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کے آقا نے ایک شیریں انار طلب کیا۔ انہوں نے ترش لیجا کر پیش کر دیا۔ اس کے بعد دو ایک مرتبہ پھر ایسا ہی ہوا، تو آقا کو غصہ آگیا اور کہنے لگا "مجھ کو ترش و شیریں انار کا بھی فرق معلوم نہیں" مبارک بولے "اے آقا نے کہا" بھلا یہ کس طرح ہو سکتا ہے" انہوں نے جواب دیا "میں نے کوئی انار کھایا تھا ورنہ یہ ہے جو مجھے ترش اور شیریں کی پہچان ہو" آقا نے کہا "تم نے کیوں اب تک کوئی انار نہیں کھایا" بولے "آپ نے مجھ کو اسکی اجازت کہاں دی جو میں کھانا" آقا نے اس بات کی تحقیق کی تو ثابت ہوا کہ مبارک نے جو کچھ کہا تھا درست تھا۔ اس شخص کو مبارک کی اس درجہ دینداری پر عظمت حیرت ہوئی۔ اور اس دن سے اس کو ان کے ساتھ ایک گرویدگی پیدا ہو گئی۔ اس کے ساتھ ایک اور واقعہ پیش آیا کہ مبارک کے آقا نے اپنی لڑکی کی شادی کرنی چاہی تو ان سے دریافت کیا "مبارک! میں اپنی بیٹی کی شادی کس سے کروں؟" انہوں نے کہا "عہد جاہلیت میں لوگ حسب کی تلاش کرتے تھے۔ یہودیوں کو داماد بنانے کے لیے مالدار کی جستجو ہوتی تھی اور

لیکن امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے نزدیک دیندار ہونا شرط شادی سمجھا جاتا ہے۔  
 مبارک کے آقا کو ان کا یہ جواب بہت پسند آیا اور اس نے اپنی بیوی سے کہا: میری بیٹی  
 کا شوہر بننے کے لئے مبارک سے زیادہ مناسب کوئی اور شخص نہیں ہے۔ آخر کار میاں بیوی  
 دونوں راضی ہو گئے اور اس لڑکی کی شادی مبارک سے کر دی گئی۔

دردت | حضرت عبداللہ اسی بیوی کے بطن سے مرد میں ششہ میں پیدا ہوئے اور اسی نسبت  
 سے ”مروزی“ کہلائے۔

تعلیم و تربیت | ایک دیندار گھرانہ میں پیدا ہونے کے باعث حضرت عبداللہ سے آثارِ کمال و ترقی  
 بچپن سے ہی ظاہر ہونے لگے تھے۔ انھیں طلبِ علم کا اتنا شوق تھا کہ کم عمری میں بھی اس مقصد کے  
 لئے سفر کرنے سے باز نہیں آتے تھے۔ امام احمد بن حنبل فرماتے تھے۔

”ابن مبارک کے زمانہ میں ان سے زیادہ طلبِ علم کرنے والا کوئی نہیں تھا۔“  
 ابواساتہ شہادت دیتے ہیں: ”میں نے دنیا میں عبداللہ بن مبارک سے زیادہ طلبِ علم  
 کا جذبہ رکھنے والا کوئی شخص نہیں دیکھا۔“ انھیں طلبِ علم کے شوق میں اپنی حیثیت کی بھی پروا نہیں  
 ہوتی تھی ہر چھوٹے اور بڑے سے علم حاصل کرتے تھے۔ تہذیب الاسلام ج ۱ ص ۲۸۶

علم و فضل | اس شوقِ ذوق اور محنت و جستجو کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں ہر علم و فن میں کمال حاصل ہو گیا  
 بڑے بڑے مہتممان کی جامعیت سلیم و فنون اور مہارت کا اعتراف کرتے تھے۔ حافظ ذہبی  
 فرماتے ہیں: ”بن مبارک امام حافظ اعلیٰ مدینہ شیخ الاسلام فخر المجاہدین قدوة الزہدین تھے۔“  
 عجلی انھیں جامعِ علم بتاتے ہیں۔ ابن حبان کہتے ہیں۔

۱۔ تذکرۃ الخلفاء جلد ۱ صفحہ ۲۵۳

۲۔ شذرات، باب جلد ۱ صفحہ ۲۹۶

۳۔ تذکرۃ الخلفاء جلد ۱ صفحہ ۲۵۳

۴۔ تہذیب التہذیب جلد ۵ صفحہ ۳۸۴



کَانَ فِيهِ خِصَالٌ لِمَنْ يَجْتَمِعُ فِي أَحَدٍ مِنْ أَهْلِ  
 الْعِلْمِ فِي زَمَانِهِ فِي الْكَادِ حُلَا<sup>۱</sup>  
 ابن مبارک میں بل علم کے لئے خصال جمع ہو گئے تھے  
 کہ ان کے زمانہ میں تمام روئے زمین پر کسی میں  
 مجتمع نہیں ہوئے تھے۔

امام نووی فرماتے ہیں ”عبد اللہ بن مبارک کی امامت و جلالت پر سب کا اتفاق ہو وہ ہم چیزوں  
 کے امام تھے ان کے ذکر سے رحمت نازل ہوتی تھی، دوران کی محبت کی وجہ سے بخشش کی توقع  
 کی جاتی تھی“ علامہ ابن سعد لکھتے ہیں ”ابن مبارک نے علم طلب کیا۔ روایات کثیرہ بیان کیں علم  
 کے مختلف ابواب و انواع پر بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ زہد میں اور ترغیب جہاد میں اشعار کہے  
 علم کثیر کی باعث کی۔ وہ محترم تھے۔ مقتدا ہجت۔ اور کثیر الحدیث تھے“

حدیث [حدیث ان کا فاضل فن تھا اس کے لئے انھوں نے شام۔ مصر۔ یمن۔ حجاز۔ و عراق کے  
 طویل و دشوار سفر کئے۔ اور اس زمانہ کے جلیل القدر ائمہ حدیث سے استفادہ کیا۔ چنانچہ ان کے  
 شیوخ کی فہرست بہت طویل ہے جس میں سے چند نام یہ ہیں۔

مشیرخ [سیمان النیسبی۔ سیمان الاعمش۔ حمید الطویل۔ عبد اللہ بن عون۔ یحییٰ بن سعید الانصاری  
 موسیٰ بن عقبہ۔ ابن جریج۔ مالک بن انس۔ سفیان الثوری۔ شعبہ۔ اوزاعی۔ ابو عوانہ۔ زہیر بن مہاذ  
 ہارت فن [ان اکابر امت کے فیض التفات اور خود اپنے ذاتی ذوق و شوق کے باعث عبد اللہ  
 ابن مبارک حدیث کے دریائے بکرا بن گئے۔ ان کی ہارت و امامت کی شہرت دور دور پہنچ  
 چکی تھی اور بعض وہ امام جن سے سماع حدیث کا اشتیاق ابن مبارک رکھتے تھے خود ان کی  
 حدیث سننے کے مشتاق رہتے تھے۔ احمد بن سنان کا بیان ہے ”عبد اللہ بن مبارک پہلی مرتبہ

۱۔ تہذیب الاسلام جلد ۵ صفحہ ۲۸۵

۲۔ تہذیب الاسلام جلد ۵ صفحہ ۳۸۶

۳۔ تاریخ خلیف بغدادی جلد ۱ صفحہ ۱۵۲

۴۔ تہذیب الاسلام جلد ۵ صفحہ ۲۸۶

حماد بن زید کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے پوچھا ”آپ کہاں سے آئے ہیں؟“ بولے  
 ”خراسان سے“ پوچھا ”خراسان کے کس شہر سے؟“ جواب دیا ”مرو سے“ پھر دریافت کیا  
 ”وہاں ایک شخص میں جن کا نام عبداللہ بن مبارک ہے، آپ انھیں بھی جانتے ہیں؟“ کہا ”ہاں  
 جانتا ہوں“ پوچھا ”وہ کس طرح ہیں؟“ بولے ”ابن مبارک ہی تو اس وقت آپ سے خطاب  
 کر رہا ہے۔“ حماد بن زید یہ سن کر قیاب ہو گئے ان کو سلام کیا اور مرجا گیا۔

ابن ہمدی کہتے تھے ”امہ چار ہیں امام الکبریٰ، حماد بن زید، اور ابن مبارک۔  
 شعیب بن حرب کا بیان ہے ”ابن مبارک جیسا کوئی شخص نہیں تھا“ شعبہ کا بیان ہے ”ہمارے  
 پاس ابن مبارک ایسا کوئی بزرگ نہیں آیا۔“ بواسطہ انھیں ”امیر المؤمنین فی الحدیث“  
 بتاتے ہیں۔ شعیب بن حرب نے ایک مرتبہ کیا ”میں نے ہر چند یہ چاہا کہ سال میں تین دن کے  
 لئے ابن مبارک جیسا بن جاؤں لیکن نہ بن سکا۔“

ایک مرتبہ یحییٰ بن معین کے سامنے کسی نے ابن مبارک کا ذکر کیا تو فرمایا ”سید من سادات  
 المسلمین“ تفصیل کہتے ہیں ”ب کتبہ کی قسم میری آنکھوں نے ابن مبارک جیسا کوئی شخص نہیں دیکھا۔“  
 صحابہ حدیث میں اگر کبھی اختلاف ہوتا تو ابن مبارک کی طرف رجوع کرتے تھے  
 فضائلہ نوی کہتے ہیں ”میں کوفہ کے علما حدیث کے پاس اٹھتا بیٹھتا تھا۔ ان حضرات میں  
 اگر کسی حدیث سے متعلق نزاع ہوتا تھا تو یہ کہتے تھے ”چلو حدیث کے اس طبیب کے پاس چلیں  
 اور اس حدیث کے بارہ میں پوچھیں۔ یہ طبیب عبداللہ بن مبارک تھے۔“

قوت حافظ | حدیث کے لئے قوت حافظ شرطِ اولین ہے عبداللہ بن مبارک کو قدرت نے اس

لئے تذکرۃ اصحاب جلد ۱ صفحہ ۲۵۴

لئے، یک خطیب بغدادی جلد ۱، صفحہ ۵۰

لئے، یک خطیب بغدادی جلد ۱ صفحہ ۱۵۶

لئے تذکرۃ اصحاب جلد ۱ صفحہ ۲۵۵

نمت سے بھی حصہ عطا فرمایا تھا۔ صخر حضرت عبداللہ بن مبارک کے ایک دوست تھے وہ بیان کرتے ہیں کہ بچپن میں ایک مرتبہ میں اور ابن مبارک دونوں ایک مقام سے گزر رہے تھے۔ وہاں دیکھا کہ ایک شخص خطبہ دے رہا ہے۔ خطبہ طویل تھا۔ ہم دونوں سنتے رہے۔ خطبہ کے ختم پر ابن مبارک بولے ”مجھ کو یہ خطبہ یاد ہو گیا ہے“ جماعت میں سے کسی شخص نے یہ فقرہ سن لیا۔ بولا اور اچھا سناؤ، ابن مبارک نے فوراً وہ خطبہ ازاد لے لیا آخر سنا دیا“

**احتیاط** | اس علم و فضل اور قوت حافظہ کے باوجود وہ محتاط اس قدر تھے کہ شخص حافظہ سے روایت نہیں کرتے تھے بلکہ کتاب دیکھ کر روایت کرتے تھے کسی نے اُن سے پوچھا ابو عبد اللہ الرحمن آپ احادیث یاد کرتے ہیں؟ ”یہ سنتے ہی رنگ بدل گیا۔ اور فرمایا میں نے کبھی کوئی حدیث یاد نہیں کی ہے میں کتاب اٹھاتا ہوں اور اس میں غور و غوض کرتا ہوں۔ پھر جو روایت مجھ کو پتہ ہوگی ہے وہ خود بخود دل میں بیٹھ جاتی ہے“

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں ”ابن مبارک صاحب حدیث اور حافظ حدیث تھے اور کتاب سے حدیث بیان کرتے تھے“ ابن معین کا بیان ہے کہ ”وہ شہادۃً اور ثبت فی الحدیث تھے، ان کی کتاب میں جو احادیث درج تھیں ان کی تعداد ۲۰ ہزار کے قریب تھی“

ابن مبارک نے اپنی کتاب میں منتخب احادیث کا ایک ایسا ذخیرہ جمع کیا تھا کہ جو روایت اس میں نہیں ملتی تھی لوگ اس سے مایوس ہو جاتے تھے۔

**حدیث سے شغف** | حدیث سے شغف کا یہ عالم تھا کہ علی بن الحسن بن شقیق کا بیان ہے کہ ”ایک مرتبہ سردی کی رات میں ابن مبارک غالباً غشاء کی ناز پڑھ کر مسجد سے نکل رہے تھے کہ دروازہ پر

۱۔ تاریخ خطیب بغدادی جلد ۱۰ صفحہ ۱۶۵

۱۔ خطیب بغدادی جلد ۱۰ صفحہ ۱۶۵ و ۱۶۶

۲۔ تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ صفحہ ۲۵۴

۳۔ تہذیب التہذیب جلد ۵ صفحہ ۳۸۵



مجھ سے ملاقات ہوئی اور یک حدیث پر گفتگو ہونے لگی۔ اس گفتگو میں اتنی طوالت ہوئی کہ فجر کی نماز کا وقت آگیا اور موزن نے اذان دینی شروع کر دی۔

اسی سخت بالحدیث کی وجہ سے وہ باہر کم نکلتے تھے زیادہ تر گھر ہی میں بیٹھے ہوئے احادیث و آثار کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ کسی نے پوچھا کہ آپ کو مکان میں تنہا بیٹھے رہنے سے دشت نہیں ہوتی؟ فرمایا: بھلا دشت مجھ کو کس طرح ہو سکتی ہے جبکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے ساتھ ہوتا ہوں۔

ابن سہب سے اجتناب | اہل رگوں کے سامنے حدیث روایت نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک ہاشمی شخص حضرت ابن مبارک کے پاس آیا اور روایت حدیث کی درخواست کی آپ نے انکار کر دیا۔ ہاشمی نے اپنے ملازم سے کہا: ”چلو“ اور سواری پر بیٹھ کر جانے لگا۔ ابن مبارک نے فوراً اٹھ کر رکاب تمام لی۔ ہاشمی بولا: ”ابن مبارک! آپ حدیث تو سناتے ہیں اور یوں میری رکاب تمام ہے میں“ فرمایا: ”میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ تمہارے لئے اپنے بدن کو ذلیل کر دوں۔ لیکن حدیث تمہاری خاطر ذلیل کرنا نہیں چاہتا۔“

اسناد کا اہتمام | روایت کے معاملہ میں اسناد کا بڑا اہتمام کرتے تھے: سیب بن واضح کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ لوگوں نے ابن مبارک سے دریافت کیا کہ ہم کس سے علم حاصل کریں؟ فرمایا: ”ان لوگوں سے جنہوں نے علم رض اللہ کے لئے طلب کیا ہو اور اسناد کے معاملہ میں سخت ہوں۔ کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کی ملاقات کسی ثلثہ سے ہوتی ہے۔ لیکن اس کی ملاقات غیر ثلثہ سے ہوتی ہے۔ روایت کر بیٹھتا ہے اور کبھی اس کے برعکس ہوتا ہے۔ روایت کا ثلثہ عن ثلثہ مردی ہونا ضروری ہے۔“

۱۔ تاریخ بغدادی جلد ۱۰ ص ۱۵۴

۲۔ ذکرہ الحفاظ جلد ۲ صفحہ ۲۵۵

۳۔ ذکرہ الحفاظ جلد ۲ صفحہ ۲۵۵

۴۔ ذکرہ الحفاظ جلد ۲ صفحہ ۲۵۵

فقہ فقہ میں بھی بڑا کمال رکھتے تھے حافظ ابن حجر - علامہ ذہبی - امام نووی - ابن عساکر - سب انکو "فقہہ کبیتے" ہیں۔ امام مالک فرماتے تھے "یہ ابن مبارک خراسان کے فقیہہ ہیں" ابن شماس کہتے تھے "میں نے سب سے بڑے فقیہہ کو دیکھا ہے اور سب سے بڑے مفتی کو بھی" اور سب سحر پاوہ قوی حافظہ رکھنے والے کو بھی۔ سب سے بڑے فقیہہ ابن مبارک ہیں۔"

حضرت عبداللہ بن مبارک کی موجودگی میں بڑے بڑے معتبر علماء و فقہاء مسلمہ ہمانے سے احتراز کرتے تھے۔ ایک دفعہ کسی شخص نے حضرت سفیان ثوری سے کوئی مسئلہ پوچھا تو آپ نے دریافت کیا کہ تم کہاں سے آئے ہو؟ "بولا" میں اہل مشرق میں سے ہوں۔" آپ نے فرمایا "کیا تمہارے پاس مشرق کا سب سے بڑا عالم نہیں ہے؟" اس شخص نے کہا "وہ کون ہیں؟" بولے "عبداللہ بن مبارک"۔ یہ سن کر سائل نے تعجب سے کہا "تو کیا ابن مبارک مشرق کے سب سے بڑے عالم ہیں؟" حضرت ثوری نے جواب دیا "ایک مشرق ہی کیا وہ تو مغرب کے بھی سب سے بڑے عالم ہیں۔"

حاجت ابن مبارک علمی و عملی کمالات کا ایک ایسا گلدستہ ہے۔ ابھارتے کہ ان کی جس کنجصلت کو دیکھا جاتا تھا جس طرح حیرت ہو کر رہ جاتی تھی اور بے ساختہ زبان سے یہ شعر نکل جاتا تھا۔  
 ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است  
 عموماً دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ ارباب درس و تدریس اور اصحاب علم و فضل ہوتے ہیں "بادہ مردانگن جنگ" کے حریف بننے کی تاب ان میں کم ہوتی ہے "اور جو لوگ کتاب بینی میں زیادہ وقت گزارتے ہیں ان کے گھوڑے میدان غزائیں سرپٹ نہیں دوڑتے۔ لیکن ابن مبارک کی ذات بیک وقت تمام علمی و عملی کمالات کی جامع تھی۔ عباس بن مصعب کہتے ہیں "ابن مبارک حدیث، فقہ، عربیت

ایام رجال، بہادری، سخاوت، تجارت، ہر دھرم و ہر مہر کی ان تمام کے جامع تھے۔ حسن بن عیسیٰ کا بیان ہے کہ: ایک دفعہ عبداللہ بن مبارک کے اصحاب جمع ہوئے اور انہوں نے کہا کہ: آؤ ابن مبارک کے خصائل و شمائل کو شمار کریں۔ چنانچہ انہوں نے بالاتفاق کہا ابن مبارک کی ذات ستوں صفات میں علم، فقہ، ادب، نحو، لغت، شعر، فصاحت، زہد، تقویٰ، خموشی، قیام سبیل، عبادت، حج، غزوہ، شہوری، شجاعت، سندسیتی و نمونندی، فضول اور لغو باتوں سے اجتناب، اپنے ساتھیوں سے اختلاف کم کرنا، یہ تمام صفات جمع تھیں۔ حافظ ذہبی بڑے پُر اشتیاق انداز میں لکھتے ہیں، فدا کی قسم! میں عبداللہ بن مبارک سے محبت فی شد کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ان کے ساتھ محبت رکھنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مجھ کو بھلائیوں عطا فرمائے گا کیونکہ اللہ نے انکو پرہیزگاری، عبادت، خلاص، جہاد، وسعت علم، پختہ یقینی، بہرہ دہی، ہمساری، مروت اور دوسری صفات حمیدہ سے متصف کیا ہے۔

ان کی اس شان جامعیت کے باعث ابواسحاق الفراء نے انھیں "امام مسلمین" کہتے تھے۔  
 موجودہ حالات | حضرت عبداللہ بن مبارک کے فضل و کمال کی شہرت دور دور پہنچ چکی تھی۔ لوگ ان کی زیارت و ملاقات کے لئے بے چینی کے ساتھ کسی مناسب موقع کے منتظر رہتے تھے عبدالرحمن بن یزید کا بیان ہے کہ ایک دفعہ امام اوزاعی نے ان سے پوچھا: تم لے کبھی عبداللہ بن مبارک کو بھی دیکھا ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ فرمایا:

وَرَأَيْتُهُ نَقَرَاتِ عَيْنَتِہٖ  
 اگر تم انھیں دیکھ لیتے تو تمہاری آنکھیں ٹھنڈی

۱۔ تہذیب التہذیب جلد ۵ صفحہ ۳۸۵

۲۔ تہذیب التہذیب جلد ۱ صفحہ ۲۰۵

۳۔ خطیب بغدادی جلد ۱ صفحہ ۱۶۳

۴۔ تذکرہ الخلفاء جلد ۱ صفحہ ۲۵۴

۵۔ خطیب بغدادی جلد ۱ صفحہ ۱۵۷



وہ جہم جاتے تھے رات مندوں اور عقیدت گساروں کا جھگڑا لگ جاتا تھا۔ ایک مرتبہ مشہور نبی  
 ضیفہ بن ریشید رقبہ میں فروکش تھا کہ سی انسا میں حضرت عبداللہ بن مبارک کے یہاں تشریف  
 لانے کی خبر پہنچی اس خبر کے مشہور ہوتے ہی لوگ بے تماشا دوڑ پڑے اور ایسی بھاگ دوڑ مچی کہ بہیروں  
 کی جوتیاں ٹوٹ گئیں۔ بہرہ روں آدمی استقبال کے لئے شہر سے باہر نکل پڑے تھے فضا پر غبار چھا  
 گیا۔ ریشید کی ایک حرم (ام ولد) نے محل کے برج پر سے جو یہ تماشا دیکھا تو پوچھا۔ یہ کیا معاملہ  
 ہے؟ حصرین نے کہا۔ خراسان کے ایک عالم جن کا نام عبداللہ بن مبارک ہے رقبہ آ رہے  
 ہیں۔ بولی۔ بخدا! بادشاہ تو یہ ہیں بھلا بارون کیا بادشاہ ہے جو پولیس اور سپاہیوں کے  
 بغیر لوگوں کو جمع کر ہی نہیں سکتا۔

جب حضرت عبداللہ بن مبارک مرو سے روانہ ہوئے تو اہل مرو کو آپ کی جدائی کا  
 سخت رنج و قلق ہوا۔ ایک شاعر نے ان لوگوں کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا

اذا سار غید اللہ من مریۃ  
 فقد سار منها نورها وجالھا  
 اذا ذکر الاحبار فی کل بلد  
 فہم اجمہ فیہا واستھلاھا

ترجمہ۔ جب اللہ کے وقت مرو سے روانہ ہوئے تو گویا مرو کا تمام نور و جمال وہاں سے  
 چلا گیا۔ ہر شہر کے بڑے بڑے علما کا اگر ذکر کیا جاتا تو وہ سب تارے ہو گئے دیے  
 ابن مبارک آپ ان میں ہیں کی طرح چمکتے ہوں گے۔

علاء میں وقعت عامۃ سانس کا کیا ذکر! بڑے بڑے مراد اور اساتذہ حدیث و فقہ ان کا غایت درجہ  
 احترام کرتے تھے اور ان کے استقبال و مشایعت کو اپنا فریضہ عقیدت مندی سمجھتے تھے۔ عبداللہ  
 بن منان کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن مبارک کہہ سے روانہ ہوئے تو سفیان بن عیینہ اور

فیصل بن عیاض اُن کی مشائیت کے لئے دو تک ساتھ گئے۔ ان میں سے ایک نے ابن مبارک کی طرف اشارہ کر کے کہا: ”یہ فقہ اہل مشرق ہیں۔“ دوسرے نے کہا: ”اور فقہ اہل مغرب بھی یہی بن یحییٰ الاندلسی کہتے ہیں۔“ ایک مرتبہ ہم امام مالک کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ابن مبارک آ گئے۔ انھوں نے شرکت مجلس کی اجازت چاہی۔ امام مالک نے اجازت دیدی۔ وہ تشریف لائے تو امام مالک نے اپنی طریشست کو بدل دیا اور حضرت ابن مبارک کو اپنے پاس بٹھایا۔ یحییٰ کا بیان ہے کہ امام مالک کسی شخص کے لئے بھی یہی مجلس میں تبدیلی پیدا نہیں کرتے تھے۔

حسن ادب | ابن مبارک حسن ادب کے جوہر سے بھی حصہ وافر رکھتے تھے۔ اُن کے سامنے اگر کوئی قرآن حدیث کرتا تھا تو وہ اس سے کسی عبارت کو دوبارہ نہیں پڑھتے تھے بلکہ خاموشی کے ساتھ سنتے رہتے تھے۔ ابن ہدی کا بیان ہے ابن مبارک آدب عند ذہن الثوری۔ ایک دفعہ امام مالک حدیث کا درس دے رہے تھے جس میں ابن مبارک بھی اتفاقاً شریک ہو گئے تھے۔ ایک تلمیذ قرأت کے ہوا تھا۔ اس درس میں متعدد مواقع پر امام مالک نے حضرت ابن مبارک سے بعض حدیثوں اور مسائل کی نسبت دریافت کیا کہ اُن کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں۔ وہ ازراہ حسن ادب چپکے چپکے جوابات دیتے رہے۔ امام مالک کو حضرت ابن مبارک کے اس ادب پر بڑا تعجب ہوا اور جب وہ چلے گئے تو فرمایا: ”ابن مبارک فحیہ خراسان تھے۔“

عبادت | ان علوی و خدائی کمالات کے ساتھ عبادت گزار بھی بہت تھے بنیم بن حاد کہتے ہیں: ”میں نے ابن مبارک سے زیادہ نہ تو کوئی مقلد دیکھا ہے ورنہ ان سے زیادہ کوئی عبادت گزار دیکھا۔“

تہذیب التہذیب جلد ۵ صفحہ ۳۸۹

تہذیب التہذیب جلد ۶ صفحہ ۳۵۶

تہذیب التہذیب جلد ۵ صفحہ ۳۹۰

تہذیب التہذیب جلد ۵ صفحہ ۳۵۵

تہذیب التہذیب جلد ۵ صفحہ ۳۵۵

خوف خدا | اُن پر خوف خدا کا غلبہ اس درجہ تھا کہ وہ ہرے متعلق احادیث یا آیات پڑھتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ وحی کے ہوئے ہیل میں لھکی بندھ جاتی تھی اور وہ بوسے پر بالکل کا در نہیں ہوتے مچھے۔

نصاحت | نصاحت کا کمال بھی اُن میں س قدر تھا کہ تمام علماء عصر اس کا اعتراف کرتے تھے۔ ابن جریرؒ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ میں نے ابن مبارک سے بڑا کوئی عراقی فصیح نہیں دیکھا۔<sup>۱</sup>  
شاعری | اپنے علمی و مذہبی مشاغل کے ساتھ کبھی کبھی شعر کہ لیا کرتے تھے لیکن ان میں عام شاعری سے لگ فکت و نصیحت کی باتیں بیان کرتے تھے۔ اُن کا نمونہ کلام یہ ہے۔

قد لفتح المرء حانوثاً لم تجر ہا وقد تحت لك الحانوت بالدين

بين الكاساطين حانوت بلا نطق بتناع بالدين اموال المساكين

صنوت دينت شھينا تصيد بها وليس لفلح اصحاب الشراھين<sup>۲</sup>

ترجمہ:- (۱) لوگ تجارت کے لئے دکانیں کھولتے ہیں لیکن تو نے دین کی دکان کھول رکھی ہے

(۲) بڑے بڑے ستونوں کے درمیان تیری دوکان ہے جو بند ہی نہیں ہوتی اور جس

کے ذریعہ دین کے سکینوں کے اصول خریدے جاتے ہیں۔

(۳) تو نے اسے دین فروش، اپنے دین کو شاہین بنا لیا ہے جس سے تو نکلا کرتا

پھرتا ہے اور ہاں! شاہین بازوگوں کی فلاح نہیں ہوتی۔

تجارت | نہایت خود داری کی وجہ سے وہ علم و زہد کو اپنا ذریعہ معاش بنانا نہایت میوہ خیال کرتے تھے۔ اس بنا پر ان کا ذریعہ معاش تجارت تھا اور اس میں ان کو جو نفع ہوتا تھا اس کا



اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ فضیل بن عیاض کی روایت کے مطابق وہ ایک لاکھ و چھ سالانہ  
فقر پر تقسیم کرتے تھے۔

تجارت کا مقصد۔ ایسے ان کی تجارت کا مقصد یہ رہا کہ اپنے سے پیش از پیش سامان  
آسائش فراہم کرنا نہیں تھا بلکہ وہ اس وقت کو چھی طرح بچھتے تھے کہ علم کی تحقیق وقت اس وقت تک  
نہیں ہوتی جب تک کہ صاحب علم کو اپنی سی معاشی ضرورت میں اپنا روزگار میں سے کسی کی طرف  
انتہائی مہذب و بیکار کسی فیسی شاعر کے کہتا ہے۔

مرا تجربہ معلوم گشت خرقاں کہ قدر مرد بجم ست و قدر علم بال  
در یک عربی شاعر کہتا ہے۔

ویرمیری بعقل المرء قللة مالہ وان کون سرئی من مراحا و احولا  
ترجمہ۔ کوئی شخص خود کو تنہی بڑا سرد۔ ویرمیر کرنے والا ہو سیکر گرد و قیل مال ہے تو ہوگ  
ت بات پر اس کی عقل کو بڑھ گاتے ہیں۔

پہلے ایک دفعہ فضیل نے ان سے دریافت کیا کہ آپ ہم کو تو زہد اور قوت لایوت پر  
تائید کا حکم کرتے ہیں مگر دیکھتے ہیں کہ آپ خود خرمان سے قیمتی قیمتی سامان تجارت  
میں ہیں، راستہ ہمد و حرام میں فروخت کرتے ہیں۔ آخر یہ کیوں ہے؟ فرمایا: اے ابوعلی!  
میں یہ نہ کہتا ہوں کہ مال کے ذریعہ اپنی برادریوں و رشتہ داروں کی مدد سے خدا کی  
عامت زیاہ و ست زیاہ و کردوں اور کہ میں خدا کا جو حق اپنے ذمہ واجب دیکھوں اس کی طرف  
سبقت رکھوں۔ مگر بسکوں فضیل نے کہا: ابن مبارک! سبحان اللہ! اس مقصد بیک کا  
کیا کٹ گریہ ہو سکتا ہے؟ اسی عام سببوں کی خیر خواہی و خیر اندیشی کی وجہ سے ابن ہدی

کہ کرتے تھے۔ میں نے اس بہت کا خیر خواہ بن مبارک سے زیادہ کوئی اور شخص نہیں دیکھا۔  
 علماء کی خدمت | حضرت ابن مبارک یوں تو اپنا تمام مال کاہاے خیر میں صرف کرتے تھے لیکن میں  
 و طلباء دین کی مالی خدمت کا خصوصیت سے بڑا اہتمام کرتے تھے۔ چنانچہ علی بن الحسن کا بیان ہے  
 کہ ایک مرتبہ عبداللہ بن مبارک نے فضیل بن عیاض سے جو ان کے تلمذ تھے فرمایا: اگر تم اور تمہارے  
 ساتھی نہ ہوتے تو میں تجارت نہ کرتا۔ بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے تھے کہ ابن مبارک خاص اپنے  
 اہل وطن پر اتنا مال تقسیم نہیں کرتے جتنا کہ وہ دوسرے شہروں میں تقسیم کرتے ہیں ابن مبارک  
 کو اس اعتراض کی خبر ہوئی تو انھوں نے فرمایا: میں جن علماء اور طلباء پر اپنا مال خرچ کرتا ہوں  
 میں جانتا ہوں کہ وہ کیسے اس باب فضل و صدق میں۔ ان لوگوں نے علم حدیث حاصل کیا، اور اس  
 میں پوری محنت و سعی سے کام لیا، لیکن ان کی ضرورتیں بھی وہی ہیں جو عام لوگوں کی ہوتی ہیں  
 اس لئے اگر ہم ان کو چھوڑ دیں تو یہ اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے میں گم جائیگے اور علم ضائع ہو جائیگا  
 اس کے برخلاف اگر ہم نے ان کو غنی کر دیا تو یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں علم کی اشاعت  
 کریں گے اور نبوت کے بعد میرے نزدیک اشاعت علم سے افضل کوئی چیز نہیں ہے۔  
 اس باب حوالہ کی امداد | علماء و طلباء کے علاوہ عام حاجت مند لوگوں کی امداد بھی بڑی فراخ و صلگی  
 سے کرتے تھے سلمہ بن سلیمان کا بیان ہے کہ ایک شخص عبداللہ بن مبارک کے پاس آیا در کہنے  
 لگا کہ میں مقروض ہوں آپ میری طرف سے قرض ادا کر دیجئے۔ آپ نے فوراً اپنے وکیل کو بلوایا  
 کہ اس شخص کا قرض ادا کر دیا جائے۔ یہ شخص خط لے کر وکیل کے پاس گیا تو اس نے پوچھا: تم نے  
 عبداللہ بن مبارک سے کتنی قسم طلب کی تھی؟ بولا سات سو درہم۔ اب اس وکیل نے حضرت

بن مبارک کو لکھا کہ یہ شخص تو سات سو درہم کا مقروض ہے اور سی کا آپ سے س نے مطالبہ کیا تھا۔  
لیکن آپ لکھتے ہیں کہ اس کو سات ہزار درہم دیے جائیں درآغا میکہ غلات بھی ختم ہو گئے ہیں۔  
بن مبارک نے جواب میں لکھا، اگر غلات ختم ہو گئے ہیں تو کیا مضائقہ ہے عمر بھی ایک دن یونہی ختم  
ہو جائے گی ب جو کچھ میرے قلم سے نکل گیا ہے تم اس پر عمل کرو۔

ایک اور واقعہ اس سے بھی زیادہ عجیب ہے محمد بن عیسیٰ کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن  
مبارک طرہوس بہت آتے جاتے تھے۔ راستہ میں رقبہ پڑتا تھا وہاں ایک سرائے میں قیام کرتے  
تھے یہاں ایک نوجوان تھا جو سرائے میں قیام کی مدت میں حضرت عبداللہ بن مبارک کی خدمت کرتا  
ان کی ضرورتوں کا خیال رکھتا تھا اور ان سے حدیث کا سنا کرتا تھا۔ ایک دفعہ اتفاق ایسا ہوا کہ  
ابن مبارک رقبہ کی سرائے میں حسب معمول قیام پذیر ہوئے تو آپ کو وہ نوجوان نہیں ملا۔ دریافت  
کرنے پر پتہ چلا کہ قرض کی وجہ سے گرفتار کر کے چل خانہ بھجوا گیا ہے۔ آپ نے پوچھا وہ کتنی رقم  
کا مقروض ہے؟ لوگوں نے بتایا دس ہزار درہم کا۔ آپ نے تلاش کے بعد صاحب قرض کو رات کے  
وقت بلایا اور کہا کہ تم اپنے دس ہزار درہم مجھ سے لے لو اور اس نوجوان کو رہا کر دو۔ یہ خطیر قسم ادا  
کرنے کے بعد حضرت بن مبارک شب میں ہی وہاں سے روانہ ہو گئے۔ وہ نوجوان رہا ہوا تو لوگوں  
نے اسے بتایا کہ حضرت ابن مبارک اس سرائے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اور اب تک وہ غائب  
دو تین منزل پہنچے ہونگے۔ یہ سن کر نوجوان بھاگا اور آخر کار دو تین منزل کی مسافت پر انھیں  
پایا۔ حضرت ابن مبارک نے اس نوجوان سے اس کا حال دریافت کیا تو اس نے کہا میں قید  
میں تھا کہ ایک شخص سرائے میں مقیم ہوا۔ اس نے میری طرف سے قرض ادا کر دیا۔ میں ہو گیا  
اور لطف یہ ہے کہ میں اس شخص کو جانتا بھی نہیں ہوں کہ کون ہے۔ درکہاں سے آیا تھا۔ راوی





چنانچہ اب آپ ان سے روپیہ پیسہ لے کر اس کو یک صندوق میں بند کر دیتے اور اسکو تسفل کر کے رکھ دیتے۔ اس کے بعد ان اصحاب کو لیکر مرد سے بعد آتے۔ اور راستہ میں ان پر خوب خرچ کرتے۔ بہترین کھانے کھلاتے اور راحت و آسائش کا عمدہ سے عمدہ سامان فراہم کرتے۔ بعد ازیں مدینہ طیبہ کے لئے روانہ ہوتے تو ان لوگوں کے واسطے، چمے اچھے کپڑے بھی سلواتے۔ غرض یہ ہے کہ مروکی واپسی تک حضرت عبداللہ بن مبارک ان لوگوں پر بڑی فراخوصلگی کے ساتھ اپنا روپیہ خرچ کرتے۔ یہاں آکر اپنے تمام حاجی دوستوں کے مکانات پر اس زمانہ کے حجاج کے قاعدہ کے مطابق سفیدی و دوسرے آرائش و زیبائش کے لوازم کراتے۔ تین دن کے بعد ان سب کی طرف سے ان کے احباب و اغرا کی نہایت مکلف دعوت کرتے۔ اور جب ان سب کاموں سے فارغ ہو جاتے تو صندوق کھول کر ہر ایک کی قبلی میں اس کا نام لکھا ہوتا تھا اس شخص کے سپرد کر دیتے تھے۔ اس طرح وہ اپنے تمام رفقا کے جملہ مصارف و اخراجات کفیل کرتے تھے یہاں تک کہ وطن کی واپسی کے وقت ان لوگوں کو اپنے ہاتھوں اور متبعین کے لئے کمرے جو تحائف خریدے ہوئے تھے ان کی قیمت بھی خواہی اور کرتے تھے۔

ان واقعات سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مبارک کس قدر ہر چشم فیاض، بامروت اور سخا تھے۔ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے دوستوں کے کس و بوجہ جاں نثار دوست تھے۔ چنانچہ وہ بسا اوقات یہ شعر پڑھتے تھے۔

وَإِذَا صَاحِبُكُمْ فَصَبِّحْهُ بِصَبْحَةٍ	وَإِذَا حَيَاءُ عِنْدَ غَضَبٍ فَكَرِّمْ
وَإِذَا لَلَّتْ لَلًّا أَوْ قُلْتُ لَلًّا	وَإِذَا قُلْتُ لَلًّا قَالُوا لَلًّا

یہ تین اشعار صحیح بخاری جلد ۱ ص ۱۵۰ سے، غرض میں۔

۱۵ تہذیب الاساء جلد ۱ ص ۲۸۵

ترجمہ:- اگر تم کسی کو دوست بناؤ تو ایسے شخص کو بناؤ جو باجیا ہو اور صاحبِ غفلت و کرم بھی ہو۔ اور جس کا یہ حال ہو کہ تم کسی چیز پر نہیں کہہ دو تو وہ بھی ”نہیں کہہ دے اور اگر تم “ہاں“ کر دو تو وہ بھی ”ہاں“ کہہ اٹھے۔

سلاطین کے سامنے اظہارِ حق | حضرت عبداللہ بن مبارک ان بزرگوں میں سے تھے جن کی نظریں جاہ و جلال خداوندی کے تصور سے ہر وقت روشن رہتی ہیں اور اس بنا پر وہ دنیا کے فائدہ جابر بادشاہوں کی صولت و شوکت سے ذرا مرعوب نہیں ہوتے۔ ابراہیم بن زوح موصلی کا بیان ہے کہ ہارون رشید بن زبیر نے حضرت ابن مبارک سے ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے کہا ”امیر المومنین! ابن مبارک خراسانی شخص ہیں۔ مجھ کو ڈر یہ ہے کہ کہیں وہ آپ سے ایسی باتیں نہ کریں جو آپ کو ناگوار گذریں اور جن سے متاثر ہو کر آپ انہیں قتل کرادیں۔ اگر خدا نخواستہ ایسا ہوا تو میں اپنے آپ کو بھی ہلاک کر دوں گا۔ اور عبداللہ بن مبارک اور امیر المومنین کی ہلاکت کا بھی سبب بنوں گا۔ ہارون رشید اس وقت تو خاموش ہو گیا چند روز کے بعد اس نے پھر ابن مبارک کو یاد کیا تو میں نے عرض کیا ”امیر المومنین! ابن مبارک سخت مزاج اور بے پڑا آدمی ہیں۔ ہارون پھر خاموش ہو گیا۔ لیکن اتفاقاً اس واقعہ کے تین دن بعد حضرت ابن مبارک خود ہی تشریف لے آئے۔ ان سے کسی نے پوچھا آپ پہلے تو ہارون کی ملاقات سے اجتناب کرتے تھے، اب آپ کیسے چلے آئے؟“ فرمایا میں اپنے دل کو موت پر راضی کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ نہیں ہوتا تھا۔ اب جبکہ وہ مرنے پر رضامند ہو گیا تو میں ہارون کے پاس چلا آیا۔“

طب | حضرت عبداللہ بن مبارک کے کمالات کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ اس سے طب کا فن تک خارج نہ تھا وہ اس میں بھی اربابِ فن کا سا کمال رکھتے تھے، ایک مرتبہ وہ حضرت سفیان ثوری



کے پاس تشریف لائے تو دیکھا کہ شدت کرب سے کراہ رہے ہیں پوچھا "کیا حال ہے؟" انہوں نے پنا مرض بیان کیا۔ حضرت ابن مبارک نے لوگوں سے اسی وقت پیاز کی ایک گنٹھی منگوائی۔ وہ آگنی تو آپ نے اُس کو پھاڑ کر حضرت ثوری سے کہا کہ "میں کو سو گئے" انہوں نے تھوڑی دیر اس کو ہونٹھا تھا کہ ایک چھینک آئی اور اس سے تمام کرب و اضطراب ختم ہو گیا۔ حضرت ثوری بولے "سبحان اللہ آپ فقیہ بھی ہیں اور طبیب بھی۔"

تواضع اور انکسار | ان غویوں کے باد صفت تواضع اور فروتنی اس قدر تھی کہ کبھی اپنی تعریف سننے کو ارا نہیں کرتے تھے۔ ابو الوہب المرزئی کہتے ہیں میں نے عبد اللہ بن مبارک سے پوچھا کہ تکبر کی تعریف کیا ہے؟ فرمایا "وہ یہ ہے کہ تم لوگوں کو حقیر سمجھو اور ان سے اس کی ترقی کرو کہ وہ تمہیں پسند کریں۔" بعد فرمایا "تکبر میں یہ بھی داخل ہے کہ تم اپنی کسی چیز کی نسبت یہ خیال کرو کہ یہ کسی اور کے پاس نہیں ہے۔"

شجاعت و بہادری جنگ | جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے حضرت عبد اللہ بن مبارک صرف صاحبِ ظم و فضل ہی نہیں تھے بلکہ انھیں فن سپہ گری میں بھی کمال حاصل تھا۔ عبد بن سیون المرزئی کا بیان ہے "ہم ایک تہرہ روم کی ایک مہم پر حضرت عبد اللہ بن مبارک کے ساتھ گئے وہاں دیکھا کہ فریقین کی صف آرائی کے بعد دشمن کی صف سے ایک بہادر نکلا اور اس نے لٹکار کر دعوتِ جنگ دی اُس کے جواب میں ہماری طرف سے بھی ایک بہادر بڑھا جس نے اپنے حریف کو قتل کر دیا اس کے بعد دشمن کی صف سے ایک اور جنگجو سپاہی نکلا اور ہماری فوج کے بہادر نے اس کا بھی کام تمام کر دیا۔ اب ہمارے بہادر نے گرج کر کہا کیا کوئی اور ہے جو مقابلہ کے لئے آئے؟ کچھ تامل کے بعد دشمن کی صف سے تیسرا جنگ زما بڑھا۔ تھوڑی دیر تک دونوں میں جنگ جوتی رہی۔ آخر کار ہماری فوج

کے، اس بہادر نے اس کے بھی اس زور سے نیرزار کر اس کا آتش زمین پر خاک و خون میں ٹپ رہا تھا، راوی کہتا ہے، اب ہم سب دوڑ پڑے اور اس شخص کو احاطہ کر لیا، اس نے آستین سے پناہ چھپا رکھا تھا، میں نے زور سے جھکاکے کر آستین منہ پر سے ہٹائی دیکھا کہ ہمارا یہ بہادر عبداللہ بن مبارک تھا، مجھ کو دیکھ کر فرمانے لگے، کیوں ابو عمرو! تم بھی ان لوگوں میں سے ہو جو مجھ پر طعن و تشنیع کرتے ہیں؟

**غایت کمال و بزرگی** | نام علمی و عملی کمالات کی جامعیت نے حضرت عبداللہ بن مبارک کی شخصیت کو اس قدر محبوب و ہر دعوٰی بنادیا تھا کہ لوگ ان سے بے ساختہ محبت کرتے تھے اور ان کی شان میں کوئی کلمہ استخفاف سن نہیں سکتے تھے۔ اسود بن سالم کہتے ہیں، ابن مبارک امام مقتدری تھے۔ اور سنت میں سب سے زیادہ ثابت رکھتے تھے۔ میں اگر کسی شخص کو ان پر کلمہ چینی کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے اس کے اسلام میں شک ہونے لگتا ہے۔

ابن عیینہ فرماتے ہیں، میں نے صحابہ کرام کے حالات میں غور کیا ہے اور اصر عبداللہ بن مبارک کے حالات بھی دیکھے ہیں دونوں کے مقابلہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ صحابہ کو حضرت ابن مبارک پر محض اس وجہ سے فضیلت ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف پایا ہے اور آپ کے ساتھ غزوات میں شریک ہوتے رہے ہیں۔

امام نسائی کا بیان ہے کہ، میں ابن مبارک کے عہد میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جو مرتبہ کے اعتبار سے ان سے زیادہ بڑا اور بلند ہو اور جس میں تمام انصاف محمودہ اس جامعیت کے ساتھ پائے جاتے ہوں، فیلی کہتے ہیں، ابن مبارک متفق علیہ امام ہیں ان کی کرامات ناقابل شمار ہیں،

۱۰ خطیب بغدادی جلد ۱۰ صفحہ ۱۶۸

۱۰ تاریخ خطیب بغدادی جلد ۱۰ صفحہ ۱۶۷

۱۰ تہذیب التہذیب جلد ۵ صفحہ ۲۸۵

کہا جاتا ہے کہ وہ ابدال میں سے ہیں۔

تواندہ | حضرت عبداللہ بن مبارک ایسی جامع شخصیت سے کون کسب فیض کرنا چاہتا چنانچہ آپ سے استفادہ کی غرض سے مختلف ولایتوں کے بشمار لوگ دور دراز سے آتے اور اپنی تشنگی علم بھگاتے تھے۔ ان میں سے بعض بڑے بڑے ائمہ علم دہلی بھی تھے مثلاً عبدالرحمن بن ہمدانی، یحییٰ بن حسین ابو بکر بن شیبہ، احمد بن حنبل المروری، حبان بن موسیٰ۔

متوے | آپ کے متوے نہایت حکیمانہ اور نصیحت آموز ہوتے تھے ایک موقع پر آپ نے فرمایا: ”لوگ دنیا سے اٹھے جا رہے ہیں حالانکہ انھوں نے اس چیز کو نہیں چکھا جو یہاں کی سب سے زیادہ عمدہ اور لطیف چیز ہے۔“ لوگوں نے پوچھا حضرت! وہ کیا ہے؟ ”ارشاد ہوا: اللہ کی معرفت“ ”ن سے کسی نے پوچھا تو واضح کیا ہے؟“ فرمایا: ”مالداروں کے ساتھ تکبر سے پیش آنا۔“ ایک دفعہ آپ نے فرمایا: ”چھ لاکھ درہموں کے صدقہ کرنے سے بہتر یہ ہے کہ میں ایک مشتبہ درہم کو روک دوں۔“

ایک مرتبہ آپ سے دریافت کیا گیا: ”واقعی انسان کون ہیں؟“ فرمایا: ”علماء“ پھر پوچھا گیا: ”بادشاہ کون ہیں؟“ ارشاد ہوا: ”ارباب زہد“ پھر سوال کیا گیا: ”کہنے کون ہیں؟“ جواب دیا: ”وہ ہر نصیب انسان جو دین کو سماش کا ذریعہ بناتے ہیں۔“

ایک موقع پر ارشاد ہوتا ہے: ”ہم نے تو علم دنیا کے لئے ہی حاصل کیا تھا لیکن جب اسے حاصل کر چکے تو علم نے ہم کو بتایا کہ دنیا ترک کر دینی چاہئے۔“

ایک دفعہ آپ چند ساتھیوں کے ساتھ پانی لینے ایک گھاٹ پر تشریف لے گئے۔ وہاں



جو لوگ موجود تھے وہ آپ کو پہچاننے نہیں تھے۔ چنانچہ جب آپ پانی پینے کے لئے آگے بڑھے تو ان لوگوں نے مزاحمت کی اور آپ کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ حضرت کے ساتھیوں کو ان نادانوں کی یہ حرکت سخت ناگوار گذری۔ لیکن آپ نے یہ فرما کر انہیں خاموش کر دیا: ”زندگی کا طبع ایسی ہی جگہ پر ہے جہاں ہیں کوئی نہ جانتا ہو اور جہاں کوئی ہماری توقیر نہ کرتا ہو۔“

وفات | وفات بھی اس قدر اچھی ہوئی کہ خدا برسلمان کو نصیب کرے۔ کسی غمزدہ میں گئے تھے کہ وہاں سے واپسی پر راستہ ہی میں بیمار ہو گئے۔ عمر وہی پانی جو سید ولد آدم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی۔ یعنی ۶۳ سال کی۔ آخر کار اسی مرض میں ۱۳ رمضان ۱۱۰ھ ہجری کو علی الصباح بیت میں انتقال فرمایا۔ مشہور عباسی خلیفہ ہارون کو اطلاع ہوئی تو اس نے کہا: ”افسوس علماء کے سردار کا انتقال ہو گیا“ حضرت سفیان بن عیینہ بولے: ”وہ بڑے فقیہ عالم۔ عابد۔ زاہد۔ شیخ۔ بہادر اور شاعر تھے فضیل بن عیاض نے کہا: ابن مبارک چل بسے لیکن انھوں نے اپنا شل کوئی نہیں چھوڑا۔“

رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ

۱۵۔ یہ سب مقولے کتاب صفۃ الصوفیہ جلد ۱۰ صفحہ ۱۱۵ سے اخذ

۱۶۔ یہ شہر دریائے فرات کے لب ساحل واقع اور حدود عراق میں داخل تھا (ابن فہرستان جلد ۱ صفحہ ۲۴۸)

۱۷۔ بغدادی جلد ۱ صفحہ ۱۶۳

۱۸۔ تاریخ خلیفہ بغدادی جلد ۱ صفحہ ۱۶۸

۱۹۔ تہذیب التہذیب جلد ۵ صفحہ ۲۸۵

# معابنِ یہودی نقطہ نظر سے

تصویر کا دوسرا رخ

(ایموان، محمد حفظ الرحمن صاحب سید ہار دی)

گزشتہ سے پیوستہ

ان تمام وجوہات کو پیش نظر رکھتے ہوئے آپ انصاف کیجئے کہ یقیناً یہودی کی تاریخی تحقیق کو بے سند اور بے وجہ قرآن عزیز کے مخالف اور معارض قرار دے کر پروفیسر صاحب نے کوئی غلطی خدمت انجام دی ہے اور مجھ کو جس حدی اور چیلنج کے ساتھ مخاطب کیا گیا ہے وہ کہاں تک قرین انصاف ہے۔

میرا یہ دعویٰ ہرگز نہیں ہے کہ مسودہ اور یقیناً کی یہ نہی تحقیق، ایک نص قطعی کی حیثیت رکھتی ہو اور اس کا مخالف پہلو محال یا ناممکن ہے بلکہ یہ تاریخی مسئلہ ہے جس کے دونوں پہلوؤں میں سے کسی ایک کے ثابت ہو جانے کے بعد بھی قرآن عزیز کی زیر بحث خطابت ہر حالت میں صحیح اور درست ہے۔

اس لئے پروفیسر صاحب کو یہ تو قطعی حق حاصل تھا کہ وہ اس کے خلاف صحیح دلائل پیش کر کے اس کو غلط ثابت کر دیں۔ لیکن ان کی بحث کا موجودہ طریقہ بلاشبہ قابل اعتراض و احتجاج ہے۔ ہر حال یہ ایک ضمنی مسئلہ ہے جو تاریخی حیثیت رکھتا ہے، اس سے اصل مسئلہ زیر بحث پر کوئی اثر نہیں پڑتا اسی لئے میں نے اپنے مضمون میں یہ تصریح کر دی تھی۔

اگر یہ تسلیم ہی کر لیا جائے کہ مرحوتہ اقواس کی بنا پر یہ تینوں قبائل اسرائیلی یہودی تھے تب بھی یہ منطوقہ علمی تحقیق کے قطعاً خلاف ہے اور تمام علماء سیر متقدمین و متاخرین کا بلا خلاف اس پر اتفاق ہے کہ یہ معاہدہ یثرب (مدینہ) کے تمام یہودیوں کے ساتھ ہوا ہے جن میں یہ تینوں بھی شامل ہیں۔ ۱۸۰- برہان صغیر صفحہ ۳۸۴ (نوبہر)

میں نے بطریق اختصار جلیل القدر ارباب سیر، محدثین اور مفسرین کے چند نام شمار کر کے یہ ثابت کیا تھا کہ جمہور علماء امت اس معاہدہ کو "یہودیت متعلق معاہدہ" سمجھتے ہیں اور ان سب کے نزدیک یہ تینوں قبائل بھی اس میں اسی طرح شریک ہیں جس طرح دوسرے یہود۔ مگر پروفیسر صاحب علماء اسلام کے اس اجماع و اتفاق کی پرواہ کئے بغیر ارشاد فرماتے ہیں۔

مجھے کوئی عہد نامہ (جہاں تک میری نظر ہے) ایچ دیویر کی کتابوں میں ایسا نہیں ملا جس کو میں کہہ سکوں کہ یہ رسول اللہ اور قبائل مزبورہ کا عہد نامہ ہے۔

اس لئے اب میرے نزدیک ان قبائل کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہونا تین صورتوں میں سے ایک صورت میں ہوگا۔

اور پھر پہلی صورت تحریر فرماتے ہوئے حاشیہ کی عبارت میں تحریر فرماتے ہیں۔  
دیکھئے برہان اکتوبر نمبر صفحہ ۲۹۶۔ اس کے ذیل میں میں نے لکھا ہے وہ اسرائیلی قبائل طینت تھے مگر اس حیثیت سے کہ وہ اوس و خزرج کے خلیفہ تھے نہ اس حیثیت سے کہ اس نامہ کے ماتحت تھے۔

علمی بحث میں پروفیسر صاحب کا یہ (منطوقہ آمیز) طرز میرے لئے تو بہت ہی عجیب اور تحقیق دو ہے۔ غور فرمائیے کہ معاہدہ یثرب بحث کو نظر انداز کر کے ایچ دیویر کی کتابوں میں تلاش کی ضرورت جب پیش آئی چاہئے تھی کہ کسی نے یہ دعویٰ کیا ہو تا کہ اس عہد نامہ یا نامہ مبارک



کے علاوہ کوئی دوسرا عہد نامہ بھی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور نامبرودہ قبائل کے درمیان ہوا ہے۔

میں نے تو یہ لکھا ہے کہ سلف سے خلف تک ہزاروں مسائل میں اختلاف کے باوجود علماء اُمت کا اس پر اجماع و اتفاق ہے کہ یہ معاہدہ تمام یہود مدینہ سے ہوا ہے۔ اور جناب جمہور کے اس جماع کے مقابلہ میں نہ صرف مخالف رائے رکھتے ہیں بلکہ معاہدہ زیر بحث کو چھوڑ کر تاریخ و سیرت کے ذخیرہ میں یہ تلاش کرنے لگتے ہیں کہ ان نامبرودہ قبائل سے کوئی اور معاہدہ ہوا ہے یا نہیں اِنَّ هَذَا لَشَيْ عَجَابٌ۔

نیر صاحب رسالہ "متحدہ قومیت اور اسلام" نے بھی جمہور علماء اسلام کی طرح اگر اس کو تمام یہود مدینہ سے ہی متعلق سمجھا تو وہ خطا وار اور جناب نے بے دلیل محض قیاس آرائی سے جمہور کا خلاف کیا تو عین صواب۔ یہ عجیب انصاف پسندی ہے۔

پروفیسر صاحب نے پھر ایک مرتبہ اس کو دوہرایا ہے کہ یہود کے یہ تینوں قبائل اس خزر بن کے حلیف تو تھے مگر اس حیثیت سے کہ اس "نامہ" کے ماتحت تھے۔

اس کا مدلل جواب نومبر کے برہان میں دیا جا چکا ہے اور اگرچہ پروفیسر صاحب کے موجودہ مضمون میں بھی قیاس آرائیوں کے علاوہ اس کے خلاف کوئی ٹھوس مواد موجود نہیں ہے تاہم مزید اتنا حجت کے لئے حسب ذیل منصوص اور معقول دلائل طالب عدل و انصاف ہیں۔  
نامہ مبارک کے ابتدائی جملے قابل غور ہیں۔

هَذَا كِتَابٌ مِنْ مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ رَسُولِ اللَّهِ بْنِ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُسْلِمِينَ مِنْ قُرَيْشٍ وَهَلْ

لے اجزہ سترہ میں اس معاہدہ کی خلافت و زمری کے بعد بنی قریظہ سے مسلمانوں کا دوسرا معاہدہ ہوا تھا جس کو میں برہان نومبر میں پہلی سے نقل کر چکا ہوں شاید پروفیسر صاحب کو تلاش میں یہ بھی دستیاب نہیں ہوا۔ ۱۲

يُثْرِبُ وَمِنْ تَجْهَمٍ، فَلَحِقَ بِهِمْ فُلُحٌ مَعَهُمْ وَجَاهِدَ مَعَهُمْ أَمْتَهُ وَاحِدَةً

دون ان من الخ۔ کتاب الاموال ابی بیدمفہ ۲۰۳۔

یہ تحریر ہے اللہ کے نبی و رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قرشی مسلمانوں (مہاجرین) اور یثربی مسلمانوں (انصار) اور ان کے ساتھ پابند ہو جانے والوں اور ان کے ساتھ مل جانے والوں اور ساتھ ہو کر جہاد کرنے والوں کے مابین (قبائل انصار کے یہود، باقی تمام یثربی قبل کے یہود اور سب کفار جو مسلمانوں کے ساتھ ہو کر جہاد کریں)

اب غور طلب امر یہ ہے کہ اس معاہدہ کے وقت ان تینوں قبائل زیر بحث کی حیثیت کیا تھی۔ اگر وہ ادس و خزرج (انصار) کے حلیف تھے اور حلیف ربے جیسا کہ پرندیسر، حب کو خود بھی اقرار ہے تو "فلحق بهم" میں داخل ہو کر براہ راست معاہدہ میں شامل ہیں۔ در اگر وہ نہ صرف حلیف تھے بلکہ ادس و خزرج (انصار) کے تابع تھے تب بھی "و من تبعهم" میں داخل ہو کر براہ راست معاہدہ کے معاہدہ ہیں۔ اور اگر نہ فلحق بهم" میں نہ من تبعهم" میں اور نہ حل معہم و جاہد معہم" میں کسی بھی جماعت میں شامل نہیں ہیں تو "امتہ و اعداؤہم و دن الناس" کی دھمکی سے وہ فریق مخالف و محارب میں شامل ہو جاتے ہیں مگر یہ صحیح حدیث و روایت کے خلاف ہے اس لئے کہ اس معاہدہ کے کچھ حصہ کے بعد جب قریش نے یہود سے ساز باز شروع کر دی تو مسلمانوں کو بنی نصیر و قرظہ سے محاربت (جنگ) کی نوبت آگئی اور اس کا سبب اسی معاہدہ کا نقصان ہوتا گیا۔ بخاری کی اس روایت کے تحت میں جس میں کہ یہ واقعہ مذکور ہو حافظ ابن حجر عسقلانی تحریر فرماتے ہیں

مرودی ابن مردودہ قصۃ بنی النصیر ابن مردودہ نے بنی نصیر کے واقعہ کو صحیح سند سے

باسناد صحیح (ابن) علیا کانت وقعت روایت کیا ہے اس کا کرا یہ ہے، مدر کے موک

بدر کثبت کفار بعدہا ای الیہود کے بعد کنارت قریش نے یہود کو ایک خط لکھا جس میں تحریر

انکم اهل الخلقۃ و الحصون تھا کہ تم گویا اب بھی مسلمانوں کے ساتھ اپنے عہد پر قائم

یحد و نہم فاجمع بنوا النضیر رہے تو تہات حق میں یہ اچھا نہ ہو گا جبکہ تم زر و کبر

علی الغدار الخ رفع جلد ۱۴ اور قصوں کے مالک ہو۔ تب بنو نضیر عہد توڑنے پر مجبور ہوئے

اور اس سے آگے قتل روایت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

وکان سبب وقوع المعاربۃ بنی نضیرت جنگ پیش آنے کا سبب یہ تھا کہ

نقضہم العہد۔ انھوں نے معاہدہ توڑ دیا تھا۔

سوا گریہ میوں قبائل معاہدہ زیر بحث سے خارج تھے تو پھر وہ کونسا معاہدہ تھا جسکو بنی نضیر

نے توڑا اور غدار و ناقض عہد کہلائے اور محدثین کو یہ ثابت کرنا پڑا کہ بنی نضیر سے جنگ کے

معاہدہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی جانب سے خلافت و زری نہیں ہوئی بلکہ خود ان ہی

کی جانب سے عہد شکنی پیش آئی۔

نیز پرنسپل حنا کا یہ کلمہ دلیل سے گریز کرنا کہ اس کے علاوہ کوئی اور معاہدہ ہوا ہو گا جواب موجود

نہیں ہے۔ "تو وہ ریت پر قلعہ تعمیر کرنے کے مراد ہے۔ جبکہ تمام ذخیرہ روایات میں اُس کے

وجود تک کا ذکر موجود نہیں ہے بلکہ اُس کے برعکس جمہور علماء اس نقض عہد کے موقع پر اسی زیر بحث

معاہدہ کو پیش کرتے جاتے ہیں۔ جیسا کہ حافظ ابن قیم وغیرہ نقل کر چکا ہوں۔ اور غفریب

دوسری فتوے پیش کروں گا۔

لہذا یہ قطعی اور منصوص فیصلہ ہے کہ "من تبعہم" اور "فلحق بہم" میں قبائل انصار کے یہود

و باقی تمام قبائل یہود مدینہ شامل ہیں، بلکہ فعل تبعہم و جاہد معہم میں دوسرے وہ تمام کفار بھی شامل

ہو سکتے ہیں جنہوں نے ان صفات کے مطابق عملی ثبوت دے کر معاہدہ کو تسلیم کر لیا ہو۔



اب دوسری نقول قابل ملاحظہ ہیں۔

علامہ دشنامی نے ان قبائل سے جنگ والی حدیث کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے

(قلت) لما استقر الاسلام  
بالمدينة وظهر كتابها صلى الله عليه  
وسلم فيما بينه وبين اليهود شرط  
لهم فيه وشرط عليهم وانهم  
فيعثلى انفسهم واموالهم حتى  
يقضوا العدا فکانوا بعد النقص  
في حكم المحاربين واول نقص  
منهم بنو قينقاع (الکمال الکامل شرح مسلم)

میں کتابوں کہ جب مدینہ میں اسلام نے جڑ پکڑ لی  
اور اس معاہدہ کا معاملہ پیش آیا جو آپ کے اور یہود  
کے درمیان ہوا اور جس میں ان کے لئے اور ان کے  
ذریعہ شرط لکھی گئیں اور اس کی رو سے وہ جان  
وال میں بالکل محفوظ ہو گئے یہاں تک کہ انہوں  
نے اس عہد کو توڑ دیا تو اب نقص عہد کے بعد وہ  
عربی بن گئے اور سب سے پہلے بنی قینقاع  
نے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کی۔

اور علامہ عینی شرح بخاری میں غزوہ بنی نضیر کے متعلق تفصیل دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

(باب حدیث بنی نضیر) وهم  
قبيلة من يهود المدينة وكان  
بينهم وبين رسول الله صلى الله  
تعالى عليه وسلم عقد مواعدتهم  
قال ابن اسحاق قرظهم والنضير  
والنعام وعمر وهم اصول بنی  
خزرج بن الصريح بن التومان

بنی نضیر کی حدیث والا باب، بنی نضیر  
یہود مدینہ کے قبائل میں سے ایک قبیلہ  
ہے ان کے اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ  
علیہ وسلم کے درمیان معاہدہ تھا اور ان  
اسحق نے یہ بھی کہا ہے کہ قرظہ، نضیر، نعام  
اور عمرو یہ سب بنی خزرج بن صریح  
بن تمان کے آباد اجداد ہیں۔

جلد ۸ صفحہ ۸۸ او قسطانی جلد ۶ صفحہ ۳۷۸

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ابن اسحق اگرچہ بن ہرہہ قبائل کو اسرائیلی سمجھتے ہیں مگر ساتھ ہی یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ ان قبیلوں کے علاوہ اور بھی اسرائیلی قبائل یہاں موجود تھے مثلاً بنی النخام و بنی عمرو۔

اور بخاری کے باب منازعی کی شرح میں حافظ الدنیا امام حدیث و سیر ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں۔

وكان الكفار بعد الهجرة مع النبي  
صلى الله عليه وسلم على ثلاثة أقسام  
قسم وادعاهم على أن لا يحاربوا  
ولا يمانوا عبيدا ولا دھم  
طوائف اليهود الثلاثة قرينة  
والمضير و قينقاع الخ • قبائل قرظية خضير اور قينقاع تھے۔

فتح بابی جلد ۱، صفحہ ۲۶۳

یہ دوسری قسم کی تمام قبائل جو قبیلہ بنی نضیر و امیہ میر سے منقول ہیں تصریح کرتی ہیں کہ قرظیہ، خضیر، اور قینقاع کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاہدہ سے ان کی مراد یہی معاہدہ زیر بحث ہے۔ اسی لئے یہ تمام ارباب تصنیف ابن اسحق کے حوالہ سے اس کا ذکر کرتے جاتے ہیں۔

۲۱: باب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو مدینہ کے باشندوں کے تمام مذہبی و سیاسی حیرت میں انقلاب ہو گیا، اور جس طرح عبداللہ بن ابی کی سرداری کا معاملہ اور اس دغ و خیز کے بیان جنگ کا سلسلہ ختم ہو گیا اسی طرح قبائل میں صلح و معاہدہ اور جنگ کا نقشہ

بھی بدل گیا اور ادس و خزع نے اب یہ تمام معاملات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی مبارک کے حوالہ کر دیئے۔

اور آپ نے مدینہ کے موجودہ حالات کو پیش نظر رکھ کر سب سے پہلے یہ ضروری سمجھا کہ دو اہم امور جلد سٹے ہو جانے چاہئیں ایک مہاجرین و انصار اور انصار کے باہم قبائل کے درمیان اصلاح ذات البین وغیرہ کے معاملات اور دوسرے یہودی کی مقابل طاقت کے ساتھ صلح و معاہدہ تاکہ پھر قریش کی محاربانہ اور محاندانہ سازشوں اور جنگ و جدل کے مقابلہ میں مضبوط محاذ قائم ہو سکے۔ پس اگر پروفیسر صاحب کی پہلی صورت کے رشاد کے مطابق اس معاہدہ یا نامہ نبوی کے ماتحت یہ تینوں قبائل کسی حیثیت سے بھی شامل نہیں کئے گئے۔ تو اسلامی احکام کی رو سے ادس و خزع اور ان تینوں کے باہم علیف ہونے کا معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اب ادس و خزع و انصار میں پہلے کے ادس و خزع نہیں ہیں اب ان کا معاہدہ کسی سے جب ہی ہو سکتا ہے کہ یا مرضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ان کے پچھلے معاہدہ کو باقی رکھا جائے یا ختم کر دیا جائے پس اگر باقی رکھا گیا تو ہر عقلمند یہی کہنے پر مجبور ہے کہ وہ اس زیر بحث معاہدہ اور نامہ نبوی کے ماتحت ”معاہدہ“ کی صورت میں ”باقی رکھا گیا“ اور اگر ختم کر دیا گیا تو پھر اس معاہدہ سے قریب ہی زمانہ میں ان قبائل پر جہاد کرتے وقت ”جہاد کا سبب“ ان قبائل کا معاہدہ کی خلاف ورزی اور نقض عہد تھا ”ا“ ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا حالانکہ بخاری اور مسلم کی صحیح احادیث میں ان قبائل سے جنگ کو جو واقعات مذکور ہیں ان کی شرح میں تمام محدثین یہی سبب بیان کرتے، اور نقض عہد میں اسی معاہدہ زیر بحث کو پیش کرتے جاتے ہیں۔

(۳) اور اگر بالفرض ان تینوں قبائل کا معاہدہ اس کے علاوہ دوسرا تھا جیسا کہ پروفیسر صاحب کی بیان کردہ دوسری صورت سے ظاہر ہوتا ہے تو اس کی عبارت نہ سہی کم از کم صرف اس کے



ہونیکاہی صاف صاف ثبوت پیش کرنا چاہئے ورنہ محض قیاسی اکل سے یہ کہہ دینا کہ وہ ضائع ہو گیا ہو گنا یا ذکر نہ ہوا ایسی صورت میں کسی طرح قابل توجہ نہیں ہو سکتا جبکہ سلف سے خلف تک جمہور علماء اسلام کا اس پر اتفاق ہو کہ قابل ثلثہ سے جو معاہدہ ہوا ہے وہ یہی ہے جو کتب مطورہ بالامین کو کہہ ہے۔ اور کسی شے کے عدم ذکر سے اس کا عدم اسی وقت تک لازم نہیں ہوتا جبکہ اس کے خلاف کوئی مانع موجود نہ ہو اور یہاں اس کے مقابلہ میں .. اجماع علماء اُمت .. موجود ہی تو پھر یہ قیاس باطل ہے (۴) نیز معاہدہ یہود کے ضائع ہونے کی نظیر میں پروفیسر صاحب کا یہ فرمانا

غزوة المشیرہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی مدینہ اور بنی خمرہ دونوں سے عہد پیمان کیا جو معاہدہ بنی خمرہ سے ہوا وہ بالفاظہما موجود ہے اور بنی مدینہ کا نہیں تھا حالانکہ ممکن ہے ان کیلئے جداگانہ معاہدہ کیا گیا ہو۔ شواہد بھی اس کے موجود ہیں واقعہ یہ لکھا ہے (لما قتل کعب بن اشرف، فرغت الیہود ۶۰) اس بیان میں جس تحریر یا عہد و پیمان کا ذکر آتا ہے وہ اب کہیں نہیں ملتی۔

قیاس مع الفارق ہے یعنی بے جوڑ بات ہے اس لئے کہ بنی خمرہ کے معاہدہ یا مذکورہ بالا تحریر کے ساتھ تو تمام ارباب سیر و تاریخ فقط یہ ذکر کر دیتے ہیں کہ بنی مدینہ سے بھی معاہدہ ہوا یا کعب بن اشرف کے قتل کے بعد مطورہ بالا تحریر لکھی گئی لیکن کوئی ایک مورخ یا عالم سیرت احکام شرعی یا یہی حوالجات میں کسی تحریر کے متعلق یہ نہیں کہتا کہ بنی مدینہ کا معاہدہ یہ ہی یا مطورہ بالا تحریر بنی مدینہ کا معاہدہ ہے بلکہ اس کا موجود نہ ہونا مسلم ہے بخلاف یہود و نہ کے معاہدہ کے کہ اس کے متعلق تو بیسیوں حوالجات سے یہ ثابت کر چکا ہوں کہ جمہور علماء اُمت کا اس پر اتفاق ہے کہ نامہ زیر بحث ہی وہ معاہدہ ہے جو قرطیہ، نصیر، قینقاخ اور تمام یہود مدینہ سے ہوا ہے۔ اور محدثین حدیثی مباحث میں 'مفسرین' تفسیری مذاکرہ میں فقہاء فقہی اسناد و استشادات میں اور ارباب سیر و تاریخ کے مسائل میں

باتفاق رائے اس کو یہی کہہ کر پیش کرتے اور سند شہادت اور دلیل ٹھہراتے جاتے ہیں کہ یہ معاہدہ  
یہود سے ہے۔

بہیں تفادیت رہ از کجاست تا بکجا

جن حضرات کو ان مسائل کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ ان کے حقائق کے فہم و ادراک کا ملکہ  
بھی خدا سے برتر کی جانب سے عطا ہوا ہے وہ سب کی روضہ الافان اور زرقانی کی شرح  
نواہب لدنیہ میں غزوہ بواط اور غزوہ غیرہ کی بحث کو از اول تا آخر پڑھ کر آسانی یہ فیصلہ کر سکتے  
ہیں کہ بنی خمرہ اور بنی مدج کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا وہ تقریباً ایک ماہ کے فرق سے ہوا ہے۔  
صفر ۱۱۰۰ ہجری میں بنی خمرہ کا واقعہ پیش آیا اس کے بعد بنی مدج کا ۱۰۰ اور چونکہ بنی مدج بنی خمرہ کے  
حلیف تھے لہذا جس قسم کا معاہدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور بنی خمرہ کے درمیان ایک  
ماہ پیشتر ہوا تھا ایک ماہ بعد بعینہ وہی شرائط بنی مدج کے سامنے پیش کر دی گئیں اور انہوں نے  
اپنے پیشرو حلیف قبیلہ بنی خمرہ کی طرح ان کو بجنہ قبول کر لیا پس جبکہ بنی خمرہ کے پورے معاہدہ  
میں لفظ بنی خمرہ کے بجائے صرف بنی مدج کے علاوہ ایک لفظ کا بھی فرق نہیں تھا تو اصحاب سیر  
نے صرف اس کا حوالہ دیدینا ہی مناسب سمجھا اور بنی مدج کے معاہدہ کی عبارت کو تحریر نہیں فرمایا۔  
(۵) نیز اس سلسلہ میں پروفیسر صاحب کا غزوہ بنی قینقاع کے بیان میں واقعہ کی حسب ذیل  
عبارت پیش کرنا۔

لما قدم رسول الله صلى الله عليه وسلم المدينة وادعته يهود كلهم فكتب بينهم

و بينهم كتابا بالحق رسول الله صلى الله عليه وسلم كل قوم بخلفاءهم، الخ

اور اس سے یہ نتیجہ نکالنا۔

میرے نزدیک یہ عہد نامہ بھی تاریخوں میں نہیں ہے

یا سخت غلط فہمی پر مبنی ہے اور یا حق کی راہ کو چھوڑ کر بات کی تیج پیش نظر ہے۔ ورنہ تو واقعہ کی

اس تحریر میں زیر بحث معاہدہ سے جدا کسی اور معاہدہ کا ذکر نہیں ہے بلکہ اسی مشہور معاہدہ کے مصلیٰ الفاظ نقل کئے بغیر اپنے الفاظ میں اختصار کے ساتھ اُس کا ذکر کرنا مقصود ہے اور بس۔

مگر چونکہ واقعہ یہ ہے ”یہود کلہا اکہہ کر یہ ظاہر کر دیا کہ معاہدہ زیر بحث تمام یہود سے متعلق تھا اور یہ آپ کے خلاف منشا ہے مذاہترین ترکیب یہی ہو سکتی تھی کہ اس کو ایک جدا معاہدہ کہہ دیا جائے۔ حالانکہ اس کے خلاف خود عبارت ہی میں قسرا اُن موجود ہیں مثلاً مدینہ آنے کے متصل ہی معاہدہ کرنا اور ہر قبیلہ کو اُس کے حلیفوں کے ساتھ شامل کرنا وغیرہ۔

مگر اس معاملہ کے باوجود پروفیسر صاحب کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس کو کسی طرح صحیح نہیں تسلیم کیا جاسکتا۔ اس لئے اس کے تحت میں حاشیہ کی عبارت میں یہ بھی فرما دیا ہے۔

اگرچہ ہماری رائے اس کے خلاف ہے، ہم اگر کوئی اس بیان کو نامہ زیر بحث سے متعلق ہونے پر صراحت کرے تو ہمیں انکار کی ضرورت نہیں۔

۶۱ میں نے جلیل قدر محدثین و بابائے قول کے حوالہ دیکر یہ ثابت کیا تھا کہ جمہور کی بھی رائے یہی ہے جو حضرت مولانا حسین احمد صاحب کی رائے ہے البتہ آپ کی رائے کی موافقت میں سلامی علی ذخیرہ میں ایک رائے بھی موجود نہیں ہے۔ اس پر پروفیسر صاحب جو کچھ تحریر فرماتے ہیں وہ قابل ملاحظہ ہے۔

میں ان حضرات کی شہادت کی صحت کو نہیں اتنا درودجہ اس کی یہ ہے کہ زیر بحث نامہ مبارک میں مجھے کوئی اندرونی شہادت ایسی نہیں ملتی جو محمولہ بالا بیرونی شہادت کی تصدیق کرتی ہو۔ اور جب تک یہ بیرونی شہادتیں اندرونی شہادت سے مطابق

نہیں خواہ ان کا کتنا ہی بناویں نہ ہو۔ الخ

اس کے متعلق میں صرف یہی گزارش کر سکتا ہوں کہ بحث کا جو طریقہ شروع ہی سے جناب نے



اختیار فرمایا ہے اس کا قدرتی نتیجہ ہی ہو سکتا تھا جو آپ کے زورِ قلم سے اب نکلا ہے۔

بہر حال جناب کو یہ معلوم رہے کہ یہ بیرونی شہادتیں کچھ اُکل کے تیر نہیں ہیں بلکہ اپنے ساتھ مضبوط قرائن اور محکم دلائل و شواہد رکھتی ہیں پس جناب کے تسلیم نہ کرنے سے اس راہِ بار کا علمی وزن کم نہیں ہو سکتا خصوصاً جبکہ علماء اسلام نے اس سے فقہی، حدیثی، اور تاریخی مسائل میں ستاد و استشاد تک کیا ہو۔ اور صراحت کے ساتھ یہ کہہ کر کیا ہو کہ یہ معاہدہ یہودی ہے۔

راہِ اندرونی شہادت کا بیرونی شہادت سے مطابقت کا معاملہ سو اس کو بہت تفصیل کے ساتھ اکتوبر کے برہان میں بھی اور صفحات گزشتہ میں بھی مشرح بیان کیا جا چکا ہے۔ البتہ یہ چشمِ حق میں چاہئے حق کی حمایت کے لئے پھر اس سے آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں۔

اس لئے کہ ن بیرونی شہادتوں کے الفاظ میں، الفاظ کے مفہوم میں، مفہوم کے نتائج میں کھلا اختلاف موجود ہے۔ ابنِ ہشام نے اس نامہ کے عنوان میں بروایت ابنِ شحان لکھا ہے اور لستہا اچھا لکھا ہے۔

کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم      رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تحریر مہاجر  
کتابا بین المہاجرین و الانصار      و انصار کے باب میں لکھونی جس میں یہودی سے  
و ادع فیہ یہود دعا ہدھم      حمد و بیان فرمایا۔

سیرت ابنِ ہشام کے شارح علامہ سیسی روضۃ الغنی میں اسی عنوان یا اس کے مفہوم کو یوں ادا فرماتے ہیں۔

کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم      رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ نامہ جو آپ  
فیما بینہ و بین الیہود      نے اپنے اور یہود کے مابین لکھوایا۔

کہں بین المہاجرین والانصار اور کہاں بینہ دین الیہود اس میں نامہ مبارک کے اضافہ  
 ہی نہیں چھوٹے بلکہ تحریر کی نوعیت ہی بدل گئی ۱/۶  
 اب ابن اثیر کو دیکھئے فرماتے ہیں۔

دخل فی عقدہ علیہ السلام رسول اللہ کا مہاجرین والانصار میں ایک تحریر  
 الا لفتہ بین المہاجرین والانصار کے ذریعہ جس کے باعث آپ نے حکم دیا وروہ  
 بالکتاب الذی امر بہ فکتب لکھی گئی "باسم اللہ" وروہ بھالی چارہ نام  
 والمواخاۃ التی امر ہم بھا و کرنا جس کے لئے آپ نے ارشاد فرمایا اور مسلمانوں  
 قر رہم علیہا وموادعہ الیہود پر رومی نمبر ایتھی وراپ کا ان یوہودیوں مدینہ  
 والذین کانوا بالممدینۃ میں تھے بہم نمد و پیمان کرنا۔

ابھی نامہ بت و۔ سی کا عنوان وراسی میں مہاجرین و انصار کی موافقا تو بھی اگر داخل  
 ہوئی جس کے سے رسول اللہ کا کوئی تحریر لکھو، ثابت نہیں ہے۔

پرو فیہ صاحب کی تحریر سے یہ غویل عبارت میں نے نقل کی کہ ایک صاحب نظر  
 بآسانی یہ معلوم کر سکے کہ جمہور علماء اسلام کی متفقہ رائے کی مخالفت کرتے ہوئے پرو فیہ صاحب  
 کے پاس جو دلائل ہیں ان کا کیا وزن ہے؟

ہر ایک صاحب نظر بیان کردہ حوالوں سے یہ تو بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ بن ہشام  
 اسماعیلی و ابن اثیر دونوں کے عنوان میں "موادعہ و معاہدہ یوہودیہ" کا ذکر خیر کسی اختلاف کے موجود  
 ہے اور یہ کہ نفس معاہدہ یوہودیہ کے متعلق ان میں کوئی سابغی اختلاف نہیں پایا جاتا۔

البتہ اس طویل عہد نامہ میں جبکہ مہاجرین اور انصار کے درمیان اصلاح ذات البین کے  
 سلسلہ میں ادا دیت، باتیں سال و انصاف کا محاط، باہم یکدگر خیر خواہی کے لئے بھی تحریر تھی

اس لئے ان بزرگوں نے اپنے اپنے خیال کے مطابق ان مضامین کے مناسب عنوان قائم کر دیے۔  
اسی سلسلہ میں معاہدے کے حسب ذیل جملے قابل ملاحظہ ہیں۔

المہاجرین من قریش علی رباعیتہم قریش بنجرین (دیت کے معاملات میں)  
یتعاقلون بینہم معاقلہم الا ولی اپنے پہلے ہی رداج پر رہیں گے۔

و بنو عوف علی رباعیتہم یتعاقلون و بنو عوف (انصاری قبیلہ) (دیت  
معاقلہم الا ولی کے معاملہ میں، اپنے پہلے چلن پر رہیں گے

اسی طرح تفصیل کے ساتھ انصاری قبائل کا ذکر کرتے ہوئے فران ذیشان ہے  
وکل طائفۃ منہم تقدی عاینہا اور ہر ایک انصاری قبیلہ اور ناعرین، اپنے

بالمعروف والقسط بین المؤمنین قیدی کا زینتہم ہم مسلمانوں میں بھائی اور  
انصاف کا پاس رکھتے ہوئے ادا کر دیا کریگا۔

و المؤمنون بعضهم موالی بعض اور دوسروں کے مقابلہ میں تمام مسلمان ایک  
دور الناس دوسرے کے محب، اور دوست ہیں۔

اب انصاف کہنے کے اس قسم کے احکام مذکور ہوتے ہوئے اگر عنوانات مسطورہ بالا قائم  
کر دیے گئے تو عنوانات کے لفظی اختلاف سے مفہوم اور نتیجہ کا اختلاف، کیسے لازم آگیا۔ جبکہ  
نامہ مبارک یا معاہدہ زیر بحث میں بھی اور پروفیسر صاحب کے بیان کردہ عنوانات میں بھی ”موافقہ  
یہود“ کا بھی ذکر ہے اور مہاجرین و انصاری یعنی مسلمانوں کے باہمی تعلقات و معاملات کا بھی، تو پھر  
اصل اور تبع، نوعیت تحریر کی تبدیلی، اور لفظ ہواخا کا اضافہ، وغیرہ قسم کی موٹگائیوں سے  
جواب کا مقصد کیسے حاصل ہوتا ہے۔ اور نہ وہ شخص جو کتب حدیث، تفسیر، سیر و تاریخ کی روایات  
کے لفظی اختلاف پر کافی عبور رکھتا ہے اس قسم کے لفظی اختلافات کو مفہوم اور نتیجہ کا فرق کہہ سکتا ہے؟



کیونکہ اس سلسلہ میں حسب ذیل شہادت قابل ملاحظہ ہے۔

بخاری در مسلم میں معراج کی روایات میں متعدد اختلافات ہیں مگر اس کے باوجود قرآن عزیز

سے درجہ ثبوت ان احادیث سے مناسب۔ صدی نقطہ نظر سے اس پر بھی ایمان لانا ضروری ہے اور ان نزاعات کی وجہ سے مغموم و نتیجہ کی تبدیلی کا دعویٰ کر کے کسی بھی دلیل حق نے ان روایات کو غلط کہنے کی جرات نہیں کی۔ برہان کی طبیعت کی مباحثہ کی ہے اور وہ اس میں کامیاب ہوئے ہیں۔

ان البیہی علی اللہ علیہ وسلم حدیثہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس  
عن بیۃ سری بدرینا انا رت بحو کو معراج ہونی میں میسر میں تھا کہ یہ واقعہ  
فی الحطیم (بخاری) پیش آیا۔

وفی روایہ فی الحجج اور کبھی راوی کہتا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں  
(بخاری) حجر میں تھا۔

وفی روایتہ فرج سفینیتی و یسرہ جزہ کی محبت میں سنگات یا گیا جبکہ میں  
اما بملکہ نزل حبوس فرج صدر کہ میں تھا اور مہربان اترے در انھوں نے میرا  
وفی روایتہ ذاتی الحجج ذاتی میں حجر میں تھا کہ آنے والا آیا اور اس نے میرا  
آت فتق ما بین ہذا الی ہذا بیچ سینہ چاک کیا۔

مختصر کے لئے یہاں صرف دو اختلافات ہی کو میں نے نقل کیا ہے۔ ایک یہ کہ جب معراج کا واقعہ ہوا تو آپ کہاں تھے۔ روایات اس میں مختلف ہیں۔ آپ اپنے حجر مبارک میں تھے آپ حیم میں تھے۔ آپ حجر میں تھے۔ ایک روایت ہے کہ آپ ام ہانی کے مکان میں تھے۔ دوسرا اختلاف یہ کہ آپ کا شق صدر، معراج کے واقعہ میں کس جگہ ہوا۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا

ہے کہ حجرہ مبارک ہی میں ہوا۔ دوسری سے معلوم ہوتا ہے کہ حطیم میں ہوا، حالانکہ واقعہ معراج صرف ایک ہے۔

چنانچہ اس واقعہ کے متعلق دو راہیں ہیں۔ ایک اہل حق کی اور دوسری اہل باطل کی۔ اہل حق کا اجماع ہے کہ صحیحین میں مذکور واقعہ صحیح اور واجب الایمان ہے اس لئے انھوں نے اس قسم کے اختلافات دور کرنے میں تسلی بخش تطبیق دیدی۔

دوسری راہ اہل باطل کی ہے انھوں نے اس قسم کے اختلافات سے فائدہ اٹھا کر نفس مسئلہ سے ہی انکار کر دیا۔

میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ بخاری و مسلم کی روایات اور معابد مذکور کی روایت کی حدیثی حیثیت برابر ہے بلکہ صرف یہ بتانا ہے کہ اس قسم کے اختلافات سے جب روایت کے انکار کا فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا تو اباب سیر کے مختلف عنوانات کی وجہ سے جو اگرچہ الفاظ میں مختلف ہیں مگر مفہوم و نتیجہ میں ہرگز مختلف نہیں ہیں۔ یہ ہرگز دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ یہ ”معابد و ہود“ نہیں ہے۔ جبکہ عنوانات قائم کرنے والے سب بلا خلاف اس پر متفق ہیں کہ یہ معابد و ہود ہے۔ البتہ ہر صاحبِ علم کو یہ حق ہے کہ وہ یہ تسلیم کرتے ہوں کہ یہ معابد و ہود ہے اس کے عنوانات پر تنقید کرے اور ان کی خامیاں اگر ہوں تو بیان کرے۔

لے محبین نے کہا ہے کہ ان روایات میں اجمال تفصیل اور بعض رویوں کے وہم و غل ہے اس لئے ان خوات کی تطبیق یہ ہے کہ اُس زمانہ میں آپ کا اپنا مکان نہ تھا اور آپ اپنی چچا زاد بہن مہربانی کے گھر میں سکونت پذیر تھے، واقعہ یہاں سے شروع ہوا اور پھر آپ کو مسجد حرام میں لیجا یا گیا، ابھی تک آپ نیم خوابی کی حالت میں تھے یہاں کر پھر نیند کا غلبہ ہو گیا۔ اُس کے بعد بیدار کیا گیا در پھر ہمیں حطیم اور حجر کے پاس کعبہ کے قریب شق صدر کا واقعہ پیش آیا۔ فتح الباری جلد ۷، صفحہ ۱۶

اب جمہور کے اس رد انبار، کو پھر ایک مرتبہ ملاحظہ فرمائیے کہ جس میں حافظ ابن حجر، حافظ بدر الدین عینی، امام شافعی، حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم جیسے اساطین امت ہیں، اس سے آگے چل کر لواست بیجا کو سوہ بناتے ہوئے پروفیسر صاحب نے ”ہے“ اور ”نہیں ہے“ پر بھی متضاد بحث فرمائی ہے۔ ارشاد ہے۔

میں کتابوں، اس منقول یا مستنوں عنہ عبارت میں یہ جو ہے ”اس لئے ان میں کی تفصیل کی گئی“ میں نے اس جملہ پر خط کھینچا یہ ہے میں سمجھتا ہوں ”تفصیل نہ کی گئی“ کی جگہ تفصیل لکھ گئی۔  
 غلط چسپ کیا ہو اگر یہ غلط نہیں چسپا تو پھر میں سلسلہ کی عبارت کو نہیں سمجھ سکا ہوں۔  
 بیشک آپ صحیح سمجھتے ہیں اور مضمون کو دیکھ کر ہر شخص ہی سمجھے گا، یہ کوئی دقیق بات نہیں ہے سیاق و سباق اس کا خود ضامن ہے اس سے ہر جملہ پر ”اگر“ کے ساتھ شقوق پیدا کرنا اور ضروری تو سکا فیروں کو کام میں لانا کچھ موزوں معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ کتابت میں ایسی غلطیاں ہو ہی جایا کرتی ہیں اور اہل علم سیاق و سباق سے خود اس کو صحیح کر یا کرتے ہیں۔

اس کے بعد میرے ایک فقرہ کا حوالہ دیتے ہوئے اس پر تنقید فرماتے ہیں در کہتے ہیں۔  
 نیز جناب مولوی صاحب لکھتے ہیں بیان برد و شبہ کو رد کرنے کے لئے انصاری قبائل کے یہود کی قبائل و تفصیل دی گئی تاکہ جب معاہدہ میں انصار کا خط آئے تو اس سے صرت ثربی مسلمان مراد ہوں۔ ”اممہ ہر یک رج میں نے نقل کیا ہے۔ درجے معاہدہ کا جارہ ہے میں تو انصار کا غلط ہی نہیں ہے تو پھر میں توجہ یا تحلیل یا دیس کر گئے سمجھا تو مند و ہون

مجھے غلط انصار لکھ دیں میں اپنی تعمیری غلطی کا اعتراف ہے اور میں اس جانب توجہ دلانے پر پروفیسر صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ لیکن ”توجہ یا تحلیل یا دلیل“ کو نہ سمجھنے میں جناب کو مند و ہون نہیں سمجھ سکتا اس لئے کہ میرا مقصد تو یہ ہے کہ معاہدہ فاریز بحث میں جن مقامات میں بنی عوث، بنی نجار، بنی ساعدہ



دیگرہ قبائل کا نقطہ نام آیا ہے وہاں انصاری مسلمان مراد ہیں درجن مقامات میں یہودی بنی عوف، یہودی بنی بخار اور بنی شطنہ وغیرہ آیا ہے وہاں وہ یہودی المذہب مراد ہیں جو یثربی قبائل میں سے یہودی ہو گئے تھے۔ لہذا توجیہ یا تعلیل یا دلیل اپنی جگہ بالکل ٹھیک اور محکم و مضبوط ہے اور اگر جناب کسی غیر جانبدار شخص سے اس مضمون کا مطلب دریافت فرمائیں گے بلکہ مناظرانہ شان سے جدا ہو کر خود ہی توجہ فرمائیں گے تو یہی جواب ہو گا کہ لفظ انصار کو نکال دینے کے باوجود عبارت کا حاصل وہی ہے جو میں نے گزارش کیا۔ لہذا عبارت کے سقم کو اس طرح دور کیا جا سکتا ہے۔

تاکہ جب معاہدہ میں مرتبہ انصار کے قبائل کا نام آئے تو اس سے نقطہ یثربی مسلمان مراد ہوں اور جب ان کے قبائل کے یہود کا ذکر آئے تو قبائل کی تفصیل کے ساتھ لفظ یہود کا بھی ذکر آئے۔

غرض جو شخص بھی برہان اور نمبر میں اس مضمون کو پڑھنے لگا اور پھر تصحیح کے بعد عبارت مسطورہ بالا کا مطالعہ کرے گا وہ بہ نظر انصاف یہ فیصلہ آسانی کر سکے گا کہ دونوں صورتوں میں ”توجیہ یا تعلیل یا دلیل“ کی حقیقت، مفہوم، اور نتیجہ میں مطلق کوئی فرق نہیں پڑتا۔ البتہ دلیل کے ایک لفظ، انصار، میں معاہدہ کے لفظ کے ساتھ لفظی اختلاف ضرور پایا جاتا ہے جو تعبیری غلطی ضرور ہے مگر مقصد میں خلل انداز نہیں ہے اس کے بعد پروفیسر صاحب نے یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے جب یہ تینوں نامبروہ قبائل نمایاں شہرت کے مالک تھے اور یہودیت میں امام۔ تو ان کا نام نہ لیا جائے اور جو تابع ہوں ان کو قبائل وار بصراحت بیان کیا جائے اور اس کے لئے ”مثال“ بھی طلب فرمائی ہے۔

مسطورہ بالا عبارت میں پروفیسر صاحب نے میرے قول کی صحیح ترجمانی نہیں فرمائی بلکہ اس کو اپنے خیال کے قالب میں ڈھال کر پھر اس پر اعتراض فرمایا ہے۔ حالانکہ میں نے جو کچھ کہا تھا اس سے خود یہ صاف واضح ہوتا ہے کہ میرا اصل مراد یہ ہے کہ اس معاہدہ میں تمام یہود مدینہ شامل ہیں۔ اور



وان الیہود ینفقون مع المؤمنین اور یہ بھی ضروری ہو گا کہ جنگ کے زمانہ میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ یہودی بھی مصارف جنگ برداشت کریں گے۔

معادہ کی یہاں تک کی تمام عبارت میں (جو تقریباً ایک ورق کو حاوی ہے) کسی ایک جگہ بھی ایسا لفظ نہیں ہے جو اس معادہ کو فقط انصاری قبائل کے یہودیوں کے ساتھ مخصوص کرتا ہو۔ اور اسی لئے جمہور علماء امت "من تبعنا من الیہود" کی تفسیر یہودیہ کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور لفظ "مشرک" ایک کو امام شافعیؒ نے عام معنی "کفر" میں استعمال کر کے اس کے مصداق میں بھی یہود کو شامل کر لیا ہے، اس کے بعد یہ ایک واقعاتی سوال پیدا ہوتا تھا کہ اس عموم میں اگرچہ مشہور قبائل یہود کے ساتھ ساتھ انصاری قبائل کے یہود بھی شامل ہو گئے تاہم انکی ایک حیثیت یہ بھی ہے کہ وہ نسل و خاندان کے اعتبار سے انصاری کے افراد و اجزاء ہیں اور مذہب کے لحاظ سے یہودی۔ تو کیا اسلامی احکام کے اعتبار سے ان یہود کے درمیان جو قحطانی یا اسرائیلی ہونے کے ساتھ ساتھ مالک قطعات و صاحب ساز و سامان جنگ بھی ہیں، اور انصاری قبائل یہود کے درمیان کوئی خاص فرق اور امتیاز تو نہیں ہے، جو بعض حقوق کے لئے محرومی یا اضافہ کا باعث بنتا ہو اس لئے کہ وہ یہودی ہو کر یہاں (مدینہ) میں نہیں بے تھے بلکہ یہودیوں سے متاثر ہو کر یہودی ہو گئے تھے، تو اب جب کہ ان کے تمام قبائل مشرف باسلام ہو کر انصار کہلائے تو ان کی حیثیت نہ زیر بحث قبائل یہود کی طرح مالک حصون و قسٹوں کی تھی اور نہ نسل و خاندان کے لحاظ سے یہودی النسل ہونے کی ضرورت تھی کہ ان دوسرے نمبر کے یہودیوں کی حیثیت کو بھی صراحت کے ساتھ بیان کر دیا جائے پسند الکلھا گیا کہ۔



ان ایہود بنی عوف و مو لبہد و قبیلہ بنی عوف کے یہودی اور ان کے غلام بھی  
 انقسمہ امتہ من المؤمنین مسلمانوں کی امت (جماعت) ہی میں شمار ہوں گے  
 اور اسی طرح یہود بنی النجار، بنی الکھارث، بنی ساعدہ، بنی امادس وغیرہ کے متعلق تحریر کر دیا  
 گیا اور بتا دیا گیا کہ جان نال، آبرو، اور تمام دنیوی معاملات میں اپنے قبائل کے مسلمانوں ہی  
 کی طرح ہیں۔" سی لے اس معاہدہ میں ان کے لئے "امۃ من المؤمنین" فرمایا اور "من تبعم فلحق بجم" کے  
 عام مصداق میں تمام معاہدین کو "امۃ واحدة من دون ان" فرمایا مگر اس کے ساتھ یہ بھی صراحت  
 کر دی گئی کہ جہاں تک دین کا معاملہ ہے اس میں سب مسلمان علیحدہ ایک قوم ہیں اور تمام یہودی علیحدہ قوم  
 لیہود دینہم و المؤمنین دینہم۔ یہود کے لئے اپنا دین ہے گا اور مسلمانوں کے لئے اپنا دین،  
 اس کے بعد پھر تمام معاہدین کے لئے کہ جس میں یہود مدنیہ بھی شامل ہیں یہ عام دفعات تحریر کی گئیں۔  
 دن بینہم المصر علی من حارب اور یہ ضروری ہو گا کہ اس عہد نامہ کے حلفاء میں سے اگر کوئی  
 مل هذه لصیفة جنگ کرے گا تو تمام حلفاء کو اس کا ساتھ دینا ہو گا،  
 ن اندینۃ حرم و مل اس معاہدہ کے تمام معاہدین سے لئے مدینہ جاء امن و  
 هذه الصیفة حفاظت ہو گا۔  
 دن بینہم مصر علی من دھو جو بھی مدینہ پر حملہ کرے گا سب اہل معاہدہ کو متحدہ طور پر  
 یترتب اس کے مقابلہ میں مدد کرنا ضروری ہو گا۔  
 دنہم و دعویٰ صلح اور اگر یہود سے یہ کہا جائے کہ وہ مسلمانوں کے دوسرے  
 حلیف یہود ذلہم مصر حوہ ن حلیفوں کو بھی اپنا حلیف بنائیں تو ان کو ایسا کرنا ہو گا اور  
 دعویٰ ی مثل ذلک فاندہم اسی طرح گریہ مسلمانوں سے یہ مطالبہ کریں کہ ان کے  
 علی المؤمنین اس حارب اندین حلیفوں کو مسلمان اپنا حلیف بنائیں تو ان کو بھی ایسا کرنا ہو گا

# جمع قرآن پر ایک نظر

قاضی عبدالصمد ضامن سیوہادی

برہان میں جمع قرآن پر بعض مضامین نکلے ہیں، میں سی سلسلہ میں چند مسطور پیش کرتا ہوں امید ہے کہ اہل علم کے لئے اُن کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

قرآن مجید رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں بین الدفتین جمع ہو گیا تھا علامہ بدر الدین عینی نے شرح بخاری میں لکھا ہے ان الذین جمعوا القرآن علی عهد النبی صلی اللہ علیہ وسلم را یخصیہم عن دولایضبطہما حد۔

کنز العمال جلد اول میں ایک حدیث ہے کہ رسول کریم نے کچھ قرآن شگے ہوئے دیکھے تو فرمایا کہ یہ تم کو فریب نہ دیں خدا ایسے شخص کو عذاب نہ دے گا جسے قرآن یاد ہو، یعنی ان کے ہر دوسرے پر حفظ سے فائل نہ ہو جانا طبقات ابن سعد جلد دوم میں کئی حدیثیں ہیں جن میں قرآن جمع کرنے والے صحابہ کے نام آئے ہیں مجھے اس وقت تک پچیس نام تحقیق ہوئے ہیں، ابوداؤد میں حدیث ہے کہ رسول کریم نے فرمایا قرآن کو دشمن کی سرزمین میں نہ لے جاؤ، یہ صورتیں جب ہو سکتی ہیں کہ کوئی چیز مجلد ہو، قرآن کی تدوین شہادت بھی اس پر موجود ہے جا بجا کتاب کا لفظ آیا ہے کہیں صحف ہے صحف اور کتاب جب ہی کہا جائے گا جب کوئی مجموعہ لکھا ہوا مرتب ہو۔ اور (لا یمسہ الا الطہرون) چھوٹی وہی چیز جائے گی جو مکتوب و مجموع ہوگی، بعض اصحاب نے اپنے لکھے ہوئے قرآن حضور کو ملاحظہ بھی کرائے تھے، حضرت علیؓ کے متعلق روایت ہے (احد من جمع القرآن وعرض علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم

ایسی ہی روایت معاذ بن قتیبہ میں زید بن ثابتؓ کے متعلق ہے۔

شاید کسی کو خیال ہو کہ "جمع حفظ کرنے کو بھی کہتے ہیں ہذا عرض ہے کہ جمع کے معنی اکٹھا کرنا۔

ضم کرنا۔ تالیف کرنا۔ میں حفظ کرنا نہیں حفظ کے لئے جمع کا استعمال مجاز ہے مجازی معنی جب لئے جاتے ہیں کہ حقیقی معنی کا مراد لینا صحیح نہ ہو سکتا ہو۔

خود بخاری میں ہے **رَدَّ عَيْنَا جَمْعَهُ وَقَرَّاهُ تَأْلِيفَ بَعْضِهِ لِيُبْعَثَ فَاذْ قَرَّاهُ فَاَتَبَعَ قَرَّاهُ فَاذْ جَمَعَاهُ وَالْفَاءُ فَاَتَبَعَ قَرَّاهُ يَ مَ جَمْعُهُ فِيهِ وَيُقَالُ لَيْسَ مَشْعَرُهُ قَرَّانَ اِی تَأْلِيفُ**

جس جگہ صحابہ کے حفظ قرآن کا ذکر آیا ہے وہاں اکثر حفظ کا لفظ استعمال ہوا ہے، ابو موسیٰ اشعریؓ کے متعلق ہے (حقہ القرآن وعمرہ علی ابی بنی علی التذلیلہ وسلم۔ منقح جلد ۱ صفحہ ۳۵۵)

وفی سربا ض من حدیث ابو ثور انہ سہمی عن عثمان لقد جمعت القرآن علی عهد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تفسیر فتح الغریز کی اس عبارت کو پڑھنا چاہی دو ابن ابی داؤد و کتاب المصاحف و دیگر محدثان معتبر روایت کردہ اند کہ چوں مہرباں در فناء حضرت عثمان رضی اللہ عنہ برائے کشتن و آئندہ مصحف مجید پیش روئے ایشاں بود و می خواندند اول آن اشقیاء ہر دو دست ایشاں شمشیر زدند خون ایشاں جاری شد و بر ہمیں آیت افتاد فسیکفیکھم اللہ و هو السميع العلیم ایشاں بیک دست خود آن خون را از مصحف دور می کردند و می فرمودند کہ قسم بخدا کہ این دست قول دہتے است کہ نوشتہ است مفصل قرآن را

ان دونوں روایتوں کے ملائے کے بعد جمع سے مطلب تالیف حاصل ہوتا ہے۔

اسناد رحل علی رسول اللہ و هو بہی مکة و الحمد ینہ فکان انہ قد تاتنی اللیتہ جزء من القرآن فالی لا وتر علیہ شیء۔ کتاب المصاحف

اس روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کے پاس بہت سے جزوں پر قرآن لکھا ہوا تھا

تحدت القرآن جمع علی عهد رسول اللہ و علی عهد ابی بکر و کان کثیرون جمعہا فی مصاحف



یتلونها فی بیوتہم (دارۃ المعارف فرید و جدی)

اور بہت سی روایتیں اور اقوال ہیں جن سے صاف ثابت ہے کہ قرآن عہدِ رسولؐ میں مرمت و مکمل  
بین الدفین ہو گیا تھا۔

بخاری میں روایت ہے کہ جنگِ یمامہ میں بہت سے حفاظِ شہید ہو گئے تو حضرت عمرؓ نے حضرت ابو بکرؓ  
سے کہا کہ میری رائے ہے کہ آپ قرآن کو جمع کرنے کا حکم دیں بحثِ مباحثہ کے بعد حضرت ابو بکرؓ  
نے حضرت عمرؓ کی رائے کو تسلیم کر لیا، اور زید بن ثابتؓ کو اس پر مامور کیا زیدؓ کا بیان ہے کہ میں نے  
قرآن کو کھجور کے پتوں، پتھر کے ٹکڑوں، آدمیوں کے سینوں سے جمع کیا سورہ برات کی آخری آیت  
ابو خزیمہ کے پاس سے ملی یہ جمع شدہ قرآن عمر بھرا ابو بکرؓ کے پاس رہا ان کے بعد عمرؓ کے پاس رہا  
پھر ام المومنین حضرت حفصہؓ کو پاس ملا حضرت زیدؓ نے یہ بھی بیان کیا کہ یہ کام مجھ کو ایسا دشوار معلوم ہوا  
کہ اس کے مقابلہ میں پہاڑ کا ہٹا دینا سہل تھا۔

اس روایت سے حسب ذیل اعتراضات پیدا ہوتے ہیں۔

۱۔ جب رسول کریمؐ کی حیات میں قرآن جمع ہو کر مجلد ہو گیا تھا تو اب حضرت عمرؓ نے کس جمع  
کا مشورہ دیا۔

۲۔ جب قرآن بین الدفین تھا تو پھر کے ٹکڑوں کھجور کے پتوں سے کیوں جمع کیا گیا۔

۳۔ جب قرآن جمع شدہ تھا تو زید بن ثابتؓ کو اس قدر دشوار کیوں معلوم ہوا۔

۴۔ ابو خزیمہ جو آیت لائے وہ کسی اور کے علم یا تحریر میں تھی یا نہیں اور اس کا خصوصیت ہے

کیوں ذکر کیا گیا۔

ان اعتراضات کے جواب لکھنے سے پہلے ان چند امور کو ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۔ یہ کہ وہ زمانہ خلافت ابو بکرؓ کا تھا رسول کریمؐ موجود نہ تھے جن کی ہر بات پر سر خم ہوتے تھے۔

ابو بکرؓ رسول کریمؐ کے صحابی تھے اور بھی سب صحابی تھے بڑی مدت تک برادری برابر ہی کی صورت تھی دوم یہ کہ چاروں طرف ہنگامے برپا تھے، عرب میں ارتداد پھیل گیا تھا، مدعیان نبوت کھڑے ہو گئے تھے اسلام کے خلاف ہر قسم کی سازشیں جاری تھیں۔

سوم یہ کہ رسول کریمؐ کے عہد سے قرون ثلاثہ کے بعد تک محدثین وائمہ اُس راوی کو ضعیف سمجھتے تھے جو تحریر دیکھ کر روایت کرے بہ نسبت تحریر کے حفظ پر زیادہ اعتماد تھا۔

چہارم یہ کہ رسول کریمؐ کے عہد میں قرآن کے لکھنے والے تین قسم کے آدمی تھے ایک تو وہ جو کوئی آیت یا سورت اپنے یاد کرنے اور یا ورد کے لئے لکھتے تھے، یہ لوگ صرف بقدر حاجت لکھتے تھے، ان کو ترتیب وغیرہ کا نہ لحاظ تھا، نہ اس کی ضرورت تھی جیسے حضرت عمرؓ کے بیٹوں سعید بن زیدؓ کی پاس جو تحریر تھی جس کو حضرت عمرؓ نے ملاحظہ کیا اس میں یہ آیات لکھی ہوئیں تھیں۔

بسم الله الرحمن الرحيم - سبح لله ما في السموات والارض وهو العزيز الحكيم - ملوك السموات والارض يحيى ويميت وهو على كل شئ قدير (سورة صمد)

بسم الله الرحمن الرحيم . طه ما ازلنا عليك القرآن لتشقى الا تذكرة لمن

يخشى (نور ملامن خلق الارض والسموات العلى الرحمن على العرش استوى)

یہ آئیں مختلف سورتوں مختلف سپاروں کی ہیں یہ رواج اب تک بھی قائم ہے اہل ورد نے

دلائل الخیرات، حزب البحر وغیرہ میں جا بجا مختلف آیات جمع کی ہیں اور بعض نے پنج سورہ ہفت سورہ، دہ سورہ، مرتب کئے ہیں۔ دوسرے وہ تھے جو کسی آیت اور سورہ کو لکھتے تھے تو اس کے ساتھ

بطور یادداشت وہ ان کی تفسیر بھی لکھ دیتے تھے جو حضورؐ نے فرمائی۔ تیسرے وہ تھے جو آیات و

سورہ کو ترتیب سے لکھتے تھے جیسے زید بن ثابتؓ کی روایت ہے (نواف القرآن من الرقاع)

پنجم یہ کہ رسول کریمؐ امی تھے اور مکمل وحی آپ کو حفظ تھی آپ کو کسی تحریر کی حاجت نہ تھی

آپ صحابہ کے یاد کرانے اور لکھنے کے لئے لکھاتے تھے جو کوئی لکھتے تھے وہ حضور کے سامنے لکھ کر پھر اور صحابہ کو لکھاتے، جمع الزوائد جلد اول صفحہ ۶۰ پر ایک حدیث ہے زید بن ثابت کہتے ہیں کہ میں حضور کے سامنے لکھ کر صحیح کر کے پھر لوگوں میں لاتا تھا، اب ان تمام امور کو خیال میں رکھ کر اس حدیث پر غور کیا جائے تو یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ جنگ یمامہ میں بہت سے حفاظ شہید ہو گئے تو حضرت عمرؓ کو خیال ہوا کہ اگر ایسے ہی دد چار معرکے ہو گئے اور حفاظ شہید ہو گئے تو عام اعتماد کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا اور حفاظ کا خاتمہ ہو جائے گا، اور جو مجلدات تھے وہ گھریلو مجموعے تھے حضرت عمرؓ نے چاہا کہ ایک سرکاری جلد مرتب ہو جائے جو سب کے لئے سند اور حجت ہو کل کو کوئی یوں نہ کہہ سکے کہ یہ فلاں کا گھریلو قرآن ہے ہم کو اس پر اعتماد نہیں فلاں شخص کے پاس یہ ترتیب اس طرح ہے یا اس سوہبت کے ساتھ یہ آیتیں اور ہیں، اس مصلحت سے ایک جلد سرکاری مرتب کرانے کا مشورہ ہوا اور اس کا اہتمام اس طرح قرار پایا کہ نہ گھریلو مجلدات کو کافی سمجھا گیا نہ زید بن ثابت اور حضرت عمرؓ وغیرہ کی یاد کو کافی سمجھا گیا بلکہ اطمینان عام کی عرض سے منادی کرا دی گئی جس کے پاس رسول کریم کے سامنے کی تحریر ہے وہ معہ دو گواہ کے پیش کرے گا ہوں کی شرط اس لئے قائم کی گئی کہ کوئی شخص تفسیری جلوں کے متعلق جزو قرآن ہونے کا دعویٰ نہ کر سکے تفسیر پر شہادت نہیں مل سکتی کیونکہ وہ لکھنے والے نے اپنے گھر بیٹھ کر اپنے لئے لکھی ہے، اب حضور کے سامنے جو تحریریں ہوئیں وہ پھر اور کھجور کے پتوں وغیرہ پر نہیں یہاں یہ بھی ظاہر کر دینا ضرور ہے کہ عرب میں قرطاس وغیرہ بھی اگرچہ لکھنے کی چیزیں تھیں لیکن جس چیز کی پائیداری مد نظر ہوتی تھی وہ کھجور کے پتوں، پتھر کے ٹکڑوں، اونٹ کے شالون پر لکھی جاتی تھی اس زمانے میں لوگوں کا یہ خیال ہے پتھر کے ٹکڑوں سے مراد ایک ایک دودو انچہ کی کنکریں اور ہڈی معمولی حالت میں اور کھجور کے معمولی پٹھے ہوں گے لیکن یہ خیال غلط



ہے، لغت و تاریخ وغیرہ کی کتابیں دیکھیں تو معلوم ہو کہ سفید پتھر کی پتلی تیلی، چکنی چکنی تختی بنائی جاتی تھی اس کو لحاف کہتے تھے۔ بخاری کی حدیث میں بھی لوح کا لفظ ہے۔ (ومعدن اللوح) درخت کھجور کی شاخوں کی جڑ کے پاس مثل جڑ کے ایک کھال ہوتی ہے۔ اس کو گوند وغیرہ سے چکنا کر کے ورق بناتے تھے اس کو عیب کہتے تھے اس طرح اونٹ کے شانے کی لمبی چوڑی بڑی کو صاف کر کے تختی بناتے تھے، ہرن کی کھال کو صاف اور چکنا کر کے ورق بناتے تھے ان سے اور عام حفاظ سے قرآن جمع کیا گیا اس امر کو زید بن ثابت نے بغرض اطمینان عام بیان کیا ہے کہ نہ تنہا میں نے تنہا اپنی یاد سے جمع کیا نہ گھریلو جلدوں سے جمع کیا بلکہ ان تحریرات سے جمع کیا جو مختلف اشیاء پر حضور کے سامنے لکھی گئیں اور تمام حفاظ سے مدلی گئی۔ تاکہ کسی کو شبہ و شکایت کا موقع نہ ملے، یہ تمام اطمینان عام کے لئے تھا اور نہ صحابہ نے اپنے گھریلو قرآن بہت جلد مرتب کئے ہیں، حضرت علیؓ نے ایک قرآن تین دن میں محض اپنے حفظ سے مرتب کر لیا تھا یہ ان کے فائدان میں محفوظ تھا اس کو ابن الندیم نے ششہ میں دیکھا تھا اس نے لکھا ہے کہ اس کے چند ورق تلف ہو چکے تھے (الفہرست لابن الندیم)

صحابہ کی یاد اور حفظ ہی پر اگر نظر کی جائے تو اتنی طوالت کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی یہ طوالت یہ بیان خود بتاتا ہے کہ یہ ساری کارروائی اطمینان عام کے لئے کی گئی اور اس کو ظاہر کر دیا گیا۔

چونکہ وہ زمانہ عام شورش اور سازش کا تھا اس لئے ایسے کام کو اس خوبی سے سر انجام دینا کہ کسی کو شکایت و شبہ کا موقع نہ ملے، کوئی شریر کسی قسم کی بدظنی نہ پیدا کر سکے۔ بلاشبہ جو شورش لانا اور پہاڑ اٹھانے سے زیادہ دشوار تھا۔

ان مختلف تحریرات میں سورہ توبہ کی آخری آیت کسی کے پاس نہ نکلی وہ صرف۔

ابو خزمیہ لائے یہ تو ظاہر ہے کہ مختلف اشیاء پر تحریرات تھیں کسی پر کچھ آیتیں تھیں کسی پر کچھ سورتیں ایک ہی تختی یا ایک ہی چیز پر سب کچھ نہ تھا، اس لئے اس آیت کا ایک شخص کے پاس سے برآمد ہونا محل تردد نہیں ہو سکتا اور یہ بھی نہیں کہ اس کو کوئی بھوئے ہوئے تھا زید بن ثابت خود اس کے متعلق کہتے ہیں کہ جس کو میں نے رسول اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا اور پڑھا تھا اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقرأ بہا۔

لیکن چوں کہ ایک اصول مقرر کر دیا گیا تھا کہ حضور کے سامنے کی تحریرات معہ گواہوں کے لی جائیں، اس لئے زید اپنی یا اپنے شرکار کار کی یاد پر نہ لکھ سکتے تھے، آخر اس کو ابو خزمیہ لائے اور وہ ان کی شہادت پر قبول کی گئی اس کو بھی زید نے بنظر احتیاط بیان کیا ہے کیونکہ یہ بظاہر اس اعلان کے خلاف قبول کی گئی جو اعلان کیا گیا تھا کہ ہر تحریر کے ساتھ دو شاہد ہوں اور اس کو تنہا ابو خزمیہ کے بیان پر قبول کیا گیا اس کی وجہ یہ تھی کہ ابو خزمیہ کو رسول کریم نے ذوالشہادتین قرار دیا تھا یعنی ان کی ایک گواہی دو گواہوں کے برابر سمجھی جائے اور حضور کے عہد میں اس پر عمل ہوا تھا یہاں زید نے اس عمل پر تعامل صحابہ کو قائم کرنے کے لئے بیان کیا میرے خیال میں اس طرح اس حدیث پر غور کرنے سے تمام شکوک کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ اور قرآن مجید کی حفاظت پر پورا اطمینان ہو جاتا ہے کہ متفرق تحریرات کو لوگوں نے ایسا محفوظ رکھا کہ بلا اختلاف تمام قرآن مرتب ہو گیا۔

جب یہ قرآن مرتب ہو گیا تو حضرت ابوبکرؓ کے پاس رہا اس کے بعد حضرت عمرؓ کے پاس رہا اس قرآن سے نہ کوئی نقل ہوئی نہ کبھی کسی کا اس کو دیکھنا نہ کورسے جو صاف اس کی دلیل ہے کہ مکے لکھائے مجلد قرآن پہلے سے موجود تھے اور اس میں اور ان میں کوئی فرق ہی نہیں تھا جو کوئی نقل کرتا اور دیکھتا پھر غلیفہ کے پاس ہی رہنا بتاتا ہے کہ یہ سرکاری جلد تھی جو بغرض

المیّان عام جمع کر دی گئی تھی حضرت عمرؓ کے بعد وہ ام المومنین حضرت حفصہؓ کے پاس رہا حضرت عثمانؓ نے اس کو نہیں لیا کیوں کہ اس کی ضرورت ہی نہ تھی وہ خود کاتبِ قرآن تھے اور ان کے پاس جمع شدہ قرآن تھا۔

حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں بوجہ اختلافِ قراءت پر جمع قرآن کا معاملہ پیش ہوا۔ اور اب بھی بنظرِ احتیاط زید بن ثابتؓ ہی اس پر مامور کئے گئے۔ اور اس وقت بھی کسی کا گھریلو قرآن نہیں سامنے رکھا گیا نہ کسی کی یاد پر لکھا گیا، اب وہ سرکاری جلد کام آئی، اس کو منگایا گیا اور پھر بنظرِ احتیاط وہی منادی کرائی گئی کہ جس کے پاس عہدِ رسول کریمؐ کی تحریرات ہوں وہ معہ دو گواہوں کے پیش کرے، اسی طرح وہ تحریرات اس سرکاری جلد سے مقابلہ کر کے درج ہوئیں، احتیاط کی یہ انتہا ہے کہ آج بھی برسوں کے بعد وہ تحریرات ٹھیک اسی طرح لائی گئیں کسی نے اس میں کوئی تغیر نہیں کیا تھا، سورہ توبہ کی آخری آیت لانے والا آج بھی کوئی ابو خزیمہ کے سوا پیدا نہ ہوا اور وہ اسی طرح ذو الشہادتین کی شہادت پر قبول کی گئی۔

حاکم نے مستدرک میں روایت کی ہے (کہ قرآن تین مرتبہ مدون ہوا اول حفصہؓ کے زمانہ میں دوم ابو بکرؓ کے زمانے میں سوم عثمانؓ کے عہد میں)۔

اس موقع پر یہ عرض کر دینا بھی نا مناسب نہ ہو گا کہ قرآن کی سورتوں کی ترتیب تو قیفی ہے حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کے متعلق یہ کہنا کہ انھوں نے کسی دوسری ترتیب پر قرآن مرتب کیا تھا صحیح نہیں کسی دوسری ترتیب یا ترتیبِ نزولی پر کوئی قرآن مرتب ہو ہی نہیں سکتا حضرت علیؓ کے لکھے ہوئے سپارہ اور قرآن موجود ہیں حضرت ابن مسعودؓ کا لکھا ہوا قرآن "کتب خانہ شیخ الاسلام مدینہ" میں ہے جس کو کتب خانہ مذکور کے مدیر شیخ ابراہیم حمدی نے راقم سطور کو دکھایا تھا وہ اسی ترتیب پر ہے۔ اگر ضرورت ہوئی تو ترتیب کے متعلق علیحدہ مضمون



ارسال کیا جاسکتا ہے۔

آخر میں میں یورپین مصنفین و مودعین کے متعلق اس قدر عرض کرتا ہوں کہ اسلام کے متعلق ان حضرات کی تحقیقات مکمل نہیں نہ یہ علوم اسلامیہ سے پوری واقفیت رکھتے ہیں، انھوں نے اسلام پر خواہ مخواہ اعتراض کرنے کا ٹھیکہ لے لیا ہے، لہذا ان کے اکثر اعتراضات تہا بیت لچر ہوتے ہیں۔

اس سلسلہ میں یورپین محققین کی ناواقفیت کی ایک دو مثالیں لکھ کر میں اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

سر ولیم میور نے قرآن کے متعلق ایک نئی اصطلاح لکھی ہے جس سے کوئی مسلمان واقف نہیں اور جو کتاب میں مذکور نہیں یعنی وحی کامل اور اس کی تعریف یہ کی ہے کہ وحی کامل سے میری مراد بلا شک اس وحی سے ہے جو محمدؐ کے اخیر زمانہ میں موجود اور مروج تھی علاوہ اس کے جو شاید ضایع یا غارت یا غیر مستعمل ہو گئی ہو

اس تحریر سے جس کی ابتداء میں آپ نے کچھ اسلام کی طرف داری کی ہے مقصد غالباً تحت خط فقرہ ہے کہ آزاد خیال یورپ زدہ گروہ ہیں یہ خیال شائع ہو کہ قرآن کا کچھ حصہ ضائع بھی ہو گیا تھا۔ ورنہ اس کی کچھ اصل نہیں، قرآن کا کوئی حصہ ضائع نہیں ہوا یہ محقق کی ناواقفیت اور نقص تحقیق کا نتیجہ ہے آپ نے کسی اسلامی کتاب میں یہ دیکھ لیا ہے کہ رسول کریمؐ کے آخر زمانہ کے اقوال سند ہیں جن پر آخر میں عمل درآمد رہا ہو۔ یہ اصول احادیث کے متعلق ہر محقق صاحب قرآن کے متعلق سمجھ گئے۔

ہمفری پرٹوڈین آف ماروح نے لکھا ہے کہ محمدؐ کے پاس پوری نقل قرآن کی کاغذ پر لائی گئی تھی اور انھوں نے اس کو ایک صندوق میں رکھا تھا جس کا نام صندوق رسالت تھا۔

اس مصنف کے اس قول کو دیکھ کر کون مسلمان ہو گا کہ جس کو منسی نہ آئے گی صندوق رسالت سے کوئی مسلمان واقف نہیں۔

میں نے بہت کوشش کی لیکن مضمون پھر بھی طویل ہو گیا میں چاہتا تھا کہ کچھ عربی زبان کے متعلق بھی لکھوں لیکن مضمون کی طوالت نے قلم روک دیا، اگر جناب ایڈیٹر صاحب اجازت دیں گے تو آئندہ عربی زبان کے متعلق بھی اپنے خیالات پیش کروں گا۔

حرفے زاد و دانش و دیں است ایں کہ ما

بہر صلاح خاطر دانا نوشتہ ایم،

(۱) تفسیر محمدی۔ تفسیر ابن کثیر کا اردو ترجمہ۔ کتب تفسیر میں یہ وہی درجہ رکھتی ہے جو کتب اعماد میں صحیح بخاری، اس میں کلام اللہ کی تفسیر خود کلام اللہ سے پھر حدیث شریف سے پھر سلف صالحین سے معتبر دستند اور نہایت صحیح و مفصل ہے۔ ڈھائی ہزار صفحات قیمت اصلی ۲۵ روپے ناظرین برہان سے صرف ۱۵ روپے (۲) اعلام الموفقین کا اردو ترجمہ، اس کتاب میں علامہ ابن القیمؒ نے تمام اسلامی مسائل کا فلسفہ بیان کیا ہے اور بدلائل ثابت کیا ہے کہ یہ سب عقل سلیم کے مطابق ہیں صفحات ایک ہزار قیمت ۱۵ روپے رسالتی معر

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام خطبے اور وعظ معہ ترجمہ بطرز خطبہ، اس کے حصہ اول میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک سو چوبیس خطبے معہ ترجمہ و حوالہ اور دوسرے حصہ میں حضورؐ کے دو سو سینتالیس خطبے درج ہیں ہر یہ رعایتی ہے دو حصے صرف دو روپے عار۔ یہ تینوں کتب پتہ ذیل سے چوتھائی قیمت پیشگی بھیج کر طلب فرمائیے:۔

نیچر دفتر اخبار محمدی صدر بازار دہلی

# تلخیص ترجمہ

## اسوہ حسنہ

(مترجم مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی (فاضل دیوبند)

نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقی معجزوں کی عظمت و رفعت کے سامنے زمین اور آسمان پانی اور ہوا، صادر ہونے والا بڑے سے بڑا مادی معجزہ بے حقیقت معلوم ہوتا ہے۔ لاریب سرکار کے علم و علم، صبر و برداشت، تواضع و ایثار، صدق و اخلاص، اور عفو و درگزر کے کھلے معجزے، اہل عرب کے لئے، سنگریزوں کی تسبیح، پاندے کے انشاق، درختوں کی حرکت اور پتھروں کی نرمی سے زیادہ حیرت انگیز تھے یہ اس لئے کہ مادی معجزے کا ہنوں کی کہانت اور جادو گروں کے جادو سے ایک قسم کی ظاہری مشابہت رکھتے تھے لیکن روحانی معجزے اس شبہ سے بالکل خالی تھے، اگر اخلاقِ عالیہ و اوصافِ عالیہ کی زبردست طاقت آپ کے ساتھ نہ ہوتی تو صرف معجزات و خوارق کے بل بوتے پر ناممکن تھا کہ آپ اپنے پیروں کے دماغوں پر وہ دسترس حاصل کر سکتے جو آپ نے حاصل کی، اور دلوں کو اس طرح فتح کر سکتے جس طرح فتح کیا۔ آخر کیا بات تھی کہ بلال حبشی، صہیب رومی، عمار بنی یاسر، عامر بنی فہیرہ رضی اللہ عنہم نے سخت سے سخت تکلیفیں سہیں اور یا سر و جنیب رضی اللہ عنہا نے جسم و جان کے رشتہ کو قطع کرنا گوارا کیا مگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن کو چھوڑنا پسند نہ کیا یہ آپ کے ”خلقِ عظیم“ ہی کا کرشمہ تھا اسی لئے فرمایا گیا

وَلَوْ كُنْتَ فَظًا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَأَفْقَضَاكَ أَلَمْ تَرَ أَنَّكَ أَنْتَ مَرْسُومٌ لِّمَنْ تَرْضَىٰ عَنْكَ وَالَّذِينَ يُرِيدُونَ وَجْهَكَ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ



یہ سب آپ کو چھوڑ بھاگتے

من حوالث

آپ قوی دل اور بلند ہمت تھے، آپ اس قوم کو توحید کی دعوت دیتے ہوئے ذرا نہ جھجکتے جس کے متعلق آپ کو معلوم تھا کہ وہ ظالم و جابر، وحشی، خونخوار ہے اپنے مذہب کی اپنی آبرو سے زیادہ عزت کرتی ہے، اور اپنے بتوں سے اپنی اولاد سے زیادہ محبت رکھتی ہے اور جبکہ قول شائستہ سار کو اہل تہذیب و تمدن نے عجز و تعجب سے دیکھا ہے۔ کیا ہم ایک دیوانہ شاعر کے کہنے سے اپنے بتوں کو چھوڑ دیں گے۔ ذرا اس منظر کا تصور کرو، چاروں طرف دشمنوں کا مجمع ہے، ہر جانب کفر کا تسلط ہے، لیکن جب علم خداوندی پہنچتا ہے

فأصدع بها توهم مد عرض عن المشركين ثم جو علم دیا جاتا ہے کھول کر سناؤ اور مشرکوں کی پروا نہ کرو تو خدا کا اولوالعزم پیغمبر، سیدھا کوہ صفا پر جا چڑھتا ہے، اور نام بنام ایک ایک قبیلہ کو پکارتا ہے اور انہیں حق کا پیغام سناتا ہے، اور عذاب الہی سے ڈراتا ہے، آپ کی زبان سے یہ غیر متوقع کلمات سن کر کافر مذاق اڑاتے ہیں اور ایک بد بخت کہتا ہے تبارک یا محمد لہذا جمعنا لے محمد تم ہلاک ہو، کیا اسی نے تم نے ہم کو جمع کیا تھا؟ اور پھر آپ کی منظم مخالفت شروع ہو جاتی ہے،

آپ کو کفرستان میں اپنے دین کی کامیابی کا اسی طرح یقین تھا جس طرح رات کی اندھیری کے بعد دن کی روشنی کا یقین ہوتا ہے، قریش آپ کا مذاق اڑاتے تھے آپ پر فقرے کہتے تھے، لیکن آپ اطمینان و یقین کی پوری طاقت کے ساتھ فرماتے تھے۔

اے جماعت قریش! قحط ہے ہی دن بعد میری دعوت سے تمہارا انکار اقرار سے بدل جائے گا، اور مجھ سے تمہاری عداوت محبت میں تبدیل ہو جائے گی، آپ علیم و کریم تھے۔ آپ کی قوم آپ کی تذلیل و تحقیر اور تکلیف دہی میں کوئی کسر

نہ چھوڑتی تھی، آپ کی نورانی پیشانی پر کھڑ پھینکی جاتی تھی اور آپ کی پشت مبارک پر نجاست ڈالی جاتی تھی، لیکن آپ کے ماتھے پر بل نہ آتا تھا۔ ذرا سفر طائف کا نظارہ دیکھو، خدا کا مقدس پیغمبر خدا کے دین کا پیغام لیکر قبائل ثقیف میں پہنچا تو ان بد بختوں نے دعوت حق کا خندہ و استہزاء سے جواب دیا شہر کے غنڈے آپ کو چھپو لگا دئے، جنہوں نے اتنی سنگباری کی کہ آپ کی جبین مبین خونخون ہو گئی اور زخموں سے چور ہو کر بستی سے باہر ایک بلوغ میں پناہ گزین ہوئے اس حالت میں آپ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھایا تو فرمایا اے اللہ

ان لم یکن بک علی غضب فلا ابالی اگر تو مجھ سے ناراض نہیں تو میں ان تکلیفوں کی پروا نہیں کرتا آپ بلند ارادہ اور پختہ عزیمت تھے اپنی قوم میں تیرہ سال تک خدا کے دین کا بلا وادیتے رہے اس بلائے کو آپ کی قوم کے اگے دتے ہی خوش قسمت افراد نے قبول کیا لیکن ایوسی آپ کے پاس نہ پھسکی۔ مہربان چچا ابوطالب، جن سے کچھ پشت پناہی کی امید تھی جب ایک دفعہ دشمنوں کی دھمکیوں سے وہ بھی مرعوب ہو گئے اور کہنے لگے اے محمد تم مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو جسے میں برداشت نہ کر سکوں تو آپ نے بے پروائی کے ساتھ جواب دیا:-

اللہ کی قسم اگر میرے واسطے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند ملے کر کہا جائے کہ کامیابی یا موت سے پہلے میں اپنے مشن کو چھوڑ دوں تو بھی میں ہرگز نہ مانوں گا۔ سرکار اسی طرح اپنے فرض کی ادائیگی میں مصروف رہے حتیٰ کہ آپ کو وحی الہی کی زبان سے معلوم ہو گیا کہ مکہ دعوت اسلام کا مرکز اور نیر اسلام کا مطلع نہیں بن سکتا اب آپ نے اشارہ خداوندی کے ماتحت مکہ سے مدینہ کو ہجرت فرمائی جہاں اسلام نے گوشہ سکون کو چھوڑ کر راہ حرکت اختیار کی اور خاموش تبلیغ بلند آہنگ نعرائے تکبیر میں تبدیل ہو گئی۔ واقعہ ہجرت تاریخ اسلام کا سہارا سی لئے قرار پایا کہ وہ اسلام کی بلند روایات کا ایک بہترین نمونہ اور داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جذبہ ثبات علی الحق و جہاد فی سبیل اللہ کی ایک عمدہ یادگار ہے۔ حضور نے اپنے فرض منصبی کو ادا کرنے کے لئے اپنے وطن کو ترک کیا اپنے عزیزوں سے جدائی اختیار کی، پھر بھی مخالفین نے پیچ نہ چھوڑا انہوں نے آپ کو روکنے کی کوشش کی اس نے نہیں کر انہیں آپ کی جدائی شاق تھی بلکہ اس لئے کہ انہیں خوف تھا کہ کہیں آپ مدینہ میں اپنے

مددگاروں اور فداکاروں کی جماعت پیدا کر کے ان کی ایذا سے محفوظ رہ جائیں، گویا وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ آپ  
 داعی حق ہیں اور داعی حق کو حق پرستوں کے گروہ میں سے کچھ نہ کچھ پار و مددگار مل جاتے ہیں۔ ہجرت کی رات قریش نے  
 آپ کے حجرہ مبارک کے ارد گرد پہرہ لگا دیا مگر آپ ایک فداکار کو اپنے بستر پر لٹا کر اور ایک یار غار کو ساتھ لیکر بے پروائی کر  
 ساتھ قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہوئے باہر نکل گئے، کافروں نے آپ کا تعاقب کیا اور آپ کی گرفتاری کیلئے انعامات مقرر کئے  
 مگر آپ پہاڑوں کی چوٹیوں اور وادیوں کی گہرائیوں کو عبور کرتے ہوئے انکی دسترس سے باہر ہو گئے۔ پھر ذرا تواضع و  
 انکسار اور عفو و درگزر کی بھی شان دیکھو! فتح مکہ کے موقع پر یہی مظلوم و مقہور شخصیت حاکم و فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل  
 ہو رہی ہے دس ہزار شکر حجاز ساتھ ہے سواروں اور پیادوں سے زمین پٹی پڑی ہے، اسلامی جھنڈوں کے پھر یوں آسمان  
 ڈھکا ہوا ہے، ہر پر قید اپنے اپنے نشان امتیازی کیساتھ شانِ تکنت کیساتھ چلا جا رہا ہے سرکارِ نامدار بھی اپنی سواری قسوا پر  
 سوار ہیں، سر نیاز درگاہ بے نیاز میں جھکا ہوئے، فدا وند قدوس کی عظمت و کبریائی کا طیفہ زبان پر ہے اور اعلان کیا جا رہا ہے  
 "ایوم یوم المر محمد، ایوم نکسی الکعبہ" آج دن ہم کا دن ہے، آج کعبہ پر غلاف چڑھایا جائے گا، آج خدا قریش  
 ایوم یعنی اللہ قریشاً کو عزت عطا فرمائے گا۔

سرکارِ نامدار محرم میں تشریف فرما ہیں، مفتوحین کو قدم کانپ رہے ہیں، ہاتھ لرز رہے ہیں اور دل دھڑک رہا ہے کہ دیکھتے آج  
 ہمارے ظلم و ستم کا ہمیں کیا بدلہ ملے! رحمتہ العلیین صلی اللہ علیہ وسلم نے انکی طرف ایک نگاہ اٹھا کر دیکھا اور پوچھا ایک قریش  
 تمہیں آج مجھ سے کسی قسم کا سلوک کی توقع ہو؟ سب یک زبان ہو کر بولے آپ ہمارے شریف بھائی کے بیٹے ہیں، ارشاد ہوا اچھا  
 تو باذاتم سب آزاد ہو حضور پروردگار کی زندگی بہترین رہنما ہے جو اوصاف کریمہ اور اخلاق شریفہ کی ہموار راہوں سے انسانیت  
 کبریٰ کی اعلیٰ منزل پر پہنچتی ہے، اور آپ کی سیرت ایک بلند پایہ درس گاہ ہے جہاں یہ سیکھا جاسکتا ہے کہ کس طرح زبان کی سچائی  
 عمل کا خصوص اور لے کی خشکی کا میابی کا وسیلہ بن سکتی ہے اور کیونکر راہِ حق میں قربانی باطل کو ملیا میٹ کر نیک ذریعہ ہو سکتی  
 ہے۔ ہمیں فلاسفہ یونان، حکمت روم اور علمائے فرنگ کی سوانح حیات سے کیا مطلب؟ ہماری عظیم شان تاریخ کی کابری  
 میں ایک ایسی حسین کتاب موجود ہے جو سعی و عمل، صبر و ثبات، محبت و رحمت، حکمت و سیاست، اور شرف حقیقی و انسانی

کا مکمل نمونہ ہے، ہمارے ملک گاہی جو دوسرے طیبہ جو سرکارِ نامدار احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی دستخطی اضافہ



# ادبیتا

## دردناک مشاہدہ

زیر ترتیب کتاب نفیرِ فطرت کا ایک ورق

(از جناب احسان دانش صاحب)

جناب احسان دانش نے جو عمدہ مضامین اُردو شاعری کے دردِ سورتھ میں اپنے ایک طویل مہینے کے ساتھ ذیل کی نظم برہان کے لیے بطور ایک تذکرہ "خلاص" کے بھیجی ہے۔ ہم سے نہایت مسرت کے ساتھ شائع کرتے ہیں اور "دانش و احسان" کے مس ادبی تحفہ پریمِ قصب سے شکریہ پیش کرتے ہیں۔ (برہان)

(۱)

کل صبح ایک شخص پریشان و مضطرب	پامال روزگار، مسرت سے دور تر
بیٹھا تھا اک دور اسے یہ غم میں گھرا ہوا	سانسوں میں جاری تھی کھنچی خاکِ بگڑ
ٹوٹی سی ٹوکری میں سنگھاڑے لیے ہوئے	چلار لٹا تھا "پیسے کے لیج" داسیر بھر
گاہک مگر نہ کوئی بھی آتا تھا اس کے پاس	حسرت کی اٹھ رہی تھیں نگاہیں دھڑ دھڑ

(۲)

اتنے میں ایک شخص حیرت لیے ہوئے	باشان و باشکوہ و بانڈاز کروٹوں سے
ہلکی طرف بڑھا، تو یہ سمجھا وہ نامراد	"میری نوائے گرم گئی، دیں دھبہ گر"

لیکن یہ جب سنا "ابے محصول کرا دے"  
 مژدہ گپ کھلا کا کھلا سانس ٹرک گیا،  
 اس ششدری کے بعد رزنی زبان سے  
 "آیا ہوں جسے ایک بھی گاہک نہیں"  
 "محصول ک کہاں مجھے انکار کی جوں"  
 اس التجا پر طیش محسوس کو آگیا  
 ہالی میں جاگری وہ سنگھاڑوں کی فوگری  
 "بٹھسا ہے صبح صبح دور ہے کو گھیر کر"  
 انھی نہ جھکے سوگ میں ڈبی ہوئی نظر  
 کہنے لگا "ہو آپ کا رتبہ بلند تر"  
 "میں کیا کروں نہیں مری تقدیر سازگر"  
 "مہلت ہو اس قدر کہ جب آپ آئیں لوٹ کر"  
 ٹھوکر لگائی ایسی بچاڑے کے تان کر  
 چپ تھا غریب صنف کی تھامی ہو کر

(۳)

یہ ہے یہاں غریب کا معیار زندگی  
 یہ قدر آدمی کی یہاں آدمی کو ہے  
 پختہ کامیوں کی مدارات ادار  
 یہ فاقہ مستیوں پر سخاوت کی باتیں  
 یہ زندگی پر جو دستہائے زندگی  
 یہ ملک میں ہر عزت؛ شنگار ملک  
 یہ غمزدوں کے حال پر ہر لطف کی نظر  
 شرمائیں جس کو دیکھ کے جنگل کے جانور  
 یہ نامرادیوں پر عنایات! احمذہ  
 یہ ناتوانیوں پر کرم ہائے اہل زر  
 یہ خود نمایاں کہ بشر کا حشر و بشر  
 محصول دے سکیں تو کریں زندگی بہر

مذہب غلام، روح غلام، آبرو غلام

آزادی ضمیر نہ آزادی نظر

# ثمرات

از جناب نبال سیوہاری

جنونِ عشق کی کوئی ادائیگی نہیں جاتی  
 کنیرِ برگ تک ہوگا تلم مجسرتی کا  
 اٹھا ہوں ہمنوائے صورتِ بن کردیکھنا یہ ہے  
 وہاں سوچی گئی ہے خدمتِ عرضِ فنا مجھ کو  
 سمجھ لے یہ بھی ایسے پایاں ہستی سوچنے والے  
 ہوائے عشق پر آشوب تھی روزِ ازل کیسی  
 معاذ اللہ ہے ہنگامہ غم کس قدر دنیا  
 ہمیں بھی تلخی کام و دہن سے ساز آتا ہے  
 کبھی تمنا یہ تری جلوں کی منزل گاہ لیکن اب  
 نصائے عالمِ بیزنگ کیا خوش آنگی مجھ کو  
 بے باقی کا کوئی جام لے پیرِ میناں مجھ کو  
 دکھا کر اس نے جلوہ آئینے کو کر دیا حیراں  
 نبالِ محنتی گھٹائیں دیکھ کر میں پی ہی لیتا ہوں

اٹ جاتی ہے جب دنیا تو پہچانی نہیں جاتی  
 سکوں حاصل ہو جب تک پریشانی نہیں جاتی  
 کہاں تک ابنِ آدم سے تن آسانی نہیں جاتی  
 جہاں اہل وفا کی بات ہی مانی نہیں جاتی  
 نظر پایا ہستی تک آسانی نہیں جاتی  
 ابھی تک دل سے انسان کے پریشانی نہیں جاتی  
 کہ آوازِ شکستِ دل بھی پہچانی نہیں جاتی  
 نہ جائے زہرِ غم کی گرز آونی نہیں جاتی  
 ہسود کیا کہیں ہم جس کی دیرانی نہیں جاتی  
 وہاں بلو ا جہاں جلووں کی طغیانی نہیں جاتی  
 مری نظروں سے سیرِ عالم مانی نہیں جاتی  
 ازل کا ذکر ہے اب تک وہ حیرانی نہیں جاتی  
 شکستِ قہرِ جوس سے وہ نادانی نہیں جاتی



اب رہے زلزلوں کے اسباب تو اب تک غموں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ زمین کے نیچے جو آتش نشاں پہاڑیں اُن کے پھٹ جانے سے زلزلہ پیدا ہوتا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے بلکہ آتش نشاں پہاڑوں کا پھٹنا تو خود زلزلہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ زلزلوں کا مشہور سبب وہ سلسل تغیرات بنتے ہیں جو زمین کے اندر پیدا ہوتے رہتے ہیں اس کی تفصیل یہ ہے کہ زمین کے اوپر کا پھلکا بہت بڑا اور سخت ہے اور وہ زمین کی اندرونی سطح پر مرکوز ہے۔ زمین کی یہ اندرونی سطح حرارت کے خارج ہوتے رہنے کی وجہ سے سکڑاتی رہتی ہے۔ اس کا نتیجہ ابھی اس درجہ نازک صورت حال اختیار کر جاتا ہے کہ اُس سے چٹانیں پھٹ جاتی ہیں۔ زمین میں بڑے بڑے شکاف پیدا ہو جاتے ہیں اور جو پرانے شکاف ہوتے ہیں وہ وسیع ہو جاتے ہیں پادری تندر دت جو امریکہ کے علماء زلازل میں بہت مشہور ہے، بیان کرتا ہے کہ ایک مرتبہ بحر اٹلانٹک میں امریکہ کے کسی رحل کے قریب بہت تیز و تند آندھی چلی جس کی وجہ سے امریکہ کے خطہ کے کنارے پیہم تھپیڑے کھاتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمین میں زلزلہ آگیا لیکن اس قسم کے واقعات شاذ و نادر ہی پیش آتے ہیں۔

زلزلہ کا مرکز کسی ساحل کے قریب سمندر کی گہرائی میں ہوتا ہے تو اس وقت زلزلہ کے ساتھ سمندر کی موجوں میں بھی عظیم الشان تلام پیدا ہو جاتا ہے، اور اس کی وجہ سے خوفناک مہلاب رونما ہو کر بڑی بڑی عمارتوں کو مہندم کر دیتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مرکز زلزلہ کے قریب سمندر کی جو گہرائی ہوتی ہے اس میں زلزلہ کے اثر سے اُتار چڑھاؤ پیدا ہو جاتا ہے اور اُس کے اثر سے پانی کی موجیں کبھی چاس چاس تدم اونچی و درکئی کئی سو میل لابی ہو جاتی ہیں اس طرح کے موج کو بعض لوگ مد جزر سے تعبیر کرتے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ ۱۵۵۰ء میں پرتگال میں ایک زلزلہ آیا تھا جو شہر لزبن تک پہنچا۔ اور جس نے چالیس ہزار جانیں تلف کر دیں اُس وقت

زلزلہ کا مرکز ساحل سے سو میل دور سمندر کی گہرائی میں تھا۔ اس زلزلہ کوڑکے ہوئے ابھی آدھ گھنٹہ ہوا تھا کہ سمندر میں موجیں اٹھنا شروع ہوئیں جن کی بلندی لڑبن میں ساٹھ قدم اور قاعدے میں تیس قدم اور جزائر پر ابھریں اٹھارہ قدم، اور آئرلینڈ کے ساحل پر پانچ قدم تھی۔ اسی طرح ۱۸۵۴ء میں جاپان میں ایک زلزلہ آیا تھا جس کے فوراً بعد ہی سمندر کی موجوں میں طغیانی پیدا ہو گئی، ان کی بلندی سمورا پر تیس قدم تھی اور انہوں نے خزرکار اس شہر کو صفحہ ہستی سے محو کر کے ہی دم لیا۔ اس زلزلہ کا مرکز جاپان کے ساحل سے سو میل کے فاصلہ پر تھا۔

## سوویت روس میں کتابوں کی شاعت

گزشتہ سال روس میں ایک رپورٹ شائع ہوئی تھی جو بیس سال کی مطبوعات روس پر مشتمل ہے اس رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ سوویت روس کے لوگوں کو جنسی ادب کے ساتھ بڑی دلچسپی ہے۔ اور ان میں مطالعہ کا ذوق بھی بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ نیکسٹریسکو کی تالیفات ۳۰۰،۰۰۰۔ ڈی ہایورس کی کہانیاں ۳۰۰،۰۰۰۔ رومان رولانڈ کی تالیفات ۲۰۰،۰۰۰ کی تعداد میں شائع ہوئیں یہی حال شارل ڈکنز کے ناولوں کا ہے۔ وہ بھی اس تعداد میں شائع ہوئے ہیں۔ ہزک اور ناٹول فرانس کی کتابوں کی تعداد ۳۰۰،۰۰۰ سے بھی زیادہ ہے۔ اس سے زیادہ حیرت انگیز یہ امر ہے کہ بیس سال میں روس شیکسپیر کے ڈرامے دس لاکھ سے زیادہ شائع کر چکا ہے۔ اجنبی ادب کے علاوہ روس کو قدیم روس کے لٹریچر سے بھی کافی دلچسپی ہے۔ اور وہ بوشکین، جوجول، ترضیف، ڈسٹوفسکی اور ٹالسٹائی کی کتابیں بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔

لیکن یہ حیرت انگیز امر ہے کہ اس قدر ذوق مطالعہ کے باوجود آج کل روس میں کوئی عالمگیر شہرت رکھنے والا مصنف یا ادیب نہیں ہے غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ سوویت نظام کے ماتحت یہاں

ادبِ قلم کو مکمل تحریری آزادی حاصل نہیں ہے۔ درسِ طرح کی قید و بند ایک ادیب کے لیے زیرِ قفل سے کم نہیں ہوتی۔ اس بنا پر جو ادیب وہاں رہتے ہیں انہیں گھٹ گھٹ کر رہنا پڑتا ہے۔ جس سے اُن کی ادبی صدیچتیں گم ہو جاتی ہیں اور یہ وہ روس کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلے جاتے ہیں تو اُن کے کارنامے روس کی طرف منسوب نہیں ہوتے۔

اقبال اکیڈمی لاہور کا پہلا شاہکار

## یادِ اقبال

ہندوستان بھر کے معتد شعرا نے ترجانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد قبال کی بھلت پر جس گہرے تاثر اور حساس کے ساتھ طبعِ عقیقہ بندی کیا ہے، اہلِ ذوق سے پوشیدہ نہیں۔ ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ ہندوستان تو درکنار دنیا بھر کی کسی شخصیت کے متعلق اتنی کثرت سے مرتبے نہیں لکھے گئے۔ عوام تو عوام، خاص بھی اس کا صحیح اندازہ لگانے سے قاصر ہیں کہ اگر ان نظموں کو جیسا جیسے تو س کی کئی مجلدات ہو سکتی ہیں۔ اقبال اکیڈمی لاہور جس کا مقصد اقبال کے حیاتِ افروز پیغام کی نشر و شاعت ہے۔ اس کے کار پر دازوں نے سب سے پہلے ”پیغامِ حق“ ماہنامہ جاری کیا جو ایک ماں سے نہایت کامیابی کے ساتھ اپنے فرزندِ سرِ انعام سے رہا ہے۔ اب مہینوں کی تلاش و جستجو اور حفرِ زری سے بعد یہ مجموعہ تیار کیا ہے جس کا پہلا حصہ اقبالِ ذوق رکھنے والے صحابہ کراموں کو گرامر سنے کے لیے شائع ہو چکا ہے۔ قیمت غیر مجید نمبر ایک روپیہ علاوہ محصول ڈاک، مجلد غیر علاوہ محصول ملنے کا پتہ۔

دفترِ اقبال اکیڈمی، ظفر منزل، تاج پورہ۔ لاہور



## تبصرہ

الفاروق کا انگریزی ترجمہ | از مولانا ظفر علی خان صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۳۰۰ صفحات کا غزنیہ اور عمدہ ٹائپ جلی اور صاف، ڈسٹ کو رہنمائی خوبصورت قیمت ۱۵ روپے کا پتہ: شیخ محمد شرف بک سلیزینہ ٹیکہ

کتاب الفاروق مولانا شبلی نعمانی کی تصنیفات میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ فارسی اور ترکی زبان میں اس کے تراجم ہو چکے ہیں۔ اب یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ مولانا ظفر علی خان صاحب کے قلم سے اُس کے پہلے حصہ کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا ہے۔ مولانا ظفر علی خان اردو کی طرح انگریزی کے بھی ادیب ہیں، اور پھر اُن کا یہ ترجمہ کیا ہوا بھی اُسی زمانہ کا ہے جبکہ اُن کے عہد شباب کے ساتھ اُن کا قلم بھی جوان تھا۔ یہی دیکھ رہے ہیں کہ وہ مولانا شبلی کی تحریر و انشاء کی خوبیوں کو انگریزی زبان میں اعلیٰ حالہ قائم رکھنے میں پوری طرح کامیاب رہے ہیں۔ حق یہ ہے کہ فاضل مصنف کی کتاب الفاروق کے ترجمے کے لیے لائق تترجم سے بہتر کوئی دوسرا شخص مشکل سے ہی دستیاب ہو سکتا تھا۔

مگر بعض جگہ ناموں میں غلطی رہ گئی ہے مثلاً ص ۶۸ پر حدیث کے ذکر کے ماتحت ایک نام Bashar لکھا ہے حالانکہ صحیح بشر ہے اور اس لیے Bishre لکھنا چاہیے تھا۔ اسی طرح صفحہ ۶ پر بجائے عوانہ کے عواط لکھا ہے۔ اسی طرح انگریزی میں بنی امیہ کے لیے Omayyad یعنی ڈی کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ اس کتاب میں بغیر ۱۵ کے لکھا ہوا ہے۔ اس طرح کی چند معمولی فریادگذاشتوں کو چھوڑ کر ترجمہ نہایت عمدہ سلیس اور رواں ہے۔ مسلمانوں کو شیخ محمد اشرف صاحب کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے الفاروق کا یہ انگریزی ترجمہ شائع کر کے ایک مفید اسلامی خدمت انجام دی ہے۔ اُمید ہے انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب اس کی قدر کریں گے۔ خدا کرے الفاروق کے دوسرے حصہ کا ترجمہ

بھی جلد شائع ہو کہ مولانا شبلی کو خود بھی اُس پر بڑا ناز تھا۔

**نقوش سلیمانی** | مولانا سید سلیمان ندوی قلعہ کلاں ضخامت ۳، ۴ صفحات۔ کتابت طباعت اور کاغذ بہتر قیمت مجدد سے، پتہ :- مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی ونئی دہلی۔

اس مجموعہ میں مولانا سید سلیمان ندوی کی وہ تمام مختلف علمی ادبی اور تاریخی تحریریں اور تقریریں یکجا کر کے شائع کی گئی ہیں جو آپ کی زبان و قلم سے مختلف مواقع و مجالس میں نکلیں۔ ان تقریروں اور تحریروں کے علاوہ بعض اُردو ادب سے متعلق اور مضامین بھی ہیں جو مقالات کی صورت میں معارف یا دوسرے رسائل میں شائع ہوئے تھے۔ یہ مجموعہ ہندوستانی زبان و ادب سے متعلق مفید کاغذ یاد سلومات کا ایک عمدہ ذخیرہ ہے جس سے اُردو زبان کی تاریخ، اُس کی علمی و ادبی وسعت زبان کی خصوصیات، اُس کی تاریخی اور لسانی اہمیت ہندوستان کے مختلف علمی و ادبی اداروں کا حال مصنفین اُردو کے کارنامے بعض مصنفین اُردو کے نجی حالات۔ اُن کے خصائص تحریر و خدمات یہ سب چیزیں ایک ہی جگہ اکٹھی نظر آتی ہیں بعض مصنفین و شعراء اُردو پر مولانا نے جو تبصرہ کیا ہے اُس سے دوسرے ارباب نظر کو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اس مجموعہ کا یہی فائدہ کیا کم ہے کہ اس سے ہندوستان کے ایک نامور مورخ و عالم کے منتشر ملفوظات و خیالات معلوم ہو جائیں۔

نماز کا ظاہری حصہ اس کے باطنی حصہ سے افضل ہے | از جناب مولانا اصغر علی صاحب بی۔

قلعہ کلاں ضخامت ۶، صفحات کتابت طباعت اور کاغذ متوسط قیمت ۴۔ پتہ :- کوہ رٹ ۳، لیک اسکواٹرنی دہلی۔

آج کل بعض ضرورت سے زیادہ روحانیت کے خلبکار عموماً کہتے ہیں کہ نماز کا اصل مقصد تزکیہ نفس اور تصفیہ باطن ہے۔ اور پھر اس سے نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ جو لوگ نماز پڑھ پڑھ کر اس مقصد کو حاصل نہیں کر سکتے اُن کے لیے نماز پڑھنا نہ پڑھنا دونوں برابر ہیں۔ اس طرح کی باتوں کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جو

لوگ نمازی ہوتے ہیں اُن میں نماز کی طرف سے بددلی پیدا ہو جاتی ہے اور جو پہلے سے ہی بے نمازی ہوتے ہیں اُن کی خوشے بدگو بہانہ بسیار اٹھ آجاتا ہے۔ اس طرح کے مدعیانِ روحانیت کی تردید کے لیے ہی زیر تبصرہ کتاب کے لائق مصنف نے یہ رسالہ لکھا ہے۔

موصوف نے اس رسالہ میں وضاحت سے بتایا ہے کہ نماز کے ظاہری اوصاف اُس کے باطنی اوصاف سے افضل ہیں۔ اس سلسلہ میں ایمان اور عمل اور ولایت و تقویٰ کی جو ضمنی بخشیں پیدا ہو گئی ہیں اُن پر بھی ساتھ ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ اصل موضوع بحث کی توضیح میں عقلی اور نقلی درجہ اور صوفیانہ نکات ان میں سے ہر ایک سے کام لیا گیا ہے، کتاب بحیثیت مجموعی پچپ مفید و مطالعہ کے لائق ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ لائق مصنف کی پُر خلوص نیت و ارادہ و مسلمانوں کی اصلاح کا شدید جذبہ اس میں جگہ جگہ ظاہر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو حسن قبول عطا فرمائے۔

اجتماعی زندگی کی ابتداء | از پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم اے تقطیع خور و ضخامت ۱۱۲ صفحات کتابت طباعت اردو کاغذ بہتر قیمت ۸ روپے :- مکتبہ جامعہ دہلی و نئی دہلی۔

اس کتاب کے فاضل مصنف نئی اور مفید و ضروری معلومات پر آسان و عام فہم اردو میں کتابیں تصنیف کرنے کا بڑا اچھا سلیقہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ زیر تبصرہ کتاب میں انہوں نے جدید علماء معاشیات و اجتماعیات کی تحقیق کی روشنی میں یہ بتایا ہے کہ انسان کا ارتقاء کب سے اور کس شکل سے ہوا۔

اور اس میں عہد بہد کیا کیا تبدیلیاں پیدا ہوتی رہیں۔ پھر انسان میں اجتماعی زندگی کی صورتیں کیا کیاری ہیں۔ ایسی کتابیں بے شبہ اردو لٹریچر میں قابل قدر اضافہ ہیں۔ اردو خواں اصحاب کو ان کی قدر کرنی چاہیے۔

امام ترک | مرتب محمد مرزا صاحب دہلوی صفحات ۲۸۶۔ کاغذ عمدہ کتابت و طباعت متوسطہ۔ سائز ۸ ۱/۲ قیمت ۵ روپے کا پتہ :- کتب خانہ علم و ادب اردو بازار جامع مسجد دہلی۔



یہ کتاب چالیس مختصر ابواب پر مشتمل ہے جس میں غازی مصطفیٰ کماں پاشا مرحوم کے سوانح زندگی پیش کیے گئے ہیں۔ اسے ترکی جدید کی تاریخ کمنا زیادہ موزوں ہو گا۔ اردو زبان میں یہ کتاب اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے جو صوں تاریخ نویسی کے پیش نظر بڑی حد تک شکوہ ثابت ہوئی ہے۔ اس میں غازی مرحوم کے وہ نظریات اور انقلابی پروگرام جو ترکی جدید کی تعمیر میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں کافی شرح و بسط کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ سٹڈ میں اتاترک مرحوم نے اپنی قوم اور اپنے وطن کی ترقی و فلاح کے لیے جو اچھے عمل مرتب کیا تھا، اس پر عمل کرتے ہوئے ترکی جمہوریہ کے ہر ایک شعبہ نے سٹڈ میں ترقی کی جوشاں آواز اور استعجاب انگیز شاں دنیا کے سامنے پیش کی وہ دنیا کی زندہ اقوام کی تاریخ میں ہمیشہ نمایاں رہیگی۔ اتاترک کے چھتیسویں باب میں انہی ترقیات پر اجمل لیکن جامعیت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔

سینتیسویں باب میں یورپ کی انسانیت سوز اور خونخوار سیاست کے درمیان ترکی کی موجودہ پوزیشن پر مؤلف نے اپنا فاضلانہ تبصرہ پیش کیا ہے۔ یہ دو باب تمام کتاب کی جان ہیں اور ان میں ترکی جمہوریہ کے موجودہ صدر، عظیم غازی عصمت اینوفا اور غازی کمال مرحوم کے قلبی ارتباط و عقلمند کو واضح و مدلل طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔

نوڈبک کی کسی تصویریں بھی شامل کتاب میں۔ ڈسٹ کوور کی تصویر میں مصور نے ایک خاص نظر کے ماتحت معنویت پیدا کرنے کی ناکام سعی کی ہے، جسے مغربی طرز کی اندھی تقلید اور کورانہ پرستش نے بہت زیادہ بڑھو مٹھی کا انگیز بنا دیا ہے۔ ۲۴

لالہ رُخ یہ انگریزی دب کی مشہور ترین مثنوی ہے جو ماس مور کی فیتیں برسوں کی مشق نگارش کا بہترین نتیجہ ہے اور انشائے لطیف کا نامور نمونہ! اس کے حقوق اشاعت پہلی بار مین ہزار گنی دے کر حاصل کیے گئے تھے۔ مغربی ادبیات میں تخیل شعری سحر کا رانہ رنگ آفرینیوں کے پیش نظر جن کتابوں

کو خصوصی اہمیت دیجاتی ہے۔ یہ ان میں ایک بہترین اور نمایاں فرد جیسے ہوئے ہے۔ اس مثنوی کی بنیاد ان ایشیائی تصورات پر ہے جنہیں الفاظ کا پیراہن پہنا دینے کے بعد صرت شاعری کہا جاسکتا ہے اس میں چار قصے ہیں جو درحقیقت کے لحاظ سے سرتاپا "الف لیلہ" "ظلم ہوشربا" "داستان امیر حمزہ" "درفانہ عجائب" وغیرہ جیسے لٹریچر میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔ ان میں "آتش پرستان فارس" دوسرے قصوں سے زیادہ اچھا ہے: — "لالہ رخ" کو اردو زبان میں منتقل کرنے کا سہرا لطیف الدین احمد صاحب اکبر آبادی کے سر ہے جو بقول نیاز فتحپوری نگار کے "اکتشافات ادبیہ" میں سے ہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ نگار کی شہرت و مقبولیت میں خود لطیف صاحب کا بہت بڑا حصہ ہے ("لالہ رخ" نگار کے ابتدائی پرچوں میں بالاقساط شائع ہو چکی ہے، اور لطیف صاحب کا ترجمہ اصل سے کسی حیثیت میں بھی کم نہیں تجنیس کی وہی نزاکتیں، انداز بیان کی وہی شیرینی و لطافت، کیفیات کی ترجمانی کے لیے اسی قسم کے سرشارانہ الفاظ۔ غرض سب کچھ اصل کے ہم یا یہ ترجمہ میں موجود ہے۔ درحالیکہ یہ شراک نہیں بلکہ نظم کا ترجمہ، اور ظاہر ہے ایسی صورت میں اصل کی ساری خوبیوں کو برقرار رکھتے ہوئے کامیابی حاصل کر لینا کوئی سہل کام نہیں لیکن لطیف صاحب اس مثنوی کے ترجمہ کی ہر ایک پیچیدہ و نازک وادی سے بہت خوبی کے ساتھ گزرے ہیں، ورنہ ان کی اس خوبصورت روانی میں کہیں بھی کوئی رکاوٹ یا غرض محسوس نہیں ہوتی اگرچہ انہیں اس مرحلہ کو طے کرنے کے لیے بیشتر تصرفات سے کام لینا پڑا ہے۔ کتاب میں متعدد تصاویر بھی شامل ہیں کتابت معمولی۔ کاغذ و طباعت عمدہ صفحات ۲۶۱ تقطیع ۳۰×۳۳ قیمت مجلد ۱۰ روپے علم و ادب دہلی سے طلب کیجیے "م"

**حیدر علی** | یہ ایک تاریخی ناول ہے جس کے مصنف "تاریخ جنوبی ہند" کے فاضل مولف محمود خان صاحب محمود ہیں، اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناول شرر مرحوم کے انداز نگارش کو پیش نظر رکھتے ہوئے لکھا گیا ہے، جس سے محمود صاحب بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ پلاٹ کی پیچیدگی کو بڑھانے اور اس

میں "انسانیت" پیدا کرنے کے لیے صرف بعض کردار تخلیل کی پیداوار میں باقی تمام واقعات تاریخی دستند ہیں جن کے خواجرات بھی اس میں درج کر دیے گئے ہیں۔ چند ابتدائی ابواب میں جہاں دیوداسیوں اور مندر کی مریوں کا ذکر آگیا ہے کسی قدر عربانی پیدا ہو گئی ہے لیکن جب واقعات ہی عربیاں ہوں تو ان کا اظہار و بیان کس طرح عربانی سے محفوظ رہ سکتا ہے؟ سلطان حیدر علی پر بعض متعصب مورخوں نے صواب سلطنت اور غدار ہونے کا حکم لگایا ہے۔ رفق مصنف نے اس غلط بیانی کی تردید نہایت خوش اسلوبی سے ایک ناول کے پیرایہ میں، مگر تاریخی واقعات کی روشنی میں کی ہے بحیثیت مجموعی یہ ایک اچھی تصنیف ہے اور مقصد کے اعتبار سے بہت بلند و قابل قدر! اس کی سب سے بڑی خوبی وہ "ڈرامائی پن" ہے جو ختم ہونے تک پڑھنے والے کو بے چین کیے رکھتی ہے۔ امید ہے کہ محمود صاحب کی یہ کوشش عام طبقوں میں بہت مقبولیت حاصل کر لگی۔ کتابت، طباعت اور کاغذ عمدہ صفحات ۱۸۴، تقطیع ۲۰، قیمت ۳ روپے ۱۲ اسٹونے کا پتہ محمد سراج الدین بک سیلر و پبلشر ڈکنسن روڈ بنگلور۔ ۴۴

**مسلمان بچوں کی پہلی کتاب** | زمقبول احمد صاحب سیوہاروی تقطیع خورد ضخامت ۳۶ صفحات کتابت طباعت اور کاغذ بہتر قیمت ۲ روپے :- اسلامی کتاب گھر سیوہارہ ضلع بجنور۔

مقبول احمد صاحب نے مسلمان بچوں کے لیے پانچ کتابوں پر مشتمل ایک دینی نصاب لکھنے کا ارادہ کیا ہے۔ یہ کتاب اس سلسلہ کا پہلا حصہ ہے۔ اس میں چند مشہور حضرات کی آراء کے بعد پہلے "ہمارا خدا" کے عنوان سے پانچ شعروں کی ایک نظم ہے، پھر خدا کی پہچان پر ایک سبق ہے۔ اس کے بعد بچوں کے سمجھانے کے لیے چند مفید باتیں ہیں۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، نماز، قرآن، اذان، رخصت اور مسجد سے تعلق بہت مفید سبق ہیں۔ اسی ضمن میں دو بچوں کا ایک مذہبی مکالمہ ہے۔ زبان نہایت آسان اور سلیس ہوئی ہے، اور انداز بیان بھی چست اور موثر ہے اس کتاب کا بچوں کے نصاب میں شامل کرنا بہت فائدہ مند ہوگا۔



مرثیہ اقبال | از اسد صاحب ملتانی تقطیع خورد ضخامت ۲۸ صفحات کتابت طباعت اور کاغذ عمد  
قیمت ۳ روپے کا پتہ :- دفتر روزنامہ شمس ملتان شہر۔

اسد صاحب ملتانی اردو کے روشناس شاعر ہیں۔ آپ کی نظمیں ہندوستان کے موقر رسالوں  
میں اکثر شائع ہوتی رہتی ہیں۔ یہ آپ کا ہی لکھا ہوا ایک درد انگیز مرثیہ ہے جو ڈاکٹر اقبال مرحوم کی وفات  
پر کہا گیا تھا۔ مرثیہ ترکیب بند ہے اور مرثیہ نگاری کے صحیح اصول پر لکھا گیا ہے۔ زبان بہت صاف  
ترکیب الفاظ چست اور بندشیں درست ہیں۔ اظہار حقیقت کے ساتھ شاعرانہ فلک پیمانی بھی کم نہیں ہے  
آئینہ کرامت | از حافظ محمود علی صاحب صائب تقطیع کلاں ضخامت ۲۸ صفحات کتابت

طباعت اور کاغذ بہتر قیمت درج نہیں۔ پتہ :- حافظ محمود علی صاحب ریاست راجن پور (گجرات)  
حضرت شاہ حافظ علی صاحب مرحوم انبیٹہ ضلع سہارن پور کے ایک بڑے خداریدہ بزرگ  
تھے۔ زیر تبصرہ کتاب آپ کے ہی حالات و سوانح میں ہے، اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے اس  
میں آپ کی کرامتوں اور زندگی کے حیرت انگیز واقعات کا ذکر زیادہ تفصیل سے کیا گیا ہے۔ شروع  
میں ایک منظوم حمد ہے۔ اور آخر میں ایک مرثیہ ہے جو لوگ صوفیائے کرام کی حکایات و کرامات سے  
دکھی رکھتے ہیں ان کے لیے اس کتاب کا مطالعہ دیکھی سے خالی نہیں ہوگا۔ اور اس سے انہیں  
ارشاد و ہدایت کی بعض مفید باتیں معلوم ہونگی۔

# رسائل سلسلہ تعلیم و ترقی جامعہ

اس وقت ذمہ : لغوں کے لیے اور درسیات کا کوئی سلسلہ موجود نہیں ہے بچوں کی کتابیں بڑی عمر کے لوگوں کے لیے نہ دیکھ پڑتی ہیں ورنہ مولویوں اس لیے ادارہ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی باغ بندیوں کے لیے رسائل کا یہ سلسلہ ترتیب دے رہا ہے اور تقریباً دو سو رسائل کا خاکہ تیار کیا گیا ہے جو بالغوں کے لیے نصیب تعلیم پر حاوی ہو گا۔ رسائل تعلیم و ترقی کی کتابت اور مضامین میں مدارج کا بھی لحاظ رکھا جائیگا۔ ان رسائل کا اصل مشاوریہ ہے کہ اردو پڑھنے کی بھی طرح مشق ہو جائے اور کتب بینی کا شوق پیدا ہوتا کہ آئندہ کتب خانہ تعلیم و ترقی کے ذریعہ، لغوں کی تعلیم کا سلسلہ خود بخود جاری رہے اور پڑھ لکھنا سیکھنے کے بعد آدمی پھر ن پڑھ نہ بن جائے۔ حسب ذیل رسائل اس سلسلہ کے شائع ہو چکے ہیں : زیر طبع ہیں ان کا سائز ہے : ہر سال کم و بیش سو صفحات کا ہے۔

تہذیب : لغات و لغتوں کے لیے۔ اس میں تہذیب کی تمام ضروری چیزیں اور رسائل غازیہ کے لیے ۶ صفحے قیمت ۱۰ روپے مکمل دو حصوں میں چھوٹی چھوٹی سلسلے درپائے الفاظ میں کہ اس کی کمی نہیں ہے جو غلطی و سہمی اعتبار سے خوب ہیں جیسے خدا : مغفرت کی بہت بات ہے کہ ان در دیکھ پڑاں میں کم پڑھ لوگوں کے لیے قیمت ۱۰ روپے نظمیں : مولوی شفیع الدین صاحب کی نظمیں کا مجموعہ ہے پہلی نظم حمد : دوسری دما : تیسری لغت : چوتھی ہم مسکن ہیں : سب سے ہمارا اسلام : پانچویں : حورنا ہے بھی کر لو : چھٹی : جاگو اور چکاڑ : قیمت ۱۰ روپے میونسپلٹی : صدیق اکبر : خط و کتابت : قومی گیت : ہمارا ہندوستان : ضلع کا انتظام : غزلیں : عمر فاروق : امامی بھی پڑھنے لگا : اردن دفتر : کتبہ جامعہ : دہلی : شاخیں : جامع مسجد دہلی : نواری دروازہ لاہور : امین آباد : کمنو : پرسیس بڈنگ : ممبئی :

# اسلام کا اقتصادی نظام

تالیف مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب سیداری

اس کتاب میں اسلام کے پیش کیے ہوئے اصول و قوانین کی روشنی میں اس کی تشریح کی گئی ہے کہ دنیا کے تمام اقتصادی نظاموں میں صرف اسلام کا اقتصادی نظام ہی ایسا نظام ہے جس نے محنت و سرمایہ کا صحیح توازن قائم کر کے اعتدال کا راستہ پیدا کیا ہے۔ اس وقت اقتصادی مسئلہ تمام دنیا کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ سرمایہ داری کی تباہ کاریوں سے تنگ آئی ہوئی قوموں کے سامنے سب سے اہم سوال یہ ہے کہ وہ کونسا نظام ہے جس کو اختیار کر کے ایک انسان کو انسانوں کی طرح زندہ رہنے کا حق مل سکتا ہے۔ آپ اگر اسلام کی اقتصادی دستوں کا مکمل نقشہ دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ضرور ملاحظہ فرمائیے۔ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہر صفحات ۲۶۴۔ قیمت مجلد ۴۰ غیر مجلد ۳۰

## سوشلزم کی بنیادی حقیقت

مترجم سید مفتی الدین صاحب شمس انیم لے

اشتراکیت کی بنیادی حقیقت اور اس کی اہم قسموں سے متعلق مشہور جریدے پر فیسر کانس ڈیل کی آٹھ تقریریں جنہیں پہلی مرتبہ اردو میں منتقل کیا گیا ہے، ان کے ساتھ سوشلزم کے حالات اور اس کی موجودہ رفتار ترقی کے متعلق مترجم کی کتاب سے ایک مبسوط و تحقیقی مقدمہ بھی شامل ہے، کتابت طباعت کا عمدہ نہایت عمدہ صفحات ۲۰۴۔ قیمت مجلد ۳۰ غیر مجلد ۲۰

## ہندوستان میں قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ

آزاد ہندوستان میں قانون شریعت کے نفاذ کی مکمل عملی تشکیل پر پہلا بصیرت افروز مضمون جس میں درحقیقت کے مقاصد کی تشریح، محکمہ قضا کی مالی مشکلات کے حل، قاضیوں کے انتخابی شرائط اور ان کے تبلیغی نصاب پر نہایت مفید اور جامع بحث کی گئی ہے۔ نیز مضمون کی تمہید میں موجودہ محاذوں کی تمام قابل ذکر دفعات پر زبردست تنقید کی گئی ہے۔ صفحات ۳۸۔ قیمت ۳۰

مینجر ندوۃ المصنفین قریول باغ نئی دہلی



## قواعد

(۱) برائے ہر گزیری مہینہ کی ۵ تاریخ کو ضرور شائع ہو جاتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ ظلم و زبان کے معیار پر پورے اُتریں برائے شائع کیے جاتے ہیں۔

(۳) بارچودا بہتیم کے بہت سے رسالے ڈاک خانوں میں شائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ تاریخ تک دفتر کو طے دے دیں، ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بلا قیمت بھیج دیا جائیگا۔ اس کے بعد شکایت قابلِ عمل نہیں سمجھی جائیگی۔

(۴) جواب طلب مور کے لیے اگر کالٹ یا جوابی کارڈ بھیجنے ضروری ہے۔

(۵) برائے کی صفحات کم سے کم تین صفحات، ہر دور ۶۰ صفحے سا مانا ہوتا ہے۔

(۶) قیمت سا مانا پانچ روپیے۔ ششماہی دوا روپیے بارہ آنے (مع معمول ڈاک) فی پرچہ ۸

(۷) مئی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھیے۔

ندوة المصنفین دہلی کا ماہوار رسالہ

# برہان

مترتب  
سعید احمد کسبر آبادی  
ایم۔ اے۔ فارمیل دیوبند

# ندوة المصنفین کی کتابیں الرق فی الاسلام اسلام میں غلامی کی حقیقت

تألیف مولانا سید احمد اجمہ۔ اے۔ پبلیشرز

کتب کے اس حصہ میں غلامی کی حقیقت اس کے مفادی اخلاقی و نفسی پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد بتایا گیا ہے کہ غلامی انسانوں کو خرید و فروخت کی بند کبڑوں میں سے پہلو کن کن قوموں میں پھیل چکا ہے اور اس کی صورتیں کیا تھیں، اسلام نے اس میں کیا تبدیلیاں پیدا کیں اور ان صدحوں کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا نیز منسوخ مصنفین یورپ کے بائبل اور یورپ کی عدالت خیریت میں غلامی پر موط بصرہ کیا گیا ہے۔

یورپ کے رہائے تانت و تبلیغ نے سلامی تعلیمات کو نام کرنے کے لیے جن حربوں کو کام کیا ہے ان تمام حربوں میں سیوری کا مسد بہت سی نوثر ثابت ہو ہے۔ یورپ امریکہ کے علمی و تبلیغی حلقوں میں اس کا مخصوص طور پر چرچا ہے اور یہ ترقی یافتہ ملک میں اس مسئلہ میں غلط فہمی کی وجہ سے سلامی تبلیغ کے لیے بڑی رکاوٹ ہو رہی ہے بلکہ مغربی قوم و غلبہ و غش ہندستان کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس کو ٹھنڈا کر رہا ہے۔ ایشیاء جدید کے قال میں اگر آپ اس باب میں سلامی نقطہ نظر کے تحت ایک محققانہ و یگانہ بحث لکھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ضرور دیکھیے۔ مجدد سے بغیر جلد پکار

## تعلیمات اسلام اور صحی قوم

تألیف مولانا محمد طیب صاحب مستم دار العلوم دیوبند فقہ اعزازی

مؤلف نے اس کتاب میں مغربی تہذیب تمدن کی ظاہر و باطنیوں کے مقابلہ میں اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام و اہمیت سے مسعودہ نہ زمین میں کیا ہے اور تعلیمات اسلامی کی جامعیت پر بحث کرتے ہوئے دماغ و واقعات کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ موجودہ عیسائی قوموں کی ترقی یافتہ ذہنیت کی مادی جدت طرز یاں سلامی تعلیمات ہی کے تاریخی آثار کا نتیجہ ہیں و جنہیں قدرتی طور پر سلام کے دور حیات ہی میں نمایاں ہونا چاہیے تھا۔ اسی کے ساتھ موجودہ تمدن کے انجام پر بھی بحث کی گئی ہے اور یہ کہ آج کی ترقی یافتہ عیسائی قومیں آئندہ کس نقطہ پر ٹھہرنے والی ہیں۔

نہایت مشائے مذہب سے مختلف ضمنی مباحث آئے ہیں جس کا اندازہ کتاب کے مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ کتابت طاعت علی سہ ماہی صفحہ ۱۱۱ کاغذ صفحات تقریباً ۲۰۵ قیمت غیر مجید ۲۰۰ روپے جلد پکار



# بُرْہان

شمارہ ۵

جلد چہارم

ربیع الثانی ۱۳۵۹ھ مطابق مئی ۱۹۴۰ء

## فہرست مضامین

۳۲۲	سید احمد اکبر آبادی	۱۔ نظرات
۳۳۳	" "	۲۔ ابو حفصہ فامعروف بن فیروز الکرخی
۳۳۵	مولانا محمد حفصہ الرحمن سبزواری	۳۔ معاہدہ یہود علی نقطہ نظر سے
۳۴۰	" "	۴۔ حضرت فوحؑ اور طوون فوحؑ
۳۴۴	س۔ ۱	۵۔ تلخیص و ترجمہ
۳۸۵	جناب احسان دانش، جناب ہمال	۶۔ ادبیات
۳۸۸	س۔ ۱	۷۔ شئون علیہ
۳۹۲	"ع"، "ح"، "م"	۸۔ تبصرے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

# نظرات

## فاکسار تحریک پر ایک نظر

لکھنے کو رچیت پور روڈ سے محمد یعقوب صاحب بٹ لکھتے ہیں :-

”آج کل علامہ شرفی کی تحریک فاکسار بہت حد تک مسلمانوں میں اثر انداز ہو رہی ہے۔ اور اس کے خلاف تنگ کے اکثر علمائے فتنے صادر فرما چکے ہیں لیکن زمانہ کے بیدار مغز لوگ عام مولویوں کے فتویٰ بڑیوں سے پہلے سے ہی تنگ آچکے ہیں اور حقیقت بھی یہ ہے کہ گنتی کے چند علمائے کو چھوڑ کر عام مولوی تنگ نظر حرجی ہر جگہ کام بستے بھی ہیں، ممکن ہے ان فتوؤں میں بھی یہی جذبہ کار فرما ہو۔ جہاں تک میں نے دیکھا آئندہ المؤمنین کے ارکان و علمائے تنگ نظریوں سے بالاتر ہیں۔ اس بناء پر جرات کی ہے کہ آپ کو تعجب دلاں کہ آپ اپنے موقر رسالہ ”برہان“ میں اس تحریک پر مکمل اور مفصل بحث کریں جس سے عام لوگ بڑی طرح مستفید ہو سکیں۔ اُمید ہے آپ میری اس گزارش کو معمولی سمجھ کر غرض زہنیں کریں گے۔ انتہی عفت۔“

میں میں شبہ نہیں آج کل فاکسار تحریک ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک ایسی تحریک ہے جس سے خاموش نہیں بچا جاسکتا۔ اس تحریک سے متعلق گزشتہ دو تین ماہ میں اس کثرت سے

رسالے اور مضامین شائع ہو چکے ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے ہم نے خود کچھ لکھنا غیر ضروری خیال  
 کیا۔ لیکن ہمارے سکوت کے ساتھ ساتھ پوچھنے والوں کا اصرار برابر بڑھتا رہا۔ چنانچہ مندرجہ بالا  
 خط ان متدرجہ خطوط میں سے ہے جو اس سلسلہ میں دفتر برہان میں موصول ہو چکے ہیں۔ ان خطوط  
 سے اندازہ ہوتا ہے کہ قارئین برہان میں ایک کثیر جماعت ان حضرات کی ہے جو برہان کے کارکنوں  
 کو تنگ نظر نہ سمجھنے کی بنا پر خاکسار تحریک ایسے مسائل میں ان کی رائے معلوم کرنے کا اشتیاق  
 ہی نہیں رکھتے بلکہ اس تحریک کے جواز و عدم جواز کا فیصلہ اسی کی روشنی میں کرنا چاہتے ہیں  
 ایسی ہی اصحاب کے لیے سطور ذیل قلمبند کی جا رہی ہیں جن میں مختصر چند اصولی باتوں کی طرف  
 اشارہ کر دیا گیا ہے۔

سب سے پہلی اور اصولی بات یہ ہے کہ دنیا کی ہر تحریک کسی خاص نصب العین اور  
 کسی خاص مقصد پر قائم ہوتی ہے۔ اور اس مقصد کی اچھائی اور بُرائی پر ہی اس تحریک کی اچھائی  
 اور بُرائی کا دار و مدار ہوتا ہے۔ اس لیے سب سے پہلے ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ خاکسار تحریک کا  
 مقصد کیا ہے؟ آیا وہ کوئی خالص 'سوامی' مقصد ہے یا وہ کوئی ایسا بین الاقوامی مقصد ہے  
 جس کی افادیت مسلمانوں اور دوسری قوموں سب کے لیے یکساں ہے۔ خاکسار تحریک  
 پر جب ہم اس زاویہ نگاہ سے غور کرتے ہیں تو اس عجیب و غریب حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے  
 کہ اس تحریک کا اب تک کوئی خاص نصب العین متعین ہی نہیں ہو سکا یعنی یہ نہیں کہا جاسکتا  
 کہ ان لوگوں کی منزل مقصود کیا ہے؟ انہوں نے کس مقام کو اپنے سفر کا منتہا بنایا ہے؟ اور یہ کہا  
 پہنچنا چاہتے ہیں؟ ایک طرف اس تحریک کے بانی کا علان یہ ہے:-

ہم اس تحریک کے اندر کم از کم دس لاکھ سپاہیوں کی یک پُر امن، پابند قانون،



قواعد ادا، مطیع خدا، اور منکر یا سوا، بے غرض، حکم ماننے والی خادم خلق، ہندو، مسلمان  
سکھ، عیسائی، پارسی، اچھوت، سب پر مشتمل ایک جماعت تیار کرنا چاہتے ہیں۔

(قول مفصل نمبر ۲)

پھر، ۱۔ نومبر ۱۹۴۹ء کے ”اصلاح“ میں پچیس لاکھ نئے خاکساروں کی بھرتی کے متعلق ایک  
سرکریٹ منع کرتے ہوئے یہ اعلان کیا جاتا ہے۔

ان خاکساروں کی بھرتی بلا کاغذ مذہب و ملت ہو۔ ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی،  
اچھوت، نگریز سب کے لیے کھلا دروازہ ہو۔“

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خاکسار تحریک خالص اسلامی تحریک نہیں بلکہ اس کی  
حیثیت کسی بین الاقوامی تحریک کی ہے۔ لیکن دوسری طرف جس چیز کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے  
وہ یہ ہے کہ خاکسار تحریک کا مقصد ”ملاؤ کلکتہ“ اور اسلام کی صولت و سطوت کو تمام دنیا میں از  
سر نو قائم کر دینا ہے۔ ایک سنجیدہ و متین شخص جب ان دو متضاد باتوں پر غور کرتا ہے تو حیرت و استعجاب  
میں غرق ہو جاتا ہے۔ اور وہ نہیں سمجھ سکتا کہ آخر اس تحریک کا خصوصی مطمح نظر کیا ہے؟ آپ کو دور  
جانے کی ضرورت نہیں قول مفصل کا مذکورہ بالا اعلان ذرا غور سے پڑھیے، آپ کو معلوم ہو گا کہ یہ چار  
سطریں ہی اپنے اندر کس قدر تضاد رکھتی ہیں۔ اس اعلان میں ایک طرف تو مشرقی صاحبِ خاکسار  
سپاسی کے لیے ”مطیع خدا“ اور ”منکر یا سوا“ ہونا شرط قرار دیتے ہیں۔ لیکن دوسری جانب وہ اس  
میں ہندوؤں اور عیسائیوں کو بھی شریک کرنا چاہتے ہیں۔ گویا مشرقی صاحب کے نزدیک ایک  
ہندو یا عیسائی بھی ”مطیع خدا“ اور ”منکر یا سوا“ ہو سکتا ہے۔ حالانکہ ایک ادنیٰ درجہ کا مسلمان بھی  
اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہے کہ اسلام میں کسی شخص کو صحیح معنی میں ”سوقت تک“ مطیع خدا نہیں  
کہا جاسکتا جب تک کہ اس کے اعمال کی بنیاد صحیح ایمان پر قائم نہ ہو۔ رہا ”منکر یا سوا“ تو سمجھ میں

نہیں آتا کہ اس کو مشرقی صاحب کی مذاہب سے بے خبری کہا جائے یا اُن کا حد سے زیادہ بھولا پن، کہ وہ ہندوؤں اور پارسیوں اور عیسائیوں کو بھی منکر ماسواہ قرار دے رہے ہیں۔

مشرقی صاحب کے بیانات کا تضاد یہیں تک محدود نہیں ہے، اگر اُن کی کتاب ”تذکرہ“ ”اشارات“ اور اُن کے رسائل و اخبارات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ امر بخوبی واضح ہو جائیگا کہ اس تحریک کے بانی کا دماغ یا تو کسی قطعی نصب العین کی قبین تشخیص سے کسر سہرا ہے۔ یا اگر کوئی نصب العین دماغ میں موجود ہے بھی تو اُس نے اب تک اُس کا اظہار نہیں کیا۔

پس ایسی حالت میں مشرقی صاحب کی آواز پر مسلمانوں کا اُن کے گرد و پیش جمع ہو جانا بالکل ایسا ہی ہے کہ ایک شخص جنگل میں کھڑا ہو کر شور و غل مچا رہے۔ لوگ نہیں سمجھتے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ مگر پھر بھی بے تحاشا اُس کی طرف دوڑے چلے جاتے ہیں۔ پھر جب وہاں پہنچتے ہیں تو انہیں معلوم ہوتا ہے کہ ایک دیوانہ اپنی دیوانگی کے جوش میں زور زور سے بڑبڑا رہا تھا، اور بے معنی الفاظ بک رہا تھا۔ اب ان کو اپنی فضول جدوجہد پر سخت ندامت ہوتی ہے، اور وہ اپنا سا منہ لے کر اپنے اپنے گھروں کو واپس آ جلتے ہیں۔

اور اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ خاکسار تحریک کا مقصد واقعی اعلا ر کلمۃ اللہ اور خلافت الہی کا قیام ہے۔ تو اب ہم کو اُن طریقِ عمل کا جائزہ لینا چاہیے جو عموماً خاکساروں کو اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ ہر شخص کو معلوم ہے، تحریک میں داخل ہونے والے کے لیے یہ عہد کرنا ضروری ہے کہ وہ اپنے امیر کو حاکم علیٰ الطریق مانے گا اور اُس کے حکم کی تعمیل وہ بے چون و چرا کریگا۔ اس نوع کا عہد و پیمان اسلامی اسپرٹ کے بالکل خلاف ہے۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی دعوت دی گئی ہے۔ اور حدیث میں صاف فظوں

میں ہے لاطاعۃً للخلق فی معصیۃ الخالق انما الطاعة فی المعروف۔ کون مسلمان نہیں جانتا کہ امر مطلق اور حاکم علی الاطلاق سوائے رب العالمین کے کوئی دوسری ذات نہیں ہو سکتی پس سمجھ میں نہیں آتا خاکسار تحریک کے علمبردار یہ کیسے نبوی اسلام کی شوکت و عظمت کا پرچم اڑانے چلے ہیں کہ پہلے ہی قدم پر ان کا رخ نجد کی بجائے شوالہ کی طرف مڑ گیا ہے۔ کیا کوئی مسلمان ایک لمحہ کے لیے بھی تصور کر سکتا ہے کہ جس عمارت میں مزود و فرعون، اور ہامان و شداد کے مجسمے جگہ جگہ نصب ہوں، اُس سے مسجد کا کام لیا جاسکتا ہے۔ اس طرح کی اطاعت مطلقہ کی دعوت اس چیز کی خمازی رتی ہے کہ یہ تحریک اسلامی روح سے کیسر خالی ہے، اور اس کا مقصد مسلمانوں کا تمکن فی الارض نہیں بلکہ خود اپنا تمکن و ترفع ہے، پھر روزِ مہر کی زندگی میں خاکساروں کے جواہر و افعال دیجھے گئے ہیں ان سے بھی صاف پتہ چلتا ہے کہ ان لوگوں کی ذہنی اور جسمانی تربیت و تنظیم خالص اسلامی طریقہ پر نہیں ہو رہی ہے جس کی وجہ سے ان میں شعائرِ دین کے احترام کا جذبہ کامل پایا جائے

گذشتہ ماہ رمضان میں جبکہ خاکسار مکتبہ میں یوپی گورنمنٹ کے خلاف مظاہرے کر کے کیلئے ہندوستان کے ہر گوشہ سے دہلی میں جمع ہو رہے تھے، اور انہوں نے اپنا کیمپ دفتر برائے ان کے قریب ہی قائم کر رکھا تھا۔ اس زمانہ میں صرف ہم نے نہیں بلکہ دہلی کے سینکڑوں انسانوں نے دیکھا ہے کہ خاکسار روزہ کے دنوں میں صبح شام جوق در جوق بوٹلوں میں پہنچتے تھے اور ہنڈا منٹ بانی کے ساتھ کھانا کھاتے اور چائے پیتے تھے۔ یہ تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ مسافر ہونے کی وجہ سے ان پر روزہ فرض نہیں تھا، لیکن اگر ان کے دلوں میں اسلامی شعائر کا کچھ بھی احترام ہوتا تو روزہ گزشتہ عام پر اس طرح میاکی کے ساتھ کھانا کھانے اور بازاروں میں سگرٹ سے پف اڑانے کی جہالت نہ کرتے۔ غرض کہ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ خاکسار



تحریک خالص اسلامی تحریک نہیں ہے۔ اور زبان سے ممکن فی الارض اور خلافت الہیہ کے قیام کے جو دعوے کیے جاتے ہیں وہ سراسر لغو اور بے بنیاد ہیں۔ اور اس بنا پر کوئی مسلمان ایک دقیقہ کے لیے بھی اس تحریک میں اس غرض سے شامل نہیں ہو سکتا کہ وہ اس تحریک کے ذریعہ دنیا میں سطوت حق کو قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیگا۔

ہاں بیشک کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک بڑا شخص کوئی تحریک لے کر کھڑا ہے۔ وہ لوگوں کو اس میں شمولیت کی دعوت دیتا ہے کسی مصلحت سے وہ اپنا خاص نصب العین ظاہر نہیں کرتا لیکن جب اس کے پاس لوگوں کا ایک کثیر مجمع اکٹھا ہو جاتا ہے اور وہ سب کسی ایک رشتہ و وحدت میں منظم ہو جاتے ہیں تو وہ یکا یک ایک مفید انقلاب عظیم برپا کر دیتا ہے، اس وقت تردد و تذبذب کی تمام تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں اور اس کے مخالفین کو بھی اس شخص کی عظمت کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔

لیکن یہ واضح رہنا چاہیے کہ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ اس تحریک کا قائد اپنے اخلاق و عادات اور کیر کڑ کے لحاظ سے دنیا کا کوئی غیر معمولی انسان ہو۔ اس کے برعکس خاکسار تحریک کے بانی کے اعمال و افعال کا جائزہ لیجیے تو یہاں بھی نہایت مایوس کن حالات نظر آتے ہیں۔ جو شخص اتنی بڑی تحریک کا قائد ہونے کے باوجود ایک معمولی گورنمنٹ (یوپی) سے معافی مانگ لے، اپنی بات سے ہٹ جائے اور اس پر دباؤ ڈالنے کی غرض سے گورنمنٹ آف انڈیا کو جنگ کے لیے پچاس ہزار خاکساروں کو پیش کش دینے میں ذرا شرم محسوس نہ کرے۔ پھر دلی میں گرفتار ہو تو پولیس کو دیکھتے ہی اس کے چہرہ کا رنگ فق ہو جائے اور آنکھوں میں آنسو ڈھک دیا۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایسا متلون مزاج، تھنق پسند کمزور دل و درڈر پوکا انسان اس

قابل ہے کہ اُس سے نصب العین کی تعیین کر لئے بغیر ہی ہزار در ہزار انسان اس کو اپنا قائد تسلیم کر لیں، اور اطاعتِ مطلقہ کے عہد و پیمان کے لیے اُس کے ہاتھ پر بیعت کریں، اور اپنی موت و حیات کے لیے اُس کے فیصلہ کو ناطق قرار دیں۔

✽

اس گزشتہ سے یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ خاکسار تحریک نہ تو اپن کوئی ایسا متبعین نصب العین رکھتی ہے جس کو اسلامی نصب العین کہا جائے۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اسلامی یا غیر اسلامی اُس کا کوئی اجتماعی نصب العین ہے ہی نہیں اور نہ اس تحریک کا بانی اپنے کیر کڑ کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ مسلمان اُس پر عہد کر کے اُس کے ہاتھ پر بیعت کر لیں اور بے سوچے سمجھے اُس کی پیروی کرنے لگیں۔

اب ہم اُن چند چیزوں کی طرف اشارے کرتے ہیں جو عموماً مسلمانوں کے لیے اس تحریک میں شمولیت کی داعی بنی ہوئی ہیں، وہ چیزیں یہ ہیں

(۱) فوجی تنظیم (۲) جسمانی ورزش (۳) ایک خاص ڈسپلن (۴) خاکساروں کی غیر معمولی بہادری اور پامردی۔

اؤں ان کچھ چیزوں پر گفتگو کرنے سے قبل ایک مرتبہ پھر آپ کو یہ یاد کر لینا چاہیے کہ اُس وقت آپ کو خاکسار تحریک سے متعلق اپنے ذہن میں صرف یہ تصور قائم رکھنا چاہیے کہ وہ محض ایک تنظیمی یا معاشرتی تحریک ہے۔ اب اس حقیقت کو ہمیشہ نظر رکھتے ہوئے اس پر غور کیجیے کہ تنظیم ہی سے خود کوئی مقصد نہیں ہے۔ اور اس لیے جو کام محض تنظیم کے لیے کیا جائیگا وہ کبھی کبھی نتیجہ کا بیاب نہیں ہو سکتا مسلمانوں کی تنظیم کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان میں اسلامی ربط اسلامی نظم، اور اسلامی وحدت خیال و عمل پائی جائے پس ہر وہ تنظیم

جس کی مسلمانوں کو دعوت دی جائے انہیں سوچنا چاہیے کہ اس پر عمل پیرا ہو کر وہ کس حد تک اپنے اسلامی مقاصد میں کامیابی حاصل کر سکتے ہیں! اس نقطہ نظر سے ہم خاکساروں کا تنظیمی پروگرام دیکھتے ہیں تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں شامل ہو جانے سے مسلمانوں کو فائدہ بہت کم اور مضرت شدید پہنچ جائیگی۔ فائدہ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ اُن کو فوجی قواعد کی مشق ہو جائیگی اُن کے جسم و رزق کے اثر سے چست اور موزوں ہو جائینگے لیکن روحانی، اخلاقی اور دینی اعتبار سے اُن کو جس ضرر عظیم کے پہنچ جانے کا اندیشہ ہے شاید مسلمانوں کے لیے اس وقت اس کا تصور بھی دشوار ہے۔ ذرا سنجیدگی سے سوچیے۔ آپ کو جو شخص اپنی رہنمائی میں لے کر چل رہا ہو وہ اپنے دینی عقائد اور ذاتی کیر کڑ کے لحاظ سے کس درجہ ناقابل اعتبار شخص ہے۔ پھر وہ آپ کے صرف یہ نہیں کہتا کہ میں اپنی تحریک سے تنظیم قائم کرنا چاہتا ہوں۔ بلکہ علی الاطلاق اور بڑے اصرار کے ساتھ وہ آپ کے اسلام کا مذاق اڑاتا ہے، اُس پر پمپتیاں گستاخے، آیات میں کھلی تحریف کرتا ہے۔ احادیث کا منکر ہے۔ اور دعویٰ یہ کرتا ہے کہ میں مصنوعی، دررسمی اسلام کو مٹا کر ”نبوی اسلام“ کو قائم کرنا چاہتا ہوں۔ ایسے شخص کی قیادت میں اگر آپ کسی تنظیمی تحریک کے ممبر ہو گئے ہیں تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کا معاملہ صرف جسمانی اور فوجی تنظیم تک محدود رہیگا اور اس سے گزر کر وہ آپ کے ایمان، اخلاق، اور اسلامی خصائل تک نہیں پہنچے گا؟ پہنچے گا۔ اور ضرور پہنچے گا۔ پس اگر آپ خاکسار تحریک میں شامل ہوتے ہیں تو دبان سے یہ کہہ کر اپنے نفس کو اور دوسروں کو فریب نہ دیجیے کہ آپ محض تنظیم کی خاطر اُس میں شریک ہو رہے ہیں۔ بلکہ یقین کر لیجیے کہ آپ کے قائد کی بے راہ روی ایمان و عمل دونوں کے اعتبار سے ایک دن آپ کو قمر ہلاکت میں گرا کر رہیگی۔



رہی چوتھی چیز یعنی خاکساروں کی دلیری و مردانگی اور ان کی جفاکشانہ زندگی، تو اس کے جواب میں آپ کو اصولی اعتبار سے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ خواہ کوئی عمل فی حد ذاتہ کتنا ہی اچھا اور لائق تحسین ہو لیکن اگر اس کی بنیاد حسن نیت، پاک ارادہ اور مقصد خیر پر نہیں ہے تو مضابطہ اخلاق میں کبھی اس کی تعریف نہیں کی جائیگی اور اس کو فضائل میں شمار کرنے کے بجائے ردائے کی فرست میں ہی شامل کیا جائیگا۔ آپ کو معلوم ہے جس طرح ایک جہد کرنے والی فوج میں جذبہ ایثار و مذکاری، خاص ڈسپلن، اطاعتِ امیر کا جذبہ، اور وحدتِ خیال و عمل پائی جاتی ہے، ٹھیک اسی طرح ڈاکوؤں اور میٹروں کی منظم اور باقاعدہ جماعت میں بھی یہی اوصاف پائے جاتے ہیں، پھر دلیری و پامردی جماعتِ حقہ کی ہی خصوصیت نہیں، بعض اوقات باطل پرست بھی حق کے مقابلہ میں جبرتِ انگریز شجاعت و بہالت کا اظہار کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں ان افعال کو ہم اخلاق کی روشنی میں شجاعت سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ یہ فعال شجاعت نہ ضرور ہوتے ہیں۔ وراس بنا پر وہ دیکھنے والوں اور سننے والوں کے دلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

جن لوگوں نے خوارج کی تاریخ پر بھی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ فرقہ سراسر گمراہ ہونے کے باوجود اپنے خیانت و عقائد میں نہایت راسخ تھا۔ ان کے مرد تو مرد، عورتیں تک اس درجہ پختہ خیال و ردیہ تھیں کہ ان کو شدید سے شدید جسمانی اذیتیں پہنچی گئیں، ان کے اعضاء کاٹ کاٹ کر دوپہ کے وقت پیٹے ہوئے ریت پر انہیں تڑپنے اور سسکنے کے لیے کھلے میدانوں میں ڈال دیا گیا لیکن ایک لمحہ کے لیے ان کے خیالات میں تذبذب پیدا نہیں ہوا، اور پوئی تڑپ تڑپ کر جان سے دی۔ عجب تقفی ایسا ظالم و جابر آدمی گو نہ ان پر طرح طرح کی سختیاں کرتا تھا لیکن یہ پھر بھی اپنے عموں و انصار سے باز نہیں آتے تھے تھے۔ دور کیوں جلیے، ایران

کے فرقہ پر یہ کو دیکھیے ان کو کیسی کیسی سختیوں سے دوچار مہنا پڑے لیکن یہ لوگ اپنے عقائد و خیالات سے تائب نہیں ہوئے۔

ان حالات میں آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ لوگ بڑے مستقل مزاج تھے اپنے خیالات میں نہایت مضبوط اور پختہ تھے لیکن یہ تو نہیں کر سکتے کہ ان کے استقلال کو دیکھ کر ان کے خیالات و عقائد کو بھی قبول کر لیں۔ بس اسی پر خاکساروں کی بہادری اور جانا بازی کو قیاس کر لیجیے۔ اس جماعت نے جس انداز سے بلند شہر اور لاہور کے واقعات میں اپنے سینہ پر گولیوں کاٹیں اور جان دی ہر شخص کو پورا حق ہے، اس حادثہ پر اظہارِ افسوس کرے نہ صرف اظہارِ افسوس کرے بلکہ اپنے دل میں اُس کی چین محسوس کرے۔ تاہم اس سے متجاوز ہو کر یہ نتیجہ نکالنا کہ انہوں نے جس تحریک کی خاطر یہ اقدام کیا ہے، وہ بھی درست اور صحیح ہے۔ سراسر ایک خطرناک مخالطہ اور طاقت انگیز ذہنی عدم توازن ہے۔

جن لوگوں نے نفسیات اجتماع کا مطالعہ کیا ہے انہیں معلوم ہوگا، موسیولیہان کے نظریہ کے مطابق کسی تحریک کے قائد کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے زورِ تقریر یا زورِ تحریر سے اپنے پیروں کے دل و دماغ کو اس درجہ مفلوج کر دے کہ وہ بے سوچے سمجھے اُس کی آواز پر لبیک کہنے کے لیے ہر وقت تیار رہیں۔ یہاں تک کہ انہیں اس راہ میں اپنی جانیں تلف کر دینے میں بھی دریغ نہ ہو۔ پس آج کل ہی حال خاکسار تحریک کا ہے۔ ایک آواز ہے جس کے پیچھے لوگ دوڑے پیسے جا رہے ہیں۔ ایک حکم ہے جس کی تعمیل میں اپنے اپنے دھنوں اور گھروں کو خیر باد کہہ کر چند ہزار انسان سر سے کفن باندھ کر نکل پڑے ہیں۔ ایک فتنہ ہے جس کے زیرِ دہم پرستے والے قیص کر رہے ہیں لیکن یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ انہیں کس چیز کی طرف بلایا جا رہا ہے۔ انہیں شہد انگیس کا جو جام دیا گیا ہے، اُس میں کہیں زہر تو ملا ہوا نہیں ہے۔ اور انہیں جس راہ پر لیجا یا جا رہا ہے

کہیں اُس کی انتہا ہلاکت و بربادی کے ہولناک غاروں پر تو نہیں ہوتی۔

جس طرح ایک مجاہد فی سبیل اللہ میدان جنگ میں اپنی جان دیتا ہے۔ اسی طرح دنیا کی مصیبتوں سے ایک تنگ آیا ہوا انسان بھی دشنہ و خنجر سے اپنی زندگی ختم کر دیتا ہے۔ مگر پھر یہ کیا ہے کہ ایک کے لیے فردوسِ نعیم کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، اور خداوندی انعام و کرام کا ہاتھ اُس کو حیاتِ جاوید کا خلعتِ زر میں پہنا دیتا ہے۔ اور اس کے برخلاف دوسرے کے لیے خودکشی کے جرم میں دائمی نکبت و خسران کی سزا تجویز کی جاتی ہے اور ایسا کرنے میں قدرتِ کو س بات کا خیال بھی نہیں آتا کہ اس شخص نے دنیوی مصائب سے تنگ آکر اپنی زندگی کا خاتمہ کیا تھا، اس کی وجہ بجز اس کے اور کیا ہے کہ جو شخص جذبات کی رو میں بہہ کر عقل سے کام نہیں لیتا اور اپنے ہوش و حواس معطل کر کے بیٹھ جاتا ہے وہ یقیناً قانونِ قدرت کا مجرم ہے اور اس سے اُس کو سزا ملنی چاہیے۔

پس ضرورت اس بات ہے کہ آپ سنجیدگی اور متانت کے ساتھ خاکسار تحریک کے بنیادی اصول پر غور کریں اور اس کے بانی کی صحیح ذہنیت سے واقفیت بہم پہنچائیں۔ اُس کے اقوال و اعمال کو عقل و شریعت کی روشنی میں پرکھنے اور جانچنے کی سعی کریں، اور اس تحریک کے تمام پہلوؤں کا تجزیہ کر کے یہ معلوم کریں کہ اس میں شامل ہونے سے آپ کو فائدہ کتنا ہوگا اور نقصان کس قدر؟ اور پھر اگر آپ کی تحقیق سے یہ ثابت ہو کہ فائدہ سرسری اور عارضی ہے اور نقصان شدید اور مستقل۔ تو آپ کو یہ فیصلہ کر لینا چاہیے کہ نہ آپ خود اس میں شریک ہونگے، اور نہ اپنے کسی بھائی کو اس میں شامل ہونے کی اجازت دیں گے۔



## ابو محفوظ معروف بن فیروز الکرخ

نام و نسب | معروف نام، ابو محفوظ کنیت، والد کا نام فیروز یا فیروزان تھا۔ بغداد میں ایک محلہ ہے کرخ وہاں کے باشندے تھے، اس لیے کرخی کہلاتے ہیں۔

عام حالات | حضرت معروف کا شمار اگرچہ علماء اور محدثین میں نہیں ہے، لیکن درحقیقت وہ مجسمہ ناپیدائنی روحانیت و معرفت کے لیے کامیاب شاگرد تھے کہ ان کی اس صفت کے سامنے علم ظاہر کے کمال کی کمی کچھ زیادہ محسوس نہیں ہوتی۔ ان کا شمار کبار و باریا راشد میں ہوتا ہے۔ ان کی نظر حقیقت آشنا تھی۔ مجاز کے حجابات راہ میں حائل نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کا علم قیاس و تخمین کی حد بندیوں سے بہت بلند، ایمان و یقین کی طمانیت بخشوں سے صد آفتاب درکنار تھا۔ حضرت علی بن موسی الرضا کے غلام تھے۔

بچپن | بچپن سے ہی لیے آثار ظاہر ہونے شروع ہو گئے تھے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ آگے چل کر زمانہ کی ایک نادر شخصیت بننے والے ہیں۔ ان کے والدین عیسائی تھے۔ اپنے دستور کے مطابق انہوں نے حضرت معروف کو ایک عیسائی معلم کے پاس پڑھنے کے لیے بٹھا دیا۔ ان کا استاد کہتا "کو خدا تین مجبوروں میں سے ایک مہرور ہے" لیکن یہ فرماتے "نہیں بلکہ وہ ایک ہی ہے، معلم عیسائی تھا، اور سخت متعصب۔ ایک بچہ سے اپنے عقیدہ کے خلاف یہ جملہ

یہ سب حالات تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۳۴ اور تاریخ خطیب بغدادی ج ۱۳ از صفحہ ۱۹۹ تا صفحہ ۲۰۸ اور صفحہ الصفوۃ ج ۲ از صفحہ ۱۷۹ تا صفحہ ۱۸۳ سے ماخوذ ہیں علامہ ابن جوزی لکھتے ہیں کہ میں نے حضرت معروف کرخی کے حالات میں لگ ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے۔

کس طرح سن سکتا تھا، غضبناک ہو کر وہ انہیں سخت زد و کوب کرتا۔ کیشکش زیادہ بڑھی تو حضرت معروف اپنا گھر چھوڑ کر نکل بھاگے۔ ماں باپ کو اور خصوصاً ماں کو سید محبت تھی۔ فرقت پسر ناقابل برداشت ہو گئی تو دونوں نے کہنا شروع کیا ”اے کاش معروف واپس تو آجائے ہم بھی وہی دین اختیار کر لینگے جسے وہ اختیار کر چکا ہے۔ اور اس معاملہ میں اس کا اتباع کریں گے۔“

”میاں معروف کئی سال تک وادی غربت میں دشت پیمائی کرتے رہے۔ توفیق خداوندی نے ہاتھ پکڑا، تبلیغِ اسلام کے جوش نے حوصلہ دیا۔ گھر کی اصلاح کے جذبہ نے ہمت کو ابھارا۔ پہلے خود حضرت علی بن موسیٰ الرضا کے دست مبارک پر باقاعدہ مشرف باسلام ہوئے۔ پھر والدین کے گھر کا رخ کیا۔ دروازہ پر پہنچ کر کٹدی کھٹکائی۔ اندر سے آواز آئی کون ہے؟ انہوں نے جواب دیا ”میں ہوں معروف“ پوچھا ”کس دین پر؟“ ”بوسے علی“ ”اسلام پر۔“ یہ سنتے ہی ماں باپ اپنے قول کے مطابق اسلام لے آئے۔ اس طرح یہ کتب سے بھرا ہوا بچہ دو سنجیدہ اور عقیل نسیم بوڑھوں کی ہدایت کا سبب بنا۔

خوفِ خدا ان پر خوفِ خدا کا غلبہ اس درجہ تھا اور حق یہ ہے کہ حکمِ رسّٰی بحکمۃ محمد ﷺ ہی تمام نیکیوں اور ساداتِ مندوبوں کا سرچشمہ ہے کہ یحییٰ بن جعفر بیان کرتے ہیں میں نے ایک مرتبہ حضرت معروف کو ایک اذان دے رہے تھے جب استہد ان لا الہ الا اللہ کہہ تو، اے بہشت و خوف کے سن کی دڑھی اور زلفوں کے بال کھڑے ہو گئے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اذان دیتے اور اقامت بھی کہہ بیٹھے، لیکن نماز پڑھانے کی جرأت کبھی نہیں کرتے تھے۔

یہ وہ غنی جس شخص کے دل میں شبہِ ربانی نے استبداد پایا ہو، اس کی نظر میں دنیوی نعمتیں اور غریب کی کیا وقعت ہو سکتی ہے۔ چنانچہ حضرت معروف بھی دنیا سے بالکل بے تعلق رہتے تھے۔ انتہا بہت سن کی دقات ہونے لگی تو لوگوں نے صبر کیا کچھ وصیت کیجیے فرمایا ”میں

مرباؤں تو میری قمیص کا بھی صدقہ کر دینا۔ میں چاہتا ہوں کہ دنیا سے جاؤں تو جس طرح یہاں رہنا  
آتا تھا، اُسی طرح یہاں سے بھی برہنہ ہو کر جاؤں۔ سری سقطیؒ جو خود کا برقرارِ اسلام میں شامل  
ہیں، انہوں نے ایک مرتبہ حضرت معروفت سے سوال کیا "لوگ کب اللہ کی پوری اطاعت  
پر توجہ دے سکتے ہیں؟" ارشاد ہوا "اُس وقت جبکہ دنیا کی محبت اُن کے دلوں سے خارج ہو جائے  
اگر دنیا کی محبت سے اُن کے دل فارغ نہیں ہیں تو اُن کا ایک سجدہ بھی درست نہیں ہو سکتا۔  
وہ عمر کے ایک لمحہ کو بھی ضائع دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ خود اس پر عامل تھے وہ  
دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ اُن کے پاس چند اشخاص کی  
ایک جماعت آکر بیٹھ گئی اور دیر تک بیٹھی رہی۔ آخر کار آپ نے فرمایا "کیا تم نہیں چاہتے کہ  
اب مجلس ختم کر دو۔ حالانکہ آفتاب جس رفتار سے چل رہا ہے اُس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔"  
استغراق فی التوحید | کہاں توحید یہ ہے کہ انسان اپنے تمام معاملات میں صرف خدا کی طرف رجوع  
کریے۔ اور اُس کے ماسوا کسی اور سے اپنی کوئی حاجت متعلق نہ سمجھے، حضرت معروفت ایک  
دفعہ کوفہ کے بازار سے گزر رہے تھے، وہاں انہوں نے دیکھا کہ اُس عہد کے مشہور واعظ  
بن الساک وعظ کہہ رہے ہیں۔ یہ بھی سُنے کھڑے ہو گئے۔ اُس وقت ابن الساک کہہ رہے  
تھے "جو شخص اللہ کی طرف اپنے دل سے متوجہ ہوتا ہے۔ اللہ بھی اُس کی جانب کامل التفات  
فرماتا ہے، اور جو شخص کبھی کبھی اللہ کو یاد کر لیتا ہے، اللہ بھی اُسے کبھی کبھی یاد کرتا ہے۔" حضرت  
معروفت کو خنی کا بیان ہے "میں اس دغ سے بے انتہا متاثر ہوا۔ اور میں نے آئندہ کے لیے  
عزم باہجزم کر لیا کہ اب اپنے مولیٰ حضرت علی بن موسیٰ الرضاؑ کی خدمت کے علاوہ دنیا کی کسی چیز  
کی طرف توجہ نہیں کروں گا اور ہمہ تن خدا کی طرف ہی متوجہ رہوں گا۔ یہاں سے روانہ ہو کر میں  
حضرت علی بن موسیٰ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اُن کو یہ پوری سرگزشت سنائی تو انہوں



نے فرمایا "اگر آپ نصیحت پذیر ہونا چاہیں تو یہی ایک نصیحت آپ کے لیے بہت کافی ہے" وقت سے ثابت ہے کہ حضرت معروٹ کی تمام زندگی اس اثر سے اخیر دم تک روشن رہی۔ اور وہ ثنائی التوحید کے حام جان نواز سے ایسے سرشار دوست ہوئے کہ غیر اللہ سے انہیں کوئی علاقہ ہی نہیں رہا۔

ایک شخص نے اُن سے کسی نصیحت کی درخواست کی، آپ نے فرمایا "اللہ پر توکل کرو۔ یہاں تک کہ وہ تمہارا جلیس و انیس بن جائے، اور وہی تمہاری شکایتوں کا مرجع ہو۔ اور تم موت کا ذکر زیادہ کرو جس کی وجہ سے تمہارا جلیس سوئے خدا کے کوئی اور ہو ہی نہ سکے اور ہاں یہ سمجھ لو کہ لوگ تم کو نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ ضرر۔ وہ تم کو کوئی چیز دے سکتے ہیں اور نہ کسی چیز سے منع کر سکتے ہیں۔"

رحمت خداوندی پر بھروسہ | اس ثنائی التوحید کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ خدا کی رحمت کے تصور سے بار بار اپنے دل کو تسکین دیتے اور یاس و ناامیدی کو غالب نہیں ہونے دیتے تھے وہ بسا اوقات علی الصباح اٹھ کر یہ شعر پڑھتے تھے۔

ای شیء ترید منی الذنوب      شفقت بی فلیس عنی تغیب

ما یضر الذنوب لو عفتنی      رحمۃ لی فقد علانی المشیب

ترجمہ :- "میں گناہوں سے آخر سر سے متعلق ارادہ کس چیز کا کیا ہے۔ یہ مجھ سے چھٹ گئے ہیں اور

مانع نہیں ہوتے۔ اچھا اگر اللہ کی رحمت نے مجھ کو آزاد کر دیا تو اب جبکہ مجھ پر بڑھاپا

غائب ہو گیا ہے، یہ گناہ مجھ کو کیا نقصان پہنچا سکیں گے۔"

دعا خیر | دوسروں کو گڑبڑ سے کاموں میں مبتلا دیکھنے تو اُن کے حق میں دعا، بد نہیں بلکہ ہمیشہ دعا خیر

کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ بغداد میں دریائے دجلہ کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے کہ سامنے سے چند

رنگیں مزاج نوجوان ایک کشتی میں بیٹھے ہوئے گاتے بجاتے اور شراب کے جام چھلکاتے ہوئے گزر رہے تھے۔ یہ منظر اندوگہن دیکھ کر آپ کے ساتھیوں نے کہا "حضرت! آپ ملاحظہ نہیں فرماتے یہ لوگ پانی میں التہ کی نافرمانی کر رہے ہیں۔ آپ ان کے حق میں دعا بد کیجیے" حضرت معروف کرخی نے آسمان کی جانب ہاتھ اٹھلے اور یہ دعا کی "اے میرے معبود! اے میرے آقا و مولا میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ تو ان کو جنت کی مسرتیں بھی اسی طرح عنایت فرما جس طرح تو نے ان کے لیے دنیا کی مسرتیں ارزاں کر رکھی ہیں۔" آپ کے ساتھیوں نے کہا "ہم نے تو آپ سے عرض کی تھی ان کبختوں کے لیے دعا بد کیجیے" آپ نے ارشاد فرمایا "اللہ تعالیٰ جب آخرت میں ان کے لیے سامانِ فرحت و انبساط ہیا کریگا تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اُس نے دنیا میں اُن کے گناہ معاف کر دیے ہیں (اس سے ان غریبوں کا بھلا ہو جائیگا) اور تمہیں کوئی نقصان پہنچا نہیں۔"

عبادت کا اخلا شب روز عبادت الہی میں مصروف رہتے تھے، لیکن اُس کا اظہار نہ کرتے تھے اور حتیٰ الوسع اُسے مخفی رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ واقعی طور پر صائم الہنا را اور قائم اللیل تھے۔ ان کے مرضِ وفات میں ایک دفعہ ایک شخص نے اُن سے پوچھا "آپ اپنے روزوں کی نسبت مجھ سے کچھ بیان فرمائیے" کہنے لگے "حضرت عیسیٰ ایسا ایسا روزہ رکھتے تھے" سائل بولا "میں آپ کے روزہ سے متعلق سوال کرتا ہوں" فرمایا "حضرت داؤد اس اس طرح روزہ رکھتے تھے" پھر سائل نے وہی کہا کہ میں تو آپ کے روزوں کی نسبت پوچھ رہا ہوں" آپ نے جواب دیا۔

دانش حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس اس طرح روزہ رکھتے تھے "اس مرتبہ سائل نے پھر اسی سوال کا اعادہ کیا تو آپ نے فرمایا "راہ میں: تو ہمیشہ روزہ سے رہتا تھا۔ لیکن اگر کوئی شخص میری رحمت کرتا تو میں کھانا کھا لیتا تھا۔ اور یہ نہیں کہتا تھا کہ میں روزہ سے ہوں"

محمد بن منصور کی روایت ہے کہ میں نے ایک دن حضرت معروت کی خدمت میں حاضر ہو کر دیکھا کہ اُن کے چہرہ پر زخم کا کوئی نشان ہے، میں نے چاہا کہ اُن سے اس کی وجہ دریافت کروں لیکن اُن کے رعب و جلاں کی وجہ سے ہمت نہ ہوئی۔ اُن کے پاس ایک اور شخص بھی بیٹھا ہوا تھا جو مجھ سے زیادہ جری تھا، اُس سے نہ رہا گیا، اور میں زخم کا سبب پوچھ ہی بیٹھا۔ حضرت معروت نے بات کو ٹلنے کے لیے فرمایا ”بھائی تم اپنا کام کرو، اس نوع کے سوالات کے تم کو کیا فائدہ پہنچے گا۔“ اُس نے دوبارہ پھر اصرار کیا۔ اس مرتبہ بھی حضرت معروت نے وہی جواب دیا۔ مگر جب تیسری مرتبہ اُس نے سوال کیا اور زیادہ اصرار کے ساتھ، تو آپ کو فرمانا پڑا میں گزشتہ رات بیت احرام چلا گیا تھا۔ جب بیز زخم پر پانی پیسے لیے حاضر ہوا تو وہاں میرا پاؤں پھسل گیا اور میرا چہرہ دروازہ سے ٹکرایا۔ یہ نشان اُسی وجہ سے ہے۔“

اس واقعہ سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معروت صاحب کرامت بزرگ تھے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے احوال و مزایا کا اخطا بہت کرتے تھے۔

معدلت یہ وہ مستجاب دعا تھے، اُن کے زمانہ میں ایک شخص تلیل الصیاد نامی تھے۔ اُن کا مرنے کا ایک دفعہ گھڑے سے نکل کر آتا رہا پہنچ گیا۔ اس بید پریشان تھی جس نے حضرت معروت کی خدمت میں حاضر ہو کر پورا راجہ استنایا۔ اور بڑے کی داپسی کے بے دعا کی درخواست پیش کی آپ نے دعا کی ”اے اللہ! کوئی شبہ نہیں، آسمان تیرا آسمان ہے۔ اور زمین تیری زمین ہے اور جو کچھ زمین و آسمان کے درمیان ہے وہ بھی تیرا ہی ہے۔ تو اس لڑکے کو یہاں پہنچا دے۔“

جس کے کہتے ہیں میں اس کے بعد باب الشام تک ہی آیا تھا کہ دیکھا کیا ہوں بڑا کھڑا ہوا ہے۔ جس نے وہی ہمیشہ رحمت الہی کی طلب جستجو میں سرگرم رہتے تھے ایک مرتبہ ایک سقہ کے پاس سے گزر رہے تھے وہ کہہ رہا تھا ”شُدُس پر رحم کرے جو میں پانی کو پی کر



جلے" حضرت معروف اس وقت روزے سے تھے لیکن یہ سن کر آگے بڑھے اور پانی پی کر فرما لے "کیا عجب ہے اللہ تعالیٰ اس سقہ کی دعا کو ہی قبول فرمائے"

شفقت علی الخلق | خلاق فاضلہ میں سے ایک بڑا خلق یہ ہے کہ انسان کے دل میں اپنے ہم جنسوں کے لیے جذبہ محبت و نسبت ہو۔ اور وہ اُن کے دکھ درد میں پورا شریک بنا رہے۔ حضرت معروف کی ذات اس خلق عظیم سے بھی بہرہ ور فرمیتی تھی۔ حضرت سبزی فرماتے تھے "تم مجھ میں جو کچھ دیکھتے ہو وہ سب حضرت معروف کی برکات میں ہیں ایک مرتبہ عید کی نماز سے واپس آ رہا تھا کہ راستہ میں حضرت معروف مل گئے، اُن کے ساتھ ایک لڑکا تھا۔ پر آگندہ مو، اور آشفہ رو۔ میں نے پوچھا حضرت یہ کون ہے؟" ارشاد ہوا "سب بچے کہیں رہے تھے، یہ غریب دل گرفتگی کے ساتھ ایک طرف الگ کھڑا ہوا تھا، میں نے اس سے پوچھا "میاں! تم کیوں نہیں کھیلتے" بچہ بولا "میں یتیم ہوں" یہ سن کر حضرت معروف نے بچہ کا ہاتھ پکڑا۔ اور اپنے ساتھ لے آئے۔ وہ اس سے بڑی محبت کرتے تھے اور اُس کی دیکھائی کے لیے اخروٹ اور بادام کے مغز جمع رکھتے تھے۔

علم و فضل | حضرت معروف کا شمار اگرچہ کبار اولیاء اللہ میں ہوتا ہے، اور وہ زیادہ تر اسی حیثیت سے روشناس ہیں۔ لیکن علم لدنی اور معرفت روحانی کے علاوہ وہ علم ظاہر میں بھی کم نہیں تھے۔ علامہ خطیب بغدادی لکھتے ہیں کہ حضرت یحییٰ بن سعین اور امام احمد بن حنبل اُن کے پاس اگر مسئلے مسائل یا احادیث لکھتے تھے لیکن حق یہ ہے جس کا آئینہ قلب جمال حقیقت کی ضیا باریوں سے عکس پذیر ہو رہا ہو اُس کے لیے علوم ربیہ و ظاہریہ کی ایسی ضرورت ہی کیا ہے۔ اور اگر اُس میں ان چیزوں کی کمی بھی پائی جائے تو اُس کے کمالات معنوی و روحانی کے مقابلہ میں وہ چند قابلِ اعتنا نہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ امام احمد بن حنبل کی مجلس میں حضرت معروف کا ذکر آیا ایک شخص بول اٹھا "وہ تو کوتاہ علم ہیں" امام احمد کو یہ سن کر تاب سکوت نہ رہی۔ آپ نے فرمایا

”اے شخص خاموش رہ! خدا تجھ کو معاف کرے۔ حضرت معروف جن حقیقتوں سے آشنا ہیں کیا علم کا مقصد ان کے علاوہ کچھ اور بھی ہے؟“ ایک دفعہ امام احمد بن حنبل کے صاحبزادے اپنے پدر بزرگوار سے پوچھا ”کیا حضرت معروف عالم بھی تھے؟“ آپ نے ارشاد فرمایا ”اے بیٹے! کان معہ رأس العلم، خشية الله“ ان کے پاس تو علم کی جڑ تھی یعنی خدا کا خوف۔

کرامات دینیٰ | علامہ بغدادی نے ”کرامات معروف“ کا ایک مستقل عنوان قائم کر کے حضرت معروف کرخ کے چند حیرت انگیز واقعات نقل کیے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بڑے صاحب کرامت بزرگ تھے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ انتہا درجہ کے فیاض، ہشتم ہمدرد خلّاق، اور مصیبت زدوں کے مدد و معاون تھے۔ ابو العباس المورّب بیان کرتے ہیں کہ میرے پڑوس میں ایک ہاشمی رہتا تھا، یہ غریب نہایت مفلوک الحال اور عسرت زدہ تھا، ایک دن اس کے گھر میں بچہ کی ولادت ہوئی۔ بیوی نے تنگ آکر کہا ”اس وقت میری جو کچھ حالت ہے تم پر چھی طرح روشن ہے۔ صبح کو کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ ادھر میری ناہانتی حد سے زیادہ بڑھتی جاتی ہے۔ ضروری ہے کہ کچھ نہ کچھ کھاؤں“ اس وقت رات زیادہ گزر چکی تھی، تو کل بخدا یہ غریب ہاشمی طلب رزق میں اُسی وقت گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ ایک بقال کے پاس آیا، اس کو اپنی داستان مصیبت سنائی اور بطور قرض کچھ چیزیں طلب کیں۔ ہاشمی بقال کا پہلے سے مقروض تھا۔ اُس نے مزید قرض دینے سے انکار کر دیا۔ یہاں سے مایوس و ناکام ہو کر ہاشمی غریب نے ایک دوسرے بقال کی دکان کا رخ کیا۔ اس سے پہلے سے کچھ جان پہچان تھی لیکن یہاں بھی ہی صورت پیش آئی۔ اب اس حسرت زدہ و ناکام کی سراسمگی و پریشانی کی کوئی حد نہ رہی۔ رہن اپنی تمام وسعتوں کے باوجود تنگ نظر آتی تھی، در کوئی تدبیر اس فشارِ عالم سے بچنے کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اسی عالم حیرت و بخودی میں دریاؤں و جمل کی طرف رخ کر دیا۔ اب حاصل

پہنچ کر سنا کہ ملاح بغداد کے مختلف محلوں کا نام لے لے کر پکار رہا ہے کہ کسی کو ان محلوں میں سے  
 کسی محلہ میں جانا ہو تو کشتی میں آجائے۔ ہاشمی نے ملاح کو آواز دی اُس نے اپنی کشتی کنارے  
 سے لگا دی۔ ملاح نے پوچھا کہاں جاؤ گے؟ "ہاشمی بولا مجھ کو پتہ نہیں" ملاح کہنے لگا "میں نے  
 تم سے زیادہ عجیب و غریب کوئی شخص آج تک نہیں دیکھا۔ ایسے نادقت میں تم کو اپنی کشتی میں  
 بٹھا کر لیجا رہا ہوں اور پوچھتا ہوں کہ کہاں جاؤ گے۔ تم جواب دیتے ہو مجھے معلوم نہیں" منظومیت  
 کے حساس نے دل دھڑکھڑکی و ناکامی کے دھوئیں سے دھان زار بنا دیا۔ آنکھیں پر غم  
 ہو گئیں۔ اور ہاشمی نے مجبور ہو کر ملاح کو بھی اپنی داستان غم کہہ سنائی۔ ملاح کا دل پیچ اٹھا اور اُس  
 نے تسلی دیتے ہوئے کہا "گھبراؤ نہیں میں تمہیں اصحاب الساج کے محلہ میں پہنچا دے دیتا ہوں  
 وہاں اُمید ہے تمہیں اپنے مقصد میں کامیابی ہوگی۔ چنانچہ ملاح ہاشمی کو لے کر صحاب الساج محلہ  
 کی ایک مسجد میں آیا جہاں حضرت معروف کرضی تشریف رکھتے تھے۔ ہاشمی نے ملاح کی ہدایت  
 کے بموجب وضو کیا، اور مسجد میں داخل ہو کر حضرت معروف کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوا۔  
 حضرت معروف اُس وقت نماز پڑھ رہے تھے نماز سے فراغت کے بعد وہ ہاشمی کی طرف متوجہ  
 ہوئے، علیک سلیک کے بعد آپ نے حال پوچھا اور یہاں ایسے وقت میں آنے کی وجہ  
 دریافت کی۔ ہاشمی نے، پناپورا واقعہ بیان کیا آپ نے یمن کر پھر اپنی نماز شروع کر دی۔ ساتتے میں  
 بادل آئے، اور اس زور کی بارش بسی کہ جل تھل بھر گئے۔ فلسفی میں آٹا گیلہ بیچارہ ہاشمی کے رہے  
 سے و سان بھی خطا ہو گئے۔ بیوی کو مفلسانہ زچگی کے عالم بکسی میں تنہا چھوڑ کر آیا تھا مقصد  
 اب تک حاصل نہیں ہوا تھا۔ رات تیرو تار، مسافت بعید، اور بارش موسلا دھ رہا اب غریب کے  
 لیے یہ بھی ممکن نہیں کہ فقر و فاقہ کے ساتھ ہی سہی اپنی بیوی کے پاس تو پہنچ جائے۔ ہاشمی کا تو سن  
 فکر و خیال فرط غم و الم میں انہی افکار پریشاں کے تھپیڑوں سے کھیل رہا تھا کہ یکایک مسجد کے دروازہ



پر کسی سواری کی آہٹ محسوس ہوئی، چند لمحوں کے بعد ہی دیکھا کہ ایک شخص مسجد میں داخل ہوا، وہ حضرت معروف کرخی کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا "میں فلاں شخص کا بھیجا ہوا قاصد ہوں۔ وہ صاحب آپ کو سلام کہتے ہیں، اور کہتے ہیں "میں اپنے بستر پر سو رہا تھا جسم پر فقط بنیان تھا کہ ناگاہ میری آنکھ کھل گئی۔ اور میں نے اپنے اوپر اللہ کی ایک بڑی نعمت دیکھی۔ اب میں اسی کے شکرانہ میں آپ کے پاس یہ پانسو دینار کی ایک تھیلی بھیج رہا ہوں۔ آپ اسے مستحقین میں تقسیم کر دیجیے" حضرت معروف نے قاصد سے فرمایا "تم یہ تھیلی ان کو دلاؤ" کوئی دیدہ قاصد نے حکم کی تعمیل کی۔ ہاتھی نے خوش ہو کر یہ تھیلی کمر سے باندھی۔ اور کچھ اور گھسے میں گھستا، چلتا پھرتا بڑی مشکل سے بقال کی دکان پر آیا، اور یہاں سے شہد، شکر، شیرہ، چاول اور روغن لے کر گھرا آیا۔ یہاں بیوی شدت انتظار میں جاں بلب ہو گئی تھی۔ ہاتھی کو دیکھتے ہی بر بھلا کہنے لگی۔ تب ہاتھی نے اپنی پوری سرگزشت سنائی جس سے بیوی کی جان میں جان آئی۔ دونوں نے مل کر حضرت معروف کرخی کو دعائیں دیں۔ ہاتھی نے ان دنائیر سے ایک جامد خرید لی۔ فقر مصیبت کے دن ختم ہوئے۔ اور پہلے جس گھر میں فلاکت و انداس کا دور دورہ تھا وہ اب مسرت و شادمانی کا گہوارہ بن گیا۔

اسی طرح کا ایک مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک شخص حضرت معروف کرخی کی خدمت میں حاضر ہوا، اور کہنے لگا "رات میرے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا ہے، میں چاہتا ہوں کہ اس بچہ کی نگاہ آپ پر پڑے اور وہ میرے لیے سراپا سعادت و برکت ہو" حضرت معروف نے فرمایا، تم سو مرتبہ "ماشاء اللہ کان پڑھو" یہ شخص سو مرتبہ پڑھ چکا تو آپ نے پھر دوبارہ اس کو سو مرتبہ پڑھنے کا حکم دیا۔ غرض یہ ہے کہ اس طرح اس شخص نے پانسو مرتبہ یہ وظیفہ پڑھا۔ اس دفعہ یہ وظیفہ تمام ہوا ہی تھا کہ غلاموں رشید کی شہود بیوی زبیدہ کا ایک نوکر پانسو درہم کی ایک تھیلی لیے ہوئے حاضر ہوا اور ملک کی طرف سے سلام و بہانم پہنچاتے ہوئے کہنے لگا۔ آپ ان درہم کو مستحقین میں تقسیم کر دیجیے

حضرت معروف نے پتیلی سب کی سب اس شخص کو دیدی، اور فرمایا "اگر تم وظیفہ پان سو مرتبہ سے زیادہ پڑھتے تو تمہیں روپیہ بھی اس سے زیادہ ملتا۔"

اسی سلسلہ میں ایک پُر لطف عجیب یہ واقعہ ہے کہ حضرت معروف کے خاندان میں کوئی تقریب شادی تھی، ان کے بھائی نے ان کو دکان پر بٹھادیا تاکہ وہ اُس کی رکھوالی اور نگرانی کریں یہاں سالکوں کا مانتا بندہ گیا۔ اور حضرت معروف کسی سائل کو رد کرنا جانتے نہیں تھے جو آیا اور اس نے جتنا مانگا وہ اُس کے حوالہ کر دیتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ دکان آٹے سے خالی ہو گئی حضرت معروف کے بھائیوں نے پوچھا "آٹا کیا ہوا؟" آپ نے فرمایا "بتاؤ آٹا کتنے کا تھا۔ وہ دیکھو اُس صندوق میں اُس کی تمام قیمت محفوظ ہے۔ حضرت معروف کے بھائیوں نے صندوق کھول کر دیکھا تو واقعی اُس میں تمام آٹے کی قیمت جمع تھی۔"

ایک یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے جو محمد بن منصور الطوسی کا خود بیان کیا ہوا ہے کہتے ہیں۔ "میں نے ایک مرتبہ روزہ رکھا اور عہد یہ کیا کہ سوائے مال طیب کے کسی اور چیز سے روزہ افطار نہیں کرونگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پے پے تین دن گزر گئے اور مجھ کو روزہ افطار کرنے کے لیے کوئی طیب چیز نہیں ملی۔ جب چوتھا دن ہوا تو میں نے دل میں عزم باہزم کیا کہ آج شب کو کسی بزرگ کے اس جا کر جن کا کھانا سرسبز حلال و طیب ہو روزہ افطار کرونگا۔ چنانچہ میں حضرت معروف کرخی کی خدمت میں حاضر ہوا، انہیں سلام کیا اور پاس ہی جا کر بیٹھ گیا۔ آپ نماز مغرب ادا کرنے کے بعد مسجد سے باہر آئے تو میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا "اے طوسی! تم اپنے بھائی کے پاس جاؤ اور شب کا کھانا بھی اُن کے ساتھ ہی کھاؤ۔ طوسی کا بیان ہے کہ میں نے اپنے دل میں کہا کہ چار دن تو ہو گئے مسلسل روزہ رکھتے ہوئے اور اب بھی پتہ نہیں کہ کھانا کس قسم کا کھانا پڑیگا۔ حضرت معروف کرخی سے میں نے عرض کیا "حضرت! میرے پاس طعام شب ہے کہاں! لیکن آپ نے

میرے کئے پر کچھ توجہ نہیں کی اور پھر اسی بات کا حاذہ کیا۔ میں نے بھی اُس کے جواب میں وہی کہا دو مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ تیسری بار پھر بھی سُنگو ہوئی تو حضرت معروف میرا جواب سن کر تھوڑی دیر کے لیے خاموش رہے۔ اور س کے بعد ارشاد فرمایا: ”چھ تو میرے پاس آؤ۔ میں ضعف و نقاہت کی وجہ سے بیدم ہو رہا تھا۔ بہ مشکل تم کو دیکھا۔ حضرت اُرخ کے ہاتھیں جاب جاکر بیٹھ گیا۔ حضرت معروف نے میرا دایہا ہاتھ پکڑا اور اُس کو اپنے ہاتھ میں لے کر آستین میں داخل کر دیا۔ مجھ کو آستین میں ایک سفر جمل جس پر دانت سے کسنے کے نشانات تھے۔ میں نے اُسے کھایا تو اس کا ذائقہ عجیب و غریب تھا میں نے آج تک اس طرح کا کوئی میوہ نہیں کھایا۔ اور اس میوہ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اُسے کھا کر میں پانی سے مستنی ہو گیا۔“

رد عزیزی | حضرت معروف اپنے باطنی و روحانی کمالات کی وجہ سے اس درجہ ہر و عزیز تھے کہ لوگ اپنے بچوں کا نام اُن کے نام پر رکھتے تھے اور مقصد یہ ہوتا تھا کہ شرف ہمانی سے برکت حاصل کریں۔ حضرت سفیان بن عیینہ کی خدمت میں بغداد کا ایک وفد حاضر ہوا آپ نے اُن سے پوچھا ”کہاں سے آئے ہو؟“ انہوں نے جواب دیا ”بغداد سے“ بغداد کا نام سُن کر آپ نے دریافت کیا ”تمہارے نام اہل کا کیا حال ہے؟“ اہل وند نے پوچھا ”وہ کون؟“ حضرت سفیان نے فرمایا ”ہو محفوظ معروف“ بغدادیوں نے کہا ”وہ بخیریت ہیں“ حضرت سفیان نے ارشاد فرمایا ”جب تک وہ بغداد میں رہیں گے، اہل بغداد بخیریت رہیں گے۔“

وفات | سَنہ ۱۸۸ھ میں بغداد میں وفات پائی۔ بغداد میں ان کا مزار پرانوار بہت مشہور ہے۔ اُس سے برکت و سعادت حاصل کرتے ہیں۔ ابراہیم احراری کا بیان ہے۔ معروف کی قبر ایک آئینہ تریاق ہے۔“



# معادہ یہودی علی نقطہ نظر سے

## تصویر کا دوسرا رخ

از مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب سیوہادی

(گزشتہ سے پوشتہ)

من تمام دفت سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں :-

(۱) اس معاہدہ کا مقصد عظیم مدینہ کی حفاظت، امن و اطمینان کے ساتھ مسلمانوں کی تنظیم اور حصول شوکت و طاقت کے لیے جدوجہد اور مشرکین کے مقابلہ میں مقدمہ محاذ کا قیام تھا۔

(۲) مدینہ میں اس وقت قریش اور نصاریٰ مسلمان قبائل انصار کے منافقین، جو

مسلمانوں ہی میں شریکے جاتے تھے۔ بنی قریظہ، بنی نضیر، بنی قینقار، بنی تہام، بنی عمرو۔

جیسے فحطانی یا اسرائیلی مشہور قبائل یہود (جو قلعوں اور فوجی سامانوں کے مالک تھے) اور قبائل

انصار کے یہود آباد تھے۔ ان جماعتوں میں سے مسلمانوں پر بہر صورت آپ کا فیصلہ ناطق تھا۔

اس لیے ان کے واسطے نہ معاہدہ کی ضرورت تھی اور نہ تحریری، علانی شاہی کی قرآن عزیز

اور احادیث (ارشادات عالیہ) ان کے لیے کافی تھے، مگر مقصد کے سلسلہ میں جب یہود مدینہ

نے بھی اپنی مرضی کو اکھنڈت صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کا پابند کرنا گوارا کر لیا اور اس پیروی کو اپنے

امن و اطمینان کے لیے مفید جانتا تب اس تحریری معاہدہ کو کیا گیا۔

پس معاہدہ کے مقصد کے پیش نظر یہودیوں سے پہلے وہی قابل خطاب تھے جن سے

اس مقصد کی غفلت اندازی کا زیادہ خوف ہو سکتا تھا اور وہ یہی مشہور قبائل زیر بحث تھے۔ ورنہ ان مشہور قبائل کے شریک معاہدہ ہوئے بغیر تنہا قبائل انصار کے یہود کا عہد مقصد کے لیے چند مفید نہ تھا۔ اسی لیے مورخ ناشلی نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ ان کا قیاس نہیں ہے بلکہ حقیقت حال کا اظہار ہے۔

(۳) ”من تبعہ“ سے مراد پابند معاہدہ ہے۔ ذوقی یا مستان رعایا یا اسیر و قیدی مراد نہیں ہیں۔ سب سے کہ مدینہ میں اس وقت تک مسلمانوں کو ایسی حاکمانہ حیثیت حاصل نہیں ہوئی تھی (۴) جبکہ معاہدہ میں تمام یہود نفی طلب تھے تو پھر کسی خاص قبیلہ کی تصریح کی خواہ وہ کتنا ہی مشہور و یہودیت میں پیشرو کیوں نہ ہو قطعاً ضرورت نہ تھی در ”اليهود“ لکھ دینا کافی تھا۔ (۵) ورنہ انصاری قبائل کے یہودیوں کی تصریح کی وجہ وہ ہے جو ابھی سطور بالا میں پیش کی جا چکی اسی لیے بعض قبائل کے متعلق یہاں دور کرنے کے لیے یہاں تک بھی لکھ دیا گیا کہ خداں شاخ کے یہودیوں کا تعلق انصار کے فلاں قبیلہ سے ہے۔

وان بنی الشطيبة بطن من جفنة اور بنو شيبه بنی شطبہ قبیلہ بنی جفنة کی ہی شاخ ہے۔  
 لہذا یہ اعتراض ”ایسی صورت میں تصریح کی ضرورت نہیں تھی بلکہ ”یہود“ یا ”بنو کلہا“ کہہ دینا کافی تھا“ طرزِ تحریر پر ایک بے محل نکتہ چینی ہے۔ نیز قبائل انصار کے یہود اور مشہور قبائل یہود تیس میں تبوع اور تابع، سردار و حاکم اور رعایا و ماتحت کی طرح نہیں تھے نہ میری یہ مراد ہے جیسا کہ پروفیسر صاحب نے سمجھا ہے بلکہ وہ اس حالت میں تھے جس کا ذکر نمبر ۳ میں کیا جا چکا۔  
 لہذا جن معاہدوں میں آپ حاکموں و رشاہوں کا نام پاتے اور اس کے برعکس رعایا کے نام نہیں پاتے وہ یہ معاہدے ہیں جو کسی مقام کے سلطان یا حاکم سے کیے گئے ہیں ان کا معاملہ اہل مدینہ کا سا نہیں ہے۔





واقعات اور سوانح حیات کو دیکھ کر دیکھ کر بتا ہے۔ اس لیے کہ باتفاق علماء و سیرت تاریخ ہجرت مدینہ کے بعد بھی ایک عرصہ تک مسلمانوں کے نظم حکومت کی یہ صورت پیدا نہیں ہوئی تھی کہ غیر مسلموں کے لیے آپ کا کوئی اعلان یا کوئی تحریر شاہی اعلان یا رائل کیونکس کما سکتا ہو بلکہ باتفاق جمہوری صورت حال یہ تھی کہ آپ مخالفوں سے یا صلح و آشتی کے معاہدات کر کے امن و اطمینان کے خواہشمند تھے اور یا ہرگز نہ، ورنہ ترضیع عہد کے مقابل میں جنگ کر کے انکی فتنہ سامانیوں کے کچنے میں مصروف اور خود جناب کو بھی اس کا اعتراف ہے اگرچہ اتمام حجت کے بعد اظہار حقیقت کے وقت شاید آپ نے اس کو فراموش فرما دیا یا کتب کے برآں مرہ ۲ پر آپ نے تحریر فرمایا ہے۔

یہ ادراکی قسم کی ہدایتیں اور شروط مصلحت کے قالب میں ڈھلی ہوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غیر مذہب والوں کے سامنے حبدان کو اپنے ساتھ لانا بھی چاہتے ہیں ایسے وقت میں پیش کرتے ہیں کہ وہ ہیں کوئی غلی قوت آپ کے ساتھ نہیں ہے سارو سامان کی لنگ کی ہے اور سناقریش جیسے دشمن سے ہے جو نہ وقت و قوت بھی رکھتا ہے، اور سارو سامان بھی۔

اس عبارت میں نشان زدہ جہت اتمام حجت کے لیے معروضہ نہیں ہیں بلکہ اس وقت کی صحیح حالت کا نقشہ ہے۔ سی طرح اس عبارت سے اوپر کی چند سطور قابل غور ہیں پروفیسر صاحب فرماتے ہیں:-  
اور یہ اتفاق جو کہ وقایہ وفاق ہے کہ اس میں اُن کا بھی فائدہ ہے۔ جنگ کے زمانہ میں  
کہ پناہ فرج آپ اٹھانا ہوگا جیسے مسلمان اپنا فرج آپ اٹھائیے۔

کیا شاہی اعلان یا رائل کیونکس کا "دستور العمل" ایسی حالت میں سب قوموں کے لیے شائع کیا جاتا ہے جبکہ نجف جہتیں نہ اس بادشاہ اور حکم کی مستامن و ذمی رہنما ہوں اور نہ رعایا جن پسند کرتی ہوں، بلکہ یہ رکنی معاہدہ درحقیقت ہی رہنا چاہتی ہوں اور جب یہ پینہ پر چڑھائی کرنے والوں سے جنگ

چھڑ جائے تو دود آزاد جماعتوں کی طرح مصارف جنگ کے غلطہ غلطہ ذمہ دار ہوں،

نیز تاریخ دسیرت کی ایک شہادت بھی اس کی تائید نہیں کرتی کہ قبائل انصار کے یہود،

مسلمانوں کے غلام تھے۔ پس اگر ایک مرتبہ آپ یہود سے متعلق عہد نامہ پر بحث کی شرائط کا پھر مطالعہ

فرمائیں تو آپ کو اقرار کرنا پڑے گا کہ یہ نامہ ان کے حق میں ہرگز شاہی اعلان کی حیثیت نہیں رکھتا

اور اگر پروفیسر صاحب کا یہ منشا ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اکایہ دستور العمل

مسلمانوں کے حق میں تو شاہی اعلان تھا مگر اس میں دوسری جماعتوں کو بیان کردہ وفات کے تحت

دعوت شرکت تھی اور ان کا بھی نظام اسی وقت ساتھ ساتھ بیان کر دیا گیا تھا کہ جو چاہے ان کو

منظور کر کے اس کے تحت میں آجائے۔ تو اگرچہ یہ حقیقت کے خلاف ہے، مگر ہبیل تسلیم یہ اعلان

غیر مسلموں کے حق میں اس حالت میں بھی معاہدہ ہی کہلائے گا اور آج بھی دنیا کی حکومتوں میں معاہدہ

ریکٹ ہی کہلاتا ہے۔ مثلاً برطانیہ نے موجودہ جنگ یورپ کے متعلق اپنی فہم میں اعلان شاہی کے

نام سے جرمنی کے خلاف شرکت کے متعلق ایک اعلان کیا اور اس میں ایک طرف اپنی رعایا کو وفاداری

اور باہمی اتحاد کے ساتھ حکومت کی حمایت و فیرو کا ذکر کیا تو دوسری جانب اس میں دوسری آزاد

طاقتوں کو اپنے ساتھ شریک کرنے کے متعلق بھی وفات بیان کیں۔ پس اس اعلان کے مطابق جو بھی

آزاد طاقتیں برطانیہ کی ہمنوائی پر آمادہ ہوگی ان کے حق میں یہ سلطان ایک معاہدہ اور ریکٹ کی شکل

اختیار کر لے گا، اور کیشنوں کے ذریعہ کانفرنس کر کے اس کی تکمیل کر دی جائے گی مگر خود اپنی رعایا کے

حق میں وہ اعلان شاہی رہے گا۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ اس زمانہ میں آج کی طرح طویل

لمحہ مجمع میں شاہی اعلان یا رائل کیونٹک کا وقت فتح کمر کے بعد کا ہے فتح کمر کا خطبہ، جمعہ نوداع کا خطبہ، مشرکین کے

جمع بیت اللہ پر پابندی کا اعلان، یہود کا سرزمین حجاز سے خارج کا فیصلہ، سرزمین حجاز میں غیر مسلموں کے فوج کا اعلان

جسے اطلاعات و فرمیں بد مشبہ اس تعریف میں آتے ہیں۔ درہمی صحیح ہے۔

طریقے رائج نہ تھے۔

حقیقت زیر بحث معاہدہ میں یود کی رضامندی کا بین ثبوت خود واقعات معاہدہ میں ہی موجود ہے جو تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکا۔ پھر بنی قینقاع، بنی نضیر، بنی قریظہ کی مخالفانہ جدوجہد کو باب سیرت ائمہ حدیث، ائمہ تفسیر کا سیرت کی کتابوں، صحیح احادیث کی تشریحات، اور سورہ حشر کی تفسیر میں متفقہ طور پر نقض عمد کنا، درفتھا، امت کا اسی بنیاد پر فتنی مسائل کا مستنبط کرنا بھی ہمارے دعوے کی روشن دلیل ہے۔

لہذا اسے براہ راست "معاہدہ یود" کہا جائے یا "اعلان شاہی کی شکل دی جا کر معاہدہ" کہا جائے حاصل ایک ہی ہے اور الفاظ کی الٹ پلٹ سے نفس معاملہ پر مطلق اثر نہیں پڑتا۔  
 پر تفسیر صاحب اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔  
 اس دعوے کی دلیل کیا ہے اب وہ سنئے:-

کتاب کا لفظ عربی زبان میں بہت عام ہے اور ابتداً سلام میں عام تر تھا اس سے لفظ کتاب سے ہر جگہ معاہدہ مراد لے لینا صحیح نہیں، یہی حال صحیفہ کا سمجھئے۔ یہ یقین قرینہ سے ہوتا تھا کہ وہ کتاب (یا صحیفہ) کوئی حکم و فرمان ہے، یا عہد نامہ، وصیت ہے، دکالت، یا پانچ اور یہاں نامہ زیر بحث میں وہ قرآن موجود ہیں جن کی بنا پر اس کو عہد نامہ نہیں کہا جاسکتا، در نہیں کنا چاہتے تھا مگر اس بات میں تسامح ہوتا، آتا ہے ۱/۲

اور اس کے بعد بوجہید کی کتاب الاسوال سے دو مکتوبات نبوی کو پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ اگرچہ مسلمانوں کے نام فرمان ہیں مگر بوجہید نے مسامحت ان کو معاہدات ہی کے باب میں ذکر کیا ہے مگر نہ معلوم اس بلوغت پر، تفسیر خدا کو کیا فائدہ جبکہ ہم نے یہ دعویٰ ہی نہیں کیا کہ جس مقام پر نامہ نبوی میں کتاب کا لفظ ہو گا وہ ضرور معاہدہ ہو گا، ورنہ ہمیں ابوجہید کی مسامحت سے انکار۔ لیکن اس سے یہ کیسے



لازم آیا کہ ابو عبید جس نامہ نبوی کو بھی معاہدہ کہیں وہ سماعت ہی کی بنا پر ہو گا اس طرح تو ایک معاہدہ بھی معاہدہ نہ رہے گا۔ پھر اس قسم کی سماعت اگر کسی عالم سے ہوتی ہے تو دوسرے علماء کی جانب سے اس کی اصل حقیقت بھی واضح ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ حافظ عماد الدین ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں اور دوسرے علماء سیر نے ان ہر دو مکاتیب کو معاہدات میں شمار نہیں کیا اور فرامین ہی کی طرح بیان کیا ہے مگر معاہدہ زیر بحث کے معاملہ میں ان کو پیش کرنا قیاس مع التارق ہے اس لئے کہ بار بار ذکر ہو چکا کہ اس کو خلف سے سلف تک سب ہی نے معاہدہ تسلیم کیا ہے اور نہ یہ بلکہ احکام قرآنی حدیثی اور فقہی میں اس کو سند و شہادت بنایا ہے۔ بہر حال اب پروفیسر صاحب کے قرائن قابل توجہ ہیں۔ فرماتے ہیں

اب یجب وہ قرائن جن کی بنا پر زیر بحث نامہ نبوی کا عہد نامہ نہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔

اول یہ کہ اس مکتوب گرامی میں باوجود نہایت طول طویل ہونے کے ادل سے آخر تک کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جو اس معاہدہ ہونے پر دلالت کرے مثلاً سلم۔ سالہ۔ امنہ۔

ذمتہ۔ موادعہ۔ مصاکمہ۔ عقد۔ عہدہ۔ معاہدہ۔ یشاق۔ الخ

اس سلسلہ میں میری یہ گزارش ہے کہ اول تو مجھے یہ تسلیم نہیں کہ جب تک الفاظ سطورہ بالا نہ ہوں کہی تحریر معاہدہ نہیں بن سکتی۔ اگر قرائن صاف صاف اس بات پر دلالت کرتے ہوں کہ اس مکتوب کا زاویہ نگاہ معاہدہ ہے تو بلاشبہ وہ معاہدہ ہے خواہ پروفیسر صاحب کے بیان کردہ الفاظ میں سے ایک لفظ بھی اس میں موجود نہ ہو۔ البتہ یہ الفاظ عموماً معاہدات میں پائے جاتے ہیں اس لئے پختہ معاہدات کے لئے یہ بہتر قرینہ ہیں۔ فقہاء بھی اکثر یہی قرینہ بیان کرتے ہیں ساتھ ہی اس کو کلیتہً نہیں مانتے۔ دوسرے یہ کہ شاید اس عبارت کے کچھ وقت پروفیسر صاحب نے معاہدہ کو پڑھنے کی تکلیف گوارا نہیں فرمائی۔ اگر وہ اس کو پڑھنے کی تکلیف گوارا فرمایتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ اس نامہ نبوی میں

ان الفاظ میں سے ایک نہیں بلکہ تین الفاظ سلم، مصالحتہ اور امن، موجود ہیں۔ ملاحظہ ہوں معاہدہ کی وضاحت یہ

وانه من نعمنا من اليهود وفان له اور بلاشبہ جو یہود ایسے اسی معاہدہ کے پیر (پابند)

المعروف الا سوا غير مظلومين کا ہیں یا اسی طرف سے ان کے لئے غیر خواہی اور

متنصر عليهم وان سلم للمؤمنین صلوات کاری ہے ان پر کوئی ظلم کر سکیگا، در نہ

واحد، ولا يسالهم مو من دوت ان کے خلاف ہر کسی کی مدد کریں گے۔ درہ یقینی

مؤمن في قتال في سبيل الله الا على ہے کہ تمام مسلمانوں کی صلح (سلم) ایک ہے (یعنی

سواء وعدل بينهم تمام مسلمانوں کے ذمہ ہے کہ اس مصالحت کو اپنی

طرف سے باقی رکھیں، اور کوئی مسلمان دوسرے

مسلمان کو چھوڑ کر جہاد فی سبیل اللہ میں ایسی صلح

وانهم اذا دعوا اليهم الى صلح در یقین جب مسلمان (اس صلح نامہ کی رد و)

حیث لم فانهم يصالحونه وان یہود کو اپنے کسی حلیف کے ساتھ صلح کرنے کو کہیں

دعونا الى مثل ذلك فانه لهم تو انکو ایسا کرنا ہو گا۔ اور اگر اسی طرح یہود مسلمانوں

على المؤمنين کو اپنے حلیف سے صلح کرنے کو کہیں تو مسلمانوں

في المدينة حرمها حرما لا هل هذا اور بلاشبہ مدینہ اس صحیفہ کے پابند جماعتوں کے

لئے (حرم) مقام امن ہے۔

وانه من خرج آمن، ومن تعد اور اس صحیفہ والے (مدینہ سے باہر جائیں

امن، المدينة، الا من ظلم وانهم یا مدینہ کے اندر رہیں برابر امن میں ہیں جب تک

ظلم یا دھمکی، نافرمانی نہ کریں۔

کاملاً یہودیوں کو یہودیوں کے برابر کی اور یہودیوں کی ذمہ داری ہو۔

اس کا کیا کرنا ہو گا

سے یہ جملہ کتاب اور اس سے سنوں میں در افتادہ مدینہ، بن شام اور تاریخ ابن کثیر سے منقول ہے۔

ہم نے یہ دفعہ من تبعنا من الیہود اس لئے شروع کیا ہے، کہ یہ واضح ہو جائے کہ معاہدہ کی پہلی دفعہ میں امام الخلفاء کے ساتھ معاہدین کے تذکرہ کے بعد اس جگہ سے ”الیہود“ کہہ کر یہود کو حث کے ساتھ اس معاہدہ کا مواظہ ظاہر کیا گیا ہے اور آئندہ تمام دفعات میں وہ کسی نہ کسی حیثیت سے شریک ہیں۔

اور اگر اس سے پہلے جملہ کو بھی نقل کر دیا جائے تو ایک چوتھے لفظ ”ذمہ“ کا بھی اضافہ ہو جائے گا اور صحیح اضافہ ہو جائے گا یعنی

وان ذمۃ اللہ واحد لا یجیر      اور اللہ کی پناہ ایک ہے ایک، دنیٰ مومن بھی  
علیہم اذناہم      سب مسلمانوں کی جانب سے پناہ دیکتا ہے

میں نے ”صحیح اضافہ“ اس لئے کہا کہ حقیقت امر یہ ہے کہ چونکہ اسلامی تاریخ میں یہ پہلا معاہدہ تھا اس لئے مسلمانوں کو یہ بتانا ضروری تھا کہ مسلمانوں کی نگاہ میں معاہدہ کی حیثیت کیا ہونی چاہیے اور یہ کہ امن اور عہد دینے میں ہم مسلمانوں کے درمیان امیر اور عام مومن کے درمیان اور خود مسلمانوں کے درمیان، اہل حق و تقویٰ کسی دوسرے اعتبار سے کوئی امتیاز ہے یا نہیں۔ اس لئے ”ذمہ“ اور ”سلم“ کا جو ذکر مسلمانوں کو مخاطب کر کے کیا گیا ہے اس کے مصداق معاہدین معاہدہ ”ذمہ“ بحث تو سب سے پہلے ہیں اور آئندہ کے لئے معاہدہ کی یہ دفعات مسلمانوں کے لئے ”راسخونہ“ کے طور پر بھی ہیں۔ نہ یہ کہ بغیر کسی خارجی مصداق کے یہ صرف ایک عام قانون اور دستور ہے۔

اس کے بعد پروفیسر صاحب ایک طویل عبارت میں دوسرا قرینہ بیان فرمائے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس معاہدہ میں لفظ ”بین“ آیا ہے اور اس کا طریق استعمال یہ ہے کہ کبھی دو نمایز چیزوں کے درمیان مکرر آتا ہے فان کان من قوم بیکنہم یشاق اور کبھی ایک بار جیسے بین المرءوس ورجلہ اور جب ایک پار آتا ہے تو ہمیشہ پہلی فرد پر داخل ہوتا ہے جیسے ان اللہ



یحول بین المؤمنین وقلوبہ اس کے خلافت نہیں آتا اور معاہدہ میں کم از کم دو فریق ہوتے ہیں۔ اس سے آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے۔

اس سے یہاں تین ہم تقدیری صورتیں سزاوارہ کی ہو سکتی ہیں۔ ہذا کتاب من محمد البنی  
بین المؤمنین من قریش وبنی ربیعہ المسلمین من قریش وبنی ربیعہ وبنی ربیعہ  
دوسری یہ کہ بین المؤمنین و المسلمین من قریش وبنی ربیعہ بنی من تبعہم تیسری یہ کہ  
بین المؤمنین و بین المسلمین وبنی من تبعہم ان تینوں صورتوں میں سے کسی صورت  
میں بھی یہ مکتوب رسول اللہ کا معاہدہ نہیں کہلا سکتا بلکہ ان صورتوں میں آپ صرف ایک  
نکتہ سر بنیخ رو جاتے ہیں اور یہ مکتوب معاہدہ کی بجائے صلنامہ بن جاتا ہے ۱/۲

پروفیسر صاحب نے اس مضمون کو زور عربیت میں بڑے کڑے سے بیان کیا ہے لیکن ایک  
حقیقت میں نگاہ پر یہ آشکارا ہے کہ وہ اس سے جو مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں حاصل نہیں ہوتا  
اس لئے کہ اس کلام کی تقدیر عربیت کے قاعدہ سے یہی ہے بین المؤمنین و المسلمین من قریش  
و اہل یثرب وبنی من تبعہم فلیحق بہم غل معہم و جاہدہم اور یہ اس تقدیر پر ہا شبہ  
معاہدہ ہے۔ اس اجمال کی تفصیل کے لئے سب سے پہلے اس حقیقت کو سمجھ لینا ضروری ہے کہ  
مدینہ کے اس ابتدائی دور میں جو اس معاہدہ کا دور ہے، مسلمانوں اور غیر مسلموں کی حیثیت کیا تھی؟  
اس پر گزشتہ صفحات میں کافی لکھا جا چکا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ جس وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف فرما ہوئے اس ابتدائی  
زمانہ میں مدینہ کی حیثیت "دار الامان" کی تھی نہ کہ "دار الاسلام" کی مسلمانوں کا حکمراں ہونا اور  
غیر مسلموں کا ان کی ذمی رعایا ہونا یہ کیفیت ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی اسی لئے فقہاء اسلام نے قرآن  
عزیز و احادیث نبوی سے دار الاسلام کے جو احکام بیان کئے ہیں وہ یہاں پر عام نہ تھے اور اس لئے

فقہ کی نگاہ میں اس وقت تک مدینہ دارالاسلام نہ تھا دارالامان تھا۔

چنانچہ بحر العلوم علامہ محمد انور شاہ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند و ڈابیل نور الشہر مقدہ نے بھی یہی کہ اسلم بالعربہ تھے اس معاہدہ کو معاہدہ تسلیم کرتے ہوئے اس کو دارالامان کے احکام میں شامل فرمایا ہے۔

اصل صورت حال یہ تھی کہ ادس و خزرج کی وہ سرداری جو عبداللہ بن ابی سلمے والی تھی بنی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب خود بخود اس طرح منتقل ہو گئی کہ ان ہر دو قبائل کی بہت بڑی تعداد باسٹھ افراد مسلمان ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہو چکی تھی۔ مگر یہ مدینہ اپنی آمد یثرب کے وقت ہی سے اُن کے حلیف بن کر یہاں بس گئے تھے اور آزادانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ نہ ہجرت نبوی سے پہلے ادس و خزرج کے محکوم تھے اور نہ ہجرت کے بعد اُن پر مسلمانوں کی حکمرانی تھی۔ تو اب جبکہ مدینہ میں سیاسی اور ملکی اقتدار کے اعتبار سے کسی کی حکمرانی نہ تھی بلکہ مختلف جماعتیں تھیں مسلمان، منافقین اور یہود اور مدینہ سے باہر بلکہ اطراف میں قریش مشرکین اور اُن کے حلفاء آباد تھے۔ تو ان حالات کے پیش نظر بنی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے (بحکم وحی) ان جماعتوں کو تین حصوں پر تقسیم کر دیا۔ ایک محارب (نبرد آزما دشمن) یہ مشرکین کہ تھے۔ دوسری قابل نظر انداز جماعت یعنی نہ اُن سے صلح نہ جنگ یہ منافقین تھے۔ تیسری جن سے صلح و معاہدہ مفید تھا یہ یہود بنی قینقاع، قریظہ اور نصیر وغیرہ تھے۔ اور جبکہ یہ معاہدہ اور صلح ایسے زمانہ میں ہو رہی تھی کہ ادس و خزرج کی باہمی مددات کے خاتمہ کا وقت بہت قریب کا زمانہ تھا۔

نیز جن جماعتوں کو انہوں نے حلیف بنایا ہوا اتحادہ جاہلیت کے طریقہ اور دستور کے مطابق تھا۔ اس لئے ضرورت تھی کہ پہلا اسلامی معاہدہ ان مذکورہ بالا مصالح کو پیش نظر رکھ کر کیا جائے پس ”رسول محمد رسول اللہ“ سے اس لئے ابتدا کی گئی تاکہ یہ بتایا جائے کہ یہ معاہدہ

گرچہ مومنین اہل ثیرب قریش اور یہود کے درمیان ہو۔ ہاں مگر اوس و خزرج اہل ثیرب ہونے کے ساتھ ساتھ ”مسلمان“ ہیں اور اب ان کے معاملات کی حقیقی قیادت اُس سببی کے ہاتھ میں ہے جس کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہا جاتا ہے اس لئے یہ معاہدہ دراصل آپ کا معاہدہ ہے یہ مقصد نہیں تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ جانتوں کے سرخسج ہیں۔

اور اس کے بعد معاہدہ میں یہی وفات بھی شامل کی گئیں جن سے خود مسلمانوں پر بھی یہ واضح ہو جائے کہ جب کسی غیر مسلم کے ساتھ معاہدہ کیا جائے تو امن، صلح، پابندی عہد، نقض عہد، نصیح و مراءسات کے معاملات کی نوعیت کی ہونی چاہئے۔ اور انصار کے قبائل کے باہم و قریش ہاجرین کے درمیان دیت، زرفدیہ کے احکام بھی آجائیں تاکہ وہی فتنہ و فساد کی بھی جڑ کاٹ جائے اور یہ دیکھ کر بھی ان معاملات سے عبرت و بصیرت کا موقع ملے اور جس اہم مقصد کے لئے یہ معاہدہ کیا گیا تھا وہ مستحکم اور مضبوط ہو جائے اور اس طرح یہ معاہدہ ایک آئندہ معاہدات کے لئے ”اسوہ“ بن جائے۔ چنانچہ بعد میں ہونے والے معاہدوں کے لئے صلح و نقض صلح میں وقتی وفات کے علاوہ اس کی بہت سی وفات بلاشبہ ”اسوہ“ ثابت ہوئیں۔

اس کے برعکس جن عہد ناموں میں فداں یا الی فلاں آیا ہے یا جن میں بن رسول، شد دین فلاں ہونا چاہئے وہ تمام ایسے عہد نامے ہیں جو صالحین میں ان حکام اور سرداروں سے ہوئے ہیں جو خود مختار اور حاکم کی حیثیت سے اپنی قوم اور دوسرے باشندوں کو رہا یا بنائے ہوئے تھے یا ان سرداروں، قوموں سے جو مسلمانوں سے الگ خطہ میں آباد اور اپنی چھوٹی چھوٹی یا بڑی خود مختار ریاست رکھتے تھے، ان کا حال مدینہ کی طرح ہرگز نہ تھا کہ ایک ہی آبادی میں مسلم و غیر مسلم ہاغیس آباد ہو اور اس وقت تک وہاں خود مستقل حکومت کسی کی بھی نہ ہو۔

پس جو شخص ان، یعنی فرقہ سے غفلت برتتا ہے یا نا آشنا ہے وہی اس قسم کے



امثال خیالات میں سرگرداں رہ سکتا ہے اور یا پھر ایک غلط بات کو صحیح ثابت کرنے کی ناکام سعی میں مشغول جیسا کہ پروفیسر صاحب کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے۔

حافظ ابن قیم بھی زاد المعاد میں ان تینوں جماعتوں سے متعلق بصراحت اس طرح ارشاد فرماتے ہیں۔

فما مل کل طائفة من هذه الطوائف  
بما امر بہ ربہ تبارک وتعالیٰ  
فما مل الیہود وکتبہم دینہ  
کتاب امن دکان ثلاث طوائف  
حول المدینہ بنی قینقاع وبنی النضیر  
دینی قریظہ الخ  
پس مذکورہ بالا جماعتوں میں سے ہر ایک جماعت  
کے ساتھ آپ نے وہی معاملہ کیا جس کا حکم آپ کو  
اللہ تبارک وتعالیٰ کی درگاہ سے ملا ہے اسی  
بنیاد پر آپ نے یہود سے صلح کی اور اپنے ان کے  
درمیان عہد نامہ امن لکھا اور یہ اطراف مدینہ  
میں تین گروہ تھے بنی قینقاع، بنی نضیر،

(جلد ۴ صفحہ ۱۹۹) بنی قریظہ۔

اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ”عہد نامہ“ حکمنامہ اور شاہی اعلان (دستور العمل) تھا  
تب بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ اعلان یہود مدینہ پر عادی تھا یا نہیں، یعنی کیا انھوں نے اس  
دستور العمل کے نیچے آنے سے انکار کر دیا تھا جیسا کہ آپ کے مضامین سے نتیجہ برآمد ہوتا ہے تب  
تو ان کو مجاہدین میں شمار ہونا چاہئے تھا۔ ان کو ”عہد ٹرنے والے“ کہنا کیا معنی؟ خصوصاً بنی قینقاع  
”جو کہ اس المناقین عبد اللہ بن ابی کے حلیف تھے۔ اور منافقین بصراحت محدثین دار باب سیر  
نہ مضامین شامل تھے نہ مخالف مجاہدین میں اور مصطلحت الہی نے ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔“  
کو ناقض عہد کہنا اس حالت میں قطعاً غلط، در باطل ہو گا۔ ان کے حلیف ہونے کے متعلق حافظ ابن قیم  
اس طرح تقریر فرماتے ہیں۔

وكانوا حلفاء عبد الله بن أبي  
 بن سلول رئيس المنافقين  
 وبنی قینقاع (آپ کی آمد سے پہلے) عبد اللہ  
 بن ابی بن سلول اور اس منافقین کے  
 (جلد ۲ صفحہ ۱۹۹) حلیف تھے۔

اور اگر انھوں نے اس کو تسلیم کر لیا تھا اور اس کی دوست دے دیتے اور معاہدہ بن گئے تھے اور  
 اس نامہ مبارک کے مطابق ان پر معاہدہ بن گئے تو بلاشبہ یہ نامہ نبوی "معاہدہ  
 یہود" مسلمانان "کھلانے کا مستحق ہے۔ کیونکہ چند فرد و آحاد کے علاوہ اور منافقین کے علاوہ صرف  
 "یہود" ہی مدینہ اور حوالہ مدینہ میں ایک ایسی بردست طاقت تھے جن پر مسلمانوں کو ابھی تک  
 حاکمانہ شاہی اقتدار حاصل نہ تھا۔ لہذا ایسی صورت میں لفظی طور پر دھندے و اقیقت نہیں بدل سکتی  
 اور "اطلاق شاہی" اور "معاہدہ" کے اختلاف تبصرے اصل حقیقت پر پردہ نہیں پڑ سکتا۔  
 اس کے بعد پروفیسر صاحب فرماتے ہیں۔

یہ ہیں وہ باتیں جن کی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ زیر بحث نامہ نامی نہ عبد نامہ نبوی نہ یہودی  
 نہ کوئی معاہدہ بلکہ بارگاہ نبوت کا ایک اعلان عام ہے اور ایک دستور العمل پیش کرنا ہے  
 اسی لئے اس میں یونوں، مسلمانوں، یہودیوں، مشرکوں کے ذکر کی ان کے تفرق و  
 درجات کی گنجائش ہے بلکہ طبع و ہدایت، تعلیم و تذکیر و عدۃ و وعید، انذار و تہدید کی  
 نئی چنانچہ یہ سب باتیں نامہ مبارک میں موجود ہیں۔

گویا اس کے یہ معنی ہوئے کہ جس نامہ نبوی میں یہ باتیں بھی شامل ہوں وہ معاہدہ نہیں کہا جاسکتا۔  
 معلوم ایسا ہوتا ہے کہ پروفیسر صاحب تاریخ اسلام کے یا تو پورے طو حاشیہ ہی کو بدل دینا  
 چاہتے ہیں یا یہودی نسب ان کی جانب طبیعت مائل ہے ورنہ تو قیاس باطل کے ساتھ مسطورہ بالا دعویٰ  
 نہ فرماتے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل نجران (نصاری) کے لئے جو صلنامہ لکھا ہے اس میں حسب ذیل وفات قابل ملاحظہ ہیں۔

فمن اكل الربا من ذي قبل فذمتي      پس جس شخص نے اہل معاملہ سے سود کھایا تو میرا  
صدا برئيتہ (کتاب الاموال صفحہ ۱۰۸)      دوسرے (عہد) اس سے بری ہے

وعليهم الجهد والنعم فما استقبلوا      اور ان پر یہ ضروری ہے کہ آپس کے معاملات  
غیر مظلومین۔ ولا محذوف عليهم      میں ایک دوسرے کیلئے غیر خواہی اور جانکاہی  
کا ثبوت دیں اور نہ وہ مظلوم بنائے جائیں گے  
اور نہ ان پر تشدد کیا جائے گا۔

اسی طرح اہل ظنلیس (نصاری) کے لئے جو عہد نامہ حبیب بن مسلمہ صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھا ہے اس کی وفات قابل ملاحظہ ہیں۔

فان بنتم واثتم الصلوة وآیتتم الزکوة      پس اگر تم (اپنے دین) سے تائب ہو جاؤ  
فاخواننا فی الدین      اور نماز پڑھنے لگو، اور زکوٰۃ دینے لگو تو تم  
ہمارے دینی بھائی ہو جاؤ گے۔

ومن تولی عن الایمان والاسلام      اور جو شخص نہ ایمان لایا اور نہ اسلام قبول کیا اور  
راجز یہ فعد و لله ورسوله      نہ جزیہ دینا منظور کیا پس وہ اللہ اس کے  
والذین آمنوا بالله المستعان علیہ      رسول اور مومنوں کا دشمن ہے، اور اس  
معاہدہ پر اللہ کی مدد کی خواہش گاری ہے۔

غور فرمائیے کہ یہ ہر دو معاہدے اپنے انداز تحریر کے لحاظ سے بھی اور حقیقت کے اعتبار سے بھی بالاتفاق بلاشبہ معاہدے ہیں اور مسلم معاہدے ہیں لیکن ان میں انذار و تہدید، تذکیر و تبلیغ



کس قدر صاف اور واضح الفاظ میں موجود ہے۔ لہذا اب یا تو کلمہ آفرینیاں پیدا کر کے ان کے معاہدے سے بھی انکار کر دیا جائے تاکہ یہ تاثر امیر سدویوار کج کی تکمیل ہو جائے۔ اور یا پھر زیر بحث معاہدہ یہود کو بھی معاہدہ تسلیم کیا جائے۔

اس کے بعد پروفیسر صاحب ایک طویل عبارت میں میرے اس مضمون کی تردید فرماتے ہیں کہ میں نے انصاری کے ایک جملہ کے متعلق جو انہوں نے غزوہ احد کے زمانہ میں کہا تھا (الا نستعین بحلفائنا من الیہود) پروفیسر صاحب پر یہ اعتراض کیوں کیا کہ انہوں نے اس کی تشریح میں بنی نضیر دینی قریطہ کی تخصیص فرمائی اور میری تردید کے ثبوت میں فرماتے ہیں کہ چونکہ یہ تینوں قبائل اس خروج کے حلیف تھے اس لئے میں نے انہیں تخصیص نہیں کی بلکہ اس کے ماحول کے اعتبار سے انصاری نے انہوں نے اس کے لئے ایک بڑی طویل بحث فرمائی ہے مگر حاصل بہت تھوڑا ہے مزید برآں یہ کہ میرا عرض اپنی جگہ پر پھر بھی قائم ہے اس لئے کہ میرے اعتراض کا توجہ اصل یہ ہے کہ آپ کے مسلک کے مطابق انصاری کے اس قول کا مصداق بنی نضیر اور بنی قریظہ نہیں ہونے چاہئیں۔ نیز یہ کہ اگر وہ اس معاہدہ میں شامل نہیں تھے تو سی طرح مسلمانوں کے حلیف نہیں رہے تھے۔ کیونکہ یہ تینوں قبائل عبداللہ بن ابی بن سلول اس المناقین کے حلیف تھے اور منافقین حکم الہی نہ مسلمانوں کے حلفاء میں شمار تھے نہ فرق محارب میں بلکہ ان کی مرضی اور حالت پر چھوڑ دیا گیا تھا وہ درود کا نام بھی لیتے، خود کو مسلمانوں میں شمار بھی کرتے، اور پھر دشمنوں سے ساز باز بھی رکھتے، درمیان جنگ سے بھاگ بھی آتے اور ان کو کوئی سزا بھی نہ دی جاتی، لہذا ان کے حلیف بھی مسلمانوں کے حلیف نہ تھے تو پھر انصاری کیسے ان کے متعلق یہ کہہ سکتے تھے۔ ملاوہ ازیں امام بخاری اور حافظ ابن حجر کی تخصیص کے مطابق بنی نضیر بھی غزوہ احد سے پہلے ہی جلا وطن کر دیئے گئے تھے۔ تو ایسی

نہایت سوال شدہ بات یہود حلیفوں کو وہ کے لئے کیوں نہ بلا لیں

صورت میں اس جملہ کا مصداق یہ کہیے ہو سکتے تھے۔ اس لئے میں نے عرض کیا تھا کہ پروفیسر صاحب نے ان تینوں قبائل سے مدد لینے کی جو وہ بیان فرمائی ہے وہ صحیح نہیں ہے بلکہ وہی وجہ صحیح ہی جو میری جانب سے پیش کی گئی اور جو جمہور کے نزدیک بھی صحیح ہے وہ یہ کہ ان قبائل نے معاہدہ کے متصل غزوہ بدر ہی کے زمانہ سے نقض عہد کے ڈبنگ شروع کر دیے تھے اس لئے ان پر بد کے بعد اعتماد کرنے کا موقع ہی نہ تھا البتہ طرح کافی دی گئی اور جب ان کا فتنہ مد سے بڑھنے لگا تو باری باری وہ کیفر کردار کو پہنچا دیئے گئے۔

حافظ ابن قیم زاد المعاد میں بنی قینقاع کے متعلق فرماتے ہیں۔

وشر قوا بوقعة بدر و اظہر واد اور وہ بدر کے واقعہ سے پھٹ پڑے اور سرکشی

البنی و الحسد اور حسد کو علی الاعلان ظاہر کرنا شروع کر دیا

پروفیسر صاحب نے یہ شکوہ بھی فرمایا ہے کہ انھوں نے یہ کہا تھا کہ ان قبائل سے مسلمانوں نے کبھی مدد نہیں لی اور بدر کے بعد ہی نہیں بدر کے قبل بھی نہیں لی مگر میں نے لفظ ”کبھی“ کو چھوڑ کر ان کے جملہ کو منقض المقام یعنی احد کے موقع پر مدد لینا، بنا دیا۔ اور پھر میرے اس اعتراض کو جواب میں ”کہ آپ یہ فرمائیں کہ قبائل انصار کے یہود سے کیوں مدد نہیں لی۔ بخیر فرماتے ہیں۔

اگرچہ احد سے اس دغوزج کے یہودی از خود یا بعد اللہ کے سکھائے پڑ جانے سے

بھاگ آئے تھے تاہم یہود اپنے مذہب یہودیت پر رہ کر بھی کم دیش غزوات نبوی

میں شریک ہوئے ہیں چنانچہ ابو عبید بن سلام نے کتاب الاموال میں لکھا ہے اور زوائد

کوزہری تک پہنچا یا ہے کان الیہود لیغزون مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

فیہم طعمہ۔ یہ یہود اس دغوزج ہی کے یہود ہو سکتے ہیں۔

مجھے پروفیسر صاحب کی ”کبھی“ کے صرکار انکار نہیں ہے۔ بیشک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کو کسی غزوہ میں ان یمنوں قبائل سے مدد لینے کی نوبت نہیں آئی۔ بدر کے بعد مدد لینے کی وجہ لکھ چکا ہوں کہ بدر کی کامیابی ہی سے انہوں نے گروہ بڑا شروع کر دی تھی اور بدر سے پہلے کوئی غزوہ ایسا نہیں ہوا جس میں ان کی مدد کی ضرورت ہوتی بلکہ چھوٹے غزوات میں تو تمام مسلمانوں کی شرکت بھی ضروری نہیں سمجھی گئی جیسا کہ کتب سیرت سے واضح ہے۔ امام شافعی تحریر فرماتے ہیں۔

فوادعت یهود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے  
 علیہ وسلم دلا تخرج الی شئ من درمیان سجادہ ہو گیا در اس وقت سے بدر کے  
 عداوتہ بقول یظہر ولا فعل حتی واقع تک یوں نے مسلمانوں کے خلاف ظاہر  
 کانت دفعہ بدر میں کوئی بات کی اور نہ کوئی عمل کیا راہت  
 جلد ۳ صفحہ ۹۸ بدر کے بعد معنی لغت ظاہر ہو گئی

لیکن آپ کا ترجمہ ہی کی روایت سے استدلال کرنا کہ ادس و خزرج کے یوں بھی آپ کے ساتھ غزوات میں شریک ہوتے اور حصہ پاتے تھے، صحیح نہیں ہے ادس و خزرج کے یوں کا شریک جہاد ہونا تو ابھی تک کسی روایت سے جیسا کہ بت نہیں ہوا۔ البتہ صرف ایک مرتبہ "بنی قینقاع کے چن یوں سے" ضرور آپ نے غزوات خیبر میں مدد لی تھی جو انفرادی طور پر آپ کے ساتھ شریک ہونے اور حصہ پایا اور لفظ کان یغزون جہاد میں جاتے تھے، یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ ایسا ہوتا رہتا تھا کیونکہ بعض مرتبہ صرف ایک واقعہ کو بھی اس انداز سے بیان کر دیا جاتا ہے۔ دیکھئے حضرت عائشہ صدیقہ نے جنگ کے موقع پر صرف ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قربانی کے جانوروں اہری کے قلاوہ کی رتیاں بٹی تھیں مگر وہ اس کو اس انداز سے فرماتی ہیں۔

کنت افضل ہدی قلائد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدی کے  
 صلی اللہ علیہ وسلم (ترجمہ) قلاوے بٹا کرتی تھی۔



چنانچہ اس مقام پر بھی ذخیرہ روایات میں جتو اور تلاش کے بعد صرف ایک ہی واقعہ یہودی کی مدد کا قتا ہے۔

۱۔ م شافعی غیر مسلموں سے غزوات میں مدد لینے کے جواز کی بحث میں تحریر فرماتے ہیں۔

ثم استعان رسول الله صلى الله عليه وسلم بعد بدر بسفین فی

غزاهما غیر بعد دمن یهودی

فیقتل کانرا اشداء

بست بباد اور شجاع تھے۔

اب غور فرمائیے کہ پروفیسر صاحب کی تحقیق کی ساری داستان کا کس سانی سے فیصلہ ہو گیا اور میری گزارش اسی طرح اپنی جگہ مستقیم رہی۔

آگے چل کر پروفیسر صاحب نے اس پر بحث فرمائی ہے کہ "انصار" کا اطلاق کن قبائل پر ہو سکتا ہے سو اس کے متعلق میرا اعتراض تو صرف یہ تھا اور ہے کہ جن قبائل کو بھی "انصار" کا لقب دیا گیا ہے وہ مسلمان ہونے کی وجہ سے دیا گیا ہے۔ اگر اوس و خزرج کے کسی قبیلہ کا کوئی خاندان رطلن، اسلام سے دیر یا ذبا شرابے بہرہ ربا تو اس کو "انصار" ہی نہیں کہہ سکتے۔ اسی لئے قبائل انصار کے یہود پر "انصار" کا اطلاق صحیح نہیں ہے البتہ "یہود قبائل انصار" صحیح ہے اور پہلی سے جو عبارت پروفیسر صاحب نے نقل کی ہے۔

ولم یکن الانصار اسماء لهم فی الجاهلیۃ

حتی ساءهم الله فی الاسلام و هم

بنو الاوس و انحر نرج

نام رکھا اور یہ بنو اوس و خزرج ہیں۔

اس کا مطلب بھی یہی ہے جو میں نے عرض کیا ہے۔ مثلاً عبداللہ بن ابی اور اس کی منافق

جماعت کے اکثر افراد اوس و خزرج کے قبائل ہی میں سے تھے مگر غرض اسی و خزرج ہی ہونے کی وجہ سے ان کو "انصار" نہیں کہہ سکتے۔ اور شریک کے مسلمانوں سے میری مراد اوس و خزرج کے مسلمان قبائل سے تھی کیونکہ اس موقع پر جانہین کے مخاطب میں "اسرائیلی" مفرد غ غنہ ہیں۔

میں نے حضرت مولانا حسین احمد صاحب پر پروفیسر صاحب کی نکتہ چینیوں کا جواب دیتے ہوئے ان کی لفظی گرفت پر یہ غرض کیا تھا کہ یہ طریقہ حق پسند اہل قلم کے نزدیک ناروا اور نامناسب ہے مگر پروفیسر صاحب بھی تک برابر اس میں الجھے ہوئے ہیں اور قبائل انصار کا یہود کے سلسلہ میں ان قبائل کو مسلمانوں کے قبائل کے ساتھ ساتھ یہود کے قبائل بھی کہہ دینے پر بحث کے لئے تیار ہیں مگر مجھے نفس مسئلہ کی تحقیق کے علاوہ لفظی بحثوں سے دلچسپی نہیں اس لئے کہ اس قسم کی لغزشیں بڑے بڑے عقلاء زمانہ اور اکابر علماء سے ہوتی رہتی ہیں اور ہر بنا بر بشریت ہوتی رہی گی یہ اس وقت تک ہرگز قابل گرفت نہیں ہوتی جب تک نفس مسئلہ پر مفاہاتہ نہ ماز نہ ہوں اور یہاں یہ تعبیر مسئلہ کی اصل حقیقت کو کسی طرح نہیں بدلتی۔

اس علی بحث کے تمام گوشوں کی تحلیل کے بعد اب صرف ایک بات باقی رہ جاتی ہے جس کا صاف ہو جانا بھی ضروری ہے وہ یہ کہ اگر یہ صحیح ہے کہ مدینہ میں ابھی اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی تو زیر بحث معاہدہ میں ایسے الفاظ کیوں ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر مدینہ سے نکل کر جائے اور اگر اس صحیفہ کے معاہدین میں فساد کا اندیشہ ہو تو معاملہ آپ ہی کی جانب رجوع ہو گا۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ مدینہ کے اس ابتدائی زمانہ میں اسلامی حکومت کا نہ ہونا تو ایک بدیہی، یعنی معاملہ ہے مگر یہ بھی مسلم ہے کہ مدینہ کی بہت بڑی اکثریت مسلمان تھی اور یہود اقلیت میں تھے اور اگرچہ مسلمان مختلف دشمنوں، دشمنین، یہود، منافقین، اور انصار ملی، میں گھرے ہوئے تھے اور اس کی وجہ سے یہودی جیسی سرکش قوم سے معاہدہ کرنا اسلامی مفاد کے لئے ضروری تھا

آہم وہ یہود کے مقابلہ میں طاقتور تھے اس لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی مفاد کے پیش نظر اس سے فائدہ اٹھایا مگر اس کے باوجود طاقتور جماعت "بادشاہ" اور کم طاقت جماعت "رعایا" کی حیثیت میں نہیں ہوتے تھے۔ اور یہ حقیقت تاریخ عرب پر عبور رکھنے والی نگاہ سے پوشیدہ نہیں ہے لہذا اعداد نامہ میں اس قسم کی دفات اس زمانہ کی حالت کا صحیح نقشہ میں جو طوطی نگاہوں میں البتہ قابل تخریب و استعجاب ہے۔

میں نے آخر میں یہ بھی لکھا تھا کہ اگر پروفیسر صاحب ہی کی بات کو مان لیجئے تب بھی مسئلہ کی صورت یہ ہوگی کہ اس معاہدہ کی رو سے مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان "اُمتہ واحدہ" متحدہ قومیت قائم کی گئی تھی اور یہی آپ کے دعویٰ کے خلاف حضرت مولانا مظلوم کا موقف استشاد ہے۔ اس پر پروفیسر صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"میں کہتا ہوں یہ معاملہ عبارت کا نہیں رائے کا ہے اور پھر اسے بھی ایسی رائے جو قائم ہو سکتی ہے حالات و مقدمات سے جو لوگ کہتے کہ ایک جماعت کے کثیر مسلمانوں اور قلیل غیر مسلموں کا اتحاد ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک جماعت کے کم مسلمانوں اور دوسری جماعت کے زیادہ غیر مسلموں کا اتحاد اور پھر مسلمانوں کے حق میں دونوں کو یکساں خیال کرنے وہ قیاس مع الفارق کو کام میں لاتے ہیں اور اسی لئے تسلط نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔"

گر قارئین کرام کے ذہن سے پروفیسر صاحب کا مضمون "متحدہ قومیت اور اسلام" مطلوبہ برہان اکٹوبر ۱۹۳۹ء ابھی تک فراوانی نہیں ہوا ہے تو وہ اس عبارت کی داد دے سکتے ہیں کہ انھوں نے

۱۵۔ دس دھڑ راج کے اسلام لانے سے قبل یہود پر ان کو کسی قسم کی طاقت حاصل تھی حالانکہ یہود کسی وقت میں بھی ان کی رعایا یا تخت شمار نہیں ہوتے تھے بلکہ ملیں سمجھے جاتے تھے اور عربین بھی بن جاتے تھے۔ دس دھڑ راج کے مقابلہ میں جنگ کے نتیجہ میں کاریب ہونے کی تباہی کا کرنی سزابل کے واقعات میں قرآن کریم





اور مسلمانوں کی اقلیت ہے اس لئے یہ قیاس مع الفارق ہے۔

اے کاش اگر پردیسر صاحب شروع ہی میں اپنے دل کا یہ حال ظاہر فرماتے اور شروع مضمون میں یہ ظاہر فرمانے کی کوشش نہ کرتے کہ انھیں وقت کے سیاسی سلسلے سے کوئی بحث نہیں ہے بلکہ نقطہ علمی نقطہ نظر سے یہ ثابت کرنا ہے کہ یہ نام نہ نبوتی، معاہدہ مسلمانان باہود، ہرگز نہیں ہے اور اس پر ایک موبل مضامین کا سلسلہ نہ قائم کرتے، تو ہم کو بھی اس درد سہی کی ضرورت پیش نہ آتی۔ یہ تو دہی ہوا کہ

کوہ کندن دکاہ بر آردون

ہم کو اس سے تو کبھی انکار نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے کہ یہ حق ہر ایک صاحب علم کو حاصل ہو کہ وہ اس پر بحث کے کہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی موجود زمانہ میں اجنبی طاقت کے مقابلہ میں جس قسم کی داغی متحدہ قومیت کی دعوت دیتے ہیں وہ مفاد اسلامی کے لئے مفید ہے یا مضرہ ورجیا کہ میں نے اپنے نو ممبر کے مضمون کے آغاز میں بتایا تھا کہ اس سلسلہ پر موافقت و مخالفت میں تقریر و تحریر دونوں راہوں سے بہت کافی بحث بھی ہو چکی ہے اور ارباب سیاست اور علماء اسلام نے دونوں خیمتوں سے اس پر بہت کچھ لکھا ہے، اس لئے اگرچہ بے ضرورت ہوتا مگر پھر بھی آپ کو حق تھا کہ آپ بھی اس پر قلم فرسائی فرماتے اور اس جمہور علماء اسلام کے متفقہ فیصلہ کی مخالفت کی زحمت سے بھی بچ جاتے۔

اس کے بعد یہ تحریر فرماتے ہوئے کہ صحیح مقدمات کے لئے قریش در اوس و خزرج اور اسرائیلی یہودی کی پوری تاریخ معلوم رہنا ضروری ہے۔ پردیسر صاحب ارشاد فرماتے ہیں۔

”اگر ہمیں یقین ہو گیا کہ یہ سب کچھ پیش نظر ہونے کے باوجود بھی جناب مولوی صاحب کی یہی رائے ہے تو پھر ہم اس تاریخ کو ناظرین کے سامنے پیش کریں گے۔

میرے اور میرے ہم خیال علماء اسلام کے سامنے نہ صرف یہ مکمل تاریخ ہے بلکہ قرآن عزیز،

اعادیت نبوی، اور اس سے متنبط فقہ و اصول کا ذخیرہ بھی پیش نظر ہے، اور اس سلسلہ میں بھرا اللہ جبرائیل اختیار کی گئی ہے غلی و جب البصیر و اختیار کی گئی ہے۔ آپ کا پیش فرمانا ”چشم مارو شن دل اشاد“۔  
نیر پرد فیسر صاحب کا یہ ارشاد:-

”غرض یہ ہے کہ بیٹے غلی بحث ختم ہو جائے، کہ چر غلی سیاسی مسائل آسانی سولے ہو سکیں۔  
مجھے در بھی تعجب میں ڈل رہا ہے کہ یہ سیاسی بحث سے بے تعلق کا وہ انھار جو شروع مضمون میں نظر آتا ہے، دریا کر نہت کی یہ خستی جو اس جہت سے ظاہر ہے۔ اس چہ بوالعیت؟  
گر پرد فیسر صاحب برائے ان میں تو یہ گزارش خدمت سامی میں ہو کہ ان غلی سیاسی مسائل نے چند برسوں کی غلی تحقیق اور جدوجہد کے بعد ”غلی غلی“ کی شکل اختیار کر لی ہے اور اپنے صحیح نمایاں تمام کر سیتے کے بعد بھی تحقیق حق کا اگرچہ ہر وقت دروازہ کھلا ہے تاہم غلی گھوڑے دڈرانے کا وقت گزر گیا۔ اب ”غلی اسلامی“ کے لئے جو کچھ کسی سے ہو سکتا ہے اُس کے ”کرنے“ کا وقت ہو اختلاف رائے ہمیشہ رہا ہے اور رہے گا۔ اب سیاسی جدوجہد میں ”غلی“ اور اس کا ”نتیجہ“ ہی غلط اور صحیح کا فیصلہ کر سکے گا۔ اس لئے کیا اچھا ہو کہ جو راہ غلی آپ کے نزدیک درست ہے اُس پر عمل پیرا ہو کر خست اسلام انجام دیں۔ غلی سے جو حق ثابت ہو گا۔ اگر دوسرے اہل الرائے کے اندر دیانت ہو تو وہ خود بخود اپنی رائے کی غلطی کا اعتراف کر لیں گے۔

یہ حضرت مولانا کی ”وفاقی متحدہ قومیت“ سے آپ کے نقطہ نظر سے بھی شاید اس قدر نقصان نہیں پہنچا جس قدر سلام اور اسلامی مفاد کو ان غلی و غلی تحریکات سے پہنچ رہا ہے۔ جو اسلام کے نام پر اس کے حقیقی ضد وخال بھی کو فنا کر دینے کے درپے ہیں اور ”کافر و مومن“ کے فرق کو ایمان بانہ کے خالص امتداد سے ہٹا کر دنیا کی دولت و ثروت اور مآمانہ اقتدار کے وجود و عدم پر تمام کر رہے ہیں اور جو ”اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منہم“ کی تفسیر میں انگریزی حکومت کو اعلیٰ امام



بتا کر اس کی اطاعت کو مذہبی فریضہ اور نص قطعی کی قیید ثابت کرتے، اور جہاد کو سلام کی تعلیم سے یکسر خارج کرتے ہیں اور جو اسلام کو مخصوص اعتقادات اور فرائض کا مذہب نہیں مانتے بلکہ مذہب ہی کے نام سے اُس کو سوسائٹی کی طرح کا مذہب تسلیم کرتے اور اسی طرح ہندو، اور عیسائی مشرکوں کی تقلید کو اسوہ ٹھہراتے ہیں۔ اور اس کی دعوت و ابلاغ میں تحریر و تقریر کے ذریعہ دن رات کوشاں ہیں۔ اور جو منکر حدیث بنکر اسلامی احکام و عقائد پر براہ راست تیشہ و تبر چلاتے ہیں کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ جناب کا ”ملی قلم“ اُن کے ردِ عمل میں جولانی دکھائے؟۔

دنیا اسلام کی مسلم آزار طاقت سے رستگاری کے لئے جس قدر وسائل بھی علماء حق نے آج تک اختیار کئے ہیں اور کر رہے ہیں اُن میں تو بہت سے اہل قلم حضرات کو ہمیشہ مسلمانوں کی تباہی نظر آتی، اور مختلف خامیاں، نادانیاں، اور خدا جانے کیا کیا کمزوریاں معلوم ہوتی ہیں لیکن یہ ہمیشہ ہی حیرت زما منظر رہا ہے کہ ان ہزرگوں کا ”اسپ قلم“ اس دوسری اور عالمانہ کادشوں کیساتھ ان میدانوں میں تیزی کیساتھ گامزن نہیں ہوتا جہاں علم و عمل دونوں راہوں کے اصولی اور بنیادی عقائد کو ختم کر کے مذہب کو نئے قالب ”سوسائٹی کے مذہب“ میں ڈھالا جا رہا ہے۔

ان فی ذلک لعبرة لاولی الابصار



# حضرت نوح و طوفانِ نوح

(۲)

(موجودہ حفظ الرحمن صاحب سیواری)

فردوسی سنہء کے برہان میں "عنونِ بلا" کے تحت ایک مضمون سپردِ قلم کیا گیا تھا جس کی زمین شیخ عبد الوہاب صاحب بخاری کی کتاب قصص الانبیاء سے تیار کی گئی تھی۔ اصل مضمون اگرچہ پہلی قسط میں ہی ختم ہو گیا تھا مگر بعض ضمنی مباحث باقی تھے۔ موجودہ مضمون ان ہی مباحث کا مفصل شکل ہے۔ سابق مضمون میں ایک فرد گزشتہ ہے جو قابل، صراح ہو یہ فرد گزشتہ "جس کی جانب بعض دوستوں نے بھی توجہ دلائی اور مضمون چھپنے کے ساتھ ہی خود بخود کو بھی تشبیہ ہو،" سورہ عنکبوت کی یہ آیت ہے "وَاَنَّا مُنْجُوهُمْ وَاَهْلُ الْاِمْلٰكِ" اور اصل یہ آیت حضرت اوطا علیہ السلام سے متعلق ہے جو غلطی سے حضرت نوح کی نسبت سے اُج ہو گئی ہے۔ استدلال اگرچہ بغیر اس کے بھی اپنی جگہ صحیح اور مستحکم ہے مگر اس آیت صحیح نہیں ہے۔

۔ح۔

۱۔ طوفانِ نوح علیہ السلام، خاص حصہ زمین سے وابستہ رہا ہوا تمام کرہ زمین سے ذرا ہب عالم کی تاریخ اور علم آثار ارض سے یہ قطعی ثابت ہو چکا ہے کہ یہ واقعہ تاریخی حقیقت رکھتا ہے، اور اسکی حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

چنانچہ توراة کے علاوہ قدیم ہندو مذہب کی کتابوں میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے۔ اور اگرچہ

قرآن عزیز کے بیان کئے ہوئے سادہ اور صاف واقعات کے مقابلہ میں ان میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے تاہم نفس واقعہ کے اظہار میں یہ سب متفق نظر آتے ہیں۔

مولانا سید ابوالنصر احمد حسین بھوپالی نے اپنی کتاب ”تاریخ الادب الہندی“ میں تفصیل کے ساتھ اس واقعہ کو نقل کیا ہے جس کا عنوان ہے ”برہانا دادا بانٹیار“ اس میں حضرت نوح علیہ السلام کو مانتا کہا گیا ہے جس کے معنی ”خدا کا بیٹا“ یا ”نسل انسانی کا جدِ اعلیٰ“ بتائے جاتے ہیں۔

45.

(۲) قرآن عزیز نے صراحت کی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم میں سائے نو سو سال تبلیغ و دعوت کا فرض انجام دیا۔

ولقد امر سلیمان علیہ السلام ان یقوم فلیث

فیہم الف سنة الا خمسين عاما بنا کر بھیجا پس وہ رہا ان میں پچاس کم یکسر سال

یہ عمر عمرِ طبعی کے اعتبار سے بعید از عقل معلوم ہوتی ہے لیکن محال اور ناممکن نہیں ہے اس لئے کہ کائنات کی تبدل میں ہجومِ افکار اور امراض کی یہ فرادانی نہیں تھی جو چند ہزار برسوں میں انسانی تمدن کے مصنوعی سامانوں نے پیدا کر دی ہے۔ نیز حضرت نوح کی عمر کا معاملہ یہ اسی قسم کے مستثنیات میں سے ہے جو انبیاء علیہم السلام کی تاریخ میں موسیت الہی اور معجزات کی فہرست میں شمار ہوتے ہیں اور جن کی حکمت و غایت کا معاملہ خود خدائے تعالیٰ کے سپرد ہے مذہب میں اس قسم کے مخصوص مسائل عقلاً بھی قابلِ تسلیم ہیں جبکہ وہ ناممکن اور محال کی حیثیت رکھتے ہوں۔

قرآن عزیز نے کسی نبی و پیغمبر کی دعوت و تبلیغ کی مدت کا صراحت کے ساتھ اس طرح تذکرہ نہیں فرمایا جیسا کہ حضرت نوح کے واقعہ میں مذکور ہے۔ لہذا آج تقریباً سات ہزار سال قبل کی طویل عمر کے تاریخی شواہد کے اعتبار سے اگر اس کو صحیح تسلیم کیا جائے تو اس کی پوری گنجائش ہے اور اگر تاریخ کی شہادتوں کو غیر واقعہ ان کو انکار کر دیا جائے تب بھی اس واقعہ کو مخصوص حالات کے زیر اثر ایک



عطیہ الہی سمجھنا چاہئے جو ایک رسول اور پیغمبر کی دعوت و تبلیغ کی حکمتوں سے وابستہ ہے، رائج اور حقیقی  
سلک ہی ہے۔

لیکن مشہور شاعر ابو العلاء المعری اپنے چند اشعار میں یہ ظاہر کرتا ہے کہ قدیم زمانوں میں دستور  
تھا کہ لوگ "سمنہ" اور "عام" سال، برکوز، شمز (مہینہ) مراد لیا کرتے تھے۔ اس لحاظ سے حضرت نوح علیہ السلام  
کی تبلیغی خدمات کی عمر تقریباً اسی سال ہوتی ہو اور ان کی کل عمر ڈیڑھ سو سال سے آگے نہیں بڑھتی۔  
۳۱ بعض مفسرین نے اسرائیلیات و تورات و یہود کی روایات سے یہ نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ  
نے طوفان نوح سے چار سال قبل — قوم نوح کی عورتوں کو باہنچہ کر دیا تھا تاکہ جدید نسل عالم وجود  
میں نہ آئے مگر یہ روایت "رغیب شیب" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور غالباً اسے اس لئے  
گھڑا گیا ہے کہ یہ اعتراض پیدا نہ ہو کہ طوفان نوح کی صورت میں معصوم بچوں نے کیا قصور کیا تھا  
کہ وہ بھی لقمہ اجل ہو گئے۔

ان اعتیاد پسند حضرات کو شاید یہ بات فراموش ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ کا قانون جس کا نام "عادت  
اللہ" ہے اس بارہ میں کیا ہے۔ ورنہ ان کو اس لایحی روایت کے بیان کرنے کی ضرورت پیش  
نہ آتی جو اکثر یہود کے غلط افکار و عقائد کی تخلیق ہوتی ہیں کائنات ہست و بود میں "عادت اللہ"  
یہ جاری ہے کہ امراض، و بار، طوفان، زلزلے، جیسے امور جب بھی کسی سبب سے نمودار ہوتے ہیں  
خود وہ مذاب کے لئے ہوں یا امام عبادت زندگی کے اعتبار سے کسی خارجی سبب کے ذریعہ  
ظاہر ہوئے ہوں، تو جس مقام پر وہ نازل ہوئے ہیں وہاں کی آبادی میں نیک و بد، دلی و شیطان  
زہر و عابد اور فاسق و فاجر کے امین کوئی تمیز نہیں کرتے بلکہ اسباب مادیہ کے زیر اثر مہبتات کو  
وجود میں لانے کے لئے من جانب اللہ امور ہیں۔ اور دنیوی زندگی کے اعتبار سے ان کی پہل  
میں ہر دو ان بن آجاتا ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے ان اسباب کا مستبب بن جاتا ہے۔

البتہ عالم آخرت کے اعتبار سے یہ امتیاز نمایاں ہوتا ہے کہ فاسق و فاجر اور خدا کے دشمن کے لئے یہ اسباب عذاب الہی بنتے، اور مطیع و فرمانبردار اور نیک کردار انسان کیلئے موجب سعادت و درجات عالیہ کا مستوجب ہوتے ہیں۔

کیا ہماری نگاہیں روزِ مردہ یہ مشاہدہ نہیں کرتیں کہ جب روزِ امتا ہے تو نیک و بد دونوں پر یکساں اثر کرتا ہے، وہاں پھلتی ہوئی تو نیک کردار و بدکردار دونوں ہی اُس کی لپٹ میں آجاتے ہیں۔ اور دونوں کے رشتہ حیات کے لئے وہ یکساں ملک ثابت ہوتا ہے۔

البتہ یہ بات فراموش نہ کرنی چاہئے کہ جب کبھی اس قسم کا عذاب الہی، رہنمائی پریم یا فرمانی کی وجہ سے کسی قوم پر نازل ہوتا ہے تو بغیر کوہِ بدریہ جی س کی اطلالت دیکھ جاتی ہے اور یہ حکم ہو جاتا ہے کہ وہ مع اپنے اُن پیروؤں کے جو اسام کے دامن سے دستہ ہو گئے ہیں عذاب کی کُسن بستی سے باہر چلا جائے۔ اور بانگِ دہل یہ کہہ کر جائے کہ یا قوم، اُس کے لائے ہوئے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کر دے ورنہ خدا کے عذاب کو قبول کرے۔

بہر حال مفتسرین نے جس احتیاط کی غلطی سے انبیاء کے اس ذخیرہ سے مدد لینی چاہی جو وہ قطابِ ضرورت ہے اور سالِ حیات کی حقیقت یہی ہے جو سطور بالا میں پیش کی گئی۔

پس طوفانِ نوح میں قومِ نوح کے مرد و عورت، بوڑھے اور جوان، بچے اور بچیاں سب ہی طوفان کی ہلاکت خیزیوں کا شکار ہوئے، وہ بیکفر کا وہ حصہ سب ہی پر، دکھ دیا گیا۔ اب یہ عالمہ خدا کے سپرد ہے کہ جن عاقل و باغ انسانوں نے نافرمانی کی تھی اُن کے حق میں یہ دامنِ امداد و سرمدی عذاب بنا اور جو معصوم اور غیر عاقل تھے وہ آخرت کے عذاب سے امن و محفوظ قرار پاسے۔

(۴) سیدہ نوح طوفان کے بکس مقام پر ٹھہرا، قراۃ نے اس کا نام اراہط بتایا ہے۔

حضرت نوح کی دعوت و تبلیغ اُس سرزمین سے وابستہ تھی جو دجا اور فرات کے درمیان واقع

ہے اور یہ دونوں دریا آرمینیا کے پہاڑوں سے نکلے ہیں۔ اور جدا جدا بہ کر عراق کے حقہ زیرین میں گر  
 مل گئے ہیں۔ پھر خلیج فارس میں سمندر میں جا گئے ہیں۔ آرمینیا کے یہ پہاڑ ارساطا کے علاقہ میں واقع  
 ہیں اسی لئے تورات میں ان کو ارساطا کا پہاڑ کہا ہے۔ مگر قرآن عزیز نے اس پورے علاقہ کی بجائے  
 صرف اُس خاص مقام کا ذکر کیا ہے جہاں کشتی جا کر ٹھہری تھی، یعنی جودی کا تورات کے شاہین کا یہ  
 خیال ہے کہ جودی اُس سلسلہ کوہ کا نام ہے جو ارساطا اور جارجیا کے پہاڑی سلسلہ کوہ باہم ملا ہے  
 اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ سندراعظم کے زمانہ کی یونانی تحریرات بھی اس کی تصدیق کرتی ہیں۔ اور اس  
 تاریخی واقعہ کا تو انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آٹھویں صدی مسیحی تک اُس جگہ ایک ”مسجد“ اور ”مسیک“ موجود  
 تھا، جو کشتی کا مسجد کہا جاتا ہے۔

(۵) ایک مفسر نے حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کنعان کے نجات نہ پانے کے متعلق ایک  
 لطیف اشارہ کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام جلیل القدر پیغمبر اور متجالب اللہ عوا  
 تھے انھوں نے دعا اور ہر دعا، دونوں حالتوں میں خود اپنے بیٹے کو فراموش کر دیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ  
 کافر بیٹے کا تمرد اور اُس کی سرکشی پاداشِ عمل کی صورت میں نمودار ہوئی اور وہ بھی اکیسوا تہ  
 غرق دریا ہو کر رہ گیا۔

حضرت نوح علیہ السلام نے جو قوم کو راہِ راست پر لانے سے عاجز آگئے تھے سب سے  
 پہلے یہ دعا کی۔

رب لا تذر علی الارض من الکافرین اے پروردگار تو اس زمین پر کسی بے دلتے کافر  
 دیا سرا! ملک ان تذر ہم یضلوا کزنہہ۔ چھوڑ اس لئے کہ اگر تو ان کو زندہ چھوڑ دیا  
 عبادت دلا یدوا الا فاجر اعدا تو یہ میرے بن ان کو گمراہ کرتے رہیں گے، اور ان  
 کی اولاد کا سلسلہ بھی گمراہی اور کفر ہی پر قائم ہوگا (نوح)



دریہ قطعاً فراموش کر دیا کہ اس موقع پر کنعان کو مستثنیٰ کر کے اُس کے لئے قبول ہدایت کی دعا مانگنا چاہئے۔ یا بیٹے کے کفر کا علم ہی نہ تھا۔ دوسری مرتبہ جناب باری میں یہ دعا کی۔

سب اغضیٰ و لو الذی و لمن خل اسے پروردگار مجھ کو بخشش اور اُس شخص کو بھی  
بیٹی مومنہ و المومنین و المومنات بخشش سے نواز جو مومن ہو کر میرے گھر میں  
(نوح) داخل ہوا اور مومنین و مومنات کو بھی بخش دے

مگر اس موقع پر بھی انھوں نے کنعان کا استثناء نہیں کیا اور یا اُس کے مومن ہو کر گھر میں داخل ہونے کی دعا نہیں فرمائی۔

تیسری مرتبہ پھر یہ بد دعا کی۔

ولا یزد الظالمین الا التبارا اور ظالموں کے لئے ہلاکت کے سوا کچھ اضافہ نہ کر

کنعان، ظالم تھا اس لئے کہ کافر تھا۔ موقع تھا کہ استثناء کر کے اُس کے لئے ظالم نہ رہنے کی دعا بھی فرمائیے اور اگر معلوم نہ تھا تو یہ بد قسمت بیٹے کی بد قسمتی پر ازلی فرتقی جو ثبت ہو کر رہی۔

پس جب وقت قبولیت دما آ پہنچا اور کنعان کی سرکشی بدستور رہی تو اب محبت پروری کا جوش خدا کے مادلانہ فیصلہ کے سامنے نہ ٹھہر سکا۔ اور اُس کی نجات کی دعا پر اپنی نادانی کے اعتراف کے ساتھ غدر خواہی کرنی پڑی۔ اور بایں ہمہ جلالت قدر خدا کے سامنے اپنی بندگی کے اظہار ہی کو بہتر سمجھ کر عبد کامل ہونے کا ثبوت پیش فرمایا، اور درگاہ الہی سے شرف مغفرت حاصل کر کے قربت الہی کو حاصل کیا۔

خاتمہ کلام | مسئلہ کی اصل بحث اگرچہ پہلے نمبر میں ختم ہو چکی تھی مگر بعض ضروری ضمنی مباحث کا ذکر بھی ناگزیر تھا۔ سطور فوق میں سپرد قلم کئے جا چکے ہیں لیکن اصل مضمون کی اشاعت کے بعد بعض اہل قلم نے اس پر استدراک کے عنوان سے کچھ لکھ کر بھیجا تھا میں نے اس کا مطالعہ کیا۔ اُس میں اس بات کا

انہا رہے کہ ”طوفان نوح“ عام تھا خاص نہ تھا۔ اور یہند و مذہب کی نقول سے اس طوفان کی تائید میں مواد بہم پہنچایا گیا ہے۔ دریا پھر نفس طوفان کے ثبوت میں بعض دو دلائل مذکور ہیں جو میرے اصل مضمون میں منسل بیان ہو چکے ہیں اس لئے آخری بات کو چھوڑ کر پہلی بات کے متعلق صرف یہ گزارش ہے کہ عام و خاص کی بحث کچھ زیادہ معنی خیز نہیں ہے۔ کیونکہ خدا ب کی مستحق خسار کی وہ نافرمان مخلوق تھی جو رب مسکون کے فقط ایک خطہ میں آباد تھی اور انسانی آبادی ابھی دنیا کے ہر گوشہ تک وسیع نہیں ہوئی تھی ہذا طوفان کو اس قدر عام ماننے کے کوئی معنی نہیں نظر آتے کہ رب مسکون کا کوئی گوشہ بھی اس سے خالی نہ ہو۔ اور بغرض اگر اس کو مان بھی لیا جائے تو اثرات کے اعتبار سے وہ اس حصہ زمین کے حق میں قابل ذکر ہے جس مقام پر خدا سے سرکش قوم حضرت نوح علیہ السلام کی توہین و تذلیل کے رہے تھے اور باقی حصہ زمین کشت سے خارج ہے۔

دوسری بات کے تعلق یہ گزارش ہے کہ ہند و مذہب کے حوالوں میں اجمالی طور جس قدر اصل مضمون میں سپرد قلم کیا گیا ہے میرے خیال میں اس سے زیادہ تفصیلات کا دینا ایسی عجز و کار کا کہ ذخیرو کا اضافہ رہا ہے جو عقل سلیم کے پیش نظر غیر مفید ہے۔ پس اجمالی طور پر انہار کر دینا کافی ہے کہ مذہب عالم و مائیکھی شرہ اس واقعہ کے نفس ثبوت کے بہترین شاہد عدل ہیں۔ بہر حال اس قسم کے اشتراک سے اصل مضمون کی تائید ہی نکلتی ہے جو قابل شکر یہ ہے اس کی اشاعت مضمون مکرر کی حیثیت رکھتی ہے۔

# تلخیص و ترجمہ

## تمدن جدید پر عربی تہذیب کی فضیلت

عنوان بالا کے تحت حسن السلطان کے قلم سے پروفیسر شائے لین پول سابق استاد عربی ڈبلن یونیورسٹی کے ایک مضمون کا ترجمہ رسالہ "المقتطف" مصر دہشت ماہ مارچ سنہ ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا ہے۔ ہم ذیل میں اس کا مختصر اردو ترجمہ پیش کرتے ہیں۔

عربی علوم و فنون کا عہد زریں پانچ صدی تک قائم رہا۔ نویں صدی عیسوی کے آغاز میں اس عہد کا آفتاب طلوع ہوا تھا۔ اور تیرہویں صدی کے ختم پر غروب ہو گیا۔ اس آفتاب کی روشنی نے ان تمام شہروں کو منور کر دیا تھا جن کو عربوں نے فتح کر لیا تھا۔ یہ عربی کلچر مشرق میں یرن کے تمام شہروں پر اور مغرب میں بحرِ ٹلانٹک کے ساحل پر استیلا رکھتا تھا۔ ہر مسلمان خواہ ترکستان کا ہو یا اسپین کا عربی زبان بولتا تھا، لیکن یہ تہذیب اگرچہ سانی اعتبار سے عسری تھی، مگر اصولوں کے لحاظ سے عربی نہ تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب جس زمانہ میں جزیرہ کے صحراؤں میں قیام رکھتے تھے وہ خود کسی تہذیب اور علم کے زبور سے راستہ نہ تھے۔ اور سن کا تمدن تھا، و بچا نہیں تھا، جتنا کہ اسلامی عہد میں ہوا۔ البتہ یہ بدوی لوگ شہسوری، بہادری اور تیغ زنی میں تباہ کماں رکھتے تھے کہ اس کا فائدہ سے وہ دنیا کی تمام قوموں پر فائق تھے۔ مگر علم و فن حاصل کرنے کے لیے ان کے واسطے ضروری تھا کہ عرق و شام کا سفر کریں۔

عرب زمانہ جاہلیت قبل از اسلام میں جزیرہ سے نکلے، ورنہ انہوں نے چھوٹی چھوٹی حکومتیں



قائم کیں لیکن وہ اپنے ہمسایہ ممالک کو فتح نہیں کر سکے۔ اس کے دو سبب ہیں (۱) عربوں میں وطنی  
 بجھتی نہیں پائی جاتی تھی (۲) دوسرا سبب یہ ہے کہ ان کے لیے کوئی ایسا محرک نہیں تھا جو  
 دوسرے ممالک کی فتح پر انہیں براگتھ کرتا۔ البتہ جب اسلام آیا، تو اس نے عربوں میں ان  
 دونوں چیزوں کو بیدار کر دیا۔ ایک طرف تمام عرب اسلامی خوت و یگانگت کے مضبوط رشتہ میں  
 منسلک ہو کر ایک ہو گئے اور دوسری جانب ان میں تبلیغ اسلام کے شوق نے اپنی وسعتوں کو  
 دراز کرنے کا جذبہ پیدا کر دیا۔ ان دونوں باتوں کے پیدا ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام عربی قبائل متحد و متفق  
 ہو کر تیروں کی ایک مسلسل قطار کی طرح آگے بڑھے اور اپنے ہمسایہ ممالک پر چھا گئے۔ ان مسلمان  
 عربوں کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ قبل جنگ کا بڑے سے بڑا موثر نغمہ کسی فوج پر وہ اثر نہیں  
 کر سکتا جو میدان جنگ میں کسی مجاہد کا نغمہ "لے کبر ان عرب مسلمانوں پر کرتا تھا۔

غیر معمولی مذہبی تنظیم، در دینی جوش و خروش کا نتیجہ یہ ہوا کہ سدوم کو عالم وجود میں آئے ہوئے  
 ابھی پورے پچیس سال بھی نہیں ہوئے تھے کہ قیصر و کسریٰ کی عظیم الشان مملکتیں اسلام کے زیرِ نگیں  
 ہو گئیں لیکن شروع شروع میں ان عربوں اور مفتوحہ قوموں کا تعلق محض حاکم و محکوم کے تعلق تک  
 محدود رہا، اور عربوں نے ان قوموں کے علمی و تمدنی کمالات کی طرف اہمیت نہیں کیا۔ پہلی صدی  
 ہجری کا ایک بڑا حصہ اسی طرح گزر گیا۔ پھر جب سوریوں نے مدینہ منورہ کی بجائے اپنا دار السلطنت  
 دمشق کو بنایا تو یہاں ان کو دوسری قوموں کے فنکار اور ادبا، و فلاسفہ کے ساتھ اختلاط کا موقع  
 ملا جس کی وجہ سے ان کے نظریات و جہات میں بھی تدریجی طور پر تبدیلی پیدا ہونے لگی۔ ان اموی  
 خلفائے دربار میں روم و ایران کے رہنما ہاں اپنا اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ ان سے دفتری حسابات  
 اور تحریر و نسخے کاموں میں مدد بھی جاتی تھی اور انہیں اس کی مکمل اجازت تھی کہ وہ اپنے علوم و فلسفہ  
 کو ان دی سے ساتھ لے کر پڑھیں۔ جنہ کی اثرات کی وجہ سے دفتری حسابی زبان پہلے پہل غیر عربی

(فارسی) رہی۔ لیکن تھوڑی ہی مدت کے بعد حکومت کے تمام دفتروں کی زبان عربی بنادی گئی۔  
 پنج اوقات سکوں پر ظفار کے نام کندہ ہونے لگے۔ اور اسی طرح، جنہی قوام کے لوگ مجبور ہو گئے کہ عربی زبان  
 کی تعلیم حاصل کریں۔ ان میں کثرت سے ایسے بھی تھے جو جزیرہ سے دستگاری حاصل کرنے یا مناصب و  
 اعزازات میں مسلمانوں کے ہمپا بننے کے لیے مسلمان ہو گئے تھے۔ روم، اور ایران کے لوگوں کے  
 کثرت مسلمان ہونے کا ثمر یہ ہوا کہ مسلمانوں کی ایسی مشترکہ سوسائٹی بن گئی جس میں عربوں کے علاوہ  
 مصری، شامی، یونانی، بربری اور آرمینی اقوام کے لوگ بھی برابر کے شریک تھے۔ در عربوں میں اور ان  
 سب اقوام میں باہمی طور پر شادی بیاہ کے معاملات انجام پاتے تھے۔

قرن مجید کا اثر | قرآن مجید نے مسلمانوں کی اس مخلوط سوسائٹی کو بہت بڑی حد تک متاثر کیا ہے  
 جنہی اقوام کے نو مسلم قرآن مجید کو سمجھنے کے شوق میں عربی زبان سیکھتے تھے اور اس میں ہمدست پیدا  
 کرتے تھے۔ اس سے یہ تو ضرور ہو کہ اب تک جو دفتری اور دیوانی عہدے عربوں کے لیے مخصوص  
 تھے ان کے دروازے غیر عرب مسلمانوں کے لیے بھی کھل گئے اور اس سے عربوں کی نفوذی شکت  
 و شہرت کو صد مہ پھینچا۔ لیکن اجتماعی طور پر وحدت زبان کا فائدہ یہ ہو کہ ایشیا، افریقہ، اور اسپین کے  
 تمام مسلمان ایک رشتہ اخوت میں منسلک ہو گئے۔ پھر فارس و اسکندریہ کے راستوں سے  
 یونانی فلسفہ و علوم کی جو روانی اُس نے بھی مسلمانوں کی تہذیب پر حیرت انگیز اثر کیا پہلے سے مصر

نے ہماری رائے میں پروفیسر لین پول کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ بلکہ اصل یہ ہے کہ یہ لوگ جوق در جوق جو اسلام میں  
 داخل ہوئے تھے وہ محض اسلام کی حقانیت و صداقت کی وجہ سے ہوئے تھے۔ ورنہ جہاں تک دنیوی آزادی اور  
 پیش و آرام کا تعلق ہے وہ غیر مسلم ہونے کی حالت میں بھی ان لوگوں کے لیے دمی بنانے کی وجہ سے کچھ کم نہیں تھا  
 اور پھر مذہب کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ اس کو محض دنیوی منفعت کی خاطر ایک دو نہیں بلکہ ہزار در ہزار انسانوں  
 کی جہالتیں بیک وقت چھوڑ دیں۔ حضرت عمرؓ کے عہد کا مشہور تاریخی واقعہ ہے کہ چار ہزار ایرانی سپاہی، ایرانی فوج  
 کے کپتان رستم کے لشکر سے اٹک ہو کر بیک وقت اسلام آئے تھے تو کیا کوئی سلیم الفطرت انسان تسلیم کر سکتا ہے کہ  
 ان سب نے دنیوی نفع کو حاصل کرنے کی غرض سے اپنا پورا دین ترک کر کے اسلام قبول کر لیا تھا؟ اس

شام، اور ایران، یونانی فلسفہ علوم کی تعلیم کے خاص مرکز تھے اور ایرانی بادشاہوں نے اپنے ملک کے دو ذمے اُن نسطوری لوگوں کے لیے کھول رکھے تھے جو زانیہوں کی سختیوں سے گھبرا کر ان کے ملک میں پناہ دینی چاہتے تھے۔ یہاں تک آزادی تھی کہ انہوں نے مدرسہ جندیابور کے نام سے ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی جس میں فلسفہ ہندو اور علوم طبیہ کے ساتھ ساتھ فلسفہ یونان اور دوسرے علوم کی تعلیم دی جاتی ہے۔

عرب ایران میں | امویوں کا پائے تخت دشمن ایران سے بعید تھا۔ اس لیے عرب شروع شروع میں ایرانی تہذیب و کلچر سے زیادہ متاثر نہیں ہوئے لیکن بنو امیہ کے زوال کے بعد شیعہ میں جب بنو عباس کا دور شروع ہوا، اور اس واقعہ کے بارہ برس بعد بغداد دارالاسعنت بن گیا تو اب عربی تہذیب پر ایرانی تہذیب کا رنگ سرعت کے ساتھ چڑھنے لگا۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ خلفاء بغداد نہایت فیض طبع اور غیر متعصب تھے۔ وہ ایرانیوں کو وزارت ایسے بڑے بڑے عہدوں پر بھی فائز کرنے سے دریغ نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ تاریخ بغداد کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ ہر ایک کو جو عربی مسئلہ نہیں تھے فذلت بغداد جس کس درجہ اثر و رسوخ حاصل تھا۔

عربی تہذیب کی اس اثر پذیری میں اردن رشید کی حکومت سے زیادہ مامون رشید کی حکومت کو دخل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مامون طبعا علوم و فنون اور خصوصاً فلسفہ یونان کا بڑا شوق تھا اور لکھنا آتا ہے کہ اس کی تربیت بھی ایک حد تک ایرانی ماحول میں ہوئی تھی۔ مامون کی زندگی کا بڑا کام یہ ہے کہ اُس نے یونان کے فلسفہ اور دوسرے علوم کے درس و تدریس کو بہت کچھ حوصلہ فزائی کی۔ اور عربی زبان میں ان تمام علوم کے تراجم کا اہتمام کیا اس کا اثر یہ ہوا کہ اس میں جو علوم کلام یک دہوئے سن کی بنیاد فلسفہ یونان پر ہی قائم تھی۔

مامون میں صفت یہی نہیں کہ مامون کا محل ایک شاہکار کتب خانہ اور رصد گاہ



رکھتا تھا، بلکہ اس زمانہ میں گھر گھر علم و فن کا ایسا چرچا تھا کہ بڑے بڑے علماء اور اعیان سلطنت کے مکانات علمی مذاکروں اور بحثوں کی مجلسوں میں تبدیل ہو گئے تھے لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ مدت کچھ زیادہ طویل ثابت نہ ہو سکی مامون کی وفات کے کچھ عرصہ بعد خلفاء اور امراء میں شدید اختلاف رونما ہو گیا۔ اور تمام ملک ان ترکوں کا شکار بن کر رہ گیا جو علم اور تہذیب سے بالکل بے بہرہ تھے۔ یہ عہد زریں اگرچہ مختصر تھا لیکن اس کے اثرات عالم اسلام کے گوشہ گوشہ تک پہنچے اور یہ اپنی یادگار میں ایک ایسی عظیم شان تہذیب چھوڑ گیا جو تمام سابقہ تہذیبوں سے بلند و بالا تھی۔

بعد اپنے زمانہ عروج میں مادی اعتبار سے ہی ترقی و بلندی کا مرکز نہیں تھا بلکہ علم کا حشرچہ اور عربی تہذیب کا بھی معدن تھا۔ یہاں دین کے ہر گوشہ سے طبباء کثرت سے آتے تھے اور ان کا ہجوم ایسا ہی رہتا تھا جیسا کہ آج کل امریکہ اور یورپ کی یونیورسٹیوں میں طبباء کا ہجوم رہتا ہے۔ بغداد میں مسجدیں درگاہوں کا کام دیتی تھیں، اور یہاں فقہ، قانون، فلسفہ، طب، اور ریاضیات پر لکچر دیے جاتے تھے۔

طبباء کی طرح دور دراز ممالک سے بڑے بڑے افاضل و علماء بھی بلائے جاتے تھے تاکہ وہ اپنے لکچروں کے ذریعہ تشنگان علوم کو سیراب کریں۔ یہ علماء اپنے نظریات و افکار کی تشریح میں بالکل آزاد تھے پھر ان طبباء اور ساتھ کے لیے سلمان ہونے کی بھی قید نہ تھی۔ بغداد کے دروازے ہر مذہب و ملت کے طلباء کے لیے کھلے ہوتے تھے۔

فلاسفہ اسلام اس زمانہ میں قرآن مجید کی تعلیم کے ساتھ ارسطو کے فلسفہ پر بھی بہت زیادہ توجہ کی گئی۔ یہاں تک کہ ابن رشد پیدا ہوا جو ارسطو کے فلسفہ کا بہترین شرح سمجھا جاتا ہے۔ مسلمان فلاسفہ میں انہیں لوگوں کو امتیاز حاصل ہوتا تھا جو ارسطو، بطلمیوس، جالینوس، اور بقراط وغیرہ یونانی حکماء کے افکار و نظریات سے پوری طرح باخبر ہوتے تھے۔ بغداد میں فلسفہ یونان کی تعلیم نے بڑے بڑے

نہ مورفلسفہ پیدا کیے جنہوں نے نہ صرف مسلم نوز کو بہ مشرق و مغرب کے ملکوں کو فلسفہ یونان سے روشناس کرایا۔ قرون وسطیٰ میں یورپ کی یونیورسٹیوں مثلاً پیرس کی یونیورسٹی، بادوا کی یونیورسٹی، ہینلز و ہرون کی یونیورسٹیوں میں گندی، افارابی، فرغانی، خوارزمی، ابن سینا، رازی، باطنی ابن باجہ، بیرونی، ابومشعر اور ابن رشد ایسے فلاسفہ اسلام کے فلسفہ کا ہی درس دیا جاتا تھا۔ اور چونکہ ان فلاسفہ کے نام کا عربی تلفظ یورپ کے طلباء کے لیے سہل نہ تھا اس لیے ان کو لاطینی رنگ دیا گیا۔ اس زمانہ میں یورپ نے فلسفہ، ریاضیات، طب، علم کیا اور فلکیات میں جو کچھ سیکھا وہ ان کتابوں کی وسطیت سے تھا جن کا یونانی سے عربی زبان میں ترجمہ ہو چکا تھا۔ یہ قابل انکار حقیقت ہے کہ سترہویں صدی عیسوی کے خیر تک یہ صرف فلاسفہ اسلام کی تعلیمات تھیں جن کا درس یورپ کی یونیورسٹیوں میں ہوتا تھا۔

عربوں نے علوم و فنون کے ترجمہ پر ہی اکتفا نہیں کی، بلکہ اجتہاد و فکر سے کام لیکر انہوں نے مفید صلہ میں دراضافے بھی کیے مثلاً نجوم۔ یعنی میں انہوں نے عربی ہندسوں (Arabic numerals) کا اضافہ کیا اور پھر ہندسوں کی بجائے رموز استعمال کرنے لگے۔ اسی طرح انہوں نے علم جبر (Algebra) و علم مثلثات (Trigonometry) کی ایجاد کی، یہاں اس کا موثق نہیں ہے کہ عربوں نے علوم ریاضی میں جو اضافے کیے ہیں ان کو تفصیل سے بیان کیا جائے۔ البتہ یہ دعویٰ کے ساتھ کہ جاسکتا ہے کہ ان علوم میں عربوں کی موثکافیاں اور ان کی تحقیقات ریاضیات کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ اسی طرح فلکیات پر انہوں نے جو محنت کی ہے اور جو اپنے خاص نثر ہے، انہوں نے پیش کیے ہیں وہ اس بات کا رشتہ موت ہیں کہ عرب اس علم کے ساتھ بھی کس وجہ متنا کرنے تھے۔ انہوں نے اس علم میں جو اصطلاحات وضع کی تھیں جدید فلکیات میں اب تک ہمیں سے کام لیا جاتا ہے۔ عربوں نے اگرچہ علم فلک اور علم نجوم میں

خط مقرر دیا ہے مگر یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ انہوں نے اس فن کو خالص علمی رنگ میں رنگ دیا۔ اور علوم کی صفت میں اس کو بھی ایک نمایاں مقام دلایا۔ رہا علم کی کیا تو انہوں نے اس علم کو سکندریہ کی درسگاہوں سے حاصل کیا۔ اور اس پر طرح طرح کے اضافے کر کے کچھ سے کچھ بنا دیا جس کی وجہ سے وہ طب اور دوا سازی کے فن میں بہت مفید ثابت ہوا۔ ہم یورپ کے لوگ اب تک اپنی بحثوں میں جو علم سے متعلق ہوتی ہیں، کثرت سے عربی الفاظ و مصطلحات استعمال کرتی ہیں۔ ہم نے ایک مدت تک عربوں کے اس دعوے کا مذاق اڑایا ہے کہ ایک مخصوص کیمیاوی ترکیب کمتر سے کمتر دھات کو زر خالص میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اب جدید تحقیقات نے اس دعوے کی واقفیت اور معقولیت کو ثابت کر دیا ہے۔ اگرچہ اس عمل میں کامیابی حاصل کرنے کا طریقہ عربوں کے مجوزہ طریقہ سے مختلف ہے۔

علمی تلاش جستجو اور علمی بحث و نظر دونوں کا ساتھ رہا ہے۔ جو لوگ علوم و فنون کے ماہر ہوتے تھے وہ ملک ملک کی سیاحت کر کے شب و روز اپنی علمی تشنگی کو بجھانے کے سامان میں لگے رہتے تھے۔ عربی زبان اور اس کے علوم میں ایسی کشش تھی کہ دور دورا کے عربی نہ جاننے والے انہوہ در انہوہ اپنے وطنوں کو خیر باد کہہ کر چل پڑتے تھے اور چونکہ اس زمانہ میں نقلی و عقلی قسم کے علم و فن کامرکز بغداد تھا اس لیے یہ سب طلباء یہیں کا رخ کرتے تھے۔ اسی قسم کے لوگوں میں ابو نصر فارابی تھا جو ترکستان کے ایک شہر فاراب کا باشندہ تھا۔ فارابی علم کی جستجو میں پنے وطن سے اس حالت میں روانہ ہوا کہ وہ عربی کا ایک لفظ بھی نہیں جانتا تھا۔ یہاں سے روانہ ہو کر وہ حران میں آیا۔ اور یہاں کے مدرسہ میں فلسفہ یونان کی تعلیم ایک مشہور ستارہ پرست فلسفی بطنی سے حاصل کی۔ یہاں سے فارغ ہو کر وہ بغداد آیا وراستہ طور کے فلسفہ کا عمیق مطالعہ کیا۔ اور اساتذہ فن کے اس موضوع پر لکچر سنے۔ اس کے بعد وہ شام آیا اور یہاں کی ایک عظیم الشان



دیونوری میں اپنی وفات (۹۵۰ء) تک برابر درس و تدریس میں مشغول رہا۔

امراء کے محلات اسلامی | بنی عباس کی ستمت میں جب زوال پیدا ہو گیا اور خلفاء اپنے ترک خلافت  
کھچر کی درگاہیں تھیں | کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن گئے۔ تو اب علم کے مرکز بغداد سے منتقل ہو کر دمشق

اور حلب میں آ گئے ان نئے مرکزوں نے بڑے بڑے فلاسفہ اسلام اور مفکرین کو جن کے پیشرو فارابی  
اور ابن سینا تھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ فارابی اور ابن سینا ان فلاسفہ میں سب سے زیادہ مشہور ہیں  
جنہوں نے ارسطو کا فلسفہ بنظر عمیق پڑھا اور اس کے نظریات و افکار کو عربی میں منتقل کیا۔ ابن سینا کی  
شہرت میں زیادہ تر اس کی کتاب "القانون" کو دخل ہے جو دراصل طبِ قدیم کی ایک کتاب کا  
عربی ترجمہ ہے

پھر جغزیہ اور سفر کے حالات میں جو کتابیں لکھی گئیں ان سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ عرب سیر و  
سیاحت کر کے علمی کمالات پیدا کرنے کے کتنے شوقین تھے۔ اس عہد کی جغزیہ کی کتابوں میں سب  
سے زیادہ مشہور کتاب یاقوت حموی کی معجم البلدان ہے۔ یاقوت یونانی غلام تھا، مسلمان ہو جانے  
کے بعد اس نے بغداد میں تعلیم حاصل کی۔ سفر ناموں میں حسب ذیل سفر نامے مشہور ہیں۔ سفر نامہ ترکی  
سفر نامہ مکرری، سفر نامہ ابن جبیر اور مشہور عرب مورخ مسعودی تو اپنی جہاں پیمائی کے باعث مشرق  
کا بہرہ و دانش ہی کمال ہے۔  
(باقی آئندہ)

# ای بیا

## سفر پارہ

ریل گاڑی میں

(زیر ترتیب کتاب "غیر نظرت" کا ایک راق)

از جناب احسان دانش بھلا

آچکا تھا نصف گردوں تک سوار آفتاب  
جا رہا تھا میں سہارنپور کو لاہور سے  
مونگ دلتی جا رہی تھی سینہ بھر اپریل  
بے زباں خنگل میں دورِ علم کا اعلان تھا  
کر رہی تھی دم بدم روشن چہرے انماک  
بچھ رہے تھے ایسی چپ سادھو سیلیرا میں  
پٹریوں کا ارغون تھا، گھومتی پیسوں کی گت  
یوں نظر آتی تھی حالت چرخ نیلم تاب کی  
کوئٹے کے ننھی ننھی دڑھائے نیم حباں  
بن رہی تھی صامیڈاں کی ہوت پتے کے ٹو  
دھیں سی لڑکے بڑھتی فون کرتوں کی ڈور

دوڑتا تھا سڑخ نگاروں پہ گرمی کا شباب  
دریں عبرت لے کے خواب دوستی کر دوں  
انقلابی زلزلوں کی رو تھی یا طوفان میل  
وجد تھا باغوں پہ طاری تھیں میں میدان تھا  
پٹریوں کے سنگ باروں کی صد آواز  
جس طرح سادھو سینہ تان کے جنگ گاہ میں  
چار تار رگنی سڑگوختی جاتی تھی چھت  
جیسے یہی میں ہے کائی کسی تاب کی  
برن رہو جھونکوں کے اڑتے دامنوں میں تھوڑا  
ہونکتا جاتا تھا نجن پھیلتی جاتی تھی بو  
کھینچنے کے حاشیوں پرنا چتے بچوں کا شور

ہاتھ سے رکھ کر درانتی دودھ پیتے کسان  
 بھاگتی پگڈنڈیاں، بہتی ہوئی سی شاہراہ  
 سناتے گرم جھونکے دمناتی گاڑیاں  
 دودھ پیتے کھبے، پکتے کھیت، رزم کرتے شجر  
 مفلسی سے جن کے دل بوڑھے گر چہرہ جوان  
 چمپاتی کھڑکیوں پر گلہ بانوں کی نگاہ  
 گھومتی باغات، چلتی پل، چھپتی جھاریاں  
 چڑھ رہی تھیں گویا شاعر کی نگاہیں سان پر

آہی تھی دل سے یہ آواز اے نظریات

کس قدر نامستبر، عقل انساں کا قیاس

دبہ حق میں کو لازم ذوق بیداری بھی ہے  
 محفل عالم ہے لبریز فریب چشم و گوش  
 رزم اس غفلت سر دالوں کو بیداری بھی ہے  
 ہے پیام تشنہ کامی اہتمام ناؤ نوش  
 بقرہ می ہے سکوں کے واسن خاموش میں  
 خاموشی پنہاں ہے فریاد و فغاں کے جوش

کرنہ آنکھوں کا یقیں، دنیا کی صورت اور ہر

زندگی کے ذرے ذرے کی حقیقت اور ہر



# پیام

از جناب ہمال بیواری

ارض و سلسلے کے تاجدار، ارض و سما پہ چھائے جا  
 مٹھی کے وجود غم اور بھی تو اڑائے جا  
 پیش کر ہفتخوار تو ہوا تو بھی قدم بڑھائے جا  
 اے دل زندہ چپ نہ رہ نعمہ نوٹائے جا  
 ہاں یونہی مسکرائے جا، ہاں یونہی گنگائے جا  
 خاکدہ حیات سے جام طرب اڑائے جا  
 سیلی موج سے نہ ڈریلی موج کھائے جا  
 انجمن حیات کو شعلہ نو دکھائے جا  
 اور ابھی پلائے جا اور ابھی لٹھائے جا  
 ساعزل کو اپنے تو سا غم بنائے جا  
 رختِ مہرو ماہ کو سرش قدم بنائے جا  
 ہاں اسی ساز عشق سے عقل کے ہوش اڑائے جا  
 تجھ سے یٹھ کے کیا کہوں نقش کہن مٹائے جا  
 پردہ کبھی گرائے جا، جلوہ کبھی دکھائے جا

چشمِ جہاں کو وسعتِ جوشِ عمل دکھائے جا  
 جتنا دیا ہے سختی کو و گراں غم تجھے  
 جادہ غم سے منہ نہ موڑ شانِ تہمتی نہ چھوڑ  
 رزگہ جہاں میں ہے داخل مرگ خامشی  
 ہاں یونہی دادِ ظلم دے چرخِ جفا شعار کو  
 خاکدہ حیات ہے کس کے لیے، ترے لیے  
 جس میں نہ ہو جفا کشی ننگ ہے وہ شنواری  
 حکمتِ تازہ ترے ہو کا شعبِ رازِ زندگی  
 ساقی ارتقا، ہنوز تشنہ ہے بزمِ روزگارا  
 لحظہ بہ لحظہ فاسق کر دے کے حقائقِ نہاں  
 ہونگی اسی طرح سے طے منزلیں اورج کی تمام  
 جس کی نوا سے جھوم جائے دہرہ سازِ عشق  
 کیا نہیں جانتا ہے تو غایتِ انقلاب کو  
 ہو وہ حجاب یا نمود و نوں ادائیں میں تری

تجھ سے زمینِ شعر ہے غیرتِ صدارمِ ہمال

صورتِ ابرو بہارِ پھول یونہی کھلائے جا

## شأن علمیه

### مرئخ میں زندگی کا ایک نیا مطالعہ

تند فکریات کی ایک جماعت اپنی اپنی رصد گاہوں کے ذریعہ اس اہم سوال کا قطعی جواب دینے کی کوشش کر رہی ہے کہ یہ زندگی صرف زمین تک محدود ہے جس پر انسان سانسیتہ ہے یا ان عانوں میں بھی آثار حیات پائے جاتے ہیں جن کا انکشاف رصد گاہوں کے ذریعہ ہو چکا ہے درجن کی تعداد اس وقت تک چھ کر ڈ معلوم ہو چکی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے سوا ابھی کئی کر ڈ عالم ور میں جو پورے طیر پر اب تک دریافت نہیں ہو سکے۔

اس جماعت کے علمبردار میں سب سے زیادہ مشہور پروفیسر بریسل ٹول ہے جس نے امریکہ کے ریڈوٹا کے نشیبی میدان میں اپنی رصد گاہ قائم کی اور اس کی وساطت سے اس نے مرئخ کا عمیق مطالعہ کیا۔ پروفیسر موصوف نے ایک عرصہ کی تحقیق کے بعد بتایا کہ اس رائے میں مرئخ میں جو انسان آباد ہیں وہ قریب قریب ہم زمین کے باشندوں کی طرح ہی زندگی بسر کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی رصد گاہ کے ذریعہ باریک باریک تنگ اور سیدھے خطوط دیکھے جو مرئخ کی سطح پر پھیلے ہوئے سیاہ میدانوں و جنگلوں کے درمیان میں سے گزر رہے ہیں۔ پروفیسر موصوف کا خیال ہے کہ یہ خطوط نہریں ہیں جن میں پانی بہتا ہے اور مرئخ کے سبزہ زاروں اور اس کے چشیں میدانوں تک پہنچتے ہیں۔ یہ مرئخ کی نفس ربیع کے زمانہ میں بہت صاف نظر آتی ہیں لیکن جب رومی شروع ہوتی ہے وہ خطوط نہریں اپنے نقی اطراف کی جانب سے سیاہ ہونے لگتی ہیں۔

یہاں تک کہ مرتبھی خط استوار کے قریب بالکل معنی ہو جاتی ہیں۔ پروفیسر بوئل کا بیان ہے کہ ان نہروں میں پانی اُن برقیوش طبقوں سے آتا ہے جنہوں نے زمین کے دونوں قطبوں کی طسرح رینگ کے قصبین کو ڈھانک رکھا ہے۔ یہ پانی اُس وقت زیادہ نمایاں ہوتا ہے جبکہ ان خطوط کے کناروں کی زمین موسم رجم میں طرح طرح کی مزروعات کی وجہ سے سرسبز و شاداب ہوتی ہے۔ بوئل کو یقین ہے کہ یہ نہریں قدرتی نہیں بلکہ صنعی ہیں اور مرتب رینگ کے انسانوں نے انہیں مرتب کی جیسی سختی اور خشونت کا مقابلہ کرنے کے لیے کھوڑا ہے۔ اُن کے اس عمل سے پتہ چلتا ہے کہ مرتب رینگ کے انسان فہم و ذکا کے لحاظ سے زمین کے انسان سے کم نہیں ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ یہ نہریں سو دو سو نہیں بلکہ ہزاروں میلوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔

پروفیسر بریفل بوئل نے شروع شروع میں اپنا یہ نظریہ دنیا کے سامنے پیش کیا تو علما و فلک کی ایک بڑی جماعت نے اس کو محض تخیلی اور فرضی نظریہ قرار دیا لیکن طویل بحث و تجویس نے آخر کار یہ ثابت کر دکھایا کہ بوئل کے نظریہ کے اکثر اجزاء درست اور صحیح ہیں۔ ان مباحث میں سب سے اہم بحث وہ ہے جو ڈاکٹر ٹیوڈر ڈونہم کی ہے، ڈاکٹر موصوف کلیفورنیا کی رصد گاہ کے ذریعہ ایک عرصہ تک مصروف تحقیق رہے۔ اور اب چند ہفتے ہوتے ہیں کہ انہوں نے اپنے نتائج شائع کر دیے ہیں۔

ڈاکٹر ڈونہم اپنے بیان میں کہتے ہیں کہ زندگی کا وجود ہر اُس ستارہ میں ممکن ہو سکتا ہے جو آفتاب سے ایک مناسب مسافت پر واقع ہو۔ کیونکہ اگر یہ ستارہ سورج سے زیادہ قریب ہو تو آفتاب کی تیز حرارت زندگی قائم نہیں رہنے دیگی، اسی طرح اگر بعد زیادہ ہو تو سخت سردی اور ٹھنڈ کی وجہ سے یہاں زندہ رہنا مشکل ہوگا۔ اس کے علاوہ قیام زندگی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ستارہ کا حجم اور اس کا ثقل زمین کے حجم اور ثقل کے برابر ہو تاکہ اُس کی حرکت دورانی ایسے مناسب



طریقہ پر ہو کہ ستارہ کی سطح پر رہنے والی مخلوق زندہ رہنے کے قابل ہو سکے۔ ڈاکٹر ڈونہم کہتے ہیں کہ زندگی کی ان شرطوں کو سامنے رکھتے ہوئے اب ہم مرتبج کو دیکھتے ہیں تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں یہ شرطیں بدرجہ تم پائی جاتی ہیں اور اس بنا پر کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو مع حیات ہو سکے۔

اس سلسلہ میں ڈاکٹر ڈونہم نے ایک عجیب اور دلچسپ بات کہی ہے، وہ کہتے ہیں مرتبج میں قوت کشش زمین کی قوت کشش سے بہت زیادہ کم ہے اور چونکہ زمین کی قوت کشش کا ثقل سی انسان کی حرکت کے لیے مزاحم ہوتا ہے۔ اس لیے مرتبج میں قوت کشش کی کمی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہاں کے انسانوں کی حرکت زمین کے انسانوں کی حرکت سے کہیں زیادہ تیز اور سبک ہوگی۔ ڈونہم کا خیال ہے کہ مرتبج کا ہاتھی زمین کے ہرن کی طرح چوڑیاں بھرتا پھرتا ہوگا، اور مرتبج کے انسان کا حجم زمین کے انسان کے حجم سے تین گنا زیادہ ہوگا۔ اسی طرح اس کی قوت زمین کے انسان کی قوت سے، گنا زیادہ ہوگی۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ اس قدر قوت کے باوجود مرتبجی انسان کے ہاتھ پاؤں، رطاف، اعضا، بچوں کے دست و پا کی طرح نرم ہونگے اور اس کی وجہ یہی قوت کشش کا ضعف ہے کیونکہ کشش کے کمزور ہونے کی وجہ سے عضلاتی قوت کو زیادہ کام نہیں کرنا پڑیگا۔ اور اس بنا پر مصلحت پیدا نہیں ہو سکیگی۔ دوسری عجیب بات یہ ہے کہ مرتبجی انسان کا پیٹ زمین کے انسان کے پیٹ سے کہیں زیادہ بڑا ہوگا اس کی وجہ یہ ہے کہ مرتبج میں سال کے اندر کئی مہینے ایسے آتے ہیں کہ پانی بہت کم ہو جاتا ہے اس بنا پر اس انسان کے پیٹ میں ایک نہیں بلکہ کئی معدے ہوتے ہونگے جن میں سے ایک مضمک کا رہے۔ بقیہ معدے پانی کے جمع رکھنے کا کام کرتے ہونگے۔ پھر مرتبجی انسان کا سینہ ارضی انسان کے سینہ سے زیادہ مضخم ہوگا۔ کیونکہ یہاں کی ہوا زیادہ رقیق ہے۔ اس لیے مرتبجی انسان کے ناک اور منہ کے ذریعہ اس ہوا کی بڑی مقدار اس کے سینہ میں پہنچتی رہی ہوگی اور اس کی وجہ سے سینہ کی صافی مت

زیادہ ہوتی ہوگی۔ اسی طرح س انسان کا سر زیادہ ضخیم اور اس کے کان زیادہ چوڑے ہوتے ہوئے  
 مرتخی انسان کے اس عجیب و غریب خاکہ کے علاوہ ڈاکٹر ڈونہم نے یہ بھی ثابت کیا ہے  
 کہ مرتخ کے دونوں قطب برف سے ڈھکے ہوتے ہیں۔ موسمِ بہار میں یہ برف پگھل جاتی و خریف  
 میں سمجھ ہو جاتی ہے۔ مرتخ کی زمین کے رنگ کی نسبت ڈونہم کا بیان ہے کہ ان سبزہ زاروں  
 کے علاوہ جو ادھر ادھر پھیلے ہوئے ہیں، یہاں کی زمین کا رنگ عموماً مائل بہ سرخ ہے۔ البتہ ان  
 سبزہ زاروں کا رنگ سبز اور نیلے رنگ کے درمیان ہے جو موسمِ گرما میں کسی قدر سیاہ ہو جاتا ہے۔

### ہجری اور عیسوی سنین کی تطبیق کا قاعدہ

مارچ ۱۹۳۰ء کے الملال (مصر) نے ہجری اور عیسوی تاریخوں کی تطبیق کا ایک آسان  
 قاعدہ لکھا ہے۔ جس کو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔ یہ قاعدہ ان لوگوں کے لیے بہت مفید ہے  
 ہوگا جو کسی وجہ سے جنتروں کی مراجعت نہیں کر سکتے۔

(سنہ عیسوی جس کی تطبیق مطلوب ہے) - ۶۲۱,۶  $\times \frac{1}{96}$  = سنہ ہجری

مثلاً ۶۱۹۳۰ = ۶۲۱,۶ - ۱۹۳۰  $\times \frac{1}{96}$

= ۱۳۱۸۲  $\times \frac{1}{96}$  = ۱۳۱۸۳ = ۱۳۵۹ ہجری

(۱) سنہ ہجری کی جس روز ابتدا ہوئی (جمعہ یکم محرم سنہ) اُس وقت سنہ عیسوی کے ۶۲۱ سال  
 گزر چکے تھے اور سنہ ۶۲۲ء کی جولائی کی ۱۶ تاریخ تھی۔

(۲) تنو سال قمری (ہجری) ۹۷۷ سال عیسوی کے لگ بھگ ہوتے ہیں۔

مذکورہ بالا قاعدہ میں انہی دونوں سے حساب لگایا گیا ہے۔

# تبصرہ

مفردات القرآن عربی [تفصیح ۲۶۶ صفحات ۴۴ کاغذ ایک بت جہاں بہتر مولف مولانا حمید الدین فراہی دہلی، دائرہ حمیدیہ سربراہی اعظم لکھنؤ]

مولانا حمید الدین فراہی مرحوم نے اپنے مخصوص طرز میں قرآن پاک کی غیر معمولی خدمت انجام دی ہے اہل علم اس اچھی طرح واقف ہیں، قدرت نے مولانا کو فہم قرآن سے حصہ وافر عطا فرمایا تھا اور حق یہ ہے کہ مولانا نے اس عطیہ قدرت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

”دائرہ حمیدیہ“ اہل علم کی طرف سے شکریہ کا مستحق ہے کہ مولانا جیسے شیدائے علم کی عرق ریز کوششوں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس سے پہلے ”برہان“ میں مولانا کی متعدد قابل قدر کتابوں کا تعارف کرایا جا چکا ہے!۔ زیر نظر کتاب عربی زبان میں ہے، اس میں قرآن مجید کے ایسے، مفرد و نفلوں کی تحقیق کی گئی ہے جن کے سنانی کی تعیین میں عام طور پر مشکلات پیش آتی ہیں، ہمیں پوری کتاب کے مطالعہ کا موقع نہیں ملا، ہم جست جستم جو حصے دیکھ سکے ہیں ان کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ مولانا کی شان تحقیق اس کتاب میں بھی نمایاں ہے، مفردات القرآن پر بڑی بڑی ضخیم، معتبر اور محققانہ کتابیں موجود ہیں، لیکن مولانا نے جس ضرورت کو سامنے رکھ کر یہ کتاب لکھی ہے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا جن الفاظ کی تشریح کتاب میں ملتی ہے ان میں خاص طور پر حسب ذیل الفاظ کی تحقیق قابل مطالعہ ہے۔

مصدقہ کتابین یحییہ۔ نصاریٰ۔ بادو۔ ابتر۔ الصلۃ۔ الحکمۃ۔ الاسلام۔ الاتقا۔ الالاء۔

کتاب بحیثیت مجموعی اہل عسک کے مطالعہ کے لائق ہے۔ (دع)



تاریخ اخلاق اسلامی حصہ اول | تقطیع ۲۰×۲۰ صفحات ۲۰۴ تالیف مولانا عبد السلام ندوی طباعت کتابت محمد

قیمت پچھترپہ دارالمصنفین اعظم گڑھ

ہندوستان کا مشہور و معروف علمی ادارہ دارالمصنفین اعظم گڑھ علم و ادب کی جو شاندار خدمات انجام دے رہا ہے وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی علمی و مذہبی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔  
 زیر نظر کتاب اسی گرامی قدر ادارے کی جانب سے شائع کی گئی ہے جو اپنے موضوع کے لحاظ سے ایک مفید اور کامیاب کوشش ہے۔ کتاب میں حسب ذیل بڑے بڑے عنوانوں کی ماتحت اسلامی تاریخ کا نقشہ پیش کیا گیا ہے! — اخلاق عرب قبل از اسلام۔ رذائل اخلاق۔ محاسن اخلاق۔ اخلاق عجم۔ اخلاق قرآنی علم حدیث اور اخلاق۔ آداب معاشرت۔ زاهدانہ اخلاق۔ معاملاتی اخلاق۔ سیاسی اخلاق۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاقی طریقہ تعلیم، محرکات اخلاق، عملی اخلاق اور ان کے موثرات، دور نبوت میں اجتماعی اخلاق کے نمایاں علمی مظاہر، پھر ان بڑے عنوانوں کے ذیل میں پچاسوں چھوٹے عنوان ہیں۔ جہاں تک اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی تفصیل کا تعلق ہو کہا جاسکتا ہے کہ اس کتاب میں اسے بڑی جامعیت اور دلنشین ترتیب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے خصوصاً ”اخلاق قرآنی“، ”علم حدیث اور اخلاق“ ان دونوں عنوانوں کے تحت میں فاضل مولف نے جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھ کر اسلامی فلسفے کی تمام منتشر جزئیات بیک نظر سامنے آجاتی ہیں۔ اسلام میں اخلاق اور اخلاقی تعلیمات کو جو مقام عطا کیا گیا ہے اس کا اندازہ اس کے ہو سکتا ہے کہ خود زبان نبوت نے مکارم اخلاق کی تکمیل کو منشاء بعثت قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے

بعثت لا تتم مکارم الا بخلاق

میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہو

ایک طرف اخلاقی تعلیم کی یہ اہمیت اور دوسری طرف ہمارے علمی اور مذہبی لشکر میں اس سے اس درجہ بڑا اعتنائی کہ ہماری زبان کا تمام ذخیرہ اس سے کیسے خالی! — بنا بریں ضرورت تھی کہ کوئی فاضل اس موضوع پر قلم اٹھائے اور اسلامی اخلاق کے تمام اجتماعی اور انفرادی پہلوؤں کو اردو داں پبلک کے سامنے رکھے۔ یقین ہے کہ کتاب کے اس حصہ کی طرح باقی حصے بھی کامیاب رہیں گے۔ اور اس طرح وقت کی ایک اہم ضرورت کی تکمیل ہو جائے (س ع)

یورپ کی حکومتیں حصہ اول | از ڈاکٹر نجسیم الدین احمد جعفری باریٹ لا۔ سائز  $24 \times 32$  صفحات ۲۱۶ قیمت

مجلد ایک روپیہ چار آنے ہم کاغذ بہتر کتابت، جباعث متوسط۔ نئے کاغذ۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔

اردو زبان اگرچہ نصف صدی سے علمی زبان بن چکی ہے، اور ہر قسم کا علمی ٹریچر اس میں منتقل

ہوتا جا رہا ہے تاہم سیاسی ٹریچر کی بھی بہت کمی ہے۔

پنجاب کے بعض اہل علم نے شروع میں اس طرف توجہ فرمائی اور آہستہ آہستہ ایک اچھا ذخیرہ اس سلسلہ میں بھی جمع ہو گیا۔

ڈاکٹر جعفری صاحب کی یہ کتاب بھی اس سلسلہ کی قابل ذکر کڑی ہے۔ اس کتاب میں یہ بتایا گیا

ہے کہ یورپ کی حکومتیں برطانیہ، فرانس، اٹلی، اور ترکی، کے نظام ہائے حکومت اور دستور و آئین

کی تشکیل کن اصولوں پر کی گئی ہے، اور یہ حکومتیں مختلف شعبہ ہائے حکومت میں کس طرح حکمرانی

کے فرائض انجام دیتی ہیں اور ساتھ ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں ہر ملک کی سیاسی ارتقاء پر بھی

روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کے نام کے پیش نظر اگرچہ اس میں اور بھی بہت کچھ ہونا چاہئے تھا

تاہم جس قدر موجود ہے مفید اور ٹھوس معلومات کا ذخیرہ ہے اور اس لئے مصنف کی بحث

قبل داد اور لائق ستائش ہے۔ "ح"

آتش خاموش | از احسان۔ انش کاغذ عسوی۔ تقطیع  $24 \times 22$  قیمت مجلد ایک روپیہ صفحات ۲۰۰

کاغذ معمولی، کتابت جباعث بہت اچھے کاغذ بہتر کتابت، جباعث متوسط۔ مکتبہ برہان قرون وسطیٰ دہلی

حضرت احسان، انش ملک کے اُن بلند پایہ شعرا کی صف میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک

ہیں، جن کی شاعری کا موضوع وقت کی ترجمانی اور مقصد ایک ایسا پاکیزہ انقلاب ہے جس کے

پیچھے امن و انسانیت، سکون و اطمینان کی زندگی جاگ رہی ہے۔ "آتش خاموش" احسان صاحب

کی انقلاب انگیز نظموں اور بہت ہی تغزل کے ساتھ پیغام عمل کی سرمایہ دار غزلوں کا مجموعہ ہے

جس کا ہر شعر ان کے دل کے اس محشر درد و کرب کا اثر انگیز نتیجہ ہے جسے ہندوستان کے مزدوروں اور غریبوں کی انتہائی مظلومیت نے پیدا کیا ہے!۔ یوں تو اس مجموعہ کی ہر ایک متظم سرمایہ پرستی کے ظالمانہ نظام کے حق میں جلا کر بھسم کر ڈالنے والی آگ کا ایک بے پناہ طوفان، اور سوئی ہوئی انسانیت کو بیدار کرنے کے لئے "سوراسر افیل" کا درجہ رکھتی ہے، لیکن "باعی" کا خواب۔ "ایر ملک کے فقیر باشندے"۔ "ترانہ جہاد"۔ "دو ماہیں" اور "کتا اور مزدور" خاص طور پر آرٹ اور پیغام کے وصل کا بہترین مرقع اور جوش آفرینی و دروانگریزی کے اعتبار سے شعر و ادب کا شاہکار کہلانے کی مستحق ہیں۔ "م"

مسلمان ہند کی حیات سیاسی | انوف محمد مرزا دہلوی۔ صفحات ۲۵۶ تقطیع ۲۰/۳۰/۳۰ کتابت معمولی کاغذ طباعت عمدہ "ناشر:۔ کتب خانہ علم و ادب دہلی۔

اس کتاب میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، مصنف نے مسلمانوں کی سیاسی زندگی سے بحث کی ہے، اسلوب نگارش سنجیدہ اور سلجھا ہوا ہے، لیکن اس کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے عنوان کے ہر ایک پہلو کو اپنے ایک خاص نظریہ پر توڑنے کی سعی کی ہے، اور اس سعی میں جو چیز بھی ان کے عقائد سیاسی سے ہم وزن نہیں ہو سکی، انہوں نے اس کی اہمیت و قیمت کو غیر موثر خانہ طرز کے ساتھ نظر انداز کر دیا ہے، تاہم کتاب قابل مطالعہ اور مدلل ہے اور اس چیز کی طالب ہے کہ مصنف نے جو کچھ اس میں پیش کیا ہے، اس پر سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کیا جائے۔ "م"

گنودان | مصنفہ منشی پریم چند۔ تقطیع ۲۰/۳۰/۳۰ صفحہ ۶۵۱ قیمت مجید تین روپے۔ کاغذ کتابت اور طباعت بہتر۔ ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ دہلی۔ منشی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔

منشی پریم چند کے تقریباً تمام افسانوں اور ناولوں کا موضوع و مقصد دیہات کی معاشرت



اور اس کی اصلاح ہے، انھوں نے ہمیشہ گائوں کے عام لوگوں کی عموماً اور کسان طبقہ کی خصوصاً تباہ کاریوں کی داستان حقیقت پیش کی ہے "گودان" موصوف کا آخری ناول ہے اس کا "پس منظر" بھی دیہات کی وہی معصوم فضا ہے جو ہے جس پر سرمایہ پرستوں کے خونی پنجے ہمیشہ اپنا تباہ کن جال پھیلاتے رہتے ہیں "ارو باں" کے سادہ لوح باشندوں کو اپنی اغراض فاسدہ کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھانے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں اگرچہ پیش منظر ناول کی طوالت نے پچسی کو کسی حد تک کمزور بنا دیا ہے تاہم افادی حیثیت سے اس میں کوئی کمی نہیں واقع ہوئی دیہات کی سماجی زندگی کا مکمل نقشہ صحیح معنی میں اسی طرح پیش کیا جاسکتا ہے۔ "م"

شرح غزلیات نظیری (مبدل)، از مولانا محبوب آہی صاحب۔ تقطیع ۲۶×۲۰ صفحات ۲۱۹ قیمت ۴۰

ناشر مکتبہ انیس، دہلی ۷۷

فارسی شعر و شاعری میں نظیری چوٹی کے شعراء میں شمار ہوتا ہے، اگرچہ اس کے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی ہے لیکن دراصل اس کو اس بلند مقام تک پہنچانے والی چیز صرف غزلیات ہیں جن میں اعلیٰ معیار کا تغزل پایا جاتا ہے اس کا کلام کیتر نفسیاتی اتہا جیت ہی کا نتیجہ نہیں بلکہ ہمیں احساس فریضہ کو بھی دخل حاصل ہے تشبیہات کی لطافت، جذبات کی خوبصورت طرز ادا، قوت تخیل کی بلندی، مضمون آفرینی شوکت الفاظ اور مقابلہ بندی میں وہ اپنے مشہور ہم عصر شعراء سے کسی طرح کم درجہ پر نظر نہیں آتا، انہی خصوصیات نے اس کو مقبول خاص عام بنایا۔

ٹیکل کالج دہلی فاضل پروفیسر مولانا محبوب آہی صاحب نے اس کی غزلیات کو اردو شرح کا جامہ پہنایا ہے جو پہلی جلد کی صورت میں اس وقت ہمارے سامنے ہے اس میں حروف تہجی کے اعتبار سے آخیر ختم ہونے والی غزلوں تک کی شرح کی گئی ہے جو اپنے طرز کی بالکل جدید چیز ہے شرح موصوف نے اس میں رتبہ کے ساتھ ساتھ، اصل لغات، توضیح مطالب، شعری خوبیاں،

تلیحات کی وضاحت، تحقیق الفاظ اصطلاحات کی تشریح، اور ہر غزل کے متعلق بجز و تقطیع کا بیان وغیرہ اہم امور کا اضافہ کر کے کتاب کو بہت زیادہ وسیع و سودمند بنا دیا ہے، ایک مبتدی طالب علم سے لے کر ایک عالم تک، ہر صاحب ذوق اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، کتاب کے شروع میں دو مشہور علماء ادب کی تقاریر کے بعد مولانا سعید احمد صاحب ایم۔ اے ایڈیٹر برہان کا پرمغزو بصیرت افروز مقدمہ ہے جس میں صاحب موصوف نے غزلیات نظیری کی شرح پر تبصرہ کرتے ہوئے نظیری کے سوانح حیات بیان کئے ہیں اور نظیری پر اپنی عالمانہ رائے کا اظہار کیا ہے، مجھے امید ہے کہ عام لوگوں کے علاوہ مشرقی امتحانات کے طلباء خصوصیت کے ساتھ اس سے مستفید ہوں گے۔

## گلابانگ آزادی

یہ کتاب آزادی کے موضوع پر ۵۶ معیاری رباعیوں کا بہترین مجموعہ ہے، جو "شاعر برہان" جناب نہال سیوہاروی کی تراش فکر ہیں، ایک انسان کی سب سے بڑی تلاش "غلامی" ہے اور کسی شاعر کی تخیل میں بلند پروازیوں کے ساتھ حبیب یہ تڑپ شامل ہو جاتی ہے تو اس کی قوت بیان کی سحر طرازیوں کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا۔ "گلابانگ آزادی" میں نہال صاحب آپ کو اسی مقام ارفع پر نظر آئیں گے۔ اس مجموعہ کو "مکتبہ برہان" نے پاکٹ سائز پر اعلیٰ ترین کتابت و طباعت اور بہترین کاغذ کے ساتھ شائع کیا ہے، جس کے شروع میں ۱۶ صفحات پر جناب مولانا سعید احمد ایم۔ اے ایڈیٹر برہان کا فاضلانہ و عالمانہ مقدمہ ہے جس میں صاحب موصوف نے اردو شاعری کے ارتقائی رجحانات پر تاریخی حیثیت سے روشنی ڈالتے ہوئے نہال صاحب کے کلام پر بھی مختصر تنقید کی ہے۔ قیمت مجلد سنہری صرف ۸۔

ملنے کا پتہ :- "مکتبہ برہان - قرون باغ - دہلی

# نبی عربی صلعم

تالیف مولانا قاضی زین العابدین صاحب سجادہ شریعی رفیق ندوۃ المصنفین دہلی،

تاریخ اسلام کے ایک مختصر اور جامع نصاب کی ترتیب ندوۃ المصنفین دہلی کے مقاصد میں ایک ضروری مقصد بن کر نظر کتاب اسی سلسلہ کی پہلی کڑی ہے جس میں متوسط استعداد کی بچوں اور بڑوں کے لکچر سیرت سرور کائنات صلعم کے تمام اہم واقعات کو تحقیق جامعیت اور اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کتاب کی چند خصوصیتیں حسب ذیل ہیں۔

- ۱۔ واقعات کے بیان میں تاریخی ترتیب کا لحاظ رکھا گیا ہے، مگر مضامین کے ربط و تسلسل کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا گیا۔
- ۲۔ حسب موقع ضرورت واقعات کے اسباب و نسل سے بھی سہل انداز میں بحث کی گئی ہے۔
- ۳۔ طرز ادب میں ان کی یکسانیت، سہولت، سلاست اور سادگی و شگفتگی کا غیر معمولی طور پر اہتمام کیا گیا ہے۔
- ۴۔ تمام واقعات عربی کی قدیم و جدید سیرت کی معتبر و مستند کتابوں سے لئے گئے ہیں۔
- ۵۔ کتاب کے آخر میں ایک نقشہ دیا گیا ہے جس میں سیرۃ نبوی کے تمام واقعات مشہورہ کو تاریخ وار اور سند وار بیان کیا گیا ہے اس نقشہ سے سیرۃ کے تمام واقعات بیک نظر سامنے آجاتے ہیں۔
- ۶۔ سکول کڈز کو کے علاوہ جو اصحاب تھوڑے وقت میں سیرۃ طیبہ کی ان گنت برکتوں سے بہرہ اندوز ہونا چاہتے ہیں، ان کو اس کتاب کا فاس طور پر مطالعہ کرنا چاہیے یہ کہنا ہمارے پاس ہے کہ نبی عربی اپنے طرز کی بالکل جدید اور بے مثل کتاب ہے کتابت، طباعت، نہایت اعلیٰ ولایتی سفید چمکا کاغذ صفحات ۱۰۰ قیمت مجلد نہری ایک روپیہ (عمر)

یہ مجلد بارہ آنے ۱۲ صرف اپتہ ذیل سے طلب فرمائیے۔

میجر ندوۃ المصنفین۔ قرو باغ۔ نئی دہلی



## ”چندنی کتابیں“

مضامین محمد علی حصہ اول و دوم | کچھ دن ہوئے مکتبہ جامعہ نے مضامین محمد علی کا حصہ اول شائع کیا تھا۔ اس مجموعہ میں آپ بیتی، مسائل ملی، مسلمان اور قومیت، مسلمان اور کانگریس، مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ وغیرہ وغیرہ پر مولانا محمد علی کے بصیرت افروز مضامین تھے۔ اب مولانا کے مضامین کا یہ دوسرا حصہ شائع ہوا ہے اس حصہ کو بھی جناب پروفیسر محمد سرور صاحبی۔ اے آنرز جامعہ، فاضل مصر نے مرتب فرمایا ہے یہ مجموعہ اس سنگلمہ خیز دور کی پوری تاریخ ہے، ۱۸۵۷ء سے شروع ہو کر ۱۹۳۷ء پر ختم ہوتا ہے، سرسید نے کانگریس کی مخالفت کس بنا پر کی؟ وہ مسلمانوں کو تمام تحریکوں سے الگ رکھنے پر کیوں مصر تھے؟ اسلامی سیاست کا یہ سلک آخر کار کیا رنگ لایا؟ مسلم لیگ کا قیام کیسے اور کہاں عمل میں آیا؟۔ لیگ انگریز کی دوستی سے ہٹ کر کیوں کانگریس سے ہم نوا ہونے پر مجبوری ہوئی؟ اور پھر کس طرح دونوں کی راہیں الگ الگ ہوئیں؟۔ قیمت مجلد حصہ اول دو روپے آٹھ آنے پیکر و دوم پیکر۔

جوہر اقبال | علامہ اقبال بحیثیت ایک شاعر نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا میں مشہور تھے چنانچہ ان کے بالکمال شاعر ہونے کا یہ ایک ادنیٰ ثبوت ہے کہ ان کی اکثر نظموں کا ترجمہ، دنیا کی بہت سی زبانوں میں ہو چکا ہے ”جوہر اقبال“ علامہ اقبال کی زندہ جاوید اور بے مثال شخصیت کو سمجھنے کے لئے ایک مفید کتاب ہے اس میں ہندوستان کے چوٹی کے ارباب علم و فضل ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر سید حسین، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، مولانا سید سلیمان ندوی، مہاتما گاندھی، پروفیسر محمد مجیب، پروفیسر رشید احمد صدیقی اور خواجہ غلام السیدین کے مضامین اور پیغامات جمع ہیں۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ صرف اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن چند ماہ میں ختم ہو گیا، اور اب یہ دوسرا ایڈیشن ارباب علم کی خدمت میں پہلے سے زیادہ خوشنما طریقہ سے حاضر ہے، قیمت مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے پیکر۔

# البيان

## اُمّتِ مُسلمہ امتِ سرکار کا ماہوار رسالہ

آج جب کہ دنیا بس حد تک ترقی کر چکی ہے کہ جب تک کوئی اصول عقل و تحقیق کی کسوٹی پر پورا نہ اُترے، قبول نہیں کیا جاتا، ایک ایسے علمی و دینی پرچہ کی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جو قرآن حکیم کی تعلیمات کو RATIONAL یعنی عقلی طور پر مغرب زدہ دماغوں کے سامنے پیش کرے یہ امر تمام مسلمانانِ ہندوستان کے لیے فخر و مسرت کا موجب ہونا چاہیے کہ "البيان" اسی معیار پر کلامِ عزیز کی خدمت و شانت کا فرض سرانجام دے رہا ہے۔ یہ پرچہ تمام ہندوستان میں پنے رنگ کا واحد پرچہ ہے، بل تحقیق صحابہ اس کی مقبول و معتدل روش کو دیکھ کر تسکین حاصل کریں گے۔ "البيان" ہر مہینے کے پہلے مفت ۲۰۰۰ کے سفید چھپنے کاغذ پر شائع ہوتا ہے اور صرف تین روپے سالانہ چندہ میں سات سو صفحات کے علمی و دینی مضامین کا مجموعہ پیش کرتا ہے۔ نمونہ مفت طلب کیجیے۔

## ڈیڑھ ہزار صفحے کا لٹریچر مُفت

"البيان" کا سالانہ چندہ تین روپے ہے، اگر آپ اس چندے کے ساتھ مزید ایک روپیہ شامل کر کے چار روپے بذریعہ منی آرڈر سال فرامیں گے، تو تم آپ کو رسالہ کے پُرانے ۲۴ منتخب پرچے جن کا حجم تقریباً ۵۰۰ صفحے ہے اور قیمت چھ روپے مُفت بھیج دیں گے اور آپ کے نام سال بھر کے "البيان" بھی جاری کر دیں گے یہ تمام پرچے قرآن عزیز کے حقائق و معارف، علمی و تاریخی معلومات و علمی و روحانی مضامین کا بہترین ذخیرہ ہیں۔

(نوٹ) اس عظیم الشان رعایت سے "البيان" کے نئے اور پرانے تمام خریدار فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

بمِلنے کا یَت ہے :

منیجر رسالہ "البيان" امتِ سر

# اسلام کا اقتصادی نظام

تالیف مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب سیداری

اس کتاب میں اسلام کے پیش کیے ہوئے اصول و قوانین کی روشنی میں اس کی تشریح کی گئی ہے کہ دنیا کے تمام اقتصادی نظاموں میں صرف اسلام کا اقتصادی نظام ہی ایسا نظام ہے جس نے محنت و سرمایہ کا صحیح توازن قائم کر کے اعتدال کا راستہ پیدا کیا ہے۔ اس وقت اقتصادی مسئلہ تمام دنیا کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ سرمایہ داری کی تباہ کاریوں سے ننگ آئی ہوئی قوموں کے سامنے سب سے اہم سوال یہ ہے کہ وہ کونسا نظام ہے جس کو اختیار کر کے ایک انسان کو انسانوں کی طرح زندہ رہنے کا حق مل سکتا ہے۔ آپ اگر اسلام کی اقتصادی دستوں کا مکمل نقشہ دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ضرور ملاحظہ فرمائیے۔ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہر صفحات ۲۶۴۔ قیمت جلد ۲۰ غیر مجلد ۱۰

## سوشلزم کی بنیادی حقیقت

مترجم سید مفتی الدین صاحب شمس آباد

اشتراکیت کی بنیادی حقیقت اور اس کی اہم قسموں سے متعلق مشہور جرمن پروفیسر کاسل ڈیل کی تقریریں جنہیں پہلی مرتبہ اردو میں منتقل کیا گیا ہے، ان کے ساتھ سوشلزم کے حالات اور اس کی موجودہ رفتار رتی کے متعلق مترجم کی جانب سے ایک مبسوط اور مفصل مقدمہ بھی شامل ہے، کتابت طباعت کا غذائیت عمدہ صفحات ۳۰۴ قیمت جلد ۲۰ غیر مجلد ۱۰

## ہندوستان میں قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ

آلہ ہندوستان میں قانون شریعت کے نفاذ کی مکمل عملی تشکیل پر پہلا بصیرت افروز مضمون جس میں دارالافتاء کے مفاہد کی تشریح، محکمہ قضا کی مالی مشکلات کے حل، قاضیوں کے انتخابی شرائط و ران کے تعلیمی نصاب پر بنیاد پر مشتمل اور جامع بحث کی گئی ہے۔ نیز مضمون کی تمہید میں موجودہ محکمان کی تمام قابل ذکر خدمات پر زبردست تنقید کی گئی ہے۔ صفحات ۴۸۔ قیمت ۳۰

منیجر ندوۃ المصنفین قروں باغ نئی دہلی



## قواعد

۱۔ برائے ہرگز بڑی مہینہ کی ۵ تاریخ کو ضرور شائع ہو جاتا ہے۔

۲۔ مذہبی، علمی، تحقیقی، خلاقی مضامین بشرطیکہ وہ علم و زبان کے معیار پر پورے اتریں برائے میں شائع کیے جاتے ہیں۔

۳۔ باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاک خانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دے دیں، ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بلا قیمت بھیج دیا جائیگا۔ اس کے بعد تکایت قابل متنا نہیں سمجھی جائیگی۔

۴۔ جواب طلب مور کے لیے ایک ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

۵۔ برائے کی صفحات کم سے کم اتنی صفحہ ہمارے دور ۹۶۰ صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۶۔ قیمت سالانہ پانچ روپیے پیش کشاں راور روپیے بارہ آنے (مع معصوں ڈک) فی پرچہ ۸

۷۔ منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھیے۔

ندوة امیہ مصنفین دہلی کا ماہوار رسالہ

# برہان

مترتب  
سعید احمد کبیر آبادی  
ایم اے۔ فارمیل دیوبند

# ندوة المصنفین کی کتابیں الرق فی الاسلام اسلام میں غلامی کی حقیقت

تالیف مولانا سعید احمد ایم۔ اے۔ مدیر رہبان

کتب کے اس حصہ میں غلامی کی حقیقت، اس کے اقتصادی، اخلاقی اور نفسیاتی پہلوؤں پر بحث کرنے کے بعد بتایا گیا ہے کہ غلامی انسانوں کی خرید و فروخت کی ہڈا کب سی ہوئی۔ اسلام سے پہلے کن کن قوموں میں یہ رواج پایا جاتا تھا اور اس کی سویر میں کیا تھیں، اسلام نے اس میں کیا اصلاحیں کیں اور ان اصلاحوں کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا نیز منسوب مصنفین یورپ کے پانچ اور یورپ کی بدلتی خیر اجتماعی غلامی پر بسوڑ تبصرہ کیا گیا ہے۔

یورپ کے رہا پناہ یافتہ و تبلیغ نے اسلامی تعلیمات کو بدنام کرنے کے لیے جن حربوں سے کام لیا ہے ان تمام حربوں میں سیوری کا مسد بہت ہی موثر ثابت ہوا ہے۔ یورپ امریکہ کے علمی تبلیغی حلقوں میں اس کا مخصوص طور پر چرچا ہو رہا ہے اور جدید ترقی یافتہ ممالک میں اس مسئلہ میں غلط فہمی کی وجہ سے اسلامی تبلیغ کے لیے بڑی رکاوٹ ہو رہی ہے، بلکہ مغربی قوموں کے باعث ہندوستان کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس کی شکار ہے۔ انشاء جدید کے قالب میں گرا آپ اس باب میں اسلامی نقطہ نظر کے تحت ایک محققانہ و یگانہ بحث دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ضرور دیکھیے۔ مجلد سے دیگر مجلدات کے

## تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام

تالیف مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند رفیق اعزازی

مؤلف نے اس کتاب میں مغربی تہذیب تمدن کی ظاہر آرائیوں کے مقابلہ میں اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کو یک فاس منصفانہ نہ زمین میں کیا ہے۔ تعلیمات اسلامی کی جامعیت پر بحث کرتے ہوئے وہ اُن واقعات کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ موجودہ عیسائی قوموں کی ترقی یافتہ ذہنیت کی مادی جدت طرازیوں اسلامی تعلیمات ہی سے زنجیری تیار ہو چکی ہیں جنہیں قدرتی طور پر اسلام کے دور حیات ہی میں نمایاں ہونا چاہیے تھا۔ اسی کے ساتھ موجودہ تمدن کے انجام پہنچنے کی گئی ہے اور یہ کہ آج کی ترقی یافتہ مسیحی قومیں آئندہ کس نقطہ پر ٹھہرنے والی ہیں۔ ان باتوں کے علاوہ بہت سے مختلف ضمنی مباحث آگے ہیں جن کا اندازہ کتاب کے مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

کتابت و دستاویز بہترین مفید پکنا کاغذ صفحات تقریباً ۵۰۰ قیمت غیر مجلد ۵۰ روپے سنہ ۱۳۸۵ھ



# برہان

شمارہ ۶۵

جلد چہارم

جمادی الاولیٰ ۱۳۵۹ھ مطابق جون ۱۹۴۰ء

## فہرست مضامین

۳۰۲	سید احمد اکبر آبادی	۱۔ نظرات
۳۰۹	مولانا محمد عثمان صاحب ترقی یافتہ ادیب و مفسر لاہور	۲۔ اسلام اور سائنس
۳۲۵	مولانا محمد صاحب بی بی سی ال ال بی کیل میرٹھ	۳۔ قانون قدرت پر عقلی بحث
۳۳۹	مولوی رفعت احمد خان صاحب ایم اے پکڑ گونٹ کالج المٹوہ	۴۔ اردو کی جدید شاعری اور اقبال
۳۵۲	۱۔ س	۵۔ تلمیذ ترجمہ دہلوی تہذیب کی فضیلت تہذیب جدید پر
۳۵۹	جناب میر تقی - مولانا حمزہ صدیقی	۶۔ ادبیات: نیزنگ اتن، شاعر کی صبح
۳۶۵	۱۔ س	۷۔ شہنشاہ علیہ
۳۶۹	۱۔ س	۸۔ تبصرے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

# نظرات

## عربی زبان کی ترویج و اشاعت

عربی زبان میں سائناتی (سائنس) اعتبار سے جو غریباں ہیں اُن سے قطع نظر تاریخی لحاظ سے اس زبان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اُس قوم کی مذہبی زبان ہے جو تعداد کے لحاظ سے آج دنیا کی سب سے بڑی قوم ہے۔ اور جس کی ہزار سالہ تاریخ شاندار تہذیبی و تمدنی، علمی و سیاسی کارناموں سے پُر ہے۔ اور جس نے آج کل کی اعلیٰ ترقی یافتہ قوموں کو علم اور تہذیب کی مشعل اُس وقت دکھائی جبکہ وہ قرونِ ماضی سے جمالت و اعلیٰ کی تاریکیوں میں گھری ہوئی تھیں۔ یہی زبان ہے جس نے یونان کے فلسفہ کو ایک مرتبہ فنا ہو جانے کے بعد دوبارہ زندہ کیا۔ ہندوستان اور چین کی حکمت دیرینہ کو حیاتِ تازہ بخشی، کرہ ارض کے نامعلوم گوشوں کا سرِ لگا کر اہل عالم کو اُن سے روشناس کرایا۔ ماضی کے مٹے ہوئے تاریخی نقوش کو اُجاگر کیا۔ اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ دُنب نے حق کا آخری پیغام، مکمل اور کامیاب ترین انسانی زندگی کا نظامِ عمل، اخلاق و فضائلِ عمال کا دستورِ اساسی پہلے پہل اسی زبان کے ذریعہ سُنا، اور ہدایت پائی، جس صدائے ربانی نے انسان کی عام اجتماعی زندگی کو ضلالت و گمراہی سے ہٹا کر رُشد و ہدایت کی پُر امن شاہراہ پر چلنے کی دعوت دی وہ سب سے پہلے اسی زبان کے ذریعہ فضاءِ عالم میں نشر کی گئی۔ اپنوں کا

ذکر نہیں انصاف پسند اغیار و اجانب تک اس حقیقت کے معترف ہیں۔ پروفیسر اسٹائلے لین پول جو پہلے ڈبلن کی یونیورسٹی میں عربی زبان کے اُستاد تھے اور جو کئی کتابوں کے مصنف ہیں لکھتے ہیں:-  
 ”عربی زبان جو اپنے تمام لٹریچر کے ساتھ ادبِ علم تحقیق کے دلوں میں گھر کر چکی ہے اور جس کی یہ محبوبیت اس بات کی کفیل ہے کہ وہ دنیا کی دوسری زندہ زبانوں کے ساتھ برابر زندہ رہیگی، اُس نے اس حیثیت سے انسانیت کی عظیم الشان خدمت انجام دی ہے کہ اُس نے علم کی پُرانی میراث کو اُس زمانہ میں محفوظ رکھنے کی کامیاب کوشش کی جبکہ مغرب جہالت و نادانی کی تاریکیوں میں گرا ہوا تھا۔ عربی زبان کی یہ ساحرائہ دلکشی اور اُس کے بولنے والوں کا علمی رُوح سے سرشار ہونا موجودہ علمی ترقیات کے سب سے قوی اسباب میں سے ہے۔“



پھر استقراسے پتہ چلتا ہے کہ ہر زبان کی ترویج و اشاعت کو اہل زبان کی تہذیب تمدن اور اُن کی معاشرتی خصوصیات کے پھیلائے میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ عرب جہاں کہیں گئے اُنہوں نے اُس ملک میں اپنی زبان ہی رائج نہیں کی، بلکہ زبان کے تغیر کے ساتھ ساتھ دوسری قوموں کی معاشرت، اور اُن کی تہذیب بھی خود بخود عربی تہذیب و تمدن کے قالب میں ڈھل گئی۔ ہندوستان کا حال ہمارے سامنے ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں جب تک ہندوستان کی دفتری زبان فارسی رہی، خود انگریز مسلمانوں کی وضع قطع اختیار کرنے میں، اور اُن کا سالباس پہننے میں فخر و مستحسوس کرتے تھے۔ مگر جب سے لارڈ میکالے کی اسکیم کے مطابق ہندوستان کی دفتری زبان انگریزی ہوئی ہے معاملہ بالکل برعکس ہو گیا ہے۔ اب شاید کسی انگریز کو ہندوستانی شیر وانی یا پاجامہ پہننے کا تصور بھی نہیں آتا۔ لیکن ہندوستانی روز بروز انگریزی معاشرت اور فرنگی تہذیب میں بے ارادہ غرق



ہوتے چلے جا رہے ہیں جسم کی ظاہری آرائش میں تغیر کے ساتھ ذہنیاتوں میں جو انقلاب پیدا ہو گیا ہے اُس کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہر شخص اس کا بین طور پر مشاہدہ کر رہا ہے اُس بنا پر ہم کو اچھی طرح یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ عربی زبان کو علمی اور تاریخی لحاظ سے جو اہمیت حاصل ہے اس سے قطع نظر خود ہمارے اسلامی کچھ اسلامی تہذیب، اور اسلامی روایات کا عربی زبان کے ساتھ تعلق بھی چولی دامن کا سا ہے، اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا کچھ محفوظ رہے۔ ہماری روایات زندہ رہیں اور ہماری زندگی میں اسلامیت کا عنصر نمایاں ہو، تو اس کے لیے ناگزیر ہے کہ ہندوستان میں عربی زبان کی ترویج و اشاعت، اور اُس کی ترقی و تہذیب کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی جائے۔ آپ اپنے بعض بچوں کو وہی اسلامی معلومات انگریزی زبان میں پڑھائیے، وہی معلومات دوسرے بچوں کو عربی زبان میں بتائیے۔ آپ دیکھینگے، اثر کے لحاظ سے دونوں بچوں میں بڑا فرق پایا جائیگا۔ معلومات وہی ہیں۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں محض زبان کے فرق کی دونوں کی ذہنیاتوں میں کتنا بعد پیدا ہو جاتا ہے۔



لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ عربی زبان کی ترقی کا مسئلہ جس قدر اہم اور ہماری توجہات کا مستحق تھا، ہم نے اب تک اتنا ہی اُس سے اپنے تغافل اور بے پروائی کا عمل ثبوت دیا ہے۔ یوں کہنے کو کہا جاسکتا ہے آج ہندوستان کے شہر شہر اور قریہ قریہ میں عربی کی ایک دو نہیں کہی گئی درگاہیں قائم ہیں، جہاں جوق درجوق طلباء سات سات، آٹھ آٹھ سال علوم عقلیہ و نقلیہ کی تعلیم عربی زبان میں حاصل کرتے ہیں۔ پھر ان علوم میں عربی ادب کا بھی کافی حصہ ہوتا ہے، اور افسح العرب و اعجم کا کلام بلاغت التیام بھی کر رہے کر رہے پڑھا جاتا ہے لیکن کوئی بتا سکتا ہے ان ہزار ہزار عربی پڑھنے والوں میں کتنے ایسے ہیں جن کو واقعی عربی زبان آتی ہے۔

کہتے ہیں جو عربی کا صحیح مذاق رکھتے ہوں، اُس میں تفسیر کر سکتے ہوں، تحریر لکھ سکتے ہوں۔ انگریزی کالجوں میں بھی عربی پڑھائی جاتی ہے، لیکن اگر کالج کے طلباء کو عربی نہیں آتی تو ہم کو اُن سے زیادہ شکوہ سنا ہونے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ان لوگوں کو عربی محض ضمنی طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ البتہ اُن حضرات کی طرف سے کیا معذرت پیش کی جاسکتی ہے جو کئی کئی سال محض عربی میں تعلیم پاتے ہیں اور پھر بھی عربی کی ایک سطر صحیح لکھنے یا ایک جملہ بولنے کی بھی ان میں قدرت نہیں ہوتی۔ ہمیں اپنی اس کوتاہی کا احساس اُس وقت زیادہ ہوتا ہے، جبکہ مصر و شام کا کوئی عالم کسی عربی مدرسہ میں پہنچ جاتا ہے، اُس وقت ارباب مدرسہ کی حیرانی و پریشانی قابل دید ہوتی ہے، عام طلباء کا کیا ذکر! مدرسہ کے بڑے بڑے اساتذہ بھی اس مصری یا شامی ہمان سے عربی میں گفتگو کرتے ہیں تو بہت رُک رُک کر اور ڈر ڈر کر، اور لطف یہ ہے کہ پھر بھی اکثر جملے زبان سے غلط نکل جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ حضرات ہندوستان کے علماء کی نسبت کوئی اچھا خیال لے کر واپس نہیں جاتے۔



عربی زبان و ادب کی اہمیت کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مبارک نے فرمایا: "میں نے چالیس ہزار درہم حدیث کی تعلیم پر خرچ کیے ہیں اور آٹھ ہزار ادب پر، اور اے کاش جو کچھ میں نے حدیث پر خرچ کیا ہے، وہ بھی ادب پر ہی خرچ کر دیتا" لوگوں نے پوچھا یہ کیوں؟ فرمایا: "نصاریٰ صرف ایک تشدید کے کم کر دینے کی وجہ سے کافر ہو گئے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا: "یا عیسیٰ انی ذلک من عندی بتوی" اے عیسیٰ میں نے تم کو ایک دنیا سے بے تعلق رہنے والی دوشیزہ سے پیدا کرایا ہے، لیکن عیسائیوں نے ذلک ذلک کے لام کی تشدید اڑادی جس کی وجہ سے معنی

کچھ سے کچھ ہو گئے اور کفر لازم آگیا۔

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ چند آدمیوں کے پاس سے گزرے جو اُس وقت تیر اندازی کی مشق کر رہے تھے۔ یہ لوگ نو آموز تھے۔ تیر ٹھیک نشانہ پر لگتا نہیں تھا، حضرت عمرؓ کو یہ دیکھ کر غصہ آگیا۔ اور آپ نے اُن کو بڑبھلا کہا ان لوگوں نے ازراہِ معذرت کہا "اَنَا قَوْمٌ مُّتَعَلِّمِينَ" ہم تو سیکھ رہے ہیں۔ "متعلمین" عربی قاعدہ کے اعتبار سے غلط تھا۔ اس لیے حضرت عمرؓ کو یہ سن کر اور غصہ آگیا، اور آپ نے فرمایا۔

"بجذا تمہاری یہ لسانی غلطی مجھ پر تمہاری تیر اندازی کی خطا سے زیادہ شاق ہے" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خود صحت زبان کا اتنا اہتمام تھا کہ آپ فرماتے تھے رَحِمَ اللّٰہُ اَمْرًا اَخْلَعَ مِنْ لِسَانِہِ اللّٰہُ اُس شخص پر رحم کرے جس نے اپنی زبان کی اصلاح کر لی ہو۔

یا قوت حموی نے بعض فقہاء کا قول نقل کیا ہے کہ وہ کہتے تھے "لوگوں سے محبت کرنا اللہ سے محبت کرنا ہے۔ اور دین درست نہیں ہوتا جب تک جیانا نہ ہو، اور جیانا بغیر عقل کے ہوتی نہیں۔ اور جیانا، دین، اور عقل یہ تینوں چیزیں اُس وقت تک حاصل نہیں ہوتیں جب تک کہ ادب نہ ہو۔ ظاہر ہے، اس ادب سے مراد عربی کا ادب ہی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ صرف اس ادب کی ہی خصوصیت ہے کہ اس میں ہمارت پیدا کرنے سے دین، حیا، اور عقل پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح کے مقولے کتابوں میں نظر سے گذرتے رہتے ہیں اور ہم انہیں پڑھتے پڑھاتے جی نہیں لے سکتے صریح اس کے باوجود ہماری حالت میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔ اور ان بی شمار مدارسِ عربیہ کے باوجود جہاں تک عربی زبان و ادب کا تعلق ہے ہم اب بھی وہیں ہیں جہاں پہلے تھے۔ اکثریت کا حال تو یہی ہے، ورنہ شاید نادار اشخاص و افراد تو ہرجاغت میں ہوتے ہی ہیں۔



عربی مدارس کے وجود بقا کی ضرورت و اہمیت سے کس سلمان کو انکار ہو سکتا ہے، لیکن اگر ان مدارس میں عربی ادب کی صحیح تعلیم کا بھی انتظام ہوتا اور ان کے ذریعہ ملک میں عربی زبان کی ترویج و اشاعت کا بھی کام انجام پا سکتا تو اس میں شبہ نہیں آج ہندوستان کے مسلمانوں کی وہ حالت نہ ہوتی جو آج ہے۔ اور نہ یہاں کے انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب کو اسلام اور اسلامیات سے اتنا بعد ہوتا جتنا کہ آج دیکھا جا رہا ہے۔

خدا کا شکر ہے اب حالات میں کچھ تبدیلی پیدا ہوتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ ایک طرف تو بڑے بڑے مدارس عربیہ کے ارباب اختیار نے اصلاح نصاب تعلیم کی ضرورت کو اچھی طرح محسوس کر لیا ہے۔ اور اگرچہ اب تک انہوں نے اس راہ میں کوئی موثر قدم نہیں اٹھایا، لیکن اگر اس ضرورت کا احساس اسی طرح قوی ہوتا رہا تو توقع ہے کہ ایک دن یہ عمل میں بھی آجائیگا۔ دوسری طرف وہ حضرات جو اگرچہ عربی مدارس کے سلسلہ سے وابستہ نہیں ہیں لیکن عربی کا شغف رکھتے ہیں۔ ان میں بھی بیداری پیدا ہو رہی ہے اور وہ کوشش کر رہے ہیں کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کی کوئی راہ پیدا کر سکیں۔

اس سلسلہ میں یہ خبر سرت کے ساتھ سنی جائیگی کہ ملک کے نامور فاضل عربی ڈاکٹر داؤد پوتا۔ ایم اے پی ایچ ڈی جو پہلے بمبئی کے کسی کالج میں عربی کے پروفیسر تھے اور اب سندھ کے ڈاکٹر کٹر تعلیمات ہو کر چلے گئے ہیں انہوں نے محض عربی زبان کی ترویج و اشاعت کے لئے سندھ میں ایک عربی یونیورسٹی قائم کرنے کی شاندار اسکیم تیار کی ہے ہم کو اب تک اس کی نسبت تفصیلی معلومات حاصل نہیں ہو سکیں اس لیے سیر دست اس پر کوئی تفصیلی اظہار خیال نہیں کر سکتے تفصیلات معلوم ہونے پر اس سلسلہ میں بعض مفید مشورے بھی پیش کر سکیں گے۔ تاہم سندھ کو آب و ہوا کی مائثلت اور عربوں کی ہندوستان میں آمد کے لحاظ سے عرب کے ملک سے جو نسبت خاص حاصل ہے اس کے پیش نظر

توقع ہے کہ اگر مسیحیوں کو یہاں بننے کے لیے جدوجہد اور خلوص استقامت سے کام لیا گیا تو یہ ضرور پھولے پھینگی اور  
لوہے سے اسلامی کچھڑ کے تقاضا میں بڑی ہوگی۔

ندوة المصنفين کی نئی کتابیں

خدا کا شکر ہے جو سنہ کے ختم پر زوہد المصنفین کی زندگی کے دوساں خیریت و عافیت کے ساتھ پورے ہو جاتے ہیں۔ ادارہ نے پچیس سال میں چار کتابیں شائع کی تھیں، لیکن اس سال اس کی طرف سے پانچ کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ پہلی کتاب فہم قرآن سے جو بڑی قطع کے دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں تفصیل کے ساتھ اس پر بحث کی گئی ہے کہ قرآن مجید کی حقیقی مراد سمجھنے کے لیے مرنے کی ضرورت ہے کہ دیکھ لینا کافی ہے یا اس کے لیے چند علوم حاصل کرنے اور شرط و ادب کا حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ پھر اسی سلسلہ میں بسط و تفصیل کے ساتھ اس پر گفتگو کی گئی ہے کہ اگر حدیث کے تمام ذخیرہ کو ناقابل اعتبار قرار دے دیا جائے تو کیا اس وقت بھی قرآن کی صحیح مراد کسی درذریعے متعین ہو سکتی ہے؟ اس ذیل میں حدیث کے مستند و معتبر راہر اس سے متعلقہ بحثوں پر سیر حاصل کلام کیا گیا ہے۔ یہ کتاب شائع ہو چکی ہے قیمت غیر مجید پچھتر روپے۔ دوسری کتاب "غلاصان اسلام" ہے جس میں طبقہ داراشی ایسے منتخب محدثین و فقہاء و دیباؤ صوفیاء و راہب و شعرا کے مستند و تازہ کئی تحقیقی سوانح حیات ہیں۔ جنہوں نے غلام ہونے کے باوجود شہادہ علمی و علمی کا رزنامہ کیے ہیں اور جن کو ان کے فضل و کمال کی وجہ سے سادہ سوانح میں نہایت دلچسپ مرتبہ دیا گیا ہے۔ تیسری کتاب "تذکرہ" کے نام سے ہے جس میں کتاب کے خزانہ اجزاء پر ہیں جن کے آخر تک مکمل ہو کر شائع ہو جائیں گی۔

تیسری کتاب سورہ ناخفا رحمن صاحب بیوردی کی تالیف نفیث ہے اس کا نام اخلاق اور فلسفہ اخلا  
سے۔ اس میں فلسفہ اخلاق کی روشنی میں اخلاق کی تمام اقسام اور پھر اسلامی اخلاق کی جزئیات و تفصیلات  
ایک ذمہ ندر سے شرح و بسط سے بیان کی گئی ہیں۔ یہ کتاب پریس میں ہر جولائی کے ختم تک شائع ہو جائیگی تقطیع کلاں  
ختمات، ۵۵ صفحات

چوتھی کتاب نبی عربی ہے جس کو مولانا قاضی رین احمد دین صاحب سجاد میرٹھی نے مرتب کیا۔ نزہت  
شستہ اور عام لہجہ، ان میں خوب دیکھیں درمیانوں طبقہ کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مستند و معتبر سوانح  
ذیہ اختصار مگر جامعیت کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ نذرۃ مصنفین بچوں کے لیے جو تاریخ اسلام کا ایک مجموعہ تیار کرنا  
چاہتا ہے یہ کتاب دسی سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ جلد نمبر ۱۰ صفحات قیمت ۲ روپے ۲۰ پائی۔ یہ کتاب بھی شائع ہو چکی ہے۔

یادگیری کی یہ ایک خاص چیز ہو، غور کی صاحب کی سرِ مستقیم (The Balanced way)، تمرکز کی لکاس ہے۔ خواستِ تقریباً، مصفوت پرستی سے عطرِ آبِ انبوالی ہے۔ خدا کا سرِ پرست بھی جنگ کے صفحہ پر نشانِ گزندِ حالات کے باوجود زیادہ کہبت و طاعت اور کام کے لئے فائز کردہ مہر و روزگار کھینچ نہیں پوری طرح کامیاب رہا۔ دیکھئے حضرت علیؑ دیکھئے

# اسلام اور سائنس

از مولانا محمد عثمان صاحب فارغیہ ڈیڑہ اخبار مزمل

جن مسلمان نوجوانوں نے انگریزی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مغربی طرز کی تعلیم حاصل کی ہے ان میں امدان کی رسالت سے دوسرے "تعلیم یافتہ" مسلمانوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ مذہب اور سائنس میں اصولی اور بنیادی اعتبار سے اختلاف اور تضاد ہے اور گزشتہ تین صدیوں سے ان میں ایک ایسی جنگ برپا ہے جسے ختم کرنے کی تمام کوششیں اب تک بیکار ثابت ہوئی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ موجودہ زمانہ کے علمی اکتشافات تجربہ اور مشاہدہ کے اس دائرہ میں آگئے ہیں جہاں مذہب کو قدم رکھنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ ایک طرف سائنس کے حقائق ہیں جو معائنہ کی سطح پر آچکے ہیں۔ دوسری طرف مذہب کے نظریات و مفروضات ہیں جو ایمان بالغیب سے آگے نہیں بڑھتے۔ سائنس کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا جا رہا ہے اور مذہب بنیادی اعتبار سے ترقی اور نمو کی صلاحیت کھوتا جا رہا ہے۔ اس نہاں فرق کا جو نتیجہ برآمد ہو گا وہ یہی ہو گا کہ ایمان بالغیب کو مشاہدہ اور معائنہ پر قربان کر دیا جائیگا اور مذہب کے لیے علمی سوسائٹی میں کوئی جگہ باقی نہ رہے گی۔ انگلستان کے مشہور سائنس دان پروفیسر ای۔ این رائٹ ہیڈ کو بھی بالآخر اس حقیقت کا معترف ہونا پڑا کہ

"مذہب اور سائنس کے درمیان جس نوعیت کا تضاد برپا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ گزشتہ نصف صدی میں ان کے درمیان توافق و تطابق کی کوئی صورت پیدا



نہیں ہوگی تب تو حاملہ فیصلہ کرنا ہی پڑیگا کہ یا تو سائنس کے واضح حقائق کو خیرباد کہہ  
دیا جائیگا یا مذہب ہی کو اس کے لیے جگہ خالی کرنی پڑیگی۔

مذہب اور سائنس کے باتے میں جن دماغوں میں ان خیالات کی پرورش ہو رہی ہے  
وہ چونکہ اتفاق سے اسلامی دماغ ہیں۔ اس لیے اکتشافات جدیدہ۔ تجربہ اور مشاہدہ سے مرعوب  
ہو کر سمجھا رہے ہیں کہ اسلام بھی سائنس کا حریف ہے اور مذہب و سائنس کی جنگ میں  
وہ بھی برابر کا حصہ دار ہے اور چونکہ مذہب زیادہ عرصہ تک مشاہدات کے میدان میں کھڑا  
نہ ہو سکیگا اس لیے انجمن کار اسلام کو بھی شکست کھا کر پیچھے ہٹنا پڑیگا اور کچھ عرصہ کے بعد دنیا کے  
حضرت ہو جائیگا۔

بنیادی غلطی | بلاشبہ مغربی علماء اور مفکرین نے یہ اعلان کیا ہے کہ مذہب اور سائنس میں تضاد و  
اختلاف ہے اور سائنس رحمت پسندانہ خیالات اور مابعد الطبیعیاتی مسائل کو شکست دے چکی ہے  
یہ بھی صحیح ہے کہ علمی اکتشافات نے یورپ میں مذہب کو زبردست شکست دی ہے اور وہاں  
اس شکست کی بنا پر مہریت کو نوے فیصدی روٹ حاصل ہو گئے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ یہ  
حقیقت بھی فراموش نہ کرنی چاہیے کہ مغربی علماء و فضلا کی اصطلاح میں "مذہب" سے مراد صرف  
عیسائی مذہب ہے۔ اسلام نہیں ہے۔ یہ فخر صرف عیسائیت کو حاصل رہا ہے کہ اُس نے  
گیارہویں صدی عیسوی سے علوم و اکتشافات کا مقابلہ کیا تو اٹھارہویں صدی عیسوی تک اُس  
کا پیچھا نہ چھوڑا اور مقابلہ بھی اس شدت کے ساتھ کیا کہ آج وہی مقابلہ کلیسا کے لیے روپ ہی کا  
باعث بنا ہوا ہے چرچ و کلیسا اپنا سے روم کا منصب جیلہ عیسوی عہدالتیں بھگتے احتساب  
رجال مذہب غرض عیسویت کا وہ کونسا شعبہ تھا جس نے سائنس کا بے جگری کے ساتھ مقابلہ

نہیں کیا اور علماء و حکماء کے خون سے ہاتھ نہیں رنگے؟ آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مغربی علوم و کثافات کی جنگ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں سے ان کی جہالت سے اور ان کے طریق فکر سے ہے مگر یہ علم اور جہالت کی جنگ ہوگی۔ اسلام اور سائنس کی جنگ نہ ہوگی کیونکہ اسلام خود حجت کے خلاف علم بغاوت بند کر کے علم و حکمت کی راہیں کشادہ کر چکا ہے اور ایک سچے مسلمان کی زبان سے اعلان کر چکا ہے کہ اعوذ باللہ ان اکون من الجاہلین !

اس کے علاوہ اس بات پر بھی غور کیجیے کہ کیا یورپ کے کسی سائنس دان اور فلسفی نے طبیعت، معاشیات و سیاسیات کے کسی، ہر نے، علم الحیات اور علم انسان کے کسی فاضل نے یا ملولہ مذہب کے کسی محقق اور مصنف نے معرکہ مذہب و سائنس کے سلسلہ میں کبھی اسلام کا نام لیا؟ کبھی کسی کی زبان سے سنا کہ اسلام بھی سائنس کا حریف ہے؟ کیا خود اسلام کے نمائندوں نے اس تصادم کی حقیقت کا قرار کیا؟ ہمارے فہم یافتہ نوجوان تاریخ کے ماہر میں کیا وہ بتا سکیں گے کہ اسلام بھی محکمہ اعتبار (\*) کے نام سے واقف ہے۔ کبھی کسی عالم کو علم و تحقیق اور کثافات و اختراعات کے جرم میں اسلام کے نام پر زندہ جلایا گیا؟ کیا کسی زمانہ میں بھی کوئی ایسی مخصوص عدالت قائم کی گئی جس میں اسلام نے مستثیت کی حیثیت اختیار کر کے کسی عالم درمخترع کو جانوروں کے سامنے ڈوبایا ہو یا شکنجہ میں جکڑ کر س کی جان نکالی ہو؟ سائنس دان نہیں کہتے کہ اسلام اور سائنس میں جنگ ہے۔ اسلام کے نمائندوں نے کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ اسلام حقائقِ علمیہ کا حریف ہے۔ کوئی شخص اب تک ادنیٰ ثبوت بھی نہ دے سکا کہ اسلام کی سرحد میں کثافات کا گزر نہیں ہو سکتا، اور نہ یہ کوئی بتا سکا کہ اسلام نے سائنس کے مقابلہ پر کہاں اور کب شکست کھائی؟ اس کے باوجود ”مذہب“ کے نام سے دھوکہ کھا کر یہ خیال جھامینا کہ اسلام سائنس کا دشمن اور سائنس اسلام کی دشمن ہے۔ ایک ایسا خیال کہ

جس کے اظہار کے لیے جنون کی اور باور کرنے کے لیے حماقت کی ضرورت ہے۔

بلاشبہ چرچ اور علم کا تصادم ہوا۔ نظری اعتبار سے بھی اور عملی اعتبار سے بھی اور عیسائیت کی ششری سسل تین صدی تک اس کے مقابلہ پر متحرک رہی اور اس کا نام رکھا گیا "مذہب اور سائنس کا معرکہ" اور "مذہب" سے مراد وہ خوفناک نظام لیا گیا جو کلیک کے سہارے اور سیخ اور پطرس کے نام پر علم اور سائنس کی راہ میں صدیوں تک حائل رہا۔ ان حالات میں سائنس کے مقابلہ پر اسلام کا نام لینا اور عیسائیت کا عبرتناک حشر دیکھ کر سہم جانا ایک ایسی مضحکہ انگیز حرکت ہے جسے علم کی بارگاہ کو کبھی معافی نہیں مل سکتی۔

سائنس عیسائیت کا رد عمل ہو | قرآن کریم نے عقل و فہم کے استعمال پر زور دیا ہے۔ آبار و اجداد کی انجی پیروی سے منع فرمایا ہے۔ شک و ریب اور ظن و تخمین کی مذمت فرمائی ہے۔ کتاب الہی میں جگہ جگہ عقل و فہم، شعور، تدبیر، بصیرت، بران اور فہم کا نام آیا ہے اور ان کا صحیح استعمال نہ کر ڈالوں کو جانوروں سے تشبیہ دے کر انہیں اندھا، بہرا اور گونگا قرار دیا ہے۔ گراپ کو یسین کر جبرنی ہوگی کہ ساری باتیں میں ایک جگہ بھی عقل یا اس کے ہم معنی کسی دوسرے لفظ کا ذکر نہیں آتا ہے۔ بائبل کی ڈکشنری اور بائبل کی انسائیکلو پیڈیا موجود ہے۔ اس میں عقل اور فہم کے لیے کوئی لفظ آپ کو نہیں ملے گا۔ کلیسا ہمیشہ عقل کی دشمن رہی ہے تاکہ "ایک میں تین اور تین میں ایک" کا نامعلوم اور ناقابل فہم عقیدہ اس کی زد سے محفوظ رہے۔ ٹرینٹ (trent) کی مشہور کونسل میں جو ۱۵۵۱ء میں منعقد ہوئی تھی، پوپ کی صدارت میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں مسیحی عقائد و نظریات کی تائید و توثیق کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا گیا کہ

"یہ کونسل ان متکلمین کی سختی کے ساتھ مذمت کرتی ہے جو شکاک کو حل کرنے کے

یہ عقل کا سہارا لیتے اور دلیل و محبت کا استعمال کرتے ہیں۔"



لیکن اس عقل دشمنی کا نتیجہ کیا نکلا ہے اسے این واٹ ہیڈ لکھتے ہیں :-

”بلاتشبہ یہ رد عمل عہدِ وسطیٰ کی بے لگام عقلیت (Rationalism) کے لیے

ضروری تھا اگر یہ رد عمل خود اپنی حدود سے تجاوز کر گیا تاہم اس سے ایک صحیح نتیجہ بھی

نکل آیا یعنی عصری علوم اور سائنس کی پیدائش عمل میں آ گئی۔“

یعنی سائنس اور علوم جدیدہ، عیسائیت کی بے عقلیت کے عین مخالف سمت میں واقع

ہیں اور ان کا ظہور عیسائیت کی علم دشمنی کا کھلا ارتجاعی عمل ہے! اس سے ثابت ہوا کہ معرکہ مذہب

اور سائنس کی داستان صرف عیسائیت کے دائرہ تک محدود ہے اور اسلام کو اس مصارع

و مجادلہ سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ جو مذہب عقل و ادراک فہم و بصیرت اور برہان و دینہ

کی پختہ چٹانوں پر قائم ہو وہ علم و اکتشافات کا سعادن ہوگا، مخالف نہ ہوگا اور جہاں یہ تعاون و

تعاوض ہوگا وہاں تصادم و اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔

ڈریپٹر اور اسلام | مذہب اور سائنس کی جنگ پر یورپ کے مشہور محقق ڈریپٹر نے ”سفر کہ مذہب

سائنس“ کے نام سے ایک کتاب لکھی جس کی ایک ایک سطر میں مذہب کے مقابلہ پر سائنس

کی حمایت کی گئی ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ سائنس کے مقابلہ پر مذہب ایک لمحہ کے لیے بھی

نہیں ٹھہر سکتا، مگر خود ڈریپٹر سے دریافت کرو کہ مذہب سے اس کی کیا مراد ہے؟ اگر سائنس کی

دشمنی میں اسلام بھی مسیحیت کا ہمنوا ہوتا تو ڈریپٹر اسلام پر اسی طرح بباری کرتا جس طرح اُس نے

عیسویت کے قلعہ پر کی اور یہ بتانا کہ سائنس کی مخالفت میں کچھ عیسویت ہی کو اختصاص حاصل

نہیں ہے بلکہ اسلام بھی اس میں برابر کا شریک ہے مگر اس نے علوم جدیدہ کی حمایت میں

کلیسا پر پاپائیت پر اکتب مقدسہ پر کونسوں کے میصلوں پر محکمہ احتساب اور عیسوی عدالتوں پر

جس شدت کے ساتھ بیماری کی ہے اسی شدت کے ساتھ اس نے اس امر حق کا بھی اعلان کیا ہے کہ مسلمانوں نے ہمیشہ علوم و اکتشافات کی سرپرستی کی اور یورپ کو ضلالت سے نکال کر ذرہ کمال پر پہنچایا۔ اس نے بنایا ہے کہ جس زمانہ میں سارے یورپ جہل و ضلالت، کوری و حماقت میں مبتلا تھا، اسپین اور بغداد کی یونیورسٹیوں میں علم و تحقیق کی شمع روشن تھی جس کی شمعوں سے نصفِ معمرہ ارضی منور ہو رہا تھا۔ اس نے پوری صفائی سے اعلان کیا کہ جس زمانہ میں یورپ اور محکمہ اصناف کے حکم سے حرکتِ زمین کے قائلین کو زندہ جلایا جا رہا تھا، اُس وقت اسپین کے عرب اساتذہ اور علمِ اسلامی یونیورسٹیوں میں حرکتِ زمین کی قیسم دے رہے تھے، نیز مسلمانوں نے علمِ احویات و علمِ لافلاک میں علمِ مناظر و مریا میں علمِ یسیر اور علمِ نجوم و طب میں تہِ روں کی حرکات و پیمائش اور اُن کے مرور و ہبوط کی تحقیق میں وہ عظیم الشان کارنامے انجام دیے جن کے موجودِ یورپ کو مستفید ہونے کا موقع ملا۔

ان حقائق کی موجودگی میں کیا ایک لمحہ کے لیے بھی اس بات کا تصور کیا جاسکتا ہے کہ معرکہ مذہب و سائنس سے ڈیسیر کی مراد سلام اور سائنس کا تصادم ہے؟ اس کے سامنے مسیحیت ہے، بکلیا ہے، پوپ اور اُن کے فیصلے ہیں، محمد، خطاب اور اُن کے شگفتے ہیں، جوہر و برہنہ کی جی بڑیاں اور گلیلو کا خف جسم ہے جو درہین کی یہ دے کے جرم میں سیکڑوں تازیانے کھا چکا ہے!

محکمہ اصناف | انض یورپ کے مورخین اور سائنس و حکمت کے ماہرین کو اس امر کا غماز ہے

سیرانو (Giordano Bruno) ۱۵۸۰ء تا ۱۶۰۰ء پر روم کی مذہبی عدالت نے حرکتِ زمین کے قائل ہونے کی بنا پر کفر و کد کا فتویٰ لگایا اور ماتے ڈر کے یہ غریب سائے یورپ میں بار بار پھرا ۱۵۹۲ء میں اس کی شامت سے دھکا دیا اور ٹٹی واپس چلا آیا۔ محکمہ اصناف کے "تازیانے" اس کی ہاک میں تھے۔ اور اگر تازہ کر کے میل میں ڈال دیا سات سال تک میل میں رہنے کے بعد آخری ۱۶۰۰ء فروری ۱۶۰۰ء میں جلادیا گیا۔ ۱۲۰

کہ سلام اور مسلمان علوم و اکتشافات کے مخالف نہیں ہیں اور نہ اسلام، ورسائیس میں کسی قسم کا تقابض و تضاد ہے، گران میں تصادم ہوتا تو مسلمان علم و حکمت کی کبھی سرپرستی نہ کرتے اور کبھی اپنی درسگاہوں میں ایسی تعلیم نہ دیتے جس کی بنا پر اٹلی، فرانس، انگلستان، اسپین اور پرتگال میں ہزاروں علماء اور حکما کو زندہ جلایا گیا، اور بیشمار اشخاص کو اکتشافات کے جرم میں جیلوں اور کوٹھڑیوں میں گھلا گھلا کر مار دیا گیا۔

تیرہویں صدی عیسوی میں اٹلی میں محکمہ احتساب قائم کیا گیا۔ جس کی نقل انگلستان اور فرانس میں بھی اتاری گئی اور اسپین میں نہ صرف نقل اتاری گئی بلکہ اس پر عمل بھی پوری قوت کے ساتھ کیا گیا۔ اور ایک لاکھ سے زیادہ اشخاص کو اس کی بدولت مشن ستم بننا پڑا۔ اسٹیزیل جے۔ ایم رابرٹسن لکھتے ہیں۔

”محکمہ احتساب کی بدولت تعذیب و تخریب، قتل و خونریزی کا جو مسلسل مظاہرہ ہوا ہے اس کے اعداد و شمار اس قدر ہولناک ہیں کہ موجودہ مہذب دنیا انہیں باور کرنے پر آمادہ نہ ہوگی۔ صرف کاٹل میں ”چند سالوں کے اندر“ دو ہزار اشخاص زندہ جلے گئے، اور جن اشخاص کو مختلف غذاؤں و تکلیفوں میں مبتلا کیا گیا، ان کی عدد بیس ہزار سے کم نہیں ہے۔“

انگلستان میں علماء و حکما کو علوم و اکتشافات کے جرم میں اور مذہبی اشخاص کو ہی دو زندہ جلایا۔ ۱۵۵۶ء تک مسلسل پھانسیاں دی گئیں زندہ جلایا گیا اور شکنجوں میں کسایا۔ آدم آف آرسک کا بیان ہے کہ ایسے ستم رسیدہ اشخاص کی تعداد ... ۲۳ ہے مگر اسی کے ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ ان سب ہی کو پھانسی پر نہیں لٹکایا گیا۔



ہیں میں "قانونِ ایمان" (Auto-da-Fi) کے ماتحت جس شخص کو مجرم گردانا جاتا تھا اُسے رکانِ سلطنت اور رجالِ مذہب کے سامنے زندہ جلادیا جاتا تھا۔ چنانچہ جن اشخاص پر اس قانون کی تلوار چلائی گئی ان کی مقدّماتیں ہزاروں کم نہ تھیں اور ان میں بھی زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی جو آگ کے الاؤ میں جھونک کر خاکستر بنا دیے گئے تھے۔

یہاں محکمہ احتساب کی تاریخ بیان کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ یہ دکھانا ہے کہ سائنس و اکتشافات اور عیسوی مذہب میں نہ صرف نظری اختلاف و تضاد تھا بلکہ مسیحیت نے عملی طور پر علم و حکمت کی بنیادوں کو اکھیڑنے کا عزم کر لیا تھا۔ اگر سائنس استقامت کے ساتھ قائم رہ کر مسیحیت کو ذلت آمیز شکست دینے میں کامیاب نہ ہوتی تو محکمہ احتساب کے شعلے ہمیشہ بند رہتے اور اکتشافات کا پتہ کبھی اپنے بلوغ کو نہ پہنچتا۔

اس کے مقابلہ میں آپ نے کبھی نہ منہ ہو گا کہ علم و اکتشاف کے جرم میں کبھی کوئی شخص عمارِ اسلام کے قوسے کی رو سے قتل کیا گیا۔ یا کسی اسلامی حکومت نے کسی شعبہ علم کو اٹھا دوڑنے کا قرارداد کر اس کے حامیوں کو پھانسی پر چڑھایا یا کسی ملک میں کسی وقت اسلامی محکمہ احتساب قائم کیا گیا اور اس پر مورخین کو کتا بن لکھنی پڑی۔ کسی شیخ الاسلام، کسی مفتی، کسی عالم و امام کا نام لو اور بتاؤ اس نے کب علوم و حکم کی مخالفت کی اور اسے کفر و احماد سے تعبیر کر کے حکماء کو شکنجوں میں

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھو سر یگزند کاڈو کی کتاب - *A short History of the inquisition*۔  
۲۔ سائنس اور عیسویت کے تضاد کے سلسلہ میں متدرجہ ذیل کتب پر ضرور نظر رکھنی چاہیے:-

*The laws Relating to Blasphemy* (چارلس بریڈلا -

*The Past and Present of our Heresy laws* از ڈاکٹر ڈبلیو۔ سی۔ ہنٹر

*History of Criminal law* از جیمز اسٹیفن

*A History of the Crime of Blasphemy* از جی۔ ڈی۔ نوکس

کے یا قید خانوں میں گھلا گھلا کر مارا؟ یورپ تک کے مورخین کو اعتراض ہے کہ علم و حکمت کی اشاعت کے جرم میں جس وقت عدل و حکماء کو زندہ جلایا جا رہا تھا اس وقت اسلامی درسگاہوں میں پوری آزادی کے ساتھ تحقیقات اور ریسرچ کا کام جاری تھا اور اساتذہ و طلباء اسرار کائنات کی عقدہ کشائی میں لگے ہوئے تھے۔

ہمارا دعویٰ تھا کہ سائنس اور عیسویت میں تضاد ہے سلام اور سائنس میں کوئی تضاد نہیں ہے اور جن تعلیم یافتہ نوجوانوں کا خیال ہے کہ اسلام بھی عوم و حکم اور کشفیات کا مخالف ہے وہ یا تو انتہا درجہ کے جاہل ہیں یا پرستے درجہ کے نادان اور بے سمجھ، سو ہمارا یہ دعویٰ صرف ان چند سطور ہی سے ثابت ہو گیا ہے مگر ہم ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ ثابت کرینگے کہ عیسویت کے مقابل پر اس جنگ میں سائنس کو فتح حسین حاصل ہوئی ہے اور مسیحیت نے اس بری طرح شکست کھائی ہے کہ یورپ میں کلیسا کی بنیادیں ہل گئی ہیں اور مسیحی ارکان کو نہایت ذلت کے ساتھ اس کا اعتراف کرنا پڑا ہے۔

**مسحیت کی شکست** | ایک زمانہ تھا کہ حرکت زمین کے قائلین کو زندہ جلایا جاتا تھا اور سائنس کشفیات کی مخالفت کے لیے رومی کلیسا کو دنیا کا سب سے بڑا مولناک و خوفناک ٹھکڑا (اعتساب) قائم کرنا پڑا تھا، اس کے بعد وہ زمانہ بھی آیا کہ سائنس اپنے ارتقائی منازل طے کرتی رہی اور مسیحیت کو اپنا موقف بدلنا پڑا۔ یہ سائنس کی زبردست فتح ہے کہ کلیسا کو ٹھکڑا، اعتساب توڑنا پڑا اور مجبور ہو کر اس نے اعلان کیا کہ مسیحیت پر علمی نکتہ چینی کوئی قابلِ تحریر جرم نہیں ہے۔ علماء اور محققین کو حق ہے کہ وہ مسیحی علم کلام کو نقد و تبصرہ کی کسوٹی پر رکھیں اور دنیا کو غور و فکر کی دعوت دیں۔ پروفیسر گور (Gore) جو اسسٹنٹ برٹنم، وڈ آکسفورڈ کے بشپ رہ چکے ہیں اور جو یورپ میں سائنس کے مقابل پر مسیحیت کے زبردست حامی تصور کیے جاتے ہیں، انھوں نے نکتہ چینی کے متعلق فرماتے ہیں کہ

ہم یک لمحہ کے لیے بھی اس صداقت کا ارتکاب نہیں کرنا چاہتے کہ مسیحی لٹریچر اور کتب مقدسہ پر کتہ چینی کا حق کسی کو حاصل نہیں ہے، ظلم و خرد کا تقاضہ ہے کہ کتب مقدسہ پر سخت سخت کتہ چینی کا حق مخالفوں کو دیا جائے اور پوری اجازت دی جائے کہ ہر شخص تاریخ کی روشنی میں ہماری تاریخی دستاویزات کی جانچ پڑتال کرے۔

علم الحیات کا مشہور ماہر ہیکلے (Julian Huxley) اس رواداری اور کشادہ نظری کا خیر مقدم کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

”ظلم انفس اور مطالعہ مذاہب کی ترقی نے چرچ کے زاویہ نگاہ میں بہت بڑی حد تک تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ مذہب (یعنی عیسوی مذہب) کی سخت گیری جو نصف صدی پیشتر کلیسائی حلقوں میں موجود تھی وہ آج مفقود نظر آتی ہے۔“

گویا کلیسا نے داروگیر سے توبہ کر کے سائنس کے لیے میدان صاف کر دیا اور یورپ کے حکمرانوں نے اس دست نظری کا بڑھ چڑھ کر شکریہ ادا کیا، لیکن قبل غور بات یہ ہے کہ کلیسا نے نہ صرف سائنس کے لیے راستہ صاف کر کے شکست کھائی بلکہ اس نے اس حقیقت کا بھی اعتراف کر دیا کہ مذہب اور سائنس میں کسی قسم کا تصادم اور کسی نوعیت کا اختلاف نہیں ہے۔ سائنس نے بلاشبہ کلیسا کی رواداری کا شکریہ ادا کیا، مگر اس نے چرچ کا یہ ”ارتداد“ گوارا نہ کیا کہ مذہب اور سائنس میں کوئی اختلاف و تصادم نہیں اور ان میں پورا پورا اتفاق ہو گیا ہے۔ سائنس اپنے مقام پر کھڑی ہے بلکہ آگے بڑھ رہی ہے۔ اس کا اب بھی یہی خیال ہے کہ عیسوی مذہب سے اس کا توافق نہیں ہو سکتا، مگر کلیسا اور اس کے ارکان، سائنس کے خلاف متحدہ

Belief in god

Essays in Popular Science

بہ بپ گورنمنٹ

۱۳۲۰ء



معاذ قائم کر کے علما کو زندہ جلا کر پیٹے تو اس منزل میں آئے کہ کتب مقدسہ پر شخص کو نکتہ چینی کا حق حاصل ہے اور پھر اپنی ہزیمت کا کھدا اعتراض کرتے ہوئے اس اعلان پر بھی آمادہ ہو گئے کہ مذہب اور سائنس میں کوئی اختلاف نہیں ہے! کیا اس سے بڑھ کر مسیحیت کی شکست اور سائنس کی کوئی اور فتح ہو سکتی ہے؟ سائنس کا اب تک اعلان ہے کہ مذہب سے اس کی دوستی نہیں ہو سکتی، مگر مذہب (یعنی مسیحیت) نے اس کے سامنے یہاں تک گھٹنے ٹیک دیے کہ چھ سو سال کی مسلسل معرکہ آرائی کو بھی فراموش کر دیا۔

اس سلسلہ میں اے این وائٹ ہیڈ کا قول نقل ہو چکا ہے کہ یا تو مذہب (مسیحیت) باقی رہے گا یا سائنس کو بقا کی دولت حاصل ہوگی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ مسیحیت اور سائنس، دو شہ بدوشت چلتے رہیں، ورنہ ان میں اختلاف و تزاہم کی کوئی صورت پیدا نہ ہو۔

ایک تازہ واقعہ | اس سلسلہ میں ہم ایک تازہ واقعہ کی طرف ناظرین کرام کی توجہ مبذول کرنا چاہتے ہیں۔ گزشتہ اکتوبر ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا ریڈیو کمیٹی نے سائنس اور مذہب پر چند تقریروں کا انتظام کیا تھا، چنانچہ اس موضوع پر پہلی تقریر کمیٹی کے ایک مشہور ڈاکٹر اور سائنس دان سی ایل ڈی ایوانس (D'AVOINE) نے کی اور ثابت کیا کہ ”مذہب“ سائنس کا دشمن ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے دعوے کے اثبات کے لیے جو دلائل پیش فرمائے تھے ان کا جواب دیئے کے لیے کمیٹی کے آرچ بشپ رابرٹ کو موقعہ دیا گیا۔ آپ نے اپنی تقریر میں فرمایا۔

”ڈاکٹر ڈی اوانس نے سائنس کے حقائق کا ظہار کرتے ہوئے، بعد طبیعیاتی مسائل سے انکار کیا ہے مگر یاد رہے کہ مذہب (!) اور سائنس میں کوئی خفاہ نہیں ہے۔“  
 ۱۹۳۶ء میں فریج اکاڈمی آف سائنس کے چند ممبروں کی طرف سے بھی یہ اعلان کیا گیا تھا کہ ”مذہب“ اور سائنس میں کوئی معرکہ نہیں ہے۔“

ڈاکٹر صاحب کو جنہوں نے اس بحث کا افتتاح کیا تھا پھر جواب جواب کا موقع دیا گیا۔ آپ نے فرمایا۔

”موجودہ سائنس کی تاریخ کا ہر صفحہ گواہ ہے کہ مذہب اور سائنس میں کس شدت کا معرکہ کارزار گرم رہا ہے۔ چرچ نے گلیلیو (Galileo) کے کثافات کو غلط قرار دے کر اسے سخت اور سنگین سزا دی۔ کوپرنیکس (Copernicus) کے ”نظریہ شمسی المرکز“ (Heliocentric theory) یعنی اس نظریہ کو کہ زمین آفتاب کے گرد گردش کرتی ہے کفر و کھاد اور کتب مقدسہ کی مخالفت سے تعبیر کیا گیا اور اس خیال کی اشاعت کو ممنوع قرار دیا گیا۔ ۱۵۵۰ء میں شہنشاہ کوپوچا پال چارم نے ایک اعلان شائع کیا جس میں کوپرنیکی نظریہ کو کتب مقدسہ کے خلاف قرار دیا گیا اور بدایت کی گئی کہ اس نظریہ کی کسی جگہ بھی اشاعت نہ کی جائے۔ اس کے علاوہ شخص جسے کہ ”مذہب“ نے ڈرون کے نظریات کی کس شدت کے ساتھ مخالفت کی ہے۔“

اس اندیاز پر پوری طرح اس معاملہ سے دو باتیں صاف طور پر عیاں ہیں۔

(۱) سائنس کا خیال اب تک یہی ہے کہ ”مذہب“ اس کا دشمن ہے اور ان میں تطابق و توافق کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی مگر چرچ، کلیسا، بشپ اور آرج بشپ سب ہاتھ جوڑ کر فرما رہے ہیں کہ عیسوی مذہب اور سائنس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سائنس کے مقابلہ پر کلیسا کی مکر ٹوٹ چکی ہے اور اس نے اپنی شکست اور سائنس کی فتح کا کھٹلا اعتراف کر لیا ہے۔

۱۵ مئی کرائسٹل پیکلی ایڈیشن مورخہ ۲۶۔ جنوری سنہ ۱۹۷۰ء۔ ۱۲۔

(۲) دوسری بات وہی ہے جسے ثابت کرنے کے لیے ہم نے قلم اٹھایا ہے یعنی معرکہ مذہب سائنس سے مراد مسیحیت اور سائنس کا معرکہ ہے۔ ڈاکٹر ڈی او آن نے اگرچہ سائنس کے مقابلہ پر ”مذہب“ ہی کا نام لیا ہے۔ مگر ان کی عبارت سے صاف معلوم ہو سکتا ہے کہ مذہب سے ان کی مراد صرف مسیحیت اور کلیسائی نظام ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس تصادم کے ثبوت میں چرچ کا نام لیا۔ پوپ پال چہارم کا نام لیا۔ ان کے مذہبی اعلان کی تشریح کی، اور اس شخص کے سامنے کی جو عیسائی ہے عیسائیت کا نائندہ اور بجبئی کا آرچ بشپ ہے! حالانکہ ڈاکٹر صاحب کے جواب میں ایک مسلمان عالم کو بھی بولنے کا موقع دیا گیا تھا اور ڈاکٹر صاحب نے جواب الجواب میں ان کے دلائل کی طرف بھی اشارہ کیا تھا، مگر وہ سائنس کے مقابلہ پر اسلام کا نام تک نہ لے سکے اور کسی امام، کسی شیخ الاسلام، اور کسی مفتی کا ایک قول بھی سائنس کی مخالفت میں پیش نہ کر سکے اور نہ اسلام کے کسی ایسے مسئلہ کی طرف اشارہ فرما سکے جو قوت اور مشاہدہ کے خلاف ہو۔ لہذا یہ امر پاپائے تحقیق کو پہنچ گیا کہ سائنس کا مقابلہ مسیحیت اور کلیسا سے ہے۔ اسلام سے نہیں ہے، اور ”مذہب“ سے حکما کی مراد بھی مسیحیت ہے، اسلام سے انہیں کوئی تعلق نہیں ہے۔ عیسائیت پر پہلا حملہ چونکہ علماء و حکماء کو معلوم تھا کہ سائنس کی راہ میں مسیحی مذہب ایک زبردست خلیج ہے۔ اس لیے انہوں نے پہلے اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی اور جس قلعہ کو نابال تسخیر تصور کیا جا رہا تھا اس پر تین محار سے اس قدر شدید گولہ باری کی کہ بنیاد تک کی اینٹیں نکل گئیں جس طرح عیسویت نے سائنس پر کوئی رحم نہیں کیا تھا اسی طرح سائنس نے بھی مسیحیت پر سید کی سے گولہ باری کی۔ سائنس نے کلیسا پر حملہ کرنے کے لیے تین محاذ بنائے اور تینوں محاذوں کو اس کے خلاف استعمال کیا اور ہر محاذ پر اسے نمایاں کامیابی اور فتح حاصل ہوئی۔

عیسائیت پر سب سے پہلا حملہ ڈارون کی طرف سے ہوا۔ جس وقت اس کی کتاب



”اصل انواع“ منظر عام پر آئی تو عیسائی دنیا میں ایک کھرام مچ گیا۔ کتاب کے دلائل سے کلیسا نے محسوس کر لیا کہ ڈارون کے نظریہ ارتقاء نے کتب مقدسہ کی بنیادوں کو ہلادیا ہے۔ اس نے دیکھا کہ ڈارون کی تھیوری پر جو بھی ایمان لاتا ہے اس کے لیے لازمی ہو جائے کہ تورات (کتاب مقدس) کے الہامی حقائق کو غلط اور خلاف واقعہ قرار دے اور ایک کتاب کے بعد تمام کتب مقدسہ کا انکار کر دے۔ نظریہ ارتقاء نے بائبل کی تشریحات متعلقہ تخلیق انسانی اور مہبوط انسانی کی بنیادیں ہلادالیں اور ڈارون ازم نے کلیسہ کے حق میں وہ کام کیا جس کا تصور بھی کلیسا کے لیے ناممکن تھا۔ کتاب مقدس کی تشریحات اور تحقیق کی داستان کا جو نقشہ مشہور شاعر ملٹن نے اپنی ”فردوس المفقودہ“ میں جس انداز کے ساتھ کھینچا تھا وہ مسیحیت کے دل و دماغ پر نقش ہو چکا تھا مگر ڈارون کی بیماری نے یہ سائے نقشے محو کر دیے اور دیکھتے دیکھتے یورپ کا بیشتر حصہ گرجا سے منحرف ہو کر ڈارون ازم کی پناہ میں لگ گیا۔

نظریہ ارتقاء کے ذیل میں جب اجرام سماویہ کی تحقیقات شروع ہوئی اور علم اکیات، علم طبقات الارض، علم نسل انسانی کی مدد سے یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ دنیا کی عمر کروڑوں سے گزر کر اربوں سال سے بھی متجاوز ہے تو مسیحیت کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ کیونکہ سائنس داں کہتے تھے کہ دنیا کی عمر اتنی طویل ہے کہ اس کا شمار بھی نہیں ہو سکتا اور کلیسا کا فزون تھا کہ دنیا کی عمر پر کل سات ہزار سال گذرے ہیں۔ اے، این وائٹ ہیڈ لکھتے ہیں :-

”تج سے ایک سو سال پہلے علم طبقات الارض کے ماہرین سے دنیا کی عمر میں توسیع کا مطالبہ کیا گیا تو یہ سنسنے ہی ہرٹسٹنٹ اور کیتھولک چرچ میں صفت ماتم بچھ گئی۔ سی طرح نظریہ ارتقاء بھی کلیسہ کے بے سوا ان روح بنا ہوا ہے۔“

کچھ دنوں تک تو مسیحیت کے حامی دھینگا مشتی ہی کرتے رہے مگر جب وسیع تحقیقات نے اپنا دامن پھیلا یا تو مسیحی دنیا مجبور ہوئی اور دنیا کی عمر میں تو وسیع کا مطالبہ خاموشی سے منظور کر لیا گیا۔

ڈارون اور کلیسا | اگر کلیسا نظریہ ارتقاء کے مقابلہ پر ڈٹی رہتی تو ممکن تھا کہ ”مذہب“، ورمانٹس کا سرکہ کچھ عرصہ تک اور گرم رہتا مگر مسیحیت نے اسی میں خیر سمجھی کہ اپنی ڈارمان لی اور ابھی ایسی جس نے مادین اور تشکیلیں کو دہریت کی دلدل میں پھنسا کر چھوڑ دیا اور ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا کہ وہ خدا، انبیاء، کتب مقدسہ اور مذہب کا انکار کر دیں۔ ڈارون کے حلوں سے بچنے یا کتب مقدسہ کو بچانے کے لیے آبا رکھیا نے پہلی تدبیر توحید کی کہ نظریہ ارتقاء کو تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ بشپ گور لکھتا ہے کہ

”چودھویں صدی عیسوی میں ڈارون کا نظریہ ارتقاء مسیحی حلقوں میں تسلیم کیا جا چکا تھا اس لیے ہائے لیے اس سے گھبرانے اور سمسنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ خیال کہ کتاب پیدائش کے ابتدائی ابواب میں تخلیق کائنات کے مسئلہ میں جو کچھ کہا گیا ہے جھن تخیلی ہے تاریخی و واقعی نہیں ہے۔ نہ صرف اسکندری اسکول کے عیسائیوں میں بلکہ ابتدائی صدی کے مسیحیوں میں تسلیم کیا جا چکا تھا۔ سینٹ گرگوری کے بعد سینٹ اگسٹائن نے اس حقیقت کا اعلان کیا کہ آغاز دنیا میں خدا نے زندگی کے صرف جراثیم پیدا کئے جو بعد میں آہستہ آہستہ نشوونما پاتے رہے اور ایک مدت کے بعد درجہ تکمیل کو پہنچے۔ قدیم ترین عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ خدا نے آغاز میں انسان کو مکمل شکل میں پیدا نہیں کیا کیونکہ یہ حادثہ، اللہ کے خلاف ہے بلکہ اس نے انسان اول میں تکمیل کا وہ درجہ پیدا کیا جس میں ارتقاء کی پوری صلاحیت موجود تھی۔ بلاشبہ

مسئلہ ارتقا نے، نسویں صدی میں جو بچپی پیدا کی وہ چوتھی صدی میں موجود نہ تھی اور اس وقت نظریہ ارتقا پر حیرت کا اظہار نہ کیا جاتا تھا۔

مطلب یہ ہے کہ کتاب پیدائش میں تخلیق کائنات، ورنسانی پیدائش کی جو صورت بیان کی گئی ہے وہ چونکہ ڈارون ازم سے مطابقت نہیں رکھتی لہذا آسان صورت یہ ہے کہ مسند ارتقا کا انکار کرنے کے بجائے تواریت کتاب پیدائش کے بیان کو غیر واقعی، غیر تاریخی اور تخیلی قرار دے دیا جائے اور جو بات کے ساتھ اس کا اعلان، اس لیے کر دیا جائے کہ چوتھی صدی کے آباء اور مسیحی علماء خود مسئلہ ارتقا کے قائل تھے۔

کیا اس بیان کے بعد بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ مسیحیت نے سائنس کے مقابلہ پر شکست نہیں کھائی؟ سائنس اپنی جگہ پر قائم ہے مگر کلیسا اپنا مقام چھوڑ چکی ہے اور اس کے ارکان نہ صرف یہ کہ سائنس کے سامنے سرنگوں ہو چکے ہیں بلکہ اس کی خاطر کتب مقدسہ کے اہامی حقائق کو غیر واقعی اور تخیلی قرار دے رہے ہیں! کیا سائنس کے علماء عیسائیت کی اس رجحان اور پسپائی سے ناواقف ہیں؟ کیا اس کے بعد بھی ان کے دلوں میں مسیحیت اور کتب مقدسہ کے لیے کوئی جگہ باقی رہ سکتی ہے؟ مسیحیت نے سائنس سے ہلکار ہونے کے لیے کتب مقدسہ پر ہی ہاتھ صاف کر ڈیلا اور سائنس نے اسی بات سے بھانپ لیا کہ مسیحیت نے جس قلعہ کو ناقابل تسخیر قرار دے رکھا تھا اس کی حقیقت بیت عنکبوت سے زیادہ نہیں ہے!

(باقی آئندہ)



# تفصیلی بحث قانون قدرت پر

جناب مولوی غفیل محمد صاحب بی ایس سی ایل ایل بی - وکیل ہیر پٹہ

روزمرہ کی تحریر و تقریر میں "قدرت" اور "نظرت" کثرت سے مستعمل ہیں اور عام ذہنوں میں یہ بھی محسوس ہے کہ نظرت ایک محدود شے ہے اور قدرت ایک وسیع طاقت ہے جس کی کُنہ کو انسانی عقل نہیں پہنچ سکتی، بلکہ زیادہ تر یہ سمجھا جاتا ہے کہ قدرت الہیات کے دائرے کی شے ہے۔ اس میں شک نہیں کہ "قدرت" کا غالب مفہوم خدائی طاقت ہے مگر اس کا ایک مجازی مفہوم بھی ہے جس کا اظہار بہتر طریقہ پر قانون قدرت کے جملہ سے ہوتا ہے۔ عام لوگ تو کیا بلکہ ذہنی قسم انسان بھی اکثر یہ غور نہیں کرتے ہیں کہ مشاہدات عالم میں کین امور پر صمیم طور سے "نظرت" کا اظہار ہو سکتا ہے اور قانون قدرت کا دائرہ کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ وہ کس طرح نظرت سے ایک جداگانہ شے ہے؟

مشرق و مغرب کے تصادم سے ہماری روزمرہ کی لغات میں "نیچر" کا لفظ بھی داخل ہو چکا ہے اور اس کا اہم صفت یعنی "نیچری" اردو زبان میں ایک خاص مفہوم کے ساتھ متسخر اور تنقیر کے اظہار کے لیے بولا جاتا ہے مگر اصل لفظ "نیچر" عجیب کشمکش میں پڑا ہوا ہے۔ اردو دوں اصحاب اس کو مادہ پرستوں کا ایک خاص قسم کا شگوفہ سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں درآخامیکہ انگریزی میں یہ واحد لفظ اپنے اپنے موقع پر نظرت اور قانون قدرت دونوں پر حاوی ہے۔ اگرچہ یہ بھی واقعہ ہے کہ درباب سائنس جب قدرت کی آن گہرائیوں تک پہنچتے ہیں جہاں آلات اور عقل عاجز ہو کر

بہجتے ہیں تو وہ اپنی تسلی اس جامع لفظ سے کر لیا کرتے ہیں۔ بقول غالبؔ  
 دل کے بدلنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے!

الفاظ مذکورہ کی اس مختصر تشریح سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عرصہ کائنات میں وقت کا جو سیلاب  
 سنجیدگی و نظم کے ساتھ بہہ رہا ہے اس کی روش، آثار اور ماحذ کی طرف ذہن وضع کرنے  
 والوں کے اذہان متوجہ ہو چکے ہیں اور انسان شریعہ ہی سے بعض ضروری امتیازات کا شعور  
 رکھتا ہے یہ علم و تحقیق کا کام ہے کہ اس طاقت کے پرتیج راستوں کو ہمارے لیے صاف کر دے  
 اور بعض ایسی بنیادی حقیقتوں سے ہم کو آگاہ کر دے جو تحیل اور عقیدہ کے لیے معیار بن سکیں، اور  
 انسانی دماغ کے لیے خاص طور پر سبق آموز ہوں۔ ایک طرف مٹا ہوا فکر کا محرک بن جائے  
 اور دھڑلہ فکرهاں کشاں کشاں صداقت اور سلامتی کے اس نورانی کیف تک پہنچا دے جو بنی نوع  
 انسان کے لیے طبعی اہم طے اور صحیح معنی میں مایہ زندگانی ہے۔

چنانچہ فطرت و قانون قدرت کی جستجو کو تازہ کرتے ہوئے عالم کی اور بالخصوص  
 کرۂ ارض و اس کی آبادی کی خلقت پر غور کیجئے تو معلوم ہو گا کہ خداوند تعالیٰ نے سب سے  
 قل زمین کو قائم اور سمور کیا و اس کے بعد نباتات کو پیدا کیا کیونکہ نباتات کی ساری  
 پرورش کا سامان سطح زمین پر موجود ہے۔ پھر حیوانات کو پیدا کیا کیونکہ حیوانات کا گزارہ زیادہ  
 تر نباتات پر ہے و اگرچہ انسان مبعوث ہوا کیونکہ وہ حیوانات اور نباتات دونوں سے متمتع  
 ہوتا ہے۔ مگر الذکر ذی رشح مخلوقات میں ہر فرد اپنی جنس کے ساتھ جداگانہ طبعی خاصیت کے ساتھ  
 منسلک ہے جو اس کی پیدائش سے لے کر پوری بالیدگی تک اور پھر اس کے دوران حیات  
 میں کار فرما رہتی ہے یہی خاصیت اس کی جسمانی ہیئت کو مقررہ ضروریات کے مطابق ترتیب  
 دیتی ہے اور اس ترتیب کے دوران میں، حول کے اثرات کو وقتاً فوقتاً قبول کرتی ہوئی ترمیمیں

کرتی رہتی ہے۔ در اس فرد کو کشمکش حیات میں عمدہ برآ ہونے کی قابلیت بخشی ہے۔ موت کے واقع ہونے سے قبل یہ اندرونی خاصیت، حول کے ناموافق حلوں کا بھی بہت کچھ جواب دیتی رہتی ہے اور فنا ہو کر جینے کا منظر دکھاتی رہتی ہے۔ یہ واقعہ ضرور ہے کہ ازائہ نقصان کی نوعیت ذی شعور اور غیر ذی شعور مخلوقات میں بدلی ہوئی ہے صرف اس حد تک کہ موخر الذکر میں رفع نقصان کی طبعی قابلیت زیادہ پائی جاتی ہے جیسا کہ نباتات میں جو حل جانے پر یا سطح کے برابر کر دیے جانے پر بھی دوبارہ زندہ ہو سکتے ہیں اور وہ اندکر کو چونکہ شعور سے طرح طرح کی اعانت پہنچ سکتی ہے اس لیے طبعی بہت میں وہ ضعیف ہے۔

مذکورہ بالا مشاہدات عالم سب فطرت کا کرشمہ ہیں جو ہر نوع اور جنس میں جداگانہ طریقہ پر ظور پذیر ہوتی ہے، مگر ایک مقررہ قاعدہ کے ساتھ اور اپنی پتی جگہ محدود دُور سے کے اندر۔ اس فطرت کو اگر دیکھا ہو تو تخم میں پائی جاتی ہے جہاں جی ری ارادہ، علم و اختیار کو کوئی دخل نہیں مگر تکمیل مقصد کا پورا پورا سامان موجود ہے۔ آگے چل کر ہر ایک حرکت نظرتی ہے جس کو ہم فطری فعال کہہ سکتے ہیں۔ ترقی یافتہ انواع میں شعور کی روشنی فطرت کے چراغ پر کس قدر چھائی ہوئی معلوم ہوتی ہے، مگر حیوانات میں یہ شعور بالکل فطرت کے تابع ہوتا ہے اور انسان ہی بشر ایسی جنس ہے جو ادھر ادھر پر پاؤں کرتا ہوا نظر آتا ہے لیکن اس طرح پر جیسے سمندر کی چڑیا جو باد جو در پرواز کے اس سے جدا نہیں ہو سکتی۔

ان تفصیلات سے فطرت کا مفہوم پورے طور پر عیاں ہو جاتا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ظاہر ہے کہ اس تذکرہ کا تعلق کائنات کے چھوٹے چھوٹے جزئیات سے ہے اور یہ ملک ہی جو کثرت، نیزگی اور تفریق سے سرا سرا پال ہو چکا ہے نیزہ جزئیات فنطیعات کے اعتبار سے نہ کسی کلیہ سے متعلق معلوم ہوتے ہیں نہ کسی کلیہ کی طرف رائج نظر آتے ہیں بلکہ ہر جز اپنے میار کے مطابق اس قدر



مکمل اور موزوں ہے کہ وہ بجائے خود نمود و شخص کا دعویٰ رہے مگر ہر جزیہ کے تحت میں ایک قانون ہے جو گرد و پیش کے ذرات پر حکمرانی کر کے اشکال و قوالب کو رونما کرتا رہتا ہے۔

### قانون قدرت کی تعریف اور اس کے امثال

فکر رسا کو فطرت کی دلفریب وادی سے آگے بڑھائیے تو کائنات کا خاموش و پیر نہ سنے آجاتا ہے مگر ایک بسیط قانون اس میں ورعیت کیا ہوا یا محیط پایا جاتا ہے جس کا ہر شعبہ یہ پتہ دیتا ہے کہ خلقت کی تحریر اسی کے ہاتھوں لکھی گئی ہے کیونکہ عبارت کی ہر سطر بلکہ ہر شوشہ اس کے تابع فرمان اور منہوا نظر آتا ہے۔ وہ ایک طرف تو کائنات کے وجود کو نکھلے ہوئے ہے اور اس کی نگہبانی کرتا ہے اور دوسری جانب اس کی رونق و رنگینی کی سعی کامیاب میں مصروف ہے۔ اپنے بسط و عمومیت کے اعتبار سے نہایت عام فہم اور چھوٹی بڑی مخلوقات میں جاری و ساری مگر ماہیت کے اعتبار سے عقل کے کبج و کاؤ سے بالاتر، قدامت میں آفرینش کے کناسے کا پتہ دینے والا جہاں محسوسات اور مجاز کے پردوں میں تیزی سے زہول ہو جاتا ہے اور بالآخر مرقع ہو کر ایک حقیقت بے چون و بے چلوں باقی رہ جاتی ہے جس کو علم و مشیت الہی کے سوا کسی اور طرح پر موصوم نہیں جاسکتا۔ اسی عظیم شان اور بدیہی نظام کو قانون قدرت کہتے ہیں۔

قانون کشش جسم | اس اجمال کی تفصیل درکار ہے یا یوں کیسے کہ قانون قدرت کے امثال اور اس کے مذکورہ بالا خصوصیات کو بیان کر دینا ہے۔ اس قانون کا سب سے نمایاں پہلو کشش اجسام کا قانون ہے جس کے ذریعہ مختلف سیارے نہ صرف معلق ہیں بلکہ تیز رفتاری سے گردش کرنے کے باوجود دائرہ نظم سے باہر نہیں جاسکتے۔ اسی قانون کی بدولت زمین سورج درچاند کی شعاعوں سے صحیح طور پر استفادہ کر سکتی ہے کیونکہ اس کا راز مدار مناسب فاصلہ کے قائم ہونے پر ہے اور یہی فاصلہ دن اور رات کے ظہور اور موسمی تغیرات کا سبب اصلی ہے۔ علاوہ ازیں کشش اجسام

کی وجہ سے مختلف سیاروں میں برقی اور مقناطیسی طاقتیں گھٹتی اور بڑھتی رہتی ہیں اور ہر گزرتا کا مقررہ ذخیرہ قائم رہتا ہے جو اُس کے فطری کاروبار کو انجام دینے کے لئے ضروری اور اُس کے مقررہ طبعی افعال کی تکمیل کے لیے ناگزیر ہے۔ غرض کہ اس قانون کا اجرا خلقت میں ایک خاص طرح پڑ جانے کا باعث ہوا اور مخلوقات کے صغیر و کبیر جزئیات اُس کے تابع فرمان ہو کر اُس کے ساتھ میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ نہ صرف مادی اشکال بلکہ بیشتر قوانین فطرت بھی اُس کے حلقہ مگوش اور خوشہ چیں ہیں۔

**قانون جاذبیت** | یا مثلاً یہ قانون کہ ہر مادی شے معلق ہو جانے پر زمین کے مرکز کی طرف اپنے وزن کے اعتبار سے نزول کرتی ہے اور جب تک کوئی دوسری شے موثر طریقہ پر حاجب نہ ہو وہ اس رفتار سے باز نہیں سکتی۔ یہ قانون بین ہے اور ہر دم اُس کا تجربہ ہوتا ہے۔ سائنس جدید نے اُس کی گتہ بیان کرنے میں اس پر اکتفا کیا ہے کہ کرۂ ارض میں ایک قوی مرکز جاذب اشیاء تسلیم کیا ہے نیز اس کشش کی کیفیت کی تشریح کی ہے اور اُس کے مفصل صوابط قائم کیے ہیں مگر کسی شے کی فعلی کیفیت اور ماہیت میں بڑا فرق ہے۔ اور سائنس کے علماء اس سے بخوبی واقف ہیں کہ ماہیت کے اعتبار سے یہ قانون بھی اپنی جگہ بالکل مخیر لغتوں ہے، بہر حال ہماری بیان کردہ تعریف کے اعتبار سے یہ مشاہدہ صیغہ قدرت میں داخل ہے نہ کہ فطرت میں کیونکہ مخلوقات پر نظر کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس قانون کو عمومیت حاصل ہے یعنی یہ کہ فطری جزئیات کی تشکیں اُس کے تحت میں ہوئی ہے مثلاً بارش کا نزول اس قانون کے مطابق ہوتا ہے اور اس کے لیے پانی کو ہوا سے زیادہ وزنی بنایا گیا تاکہ اس قانون کے بموجب وہ سجا کی شکل میں معلق ہو کر اور پھر برودت کے اثر سے پانی ہو کر بہ آسانی سگان ارض کو سیرب کر سکے اسی طرح عالم نباتات کی خلقت میں جبکہ غذا کو سطح زمیں سے برگ و بار تک میسوں فٹ و پر

پہنچانا تھا تو اسی قانون کی پابندی، زم آئی اور اشجار میں ایسی شرمین پیدا کی گئیں جو قوت کے ساتھ عذا کو کشاں کشاں منزل مقصود تک پہنچا دیں۔ اس قسم کی امثال میں بہت کچھ اضافہ کر دینا ممکن ہے مگر تفہیم فہم کے لیے یہ دو مثالیں بھی کافی ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جاذبیتِ ارض کے اس قانون کا منشا من حیثِ اکل کچھ ہے یا نہیں، چونکہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ زبان کے اعتبار سے قانونِ قدرت کو جملہ مخلوقات پر فوقیت حاصل ہے اور وہ خود کائنات کا اُس کے پرزوں اور شوشوں سے قطع نظر کر کے بھی نگہاں ہے، نظر غائر کرنے سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس روزمرہ کے قانون میں بھی بعض بنیادی مقاصد پنہاں ہیں۔ وحی الہی کے فخر صادق نے ہم کو خبر دی ہے کہ ایک وقت میں تمام سیارے ایک گھڑی کی شکل میں جڑے ہوئے تھے اور یہ قدرت نے اُس کا تجزیہ کر کے عوالم اور کُرے قائم کیے۔ کائنات تقاضا فتنہ ہمارے بجا ہے خود ایک نظام کا محور بن کر ظاہر ہوا اور ہے۔ اس نظام کے دو بڑے اجزاء ہیں جن کی بقا پر اُس نظام کی کامد رہے یعنی ایک مقررہ مقدار مادہ کی در قوت کی رات دونوں اجزاء کی اصاعت رفتہ رفتہ اس نظام کی تخریب کا باعث ہو سکتی ہے لہذا ضروری ہوا کہ ہر نظام میں اپنے ذخیرہ کے تحفظ اور تکمل کی کابل صلاحیت ہو اور اس کی بہتر صورت قوی مرکزی جاذبیت ہی ہو سکتی تھی جو ذرہ ذرہ کو جوشِ مادری کے ساتھ بڑے ڈھیر کی طرف سمیٹتی رہتی ہے۔

قانونِ انجناد اسی ذیل میں مقبول قدرت کی ایک اور صنع داری کی طرف اشارہ کر دینا مناسب ہوگا۔ قانونِ جاذبیت کے ساتھ ایک قانون یہ بھی جاری کیا گیا کہ خلا، محال قرار دیا گیا یعنی کسی ایک نظام کے اندر کوئی جگہ اگر مادہ سے بالکل خالی ہو جائے تو اس جگہ میں ایسا دباؤ پیدا ہو جاتا ہے جو قریب ترین مادی اشیاء کو اپنی طرف بڑی قوت سے کھینچتا ہے۔ یہ مشاہدہ بھی اپنی



عمومیت، حاکمیت اور قدامت کے اعتبار سے قانون قدرت کی تعریف میں آتا ہے اس قانون کا بنیادی مقصد قانون جاذبیت کے فعل سے بہت کچھ مشابہ ہے، کیونکہ خاں جگہ پر کرنے سے کسی مخصوص نظام کے ذخیرہ کا ایجاد حاصل ہونا لازم ہے، اور دوائی تحفظ کا ذریعہ ہے بالخصوص اُن ایام دہر میں جبکہ مادہ زیادہ تر سیاں شکل میں تھا۔ وکان عرشاً علی الماء اور یہ بھی واضح نہیں ہے کہ اُس وقت مادہ کی کوئی دُفانی شکل بھی تھی یا نہیں یعنی ہوا کا کرہ موجود تھا یا نہیں۔ ایسی حالت میں جب مادہ سیاں حالت سے ثقل کی طرف اُل ہوگا تو بے جور گھاٹیوں سُرنگوں اور مسامات کا پیدا ہو جانا ممکن تھا مگر اس قانون کی بدولت تمام ایسے خالی مقامات کا حتی الوسع پُر ہو جانا ورنہ ارض کی سطح اور بطن کا استوار ہو جانا ممکن ہو کیونکہ یہ مقامات ہوا کے برابر ہو کر قانون کے مقصد کو پورا نہیں کر سکتے تھے۔ یہ قرائن اس قانون کی قدامت پر دل میں درس کے بنیادی مقصد کو واضح کرتے ہیں۔

اس قانون کی حاکمیت اور عمومیت کا اندازہ کرنا بھی بہ آسانی ممکن ہے جبکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ حیوانا اور نباتات کے آلات تنفس اس کے تابع مخلوق ہوئے ہیں سانس لینے میں اور پانی پینے میں تمام طبیعی افعال اسی قانون کے تحت میں صائر ہوتے ہیں کیونکہ عضو متعفنہ کی ساخت اسی اصول پر مبنی ہے۔ قانون قدرت کی اس فیاضی کا تم ذکر کر چکے ہیں کہ وہ مخلوق کا از سر تا پا حاکم بھی ہے اور خادم بھی، گو وہ سطوت سبطانی کے ساتھ فضل عافیت بھی رکھتا ہے چنانچہ قانون زیر بحث میں یہ خصوصیات نمایاں ہیں۔ ابتداء آفرینش میں اُس نے جو کچھ کہا اُس کے اعادہ کی ضرورت نہیں مگر اسی پر یہ قیاس کر سکیں کہ رُضنی نظام میں بحالت موجودہ سائنٹفک حیثیت سے سب سے زیادہ مفید مواد سیاں حالت میں ہے یعنی پانی اور ہوا۔ اس کے تیزی سے منتقل ہونے پر دور افتادہ جانداروں کی حیات کا دار و مدار ہے۔ پہاڑوں اور

چٹانوں سے طرح طرح کے چٹموں کا پھوٹنا، اُبلنا اور بہنا جزو اسی قانون کے تحت میں ظہور پذیر ہوتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ ہوا کی طبیعی کیفیت بھی اس قانون کو مد نظر رکھتے ہوئے ہے ہوا کے مہقات جب حرارت کے اثر سے لطافت پکڑ لیتے ہیں اور مائل بہ خلا ہو جاتے ہیں تو قریب و بعید کی ہوائیں اس کمی کو پورا کرنے کے لیے شدت سے دوڑتی ہیں جس میں مخلوقات کے بشمار منافع اور اسباب بارانی وغیرہ مضمین ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس باب میں قانون فرشتہ رحمت ہے۔

قانون زوجین | قانون قدرت میں یک مہتم بالشان صیغہ اپنے عظیم مصالحوں اور لطائف عام کی وجہ سے روز ازل میں لوح محفوظ پر اس طرح مندرج ہوا۔ ومن کل شیء خلقنا زوجین (یعنی تمام مخلوقات کو جوڑ جوڑا پیدا کیا گیا) اور موجودات نے جائزہ مہستی پہن کر پہلی فرصت میں اس کو لبیک کہا، نیز لم فطر میں ادنیٰ و اعلیٰ نے پورے تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا اور یہ قانون بھی ایک تہہ گیر حقیقت بن کر رہ گیا۔ بظاہر ایسا معلوم ہو گا کہ اس قانون کو کائنات کی ابتدائی طبعیات سے کوئی تعلق نہیں ہے یا یوں کیسے کہ غیر ذی روح مخلوقات میں اس کا کوئی مظاہرہ نہیں ہو گا مگر اول تو یہ خیال بعض بین مشاہدات کے خلاف ہے جیسا کہ آئندہ انکشافات سے ظاہر ہو جائیگا۔ و ردوم یہ کہ غیر ذی روح اشیاء میں اس قانون کا ظہور تشبیہ اور استعارہ کی شکل میں پایا جاتا ہے۔ جس کو ایک مبصر و عالم ہی سمجھ سکتا ہے کیونکہ عام اذہان میں جو زوج کا مفہوم ہے وہ خود محدود و علمی حیثیت سے ناکافی ہے۔ عام طور پر قانون زوجین کا اثر ایک جنس کے درمختلف الاوصاف افراد کے اختلاف سے دیگر افراد کی پیدائش سمجھا جاتا ہے اور غیر ذی روح مخلوقات پر جنس اور افراد کے تخیل کا اطلاق ہی نہیں ہوتا مثلاً کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پتھر ایک جنس ہے یا مٹی ایک جنس ہے جبکہ ایک کو دوسرے کی شکل میں آسانی تبدیل کیا جاسکتا، اور اس دائرہ

میں افراد کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس قانون کے بنیادی مقصد کی جستجو کی جائے اور ہمارے بیان کردہ معیار کی روشنی میں اس کو سمجھا جائے جو صاف طور پر یہ ہے کہ ہر قانون قدرت کائنات کا نگہبان، مدحیات اور صفحہ ہستی کے لیے ذریعہ زمینیت ہے اس تعریف میں کائنات سے خالص مادی اجسام مراد ہیں جس کے اندرونی عناصر طاقت اور خواص ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ خواص ان اجسام میں ردیعت کیے ہوئے ہیں اور ان کا جز ہیں، اور طاقت بجائے خود مجرد شے ہے مثلاً حرارت، برقی یا مقناطیسی طاقت اور جداگانہ افعال خواص کی متحمل ہے۔ یہ تمام موجودات کم و بیش قوت کے ساتھ متحرک ہیں، اثر پذیر اور اثر انداز بھی ہیں۔ اور اگر یہ حرکات کسی خاص ربط و قید کے ساتھ واقع نہ ہوں یعنی مخصوص طریقہ سے محدود نہ کر دیے جائیں تو اعتدال قائم نہیں رہ سکتا اور کارخانہ ہستی ان وحشوں و رہم برہم ہو جائیگا۔ لہذا یہ گزیر ہو کہ غیر ذی روح دنیا میں تضاد قائم کیے جائیں، اور ایسے خواص وضع کیے جائیں جو ایک دوسرے کے مقابل ہوں اور حد سے گذر جانے کے اور عالم پر بے طرح مسلط ہو جانے سے مانع ہوں حتیٰ کہ ہر طاقت اور ہر جسم اپنی اپنی جگہ پر مفید بھی رہے اور تخریب کی طرف قدم بھی نہ بڑھاسکے، لہذا مقصد کے پیش نظر متقن قدرت کے نزدیک غیر ذی روح اشیاء میں جن کے معنی ضدین قرار پائے چنانچہ خشکی کو تری سے اور تری کو خشکی سے دفع کیا گیا، تاریکی کو روشنی سے، اور روشنی کو تاریکی سے تغیر پذیر کیا گیا، حرارت کو برودت کے مقابل کر دیا گیا، تنوع کو شیرجہ مدم کر دیا گیا اور تیزاب کو کھارے سے متوازن کیا گیا، اور اجسام متعلقہ ہیں اسی قانون کے تحت میں مناسب خواص کا طور ہوا، اور طاقت میں تضاد اقسام پیدا کر دی گئیں جیسے برق اور مقناطیس میں منفی اور مثبت اقسام جو ایک دوسرے کو کھینچتے بھی ہیں اور سلب بھی کر لیتے ہیں۔ اگر ان بے پناہ قوتوں میں زمین کی صفت نہ ہوتی تو ماضی کا نام قیامت ہوتا۔



نتیجہ یہ ہے کہ بحر و بر کی تعلیمیں اس واحد قانون کی مرکزی فیڈریشن سے منسلک ہیں اور اپنے اپنے دائر پرنازوں اور قانع ہیں۔ سمندر اپنی موج میں ہے۔ زمین اپنی خاکساری پر قائم ہے اور ہوا اعتدال کے دھیمے ترانے گائے چلی جاتی ہے تاکہ کھسار کی دلفریبیوں، گل و بلبل کی آویزشوں اور انسان کی گرمی محفل میں کوئی غلط واقع نہ ہو۔

چونکہ ہر ایسے قانون کو منطق عمومیت حاصل ہوتی ہے اس لیے زندہ مخلوق میں بھی اس کے خفی و چلی اثرات پائے جاتے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ اس گروہ میں جو جنس ترقی یافتہ ہے اسی قدر وہ عامۃ الناس کے لیے اس قانون کے کمالات کی منظر ہے اور جو اجناس اپنی خلقت کے اعتبار سے گھری ہوئی ہیں اسی قدر قانون مذکور کی کرشمہ سازیاں کوتاہ ہیں۔ پوشیدہ لیکن دور ہیں ورنہ کتبہ پر عیاں ہوتی چلی جاتی ہیں بلکہ ایسے مفکرین تو یہ اقرار کرنے پر مجبور ہیں کہ مخلوقات کے خلقی درجات کو اس قانون کے رسوخ نام سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ات صرف اتنی ہے کہ ہر جنس اپنی خلقی قابلیت کے مطابق قانون سے مستفیض ہوتی ہے جس سے اس کی ہمہ گیری میں کوئی نقص لازم نہیں آتا مثلاً نباتات میں جو بظہر اکب ساکت و صامت طبقہ ہے تذکیر و تانبث کے سلسلہ میں کوئی خاص آگ و دو نہیں پائی جاتی اگرچہ دورس لگا ہیں یہ عجائبات کا بپہ لگالیتی ہیں جو جو حیرت کر دینے کے لیے کافی ہیں۔ حیوانات جو درمیانی طبقہ ہے وہ بقائیدل کے منشاء کو زیادہ نمایاں طریقہ پر لیے ہوئے ہے اور ذی نفع انسان جو اعلیٰ ترین مخلوق ہے اور اس کے اعضا و شعور مکمل ہیں اور بطری بلوغ کو پہنچے ہوئے ہیں اس قانون کی ایک خاص شرح و بسط کا حامل ہے۔ یہاں قانون کا منشا بقائیدل سے تجاوز کر کے لطیف جذبات و حیات باہمی معاشرت اور تہذیب و تمدن پر بھی حاوی ہے۔

چونکہ اخلاقی اور ذہنی مباحث موجودہ حیطہ کلام سے خارج ہیں۔ اس لیے گفتگو کو مختصر

کہتے ہوئے یہ دیکھنا ہے کہ ذی روح مخلوقات کا اس قانون سے کب ربط و تسلسل ہے۔ اس  
 ذیل میں سب سے اول یہ امر قابل غور ہے کہ جبکہ دیگر قوانین قدرت عالم فطرت کے بقا اور نمو  
 کے حامی ہیں یہ قانون جس کے تزمین و ریزنگی پر بھی غم کے ساتھ مائل ہے جس کی بنیاد مثال  
 نباتات میں موجود ہیں۔ یہ عام طور پر معلوم ہے کہ نباتات میں تذکیر و تانیث دو طرح سے پائی  
 جاتی ہے۔ یا تو ایک ہی درخت میں دو قسم کے پھول پیدا ہوتے ہیں یا ہر جنس کے دو مختلف  
 پودے تذکر و مؤنث ہوتے ہیں اور ان دونوں اجزاء کے باہم اور پے بہ پے اتصال سے  
 تخم و نثر کی بنیاد پڑتی ہے۔ فطرت نے یہ کام چھوٹے بھنگوں، تکیوں اور چڑیوں سے کیا ہے  
 جو پھولوں کے رنگ و خوشبو و ریشم عریقیت کی ریزش کے عادی و لدادہ ہوتے ہیں اور  
 ان کے جویا رہتے ہیں۔ یہ جانور اپنا حظ حاصل کرنے کے لئے شاخ در شاخ بڑھتے رہتے ہیں  
 اور تذکر اور مؤنث جزا ان کے بدن سے مس کر کے دھڑ سے دھڑ منتقل ہو جاتے ہیں۔ تخم کے  
 قائم ہو جانے کے بعد سول اس کا ہے کہ اس کو متفرق مقامات پر کیونکر منتشر کیا جائے۔ اس  
 کے لیے عجیب عجیب صورتیں اختیار کی گئی ہیں۔ پر در تخم ہیں جو ہوا پر اڑ جاتے ہیں اور جائے  
 پیدائش سے میلوں دور جا کر ٹھہرتے اور اُگتے ہیں بعض اقسام میں تخم کا کوڑا خشک ہو کر  
 اس قدر زور سے شق ہوتا ہے کہ داہنائے تخم کو دور دور پھینک دیتا ہے۔ یہ عام طریقہ ہے کہ  
 تخم کو لذیذ مغزیات اور گودے میں لپیٹ کر پیدا کیا جاتا ہے تاکہ حیوانات اور انسان اس محبہ  
 کی طرف رغبت کریں اور اس کو دور دور لجا کر گودے کو استعمال کر کے تخم کو منتشر کر دیں۔ یہی  
 متفرق مشاہدات ہیں جو مجتمع ہو کر مناظر فطرت کے نام سے سراہے جاتے ہیں۔ اور قانون قدرت  
 کی صنّاعی کا پتہ دیتے ہیں۔

نباتات میں بہت سی ایسی اقسام ہیں جو اپنی بقا و نسل کے لیے تذکیر و تانیث اختیار

کرنے پر مجبور نہیں ہیں اور ان کی شاخ کا کوئی حصہ زمین میں نصب ہونے کے بعد پورا درخت بن سکتا ہے، اگر ایسے اشجار میں بھی پیدائش افراد بذریعہ زوہین کے ہی ہوتی ہے۔ ان مشاہدات سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ اس قانون کے بعض ضمنی مقاصد اور مصالح بھی ہیں جو اجناس و افراد کے لیے فی نفسہ معین ہیں۔ مثلاً یہ کہ مختلف الاوصاف افراد خدات سے بہتر اور ترقی یافتہ افراد کے پیدا ہونے کا امکان ہے بلکہ یہاں تک بھی ممکن ہے کہ جنس کے اندر ضمنی اجناس کا ظور ہو جائے۔ نیز حیوانات کے اندر تربیت و لد میں بجائے ایک فرد کے دو افراد کو گھری رکھپی ہو جاتی ہے جو آئندہ نسلوں کے تحفظ کا ضروری ذریعہ ہے۔ حیوانات کے باب میں آبائی اور نباتات میں کسی قدر غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ازدوجی میلان بہت سے مفید طبعی اوصاف کا محرک ہے۔ اور دوسری حیات آفریں طاقتوں کو براہِ گیمتہ کرتا ہے اور فرد کو کشمکش حیات میں شاعری کے لیے ایک خاص استعداد اور جولانی بخشتا ہے بلکہ اس کی بدلت وہ حیات کی جدوجہد میں جان تک کی بازی لگا دیتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر ذی روح مخلوق کو اس قانون کی تعمیل سے سبکدوش کر دیا جائے تو ہر طرف فساد اور مُردنی کا عالم ہوگا۔ اور ترقی معکوس کا دور دورہ ہو جائیگا۔

### قانون قدرت کی کیفیت اور ماہیت

سب تک ہم نے قدرت کے قوانین کی چند امثال بیان کی ہیں جو زیادہ تر فنِ طبیعت سے ماخوذ ہیں ورنہ یہ ہے کہ موجودات کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو کسی ازلی شارع الی رُشہی میں اپنے مقرہ محور پر گردش نہ کر رہا ہو یہاں تک کہ مادیات، مادہ کے افعال و خواص، نفسیات، خدائیات وغیرہ سب کے سب یہ قوانین کے زیرِ نگیں پائے جائینگے۔ امثال مذکورہ کے تفصیل بیان سے یہ بھی ظاہر ہے کہ قانون قدرت میں کائنات کی تعمیر کار زہناں ہے اور اسی لیے



وہ زمان و مصلحت کے لحاظ سے کائنات پر فائق ہر اس سے نظر ہٹا کر جب مقاصد کو دیکھے تو یہی قانون کائنات کے اندرون میں پیوستہ اور پھرتا ہوا نظر آتا ہے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ اس قانون کا ماخذ کیا ہے اور اس کی کُنہ کا تصور کس طرح پر کیا جائے۔ مادیات کا دائرہ اس تلاش سے پیچھے رہ جاتا ہے اور مجاز کا کوئی شاہدہ گریباتی ہے تو وہ حقیقت سے بغلیں ہو چکا ہے عقل سلیم صاف طور پر بتاتی ہے کہ ایسے قانون کا کوئی منبع ہو سکتا ہے تو وہ علم بے پایاں اور غیر محدود ہو سکتا ہے جیسا کہ خداوند عالم کی ذات بابرکات کے ساتھ بجا طور پر منسوب ہے اور اس کی صفت علم ہی اس کی خالق پر دلیل عینی ہے۔ مزید برآں قانون قدرت کے عظیم مقاصد، طویل معانی اور مربوط نتائج کی فردانی سے آشکارا ہے کہ یہ قانون کسی مدبر اعظم کی مشیت کا عکس ہے جو ابھی لفظ کُن سے فارغ ہو کر اپنی رحمت و رافت کو مستقل دستور کی شکل میں نافذ فرما رہے ہیں۔ اور ضیفانِ فطرت کو اس ارشاد کے ساتھ مطمئن فرما رہے ہیں۔ وَلَقَدْ تَجَدَّ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا اور اس نکرار و صرار سے بھی دلن تَجَدَّ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَحْوِيلًا اور فطرت میں بھی سانس آنے لگا ہے۔ خواب کو بیداری کا عالم ہے۔ نصائہ نہایت موافق ہے، مہملی بستر، سرگس، آنکھیں نیم باز ہونے پائی نکھیں کہ سہنی چاندنی اور ہلکی پھوار کا منظر، میں سما کر رہ گیا۔ وجد و ولولہ کی کیفیت ہے اور کچھ بے چینی سی ہے آخر لہلہ نازک کے درمیاں نہان حرکت کر کے بروقت اعانت کی تو دُورِ شوق سے جناب باری میں غرنحوں ہے۔

بنامِ جہادِ رجاں آفریں      حکیمے سخنِ برزباں آفریں

بحث کا ایک اہم نتیجہ

ہم نے دیکھا کہ تمام دور فطرت اور مادہ کے افعال و خواص دراصل مختلف قوانین کا مجموعہ ہیں

صرف مادہ کی ٹھوس کیفیت ایک شے متمیز باقی رہ جاتی ہے مگر اُس کی بنیاد یعنی جزو لای تجزی کی بابت تحقیقات جدید نے بتا دیا ہے کہ اُس کی ماہیت برقی ذرات کی ترتیب و گردش پر ختم ہو جاتی ہے اور یہ بھی ایک مقررہ قانون ہی ہے گویا مادہ کا ثقل ایک مومنہ شے ہے۔ یہ امر خف ہے کہ جب مومنہ اشیا آپس میں متصادم ہوتی ہیں تو وہ ایک دوسرے کو حقیقت سمجھنے لگتی ہیں اور یہی دھوکا انسان کو بھی لگتا ہے۔ چونکہ مادہ کی ماہیت بھی قوانین کا مجموعہ ثابت ہوئی جو خود ایک بڑے قانون کا وردہ اور پروردہ ہے تو مادہ کی قدامت کا دعویٰ کرنے والوں نے انتہائی کوتاہ بینی سے کام لیا اور اسلم یہی ہے کہ اپنی جہالت کا اقرار کر کے رب العلین کے علم عظیم اور بے تکان خدائی کے پائیدار عقیدہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے۔

# اردو کی جدید شاعری اور اقبال

از جناب مولوی رفعت احمد خالص صاحب ایم اے لکچرر گورنمنٹ کالج الموڑہ

شاعری | خالق عالم نے نظام کائنات کو عجیب کمال سے ہم آغوش کیا ہے۔ جہاں فطرت کی مختلف کیفیات، قدرت کی دلفریبیں، مظاہر و آثار کی دلچسپیاں اور موجودات کے گونا گوں سوانح اور بوقلموں واردات انسان کے محسوسات میں تحریک و ہرجان کے باعث ہوتے ہیں۔ وہ ان موجودات کی حسن و خوبی سے متاثر ہوتا ہے اور مختلف واردات و واقعات سے اس کے قلب میں طرح طرح کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ جن کے سچے اظہار سے شعر کی تخلیق اور اس کے حسن و بقیہ کی تصدیق ہوتی ہے۔ دراصل انسان اپنے تاثرات کو متخیلہ کی مدد سے علم یا فن کی صورت میں ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ جن کے لیے وہ ن فطری اور ذہنی قوتوں کا محتاج ہے، جو خالق حقیقی نے اس کو ودیعت کی ہیں۔ فنون لطیفہ کا مذاق بھی ان ہی میں سے ایک قدرتی عطیہ ہے۔ شاعری بنسبت دیگر فنون جمیدہ کے ذہنی اور خارجی واردات اور نفس انسانی کی گہری اور بوقلموں کیفیات کی زیادہ صحیح تصویر پیش کر سکتی ہے۔ اسی وجہ سے ان سب پر فوقیت رکھتی ہے۔

شعر کی ہیبت | شاعر کی انقلاب انگیز قوت کا اندازہ تاریخی شواہد سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ جس اور شاعر کا پیغام | وقت عربی شاعری اپنے فطری رنگ میں جلوہ گرد اور سادگی اور بے ساختگی سے ہیکلار تھی اس وقت ایک بڑی حد تک شعرا بھی ملک پر حکومت کرتے تھے۔ قوم کے سیاسی نظام۔ تمدنی اور اخلاقی اصلاح اور علم و فن کی ترقی کے وہی باعث تھے۔ شعر ایک حیرت انگیز



قوت کے مرادف تھا، اور شاعر کا احترام ایک حکمران سے ہرگز کم نہ تھا۔ انگریزی شاعری میں بھی ایسی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ چنانچہ شیلی (Shelley) کے فلسفہ حیات اور سیاسی خیالات نے ملک میں پھیل چادی تھی۔ ورڈس ور تھ (Wordsworth) نے اپنے ہوطنوں کی مادہ پرستی کی مذمت کر کے ان کو قدرت کے دلکش اور سبق آموز مناظر کی جانب مائل کیا۔ براؤننگ (Browning) کی نظموں نے سیاسی دنیا میں تسکیم برپا کر دیا تھا۔ ایرانی شاعری بھی اس عملی قوت سے بالکل خالی نہیں کہی جاسکتی۔ شیخ سعدی، خواجہ حافظ مولانا روم اور دیگر شعراء نے دین کو جو درس، خلاق و تصوف دیا ہے، محتاج بیان نہیں۔ شاعری کی عملی قوت کے اثرات کو صرف جنگ و پیکار کے آئینہ میں دیکھنا غلطی ہے۔ البتہ اردو شاعری میں شوق و قوت کے مدٹوں محروم رہی۔ قصیدہ کا سہ گدائی بن گئے اور غزل ایک معجون مرکب ہو کر رہ گئی۔ نہ حدود تعزل متعین رہیں، نہ نوعیت مضامین۔ نہ جذبات کی صلی ترجمانی باقی رہی، نہ محسوسات کی سچی تصویر۔ رفتہ رفتہ تصنع اور تکلف نے سادگی اور صداقت کی جگہ لیلی۔ اردو کی جدید شاعری میں اقبال کی یہ قیاداری خصوصیت ہے کہ انہوں نے صرف غزل میں منتشر خیالات نظم کرنے کے بجائے اپنی شاعری کے ذریعہ ایک خوابیدہ ملت کو بیدار کیا، اور فلسفہ خودی سمجھا کر درس عمل دیا، ان کی شاعری دراصل ”پیغام عمل“ کے مرادف ہے، جس کا درس بھی وہ عین فطری اور سببائی طریقہ پر بتہ رنج دیتے ہیں۔ ذیل کے اشعار سے ان کے فلسفیانہ پیام کے مدارج اور تدریجی تعلیم کا جہاں اندازہ ہو سکتا ہے۔

ملت خوابیدہ کا شکوہ

اڑتی پھرتی ہیں ہزاروں ملیں گلزار میں      دل میں کیا آئی کہ پابند نشین ہو گئیں  
اب ملک شاہد ہے جس پر کوہ فادان کا سکو      اے تغافل پیشہ تجھ کو یاد وہ پیاں بھی ہے

## پیام بیداری اور فلسفہ خودی

اپنی اصلیت سے ہوا گامے غافل کہ تو  
 ہفت کشور جس سے ہوں تسخیر بے تیغ و تنگ  
 تمقین عمل اور  
 ضمیر لایہ میں روشن چراغِ رزد کرے  
 یقین کا بلِ عمل ہم، محبتِ فایحِ عالم  
 امید کی کرن  
 شبنمِ انشانی مری پیدا کر لگی سوز و ساز  
 پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجد  
 شب گریزاں ہوگی آخر جلوہ خورشید سے  
 یہ چمن معمور ہوگا غنہ توحید سے

قطرے سینِ مثالِ بحر بے پایاں بھی ہر  
 تو اگر دیکھے تو تیرے پاس ساں بھی ہے  
 چمن کے ذری ذری کو شہید جستجو کر دے  
 جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شہیریاں  
 اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائیگی  
 پھر حسین خاکِ حرم سے آشنا ہو جائیگی  
 یہ چمن معمور ہوگا غنہ توحید سے

اقبال کا یہ تمام فلسفہ ان ہی اسلامی تعلیمات کو شاعرانہ پیرائے میں پیش کرتا ہے جو ہیں قرآنِ کریم اور احادیثِ پاک سے حاصل ہوئی ہیں اور جن کی تفصیل اقبال کے فلسفہ حیات پر تفصیلی تنقید کے ضمن میں شاید ناظرین آئندہ ملاحظہ کریں جس سے یہ امر واضح ہو جائیگا کہ شاعر نے اسلامی فلسفہ عمل کو کس خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔

علاوہ پیغامِ عمل دینے کے جدید فلسفیانہ خیالات بھی اس کے کلام میں پائے جاتے ہیں لیکن سب فلسفہ اسلام کے تابع ہیں جس سے شاعر کے جذبہ ملی اور محبتِ اسلام کا ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً اخوت و ہمدردی کی تعلیم اس طریقہ پر دیتے ہیں۔

شاہِ قدرت کا آئینہ ہو دلِ میرا نہ ہو  
 سر میں جز ہمدردی انساں کوئی سودا نہ ہو  
 یہ بھی ایک حدیث شریف کے مضمون کی ترجمانی ہے۔ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ ان لوگوں میں بہتر شخص وہ ہے جو دوسرے انسانوں کو فائدہ پہنچائے۔ ایک دوسری جگہ اقبال نے کہاہے :-

یہی مقصود فطرت پرستی و مسلمانانہ اخوت کی جہانگیری محبت کی فزادانی

اُردو کی جدید شاعری | اُردو کی دکنی یا ابتدائی شاعری اپنے سادہ طرز اور جذبات نگاری میں ایک اور تجدید رومانیت

سادگی اور فطری جذبات نگاری کے نمونے "اُردو شہ پارے" (مصنف ڈاکٹر محمد الدین زور) میں بکثرت ملینگے جس طرح عرب کی شاعری اپنی فطری بے تکلفی اور سادگی کو خیر باد کہہ کر ایک عرصہ تک صرف مدحیہ قصائد پر مبنی رہ گئی تھی اور فارسی شاعری بھی اسی انحطاط پذیر دور کی تقلید کے باعث عرصہ تک تصنیفات ہی میں ابھی رہی۔ اسی طرح شمالی ہند میں اُردو شاعری بھی پہلے دور کے بعد ہی ظاہری تکلفات کا ہٹ بن کر رہ گئی۔ یہ طرز شاعری انگریزی شاعری کے کلاسیک (Classicism) کے رنگ سے مشابہ ہے۔ وہاں اگر پوپ (Pope) اور چاوسر

(Chaucer) اس طرز کے علمبردار ہیں تو یہاں ناسخ لکھنوی اور ان کے ہم رنگ شعراء کا مرتبہ ان سے ہرگز کم نہیں جس طرح انگریزی شاعری میں اس قلعہ آمیز دور کے بعد قرون وسطیٰ کے طرز شاعری کی تجدید کا زمانہ گرے (Gray) سے شروع ہوتا ہے اور بعد کو بائرن (Byron)

ورڈس ورث (Wordsworth) شیلی (Shelly) اور کیٹس (Keats) وغیرہ اس نئے طرز رومانیت کے حامل ہیں اسی طرح اُردو شاعری میں بھی یہ تغیر رونما ہوا۔ غدر کے قبل ہی نظیر

کبر آبادی نے اپنے کلام اور غالب نے اپنے خطوط میں فطری سادگی اور یہ رومانی اسپرٹ

(Romantic Spirit) اختیار کی۔ اور بعد ازاں انیس، دہرہ، حالی، آزاد، شیلی، مولوی

محمد ہنغیل، اکبر الہ آبادی اور ڈاکٹر اقبال وغیرہ نے اردو شاعری کے چہرہ سے ظاہری تصنیفات

اور دورانہ کار تشبیہات وغیرہ کے بد مذہب دور کے۔ حالی کا "مقدمہ شعرو شاعری" اس سلسلہ میں قابل

ذکر لائق مطالعہ ہے۔ انگریزی شاعری میں اس رومانی طرز نے اٹھارہویں صدی عیسوی کے



آخری حصہ میں ترقی کی بیکین ہندوستان میں یہ تحریک تقریباً ایک صدی بعد رونما ہوئی۔ اس تحریک کے بعد رفتہ رفتہ انگریزی حکومت، انگریزی طریقہ تعلیم اور تہذیب و تمدن اور دیگر اسباب کے باعث اردو شاعری مغربی اثرات قبول کرتی رہی۔ اقبال نے دیگر خود رو شاعروں کی طرح اس کی کورانہ تقلید نہیں کی۔ بلکہ اعتدال اور ضرورت کے مطابق اس رنگ کو اختیار کیا اور اس کی تہ میں اپنے پیغامِ مشرق "اسرارِ خودی" اور جذبہ اسلامی کے پیش ہما سوتیلوں کو نمایاں رکھا۔ جن کے تاباک لمحات سے چشمِ مغرب خیرہ ہوئی۔ انگریزی کا مشہور شاعر براؤننگ (Brownings) کا فلسفہ سعی و عمل اقبال کے مکمل فلسفہ حیات کے سامنے کوئی ہمت نہیں رکھتا۔ اقبال کا دل حقیقت "سراپا ذوقِ استغفار" صورتِ سیاب بقرار "زخمی شمشیرِ ذوقِ جستجو" اور مہرِ طرح تیغِ آرزو ہے۔ ان کے نزدیک زندگی اضطراب کا نام ہے "زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے" وہ مشائخِ نظریہ حیات کو پسند نہیں کرتے، غوپنہار کے فلسفہ یاس و قنوط کے مخالف ہیں۔ اور اسلامی فلسفہ حیات کے حامل ہیں۔

یاس کے عنصر سے آزاد میرا روزگار فتحِ کامل کی خبر دیتا ہر جوشِ کارزار  
اپنے فلسفیانہ تخیلات میں بھی وہ صرف اسلامی فلسفہ ہی کو حقیقی اور فطری خیال کرتے ہیں اور یونان کے حکماء کے گوسفندانہ خیالات اور یورپ کے دیگر فلسفہ دان مثلاً برگسان اور نیٹشے کے حقیقتِ ناآشنا نظریات کو باطل جانتے ہیں۔ یہ ان کے علو خیال اور اسلامی فلسفہ سے دلچسپی کی بین دلیل ہے جس میں ابہتجاج و مسرت اور اُمید و رجائیت کے ہمت افزا تخیلات ہر جگہ نمایاں ہیں۔  
جدید اثرات | اردو شاعری میں تجدید و روایت کے ساتھ ساتھ جو تغیرات رونما ہوئے اقبال کی شاعری ان خصوصیات کو عجیب و غریب دلکش پیرایہ میں پیش کرتی ہے۔ اقبال کی شاعری اپنے عہد کے معاشرتی، تمدنی اور مذہبی حالات کی آئینہ دار ہے۔ نقد ادب کے جدید اصول کے مطابق ان کی شاعری

درحقیقت "تنقید حیات" ہے۔ اس وصف کی اردو شاعری میں بہت کمی ہے۔ کیونکہ وہ ایک عرصہ تک "سرشتہ خمارِ رسوم و قیود" رہ چکی ہے۔ اسی سبب سے اس میں مختلف ازمینہ کے معاشرتی مسائل نمایاں طور پر ظاہر نہیں ہونے پائے۔ جن سے شاعری کے جذبات کی صداقت پر کافی روشنی پڑے۔ اقبال کے عہد میں سیاسی تحریکات، معاشرتی اصلاحات، قومیت کی ترقی، مذہبیت کا تنزل، مادیت و مغربیت کا عروج، ملکی اقتصاد کی انتشار رساوات و آزادی کا زور، افادیت و حریت کا شعور، اسلامی دنیا کے زوال پذیر واقعات اور دروانِ گیز حالات اور اسی نوع کے دیگر اثرات نے ان کو بالآخر ایک سچا قومی اور اسلامی شعور بنادیا۔

بچوں سادگی کے متعلق سادگی اور صداقت اظہار کے باعث جو روانیت کا خاص امتیاز ہے اقبال ایک غلط فہمی کا ازالہ کی شاعری سرایہ ناز ہے۔ اور یہ وصف جو اردو شاعری کے دکنی یا ابتدائی دور میں جلوہ گر ہے۔ عہدِ حاضر کے شعراء کے کلام میں بھی مفقود نہیں۔ دراصل سادگی ایک فطری شے ہے جو تکلیف سہی و کاوش اور آوردہ سے کوسوں دور ہے۔ ورنہ تکلف اور نظری سادگی جو باہم متضاد ہیں مترادف قرار پائینگے۔ یہ امر بھی ناقدین کی حقیقت شناس نگاہوں سے پوشیدہ نہیں کہ عصرِ حاضر کے کچھ نام نہاد شعراء، انگریزی ادب کی غلط اور کورانہ تقلید کی وجہ سے غیر شاعرانہ مضامین کو ٹھٹھ دیہاتی الفاظ میں ادا کر کے جدید شاعری کے علمبردار بنتا چاہتے ہیں لیکن نتیجہ معلوم؛ چونکہ یہ ایک دلچسپ موضوع ہے جس کے لیے ایک بسوطِ مضمون کی ضرورت ہے اس لیے پھر بھی اس پر ماضی و حال کی شاعرانہ خصوصیات نمایاں کر کے شرح و بسط کے ساتھ بحث کی جائیگی۔

رومانیت کی تجدید دراصل قدیم سادگی کی تجدید ہے۔ یورپ میں بحلاف جرمنی اور انگریزی ادیبوں کے فرانسیسی ادیبوں کا یہ خیال تھا کہ تجدید رومانیت دراصل قدرت کے

وسیع میدان کی طرف ترغیب کے مراد ہے۔ اس اعتبار سے اردو شاعری میں اس تحریک کے مجددین دراصل نظیر اکبر آبادی ہیں لیکن انوس ! ان کی بے نظیر نظمیں نچرل سادگی اور ترجمانی قدرت کے باوجود ماحول کی ناموفقت کے باعث قدر کی نگاہوں سے نہ دیکھی گئیں اور اپنی ندر و منزلت کے لیے نوابی عہد کے اختتام اور دور جدید اور خصوصاً انگریزی شاعری کی آمد کی منتظر ہیں۔ اقبال بھی قدرتی شاعری میں اپنی نظموں کو نظرت سے ہم آہنگ کرنا چاہتے ہیں۔ شاعر کا قیاز اس میں شک نہیں کہ تیر کے رنگ تغزل اور سوز و گداز۔ داغ کی سادگی اور اکبر کی ظرافت کی طرح ہر شاعر کا ایک فطری رنگ ہوتا ہے۔ چنانچہ اقبال کے کلام کی یہ قیاز خصوصیت اسلامی تعلیم کی ترجمانی میں فلسفہ کی فراوانی ہے۔ یہ فلسفیت ان کے کلام میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ اور کسی خاص صنف سخن کی پابند نہیں۔ اس لحاظ سے ان کے اشعار شیملی (Shelly) کے نظریہ شعر کے مطابق ”متخیلہ کے انکشافات“ ہیں جن میں فلسفیانہ سرستی ہر جگہ جلوہ گر ہے۔

اثر جدید اور ترک غزل گوئی | دور جدید کی دیگر خصوصیات کے ساتھ اقبال نے بھی غزل کے پامال و فرسودہ میدان کو ترک کیا لیکن غزلوں کا جس قدر ذخیرہ بھی موجود ہے وہ فلسفیانہ تخیلات جدید تراکیب و تشبیہات اور نشست الفاظ کے باعث غالب کی یاد کو تازہ کرتا ہے۔ بعض غزلوں میں داغ کی سادگی صاف جھلکتی ہے جو دل غ کے ساتھ ایک فقرے سے سلسلہ تلمذ کا پتہ دیتی ہے لیکن یہ نسبت داغ کے غالب کا اثر زیادہ نمایاں ہے۔ ان کی غزلوں میں بھی معنی آفرینی، جدت طرز، اور رنگیں بیانی ان کو عصر جدید کے دیگر شعرا سے ممتاز کر دیتی ہے۔ اعلیٰ مضامین کے ظہار میں غالب کی طرح ان کی غزلیں جس طرح ترنم ریز ہیں اُسی طرح جذبات سے لبریز ہیں۔ کارلائل (Carlyle) کے نظریہ شعر کے مطابق ان کے کلام میں موسیقی



اور شاعری دوش بدوش ہیں۔ ان کی مختصر غزلیں بھی حسن و حقیقت کی تفسیر اور حیاتِ انسانی کی تنقید ہیں۔ چند شعرا ملاحظہ ہوں کیونکہ اس مختصر مضمون میں شرح و بسط سے تنقید کی گنجائش نہیں ہے۔

نہ کہیں جہاں ہیں اماں ملی جہاں ملی تو کہاں ملی  
مرے جرمِ فائدہ خراب کو ترے عفوِ بندہ واز میں  
نہ رہِ عشق میں ہیں گرمیاں وہ حسن میں ہیں شہیاں  
نہ وہ غزوی میں ترپے ہی نہ وہ خم پر زلفِ یاز میں

عشق پر فرمودہ قاصد کو سبک گامِ عمل  
عقل سمجھی ہی نہیں معنی پیغام ابھی  
کھولی ہیں ذوقِ دید لے آنکھیں تھی اگر  
ہر رنگہ میں نقشِ کفِ پائے یار دیکھ  
نظارہ کو یہ جنبشِ مژگاں بھی بارہر  
زگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی  
کشادہ دستِ کرم جب وہ بے نیاز کرو  
نیاز مند نہ کیوں مابجری پہ ناز کرو  
نائل تو تھا ان کو آنے میں تھیں  
مگر یہ بنا طرزِ انکار کیا تھی؟

گوارہ سخن کی اس جدید جنبش کے ساتھ ساتھ اقبال نے بھی غزلیں کو ترک کیا اور قدرتی، اخلاقی، تاریخی، معشرتی، قومی اور ملی نظموں کی طرف توجہ کی، اور سدس اور دشمنی وغیرہ کے دامن کو اپنے فکر و تخیل کے گہرائی سے آبدار سے زیرِ بحث بنائی کیونکہ انہی اصنافِ سخن میں مسلسل مضامین باسانی نظم ہو سکتے تھے۔ اور وہ اپنے پیغامِ زمیں کو دنیا کے سامنے شرح و بسط کے ساتھ پیش کر سکتے تھے۔ جدید طرزِ سخن کے علمبردار ہونے کے باوجود انہوں نے انگریزی شاعری کی کورانہ تنقید نہیں کی اور روایتِ وقافیہ وغیرہ کو خیر باد کہہ کر صرف پیش پا افتاد مضامین کو نظم کر کے اپنے کلام کو بازیچہٴ اطفال نہیں بنایا بلکہ مشرق کے وقار و وقعت، مذہب اور فلسفیت کو قائم رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی انفرادیت "مغربیت" کی نظر قریب گھاؤں میں بھی

جدید اثرات اور  
کلام کی خصوصیت

برق کی طرح چمکتی ہے جس پر امیر مرحوم کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

گمٹا میں برق جو چمکی تو یاد آئی امیر ادا کسی کی وہ پردہ اٹھا کے آنے کی

بلاد اسلامیہ کی پُرانی عظمت و شان، مغرب کے سفر اور یورپ کے مختصر قیام نے شاعر کے دماغ کو ایک بڑی حد تک متاثر کیا۔ ایک طرف تو وطن کے دیوتاؤں کی پرستش کے بجائے اسلامی اتحاد و مرکزیت کے پرستار اور جذبہ ملی کے ترجمان بن گئے۔ اور یورپ کے سطحی فلسفیانہ نظریات، تہذیب تمدن کے ناگفتہ بہ حالات اور اقتصادی و سیاسی ہیجان و انتشار دیکھ کر ”مغربیت“ سے متنفر ہو گئے۔ دوسری جانب اسلام کی ہمہ گیری اور جامعیت نے ان کے قلب پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ ایران کی صوفیانہ شاعری نے جو جرہی میں ان کے مقالہ کا خاص موضوع تھی ان کے مذاق تصوف کو عروج پر پہنچا دیا۔ درحقیقت اقبال کی فلسفیانہ سرستیوں کا راز ایک بڑی حد تک انہی ایرانی میخانوں کی سیر میں پنہاں ہے۔ جہاں ہزاروں سرخوش پڑے جھوم رہے ہیں۔ جن میں مولانا رومؒ کا اسم گرامی خاص اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ انہی کے مقدس کلام نے نکات تصوف، اسرار خودی اور رموز بے خودی سے اقبال کے شوق آگیاں قلب کو مالا مال کیا جن کو اقبال کی صوفیانہ شاعری پر تفصیلی تنقید کرتے وقت دوسرے مضمون میں وضاحت و تحقیق کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس وقت اقبال کے مغربی تاثرات کا ذکر کرنا مقصود ہے۔

(۲) انہی تاثرات کے باعث انہوں نے انگریزی شاعری کے طرز جدید، پچھلے مضامین کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔ مثال کے طور پر ان کی نظموں کے چند عنوانات لکھے جاتے ہیں جن میں اس قسم کے مضامین بھی ہیں۔ کنار راوی، ہمالہ، کوہسار، ایک شام، موثر گل رنگیں، پرندے کی فریاد۔ وغیرہم۔ انہوں نے کنگھی، چوٹی اور زلف دکا کل کے مضامین اور دیگر لفظی تصنیفات سے اپنے کلام کو محفوظ رکھا۔

(۳) انگریزی طریقہ پر پچھلے مضامین کے انتخاب ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ انگریزی نظموں کے ترجمے بھی کیے۔ بطور نمونہ چند کے نام ذیل میں درج ہیں۔

ایک پہاڑ اور گلہری .. ماخوذ از ایمرسن (Emerson)

ہمدردی .. کوپر (Cooper)

خصیت بزمِ جہاں .. ایمرسن (Emerson)

عشق اور موت .. ٹینیسن (Tennyson)

پیامِ صبح .. لانگ فیلو (H. W. Longfellow)

(۴) اپنی فارسی مثنویوں یا اردو کی چند نظموں میں جو فلسفہ مغرب کے جواب یا استرداد میں لکھی گئی ہیں (مثلاً ان کی مثنوی "پیامِ مشرق" جرمن شاعر گیٹے کے جواب میں لکھی گئی ہے) اسلامی فلسفہ کی عظمت اور یورپ کے سطحی تخیل سے نفرت کے جذبات کو عجیب و غریب انداز میں ادا کیا ہے۔ تطویل مضمون کے خیال پر اشارہ نقل نہیں کیے گئے۔ کیونکہ اس موضوع پر بھی ایک جدا مضمون شائع کرنے کی ضرورت ہے۔

قدرتِ شاعری | اقبال اپنی نظموں میں انگریزی طرز پر نئی تخیلی ترکیب اور اسی نوع کی تشبیہات اور استعارات بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً قربِ فراق آمیز۔ دائۂ خرمین نما۔ انجمن بے خروش نظارۂ خاموش۔ ہنگامہ خاموش وغیرہ۔ ان نئی ترکیب کے ساتھ رنگینی تخیل بھی انگلستان کے کسی رومانی شاعر سے خواہ وہ شیلی (Shelley) ہو یا ورڈس ور تھ (Wordsworth) کم دلکش نہیں ہے۔

چاندنی بھکی ہو اس نظارۂ خاموشی صبح صادق سوہی ہر رات کے آغوش میں  
چاندنی کو پھیکا بتلانا، صبح کو رات کے آغوش میں جگہ دینا اور محرکِ عارضِ رنگیں دکھانا کمالی



کے سینہ زیریں کو کھولنا، وردس ور تھ کی قدرتی شاعری کی یاد تازہ کرتا ہے۔ بلکہ بعض مقامات پر و اقبال کا کلام علو تخیل اور رنگینی کے ساتھ فلسفہ کی آمیزش کے باعث اتنا بلند و ارفع ہو گیا ہے کہ وردس ور تھ یا کسی دوسرے انگریزی شاعر کے مرغ فکر کی پرواز سے ماورا ہے۔ یہ اقبال ہی کا کمال ہے کہ باوجودیکہ انگریزی رومانی طرز کو اختیار کیا، لیکن نہ انگریزی شعراء (مثلاً کیٹس (Keats) یا اردو میں اُن کے کورائے مقلدین کی سی عربی مضامین ان کے یہاں پائی جاتی ہے۔ اور نہ نا، نوس الفاظ۔ مثال کے طور پر صرف دو نظموں کے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔

ایک شام	نظرت بیہوش ہو گئی ہے	آغوش میں شب کے سو گئی ہے
	کچھ ایسا سکوت کافسوں ہے	پیکر کا خرام بھی سکوں ہے
تنہائی	یہ چاند یہ دشت و در یہ کہسار	نظرت ہے عام نستر نزار
	رفعت آسمان حساموش	خوابیدہ زمیں جہان حساموش
	موتی خوش رنگ پیائے پیائے	یعنی ترے آنسوؤں کے تارے
	کس شے کی تجھے ہوس ہوئے دل	قدرت تری ہم نفس ہوئے دل

طرزِ ادا کی سادگی، تشبیہات کی ندرت، استعارات کی جدت، رنگینی تخیل اور روایت کس درجہ ان اشعار سے ظاہر و باہر ہے۔ عدا وہ بریں ان سے حقیقت بھی برگشتہ حجاب ہو جاتی ہے کہ اقبال اپنی قدرتی شاعری میں بھی کوہ و دریا کے خوشنما مناظر اور دشت و صحرا کے جاذبِ نظر مناظر کو ایک عامی کی طرح سطحی نگاہوں سے مشاہدہ نہیں کرتے اور انگریزی شعراء یا اردو میں ان کے کورائے مقلدین کی طرح صرف ظاہری حسن و خوبی کے فرسودہ بیان پر اکتفا نہیں کرتے۔ اقبال کی شاعرانہ نگاہ میں ایک خاص عمن اور گہرائی ہے۔ جو ان کی حقیقت کی

کاپتہ دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا تخیل درڈس ورثہ (Worth) یا انگلستان کے دوسرے قدرتی شاعروں کے خیالات سے زیادہ نازک اور حقیقت سے ہلکا معلوم ہوتا ہے۔ مظاہر و آثار کی خوشنائیوں کو سبق آموز حقیقت بنا کر انسان کو توحید کا نظریہ درس دینا قرآن کریم کا خاص طریقہ تعلیم ہے جس کو اقبال نے جا بجا اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔

تردید سرمایہ داری (۶) اقبال نے عصر جدید کی دیگر تحریکات کے ساتھ وطنیت کی بنیاد پر سرمایہ داری کی فسونکاری کے خلاف بھی صدائے احتجاج بلند کی۔ یورپ کی سرمایہ داری اور قومیت کی مسموم نضد دیکھ کر یہ نقوش در نمایاں ہو گئے۔ سرمایہ داری کے ہلکے اثرات مشاہدہ کر کے مزدور کو یاد کرتے ہیں مغربی تہذیب و تمدن و اقتصاد و سیاست کو ہمدردی و ایثار اور باہمی محبت و ہمدردی کے فقدان کے باعث بنی نوع انسان کے لیے ہلکے و مضر خیال کرتے ہیں بلکہ ہوسناکی سے تعبیر کرتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں۔

تدبر کی فسونکاری سے محکم ہو نہیں سکتا جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہو  
وہ حکمت، ذہانت، جس پر خردمندان مغرب کو ہوس کے پنجہ بخونی میں تیغ کار زاری ہو

حذری اور وطنیت اپنے خیالات کی پختہ کاری کے بعد اپنی شاعری کے آخری دور میں وطن کو دشمن سمجھتے ہیں جس کی پرستش کو ناجائز قرار دیتے ہیں اور اپنی ملت کو جغرافیائی حدود میں محصور نہیں دیکھنا چاہتے۔ نہیں تو رسولِ اتمی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی ترکیب قوم پسند ہے۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر خاص ہر ترکیب میں قوم رسولِ ہاشمی  
ان کی جمعیت کا ہر ایک نسب پر انحصار قوتِ مذہب کو مستحکم ہے جمعیت تری  
پھر سیاست چھوڑ کر اصل حصارِ دیں میں ملکِ دولت ہو فقط حفظِ حرم کے واسطے  
تو بانیِ رعبے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

تہذیب حاضر اکبر آبادی کی طرح تہذیب حاضر اور تمدن مغرب کی نظر فریب نصا کے مہلک اثرات سے متنبہ کرتے ہیں۔ اور حاجی اسلامی طرز و طریقہ کی ترغیب دیتے ہیں، بلکہ انہیں وثوق یقین ہے کہ مستقبل قریب میں ہی اسلامی طریقہ مقبول خاص عام ہوگا۔

تہذیب مغرب

نظر کو خیرہ کرتی ہر چمک تہذیب حاضر کی یہ صنائی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے  
تمہاری تہذیب پھر خنجرِ آپ ہی خود کشی کرے گی جوشلخ نازک پہ آشیانہ بیگا ناپائیدار ہوگا  
حیات تازہ اپنے ساتھ لائی بدتمیز کیا کیا رقابت، خوفزدہی، ناشکیبائی ہوسنا کی  
ملت کے لیے صرف ایک سلام اس کی جامعیت اور ہمہ گیری جس کمال سے ہم آغوش ہے  
ہی طریقہ کا میابی ہے وہ انسانی فکر کو تحمل کا نتیجہ ہونے سے وراء الورا ہے۔ اسی سبب

سے اس کے اصول ہر ملک و قوم ہر جگہ اور ہر ماحول میں کاشیاپ رہتے ہیں۔ انہی اصول  
میں امن و صلح، مساوات و اخوت، اور اتفاق و اتحاد کا راز مضمر ہے۔ چنانچہ اقبال اہل  
ملت کی معاشرتی، سیاسی، تمدنی، اقتصادی، دنیوی، اور اخروی فلاح صرف اسلام ہی  
کے زیر اصول پر منحصر خیال کرتے ہیں۔

دراست، پادشاہی، علم اشیا کی جنگلی ری یہ سب کیا ہیں فقط ایک نقطہ ایمان کی تفسیر  
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے اسلام ترا میں ہے تو مصطفوی ہے  
صدقت جذبات اور یقین و توکل کا یہ عالم ہے کہ اہل ملک کی موجودہ غفلت شیاری  
اسے قطعاً مایوس نہیں ہوتے بلکہ اسلام کے زیر اصول اور توحید و رسالت کے سچے عقائد  
کو دنیا میں ہر جگہ جلوہ گر دیکھنے کا یقین کامل رکھتے ہیں۔

شب گریزں ہوگی آخر جلوہ خورشید کی یہ چین معمور ہوگا نغمہ توحید سے (باقی)



## تَلَخِیصُ تَنْجَمَا

### عربی تہذیب کی فضیلت تہذیب جدید پر

(۲)

فاطمین کی حکومت کا نمایاں امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے سنگ تراشی اور خصوصاً ان فی مجسموں کے بنانے پر کچھ زیادہ تشدد کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ اس معاملہ میں اغماض و تسامح سے کام لیا، ایک وزیر نے تو یہاں تک جرات کی کہ اس نے اپنے محل کی دیواروں پر ایک رفاصلہ لڑکی کا مجسمہ بنوایا۔ یورپ کے عجائب خانے فاطمی آثار سے بھرے ہوئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو فن سنگ تراشی اور نقش نگاری سے کس درجہ مجبھی تھی اس شوق نے بنو فاطمہ کے مذہبی تعصب و تقشف کو بہت ہلکا کر دیا اور یہ عیش و عشرت کی طرف زیادہ مائل ہو گئے۔ اس میں شبہ نہیں ان خلفاء کے محلات عجیب و غریب فنی نمونوں سے پر تھے اور اس حکومت کے آخری خلیفہ مستنصر کے محل کے جو فنی نمونے ترکی لشکر کے ہاتھ لگے اور جو یورپ کے عجائب خانوں میں محفوظ ہیں، ان سے فاطمیین کی مادی اور فنی ثروت پر روشنی پڑتی ہے۔

ترکی لشکر نے خلیفہ کے محل کی تمام قیمتی چیزوں پر جن میں ایک سو کیلو گرام کے وزن کے قیمتی پتھر، شیشے، اور سونے کے برتن، سونے، چاندی اور ہاتھی دانت کے سامان شامل تھے قبضہ کر لیا۔ ان کے علاوہ ایک خاص تکیہ تھا جس میں سونا بھرا ہوا تھا، اور جس پر خلیفہ سر رکھ کر سوتا تھا، وہ بھی اس فوج نے ہتیاں اور بعد میں فروخت کر دیا۔ اور وہ تمام قیمتی تحفے

جو دنیٰ و دنیا سلطین روم کی طرف سے خلفاء کو ملتے رہتے تھے۔ ان پر قبضہ کر کے آپس میں تقسیم کر لیا۔ ان کے علاوہ خلفاء کے محلات سے جو نادر چیزیں برآمد ہوئیں، ان میں شیار ذیل خصوصیت کے ساتھ ذکر کے قابل ہیں۔ فولادی آئینے، شطرنج کی بساط جو ریشم سے دھکی ہوئی ہوتی تھی اور جس پر سونے کا کام ہو رہا تھا، شطرنج کے ہرے جو سونے چاندی، اکتھی دانت اور انبوس کے بنے ہوئے تھے، زرگس اور پارہ کے پھول، جو مصنوعی طور پر خالص سونے اوریش قیمت جو اہرات کے ٹکڑوں سے جوڑ کر بنائے تھے، ان سب سے زیادہ قیمتی خلیفہ کا عمامہ تھا جس میں آٹھ کلو گرام کے وزن کے قیمتی جواہرات لگے ہوئے تھے۔

خلیفہ کے محل میں ایک مور بھی تھا جو خالص سونے سے بنایا گیا تھا۔ اور اس کی آنکھیں نہایت صاف و شفاف یا قوت کی، اور اس کے پر مختلف جواہرات کے تھے۔ اس مصنوعی طاؤس کی طرح محل میں ایک ہرن بھی تھا جو خالص سونے کا بنا ہوا تھا، اور جس کی گردن بیش قیمت موتیوں کے ہاروں سے چھپی ہوئی تھی۔ اسی نوع کا ایک درخت تھا جو زر خالص سے بنایا گیا تھا اور جس کی شنیان قیمتی جواہرات کی تھیں۔ خاص خلیفہ کی تفریح کے لیے اڑتیش کشتیاں تھیں جن کو وہ دریائے نیل میں تفریحاً استعمال کرتا تھا، محل کا سب سے بڑا کمرہ نہایت آراستہ تھا اس میں ایرانی بیش قیمت قالین بچھے ہوئے تھے و عجیب بات یہ ہے کہ ان قالینوں پر دنیا کا جغرافیہ لی نقشہ بنا ہوا تھا۔ اس کمرہ کی دیواروں پر نہایت بیش قیمت ریشمین پردے لٹک رہے تھے جن پر سینے کی نسبت کاری کے ذریعہ ایک باغ بنا ہوا تھا، اور اس میں کئی ہاتھی دکھائے گئے تھے۔

فاتح شکر نے محلات کی ان قیمتی اور نادرہ روزگار چیزوں کو ہی نہیں لوٹا بلکہ خلفاء کے عجائب خانوں میں جو تاریخی یادگاریں محفوظ تھیں، ان کو بھی برباد کر دیا۔ ان تاریخی یادگاروں میں

حضرت امام حسینؑ، و حضرت امیر حمزہ کی زریں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تلوار جس کو ذوالفقار کہا جاتا ہے، خاص طور پر لائق ذکر ہیں، اور ان خلیفہ کے لیے ایک خاص قسم کا ریشمی خیمہ بھی تھا جس پر سونے کا کام ہو رہا تھا، اس کی قیمت تیس ہزار دینار بتائی جاتی ہے۔ خیمہ جب قائم کیا جاتا تھا تو زمین پر سے ۶۵ فٹ اونچی ہوتا تھا، اور وہ سو ڈنٹوں پر لاداجاتا تھا۔

مصر بنو فاطمہ کے زمانہ میں فاطمیوں نے اجتماعی زندگی کے مادی رُخ پر ہی زیادہ زور نہیں دیا۔ بکوٹھی معیار کے بلند کرنے میں بھی انہوں نے شاندار کوششیں کیں، چنانچہ خلیفہ الحاکم بامر اللہ نے شہر میں شہر قاہرہ میں ایک دارالعلوم کی بنیاد رکھی تاکہ علماء امامیہ نے جو کچھ لکھتے تھے اس کا درس دیا جائے۔ اس فرقہ کی کتابوں کے علاوہ دارالعلوم میں علم کلام، عروص، قانون، طب، اور فنکیات کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ دارالعلوم کے کام میں مدد دینے کے لیے الحاکم بامر اللہ نے قاہرہ میں ایک شاندار کتب خانہ بھی قائم کیا تھا جس میں دنیا بھر کی نادر تصنیفات جمع تھیں۔ مصر کے طلباء کے لیے یہ کتب خانہ کعبہ کا حکم رکھتا تھا۔ اور دوسرے اسلامی ممالک کے طلبہ بھی یہاں آکر استفادہ کرتے تھے۔ خلیفہ مدرسہ کے اساتذہ کو اپنے محل میں بلا کر بھی ان سے مذاکرہ علمیہ کرتا تھا، اور جب یہ لوگ یہاں سے واپس جاتے تھے تو ان کے دامن شاندار عطیات سے پُر ہوتے تھے۔

فاطمی خلیفہ نے مصر کا مقام تمام اسلامی شہروں میں اتنا اونچا کر دیا تھا کہ بحر متوسط میں اس کا بیڑی سب سے ممتاز در نمایاں تھا۔ ابن طولون کا بحری بیڑہ موکشتیوں پر مشتمل تھا۔ لیکن بڑھتے بڑھتے یہی اتنا بڑھ گیا کہ مغرب کے زمانہ میں اس میں چھ سو بڑی بڑی کشتیاں شامل تھیں جو سمندروں میں بے خوف و خطر چلتی، شہروں کا کھوج لگاتی اور مشرق کی تجارت کو مغرب کی طرف منتقل کرتی تھیں۔ اس دربر دست بحری بیڑے کی وجہ سے ہی خلیفہ مصر کو



بحر روم میں خلیفہ قرطبہ (اندلس) کے ساتھ جنگ کرنے کا حوصلہ ہوا۔ عہد سلطنت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اُس نے مذہب و ملت کی تفریق کے بغیر تمام رعایا کے ساتھ یکساں سلوک کیا، یہاں تک کہ سرکاری عہدے اور منصب بھی غیر مسلموں کو نیا صنی کے ساتھ دیے جاتے تھے۔ چنانچہ اُس کا وزیر ایک یہودی تھا۔ اس نے روم، ایران، اور قبط کے ارباب فن کو اپنے دربار میں جمع کر لیا تھا جس کی وجہ سے مسلموں اور غیر مسلموں میں دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ اس میں شک نہیں فاطمی خلفاء کی اس غیر معمولی ترقی نے یورپ کی اجتماعی زندگی کو بہت زیادہ متاثر کیا، اور یہ کیونکر نہ ہوتا جبکہ اسلامی تجارتی بیڑوں کی مدد سے اسلامی ممالک کی خاص خاص مصنوعات یورپ پہنچ رہی تھیں۔ کیونکہ تجارتی تعلقات تمدن کے سب سے قوی دواعی میں سے ہیں۔

عرب کو جو اقتدار بحر متوسط میں حاصل تھا، اُس نے صرت اس کے ساحلوں کو ہی متاثر نہیں کیا، بلکہ جو بڑے بڑے اہم جزیرے اس میں واقع تھے وہ بھی عربوں کے اقتدار سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ نویں صدی سے گیارہویں صدی تک تقریباً دو سو برس تک جزیرہ مالٹا پر عربوں کے اقتدار کا پرچم لہراتا رہا، اور اب بھی مالٹا کی زبان کا بحریہ کہنا جائے تو اس میں عربی زبان کے الفاظ کثرت سے ملینگے۔ اسی طرح جزیرہ سارڈینیا اور جزیرہ کورسیکا پر دسویں صدی کے اواخر تک عربوں کا اقتدار رہا۔ کورسیکا کے محلات اور دوسری عمارتوں میں بھی اندلسی فن تعمیر کی خصوصیات بہت نمایاں ہیں۔

عربوں نے اپنے علوم و فنون سے یورپ کی دنیا کو مسلسل دو صدیوں یعنی دسویں اور گیارہویں صدی تک سیراب کیا۔ یہاں تک کہ فرانس کا پاپا سیفسترن ثانی اپنی تعلیم میں سرسبز عرب اساتذہ کا اور اسلامی تصنیفات کا مرمون احسان تھا۔ کورسیکا کے بادشاہوں نے بھی اپنے محلات

کے دروازے مسلمانوں کے لیے کھول رکھے تھے۔ تاکہ وہ اسلامی علوم و فنون سے بہرہ اندوز ہو سکیں۔ تاریخ کا یہ ناقابل انکار واقعہ ہے کہ روجر ثانی نے ادیبی کو جو عرب علماء میں بہت وسیع شہرت کا مالک تھا، اپنے یہاں بلوایا اور اس کی تعظیم و تکریم کا حق اس طرح ادا کیا کہ اُسے اپنے ذاتی محل میں ٹھہرا۔ سسلی میں عربی کچھر [فریڈرک ثانی جس طرح سیاسی اعتبار سے سسلی کا عظیم ترین بادشاہ سمجھا جاتا ہے] اسی طرح اُسے علم و فن کی ہمارت میں بھی اہل سسلی سے نمایاں امتیاز حاصل ہے لیکن یہ واضح رہنا چاہیے کہ اُس کا یہ علمی تجربہ محض علوم عربیہ اور فلسفہ اسلام کے عمیق مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ فریڈرک کو اسلامی و عربی علوم سے اس درجہ شغف تھا کہ اس کے اہل ملک اُسے مسیحیت سے مرتد ہو کر اسلام کا حلقہ گروٹ سمجھنے لگے۔ یہی وجہ تھی کہ جب فریڈرک صلیبی لڑائیوں میں عیسائیوں کی مدد کے لیے بیت المقدس گیا تو اُس نے وہاں پہنچ کر خونریزی نہیں کی بلکہ سلطان صلاح الدین کے بھتیجے کے ساتھ دوستی کا عہد و پیمان کر لیا، ورنہ بیت المقدس میں جو بڑے بڑے مسلمان علماء تھے وہ ان کو اپنے حلقہ احباب میں شامل کر لیا۔

شہنشاہ فریڈرک کو اسلامی علوم و فنون اور عربی زبان و ادب کے ساتھ جو قہمی لگاؤ تھا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یہ عربی زبان نہایت اچھی بولتا تھا، اور سوائے اس کے کسی اور زبان میں گفتگو ہی نہیں کرتا تھا، لباس بھی عربی پہنتا تھا، اور اپنی ملکی و قومی عادات کو ترک کر کے عربوں کے ہی اطوار و خصائل کو اختیار کر لیا تھا۔ اُس نے مشہور عربی فلاسفر ابن سینا کو عربی زبان میں کئی طویل خطوط بھی لکھے ہیں جن میں اُس کے متعدد مابعد الطبیعیاتی افکار و رائے پر مناقشہ کیا ہے۔ اس نے اپنے ذوق کی تکمیل کے لیے کئی میں نیپلز کی یونیورسٹی قائم کی، تاکہ علوم غریبہ کے چشمہ کا کام دے۔ اس کا ایک اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ اُس نے میکائیل سکوت نامی ایک عام کوئلیٹل س غرض سے روانہ کیا کہ وہ ارسطو کی کتابوں پر ابن رشد کے

لکھے ہوئے حواشی کو اطالوی زبان میں منتقل کر کے لائے خود اپنی یونیورسٹی کے علاوہ وہ سیلار نو اور اور بولونا کی یونیورسٹیوں کو بھی جن میں عربی طبی علوم پڑھائے جاتے تھے بھاری رقم سے مدد دیتا تھا غرض یہ ہے کہ اس طرح عربی کلچر تمام یورپین شہروں میں پھیل گیا، اور علوم عربیہ نے یورپ کی سب یونیورسٹیوں پر اپنا قبضہ جمالیا۔ ایک طرف اسلامی علوم یورپ پر اپنا نفوذ و اقتدار قائم کر رہے تھے، دوسری جانب ریشم اور شیشہ کی مصنوعات اسلامی تجارت کی رہ سے اطالوی شہروں کے تمام بازاروں میں رائج ہو گئیں۔ کوئی اطالوی بندرگاہ ایسی نہیں تھی جہاں ایک مخصوص کاروانسرے عرب تاجروں اور اسلامی شہروں سے آنے والوں سے پڑتا ہو۔ عربی کلچر کا اثر اب بھی ان فرانسیسی علاقوں میں دکھایا جاسکتا ہے جو اسپین کے پڑوس میں واقع ہیں، یہ صحیح ہے کہ شارل مارٹل عربوں کو پرنیز کے پہاڑوں سے آگے بڑھنے سے روکنے میں کامیاب ہو گیا، لیکن وہ عربی کلچر کے اثر و نفوذ کو فرانسیسی شہروں میں داخل ہونے سے باز نہیں رکھ سکا۔ انتہی پر کہ ان علاقوں کے گاؤں اور گیتوں میں اب تک عربی کے پڑنے اچان کی آمیزش پائی جاتی ہے اس بحث کو ہمیں ختم کر دینا بغیر اس کے کہ اندلس کے عہد زریں کی نسبت کوئی کلمہ کہا جائے ناممکن ہے۔ اندلس کا عہد زریں اپنی چند در چند خصوصیات کے باعث بغداد کے عہد سے بھی زیادہ نمایاں ہے۔ پہلی خصوصیت یہ ہے کہ بغداد کے دور علمی و تمدنی کا حلقہ اتنا وسیع نہیں تھا جتنا کہ اندلس کے عہد زریں کا ہے۔ پھر فنی اعتبار سے بھی اندلس کو بغداد پر فوقیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ بغداد میں عربی عنصر کے زیادہ طاقتور اور درجہ اول کا تھا، اس کے برخلاف اندلس میں اس عنصر کو ثانوی درجہ حاصل تھا، کیونکہ یہاں کا تمدن مختلف قوموں کی آمیزش سے مخلوط تھا، یہ عجیب بات ہے کہ شام میں بنی امیہ نے علم و فلسفہ کی طرف اتنا اعتنا نہیں کیا جتنا ان کے اخلاف نے اندلس میں کیا، اور اعتنا بھی کیا،



پہلے پہل کے اباس میں کریک قوی سب پر۔

علم اور فلسفہ کو انتہائی ذرہ کمال تک پہنچا کر ایک ترقی یافتہ تہذیب و تمدن کی اساس قائم کر دی  
فلسفہ ارسطو اور ابن رشد کے عہدوں میں پندرہ صدی کا فاصلہ ہے۔ اور اس لیے ہم یہ  
اور یورپ | کہہ سکتے ہیں کہ ارسطو کے فلسفہ نے ایتھنز سے چل کر اندلس تک پہنچنے میں بڑی  
طویل مدت لے لی۔ لیکن ہمارا یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ اس طویل درمیانی مدت میں فلسفہ ارسطو کو  
ایسے ایسے دشوار گزار رستوں سے گزرنا پڑا ہے کہ اگر مسلمان اُس کی دستگیری نہ کرتے تو وہ کبھی  
کا ختم ہو چکا ہوتا۔ یہ معلوم ہے کہ یونانی فلسفہ یونانی منطق کے بغیر سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ لیکن رومانی شہنشاہ  
سے باکثیر باکی طرف منطق کو منتقل کرے گا سہرا عربی زبان کے ہی سرے۔ یہ عربی زبان سی  
ہے جس کی بدولت بلا و غرب میں علم کی آگ بجھ جانے کے بعد پھر دوبارہ مشتعل ہو گئی اس طرح  
گویا ارسطو کے فلسفہ نے تین رنگ قبول کیے ہیں۔ پہلا رنگ یونانی تھا، پھر سبھی ہوا، اور آخر میں  
اسلامی رنگ سے رنگین ہو، اس میں شبہ نہیں فلسفہ رسطو سریانی اور لاطینی زبانوں میں بھی  
مدون ہو چکا ہے لیکن یہ کہنا خاص اہم بالغہ ہے کہ ان زبانوں میں مدون ہو کر ارسطو کا فلسفہ محض  
فلسفہ ارسطو نہیں رہ سکا، بلکہ اُس میں مصر، یونان، اور ہندوستان کے فلسفیانہ معتقدات بھی  
ہست کچھ دخل پا گئے۔ یہ فخر صرف عربی زبان کو حاصل ہے کہ وہ فلسفہ ارسطو کو جوں کا توں  
محفوظ رکھنے میں کامیاب ہوئی۔ اور پھر اُس نے اُس کو پورے اخلاص و دیانت کے ساتھ  
یورپ کی طرف منتقل کر دیا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عربی زبان اپنے وسیع شریح کے ساتھ اپنے اندر گونا گونہ دیکھی  
رکھتی ہے جن کی وجہ سے آج وہ علمی دنیا کی نہایت محبوب زبان ہے۔ اور اُس کی یہ محبوبیت  
ہی دنیا کی اور زندہ زبانوں کے ساتھ ساتھ خود اس کی زندگی کی بھی ضامن ہے۔ اس زبان  
نے اس حیثیت سے انسانیت کی ناقابل فراموش خدمت انجام دی ہے کہ اُس نے زمانہ قدیم کی

# ادبیتا

## نیرنگ افق

از جناب میر تقی کاظمی امر دہوی

بیرنگ ہر اک نقش ہو بے آب ہو ہر رنگ  
کچھ اپنی طبیعت کا دکھاؤں میں اگر رنگ  
بے رنگ و کیرنگم و صدرنگم و ہر رنگ  
از داغ دورنگی نکم رنگ و گر رنگ  
از دیدہ عبرت نظر انداز ہر رنگ  
کیس چرخ گردو ہمہ دستے بدگر رنگ  
چاہے کہ درخشاں ہو ترا مثل گہر رنگ  
یوں بختہ ہوا خام کہ چڑھ جائے ہر رنگ  
جب تک ہو دل صاف تصوف کا نہ بھر رنگ  
کپڑا ہو جب اُجلا تو دکھاتا ہے اثر رنگ

رہتا ہی سوز محبت کا اگر رنگ  
ہو جائیگا حل حل کے مرادل بھی ہر رنگ

کس طرح بدلتا ہے جہاں شام و سحر رنگ  
قدرت کے شب روز میں کیا پیش نظر رنگ  
ہر دھوپ سنہری تو کہیں چاندنی اُہلی  
دن رات دکھاتے ہیں عجیب شمس و قمر رنگ  
بے برگ و ثمر ہیں کبھی پُر برگ و ثمر ہیں  
ہر فصل میں کس طرح بدلتے ہیں شجر رنگ  
نقشہ ہے الگ شکل نئی شان و نوکھی  
رکتے ہیں جدا شاخ و گل و برگ و ثمر رنگ  
گلشن ہر کہ گلدستہ نیرنگی فطرت  
کیا قدرت خالق نظر آتی ہے ہر رنگ  
اشدے نیرنگی قدرت کے کرشمے  
گلشن میں دکھاتا ہر نیا ہر گل تر رنگ

یک رنگی وحدت ہے بصد رنگی کثرت تو غور سے دیکھو تو ہر اک رنگ ہر رنگ

توحید کی یک رنگ قبا تن میں ہیں پہن لے

پھر شوق سے کر دہر میں نظارہ ہر رنگ

آشوب نہ ہو کچھ تری آنکھوں میں قلع ہرگز کوئی بھی نگاہوں کو نہ پہنچائی ضرر رنگ

کچھ دیر تو ک رنگ میں شان اپنی دکھا دے حو با صفت اک دم کئی تبدیل نہ کر رنگ

طاعت میں تری شاہتہ تک موند ریا کا ہشیار! ملائے نہ کہیں خیر میں شر رنگ

بوسیدہ و صد پارہ ترا فرش ہے گھر میں دروازہ کے پردے پڑے کھلنے کو نہ کر رنگ

بہ صورتی پاسے بہا اشکِ ندامت ہاں صورتِ طاؤس پئے رقص نہ پر رنگ

ہاں دیکھ نہ صورت ہی کو سیرت بھی پرکھ خوشبو بھی ہو گل کی نہ فقط مدِ نظر رنگ

سوئی کی طرح مُٹک کر ظاہر سے ہو بیتاب پھر دیدہ باطن سے بن اک پر خضر رنگ

نیرنگی عالم سے خبردار! خبردار! رکھتی ہے نیا دہر کی ہر ایک خبر رنگ

آکر ہیں یہاں منکریں جانے کی شبِ روز

ہر منزل گنتی کی اقامت بھی سفر رنگ

اس مجلسِ رنگیں میں تہمتِ سریر و تجرید اپنا ہی جہاں ہے ہر اک فردِ بشر رنگ

کیا قہر ہے کیا قہر ہے مسلم سادہ کیوں تیری طبیعت میں جہا جاتا ہر ہر رنگ

ہاں مصطفویٰ رنگ سے اچھا نہیں کوئی دنیا کے ملن کے ہیں مری پیشِ نظر رنگ

بیدار ہر دل تازہ ہر جاں روح شگفتہ

جب سے کہ تصور میں ہر وہ رویہ سحر رنگ

قرآن کے دامنِ مصفا کو پکڑ لے اور اپنی طرف سے کوئی تو اس پہ نہ کر رنگ



کوئین کی دولت کا یہ معمور حسن زینہ  
 دنیا بھی ہر دین بھی ہر معیشت بھی ہر اس میں  
 تو رنگ میں قرآن کے رنگیں ہو سراپا  
 رہبر ہوں ترے سیرت و ارشاد پیسر  
 حاصل ہر تجھے آج ہی دنیا کی خلافت  
 ہو غرق محبت صفت حمزہ و جعفر  
 ہو وقت جہاد و رہ حق صورت حیدر  
 شیدائے نبی صورت عثمان غنی بن  
 سرسبز ہو و سرخ ہو حسین کی صورت  
 باطل کی ہلاکت ہو کرے حق کی تھمت  
 تقدیر ہے خاکہ ترے اشکالِ عمل کا  
 یہ خوان ہے لاریب پُر از نعمت ہر رنگ  
 تصویرِ سیاست بھی نمایاں ہر ہر رنگ  
 پھر دیکھ کہ تیرا نہیں جہتا ہر کد ہر رنگ  
 ہر رنگ میں سنت کا ہے پیش نظر رنگ  
 نکھرے عملِ صالح و ایمان کا اگر رنگ  
 اخلاص میں دل صورت بوکر و عمر رنگ  
 خالد کی طرح پرچمِ تسخیر میں بھر رنگ  
 ہواں پیسر کا ترے پیش نظر رنگ  
 پی دل ہو عجم عشق، ادم عشق میں سر رنگ  
 میدان میں دکھائے یہ تری تیغ و سپر رنگ  
 تدبیر سے ان سادہ تصاویر میں بھر رنگ

تو حسنِ عمل پنا دکھا ہر زمِ عمل میں  
 ان جوشِ خطابت کو نہ لفاظ میں بھر رنگ

برفیز کہ ایں گرمی ہنگامہ چو برق است  
 ہر شعبہ تری زلیست کا دابستہ حق ہو  
 فطرت کے کمالات کا ایک آئینہ بن جا  
 ان غوطہ زین رنگ الہی ہو سراپا  
 انسان مکمل ہو اک انسانِ مکمل  
 دنیا کے ہر اک رنگ میں آجائے تغیر  
 دریاب کہ ایں فرصتِ ہستی است شر رنگ  
 خورشیدِ حقیقت کی تجلی ہو ہر رنگ  
 در صورت و در سیرت و در نقشہ و در رنگ  
 اس رنگ میں دل رنگ جگر رنگ نظر رنگ  
 بن پیکرِ اخلاقِ حکیمانہ ہر رنگ  
 پہلے نہ ترے رنگ الہی گا مگر رنگ

نیرنگ طبیعت کا یہ اظہار نہیں ہے      مغل میں جہاں ہے کسے مد نظر رنگ؟  
 بیتاب دلِ ملتِ اسلام ہو شاید      اشعار میں لایا ہے مرادِ جوہرِ رنگ  
 دسوزیِ ملت میں جگر خون کیا ہو      کیوں لائے نہ ہر ایک مرا مصرعِ ترنگ  
 آفاق میں کب ہی شفقِ سرخ نمودار  
 لایا ہی افق یہ تو مرا خونِ جگر رنگ

ندوۃ المصنفین دہلی کی جدید کتاب

## فہم قرآن

”فہم قرآن“ اردو زبان میں پہلی کتاب ہے جس میں فہم قرآن سے متعلق تمام قدیم و جدید نظریوں پر نہایت  
 مبسوط اور محققانہ بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید کے آسان ہونے کی حقیقت  
 کیا ہے، اور یہ کہ ”وحی الہی“ کا صحیح فہم حاصل کرنے کے لیے تاریخِ علیہ السلام کے اقوال و افعال کا معلوم  
 کرنا کیوں ضروری ہے، اس سلسلہ میں بعض جدید تعلیم یافتہ اصحاب کی طرف سے جو شکوک و شبہات  
 کیے جاتے ہیں ان کا بھی نہایت سنجیدہ و تشفی بخش جواب دیا گیا ہے، نیز مذہب وین حدیث، فقہ  
 وضع حدیث، اس فقہ کے اسناد، احادیث کے پایہ اعتبار، صحابہ کا عدول ہونا، کثرت سے  
 روایت کرنے بعض صحابہ کے سوانح حیات، دورِ تابعین کی خصوصیات اور دیگر اہم عنوانات پر  
 تفصیل سے کلام کیا گیا ہے۔ کتابت، طباعت اعلیٰ صفحات ۲۰۰ قیمت غیر مجلد ۵۰ مجلد نہری ۷۰،  
 منجر ندوۃ المصنفین قروہ بلغ نئی دہلی

# شاعر کی صبح

از مولانا قحوی صدیقی لکھنؤی پکچرار مدراس یونیورسٹی

سحر کے دکشا منظر سے کب یہ جی بہتا ہے  
چلتے ہیں جو غنچے، گل گریباں چاک تیرے  
جو برگ گل پہ کچھ شبنم کی بوندیں تلملاتی ہیں  
ہواؤں کے تھیردوں سے خوشائیں تھر تھرائی ہیں  
جو بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہو سینہ گل میں  
صبا کا پائے نازک جبکہ سرت رنگ بوہو کر  
نسیم صبح رنگیں روندتی ہے تپ تپ کو  
جز نازک نازم، ننھی پیوں پر اپنی اتر کر  
لب جو ننھی ننھی بوٹیاں جلیباتی ہیں  
ساتی گد گدتی ہے ہوا خاموش کلیوں کو  
ہو، نہیں سرسراتی اور غنچے لنگھاتی ہیں  
اردھر نہروں کی موجیں سطح سمیں پڑتی ہیں  
زحانیں کیوں میری آنکھوں سے بڑھتی ہیں آنسو  
جو چڑیاں چھاتی اور میٹھے راگ گاتی ہیں  
کسک سی کوئی بھردیتا ہے میری ہر گڈ پی

یہی معلوم ہوتا ہے کوئی دل کو سلتا ہے  
تو یہ دل اور بھی آغوش سینہ میں چلتا ہے  
خدا ہی جیسے دل کیوں خود بخود پڑا اچھلتا ہے  
تو، زک جلیوں سے کوئی دل پیو میں لٹا ہے  
اُمنگوں دلولوں کا جب کہ چشمہ سا اُبتا ہے  
دل ہر غنچہ گل کو شرارت سے کھلتا ہے  
خرم ناز اس کا فرش برگ گل کو ملتا ہے  
زمین کا چیر کر سینہ کوئی پودا نکلتا ہے  
جہاں موج ہوا کی کر ڈھیں پودا بدلتا ہے  
نظر حسرت سے تکتی، دل کف فوس ملتا ہے  
تو دل بیتاب ہو کر ہر گھڑی پہلو بدلتا ہے  
سفینہ دل کا سینہ کے سمندر میں چلتا ہے  
جو بہنے کے لیے سیلاب چشموں سے اُبتا ہے  
لب خاموش سے بیتاب اک نالہ نکلتا ہے  
جو پائے موج ہر ساحل سے ٹکرا کر پھسلتا ہے



ابھرتے ہیں جو موجوں کے جہاز، ٹوٹ چکے ہیں  
 نئی کونسل سحر کو بھڑکتی ہے جبکہ پودے میں  
 گزرتے ہیں ہزاروں سوکے قلب پریشاں  
 چمن کی پتیوں کے نرم و نازک سبز مخمل پر  
 بھانک رات جب جاتی ہے تاری سہ چھپا کر  
 ادھر یہ کیف، یہ مستی، یہ رنگینی، یہ رعنائی!  
 غرض ہر ایک نظارہ گلستاں کا، ایسا ہی  
 بجائے یہ کہ یہ اسرار قدرت کے مظاہر ہیں  
 نہ پوچھو حال کیا ہوتا ہے پیلوں مری دل کا  
 یہ نہا ہوا نظام محفلِ مستی یونہی قائم  
 گردیت پر کمزوروں کو اپنے دورِ بازو کی  
 بھرم رکھتا ہے وہ اپنا فریبِ آبادِ مستی میں  
 اسی کو ہر سر کھینچتا ہے اس برم گیتی میں  
 ثبوتِ زندگی دیتا ہے وہ اس باغِ نظریات میں  
 تو فرطِ سوزِ غم سے موم آسا دل نگھٹتا ہے  
 زمیں کا سنہ جو کوئی سبز فیروزہ اُگلتا ہے  
 دلی حساس پر گویا کوئی آرا سا چلتا ہے  
 ہوا کا تیر بھونکا آہ جب اتر لے کے چلتا ہے  
 آجالتِ صبح کا ہوتا ہے اور سو بچ نکلتا ہے  
 ادھر یہ حال، دل ہر منظرِ دلکش پہ چلتا ہے  
 سحر کے سحر ساں وقت میں اس دل کو کھلتا ہے  
 مری چھاتی ہے ہر نظارہ رنگ کا رنگ دلتا ہے  
 شجر جب پھیلتا، اور پھول کر موت پھلتا ہے  
 جو اوروں کو کچلتا ہے وہ خود بڑھتا ہی ملتا ہے  
 تب اطمینان سے دنیا کے رستے میں چلتا ہے  
 جو اپنی زندگی کی خاطر اوروں کو کچلتا ہے  
 پھسلتا بھی اگر ہے پاؤں تو اٹھ کر سنبھلتا ہے  
 سکوں جس کو نہیں ہر لمحہ اک پہلو بدلتا ہے

جو بال جھٹے حکمِ فطرت ہو کے اٹھ آئے  
 دلِ قحوی بھلا اس زندگی سے کیا سکوں پائے

# شؤونِ علمیہ

## عمرِ طبعی کا اوسط

اٹھارہویں صدی عیسوی میں انسان کی عمر کا اوسط <sup>۳۵</sup>بینتیس سال تھا لیکن انیسویں صدی میں یہ اوسط پچاس سال ہو گیا۔ اور اب آج کل مرد کی عمر کا اوسط ساٹھ سال اور عورت کی عمر کا اوسط چونسٹھ سال ہے۔ اوسط کی زیادتی کے باوجود یہ عجیب بات ہے کہ آج کل انسان اتنا زندہ نہیں رہتا جتنا کہ وہ گزشتہ زمانہ میں رہتا تھا۔ زندگی کے بیمہ کی کمپنیوں کا خیال ہے کہ آج کل انتہائی عمر ۱۰۶ سال ہے۔ وہیات متحدہ امریکہ میں ۳۰ فی ہزار آدمی ایسے ہیں جن کی عمر سو کو پینچی ہو۔

لیکن مصر کا معاملہ بالکل نرالا ہے، ایک طرف تو مصریوں کا حال یہ ہے کہ ان کے ہاں سب قوموں سے زیادہ بچے پیدا ہوتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے مصر میں تقریباً ۴۰ فی ہزار بچے ہر سال پیدا ہوتے ہیں، حالانکہ برطانیہ میں صرف ۱۰ فی ہزار، فرانس میں ۱۸ فی ہزار، اور جرمنی میں ۱۹ فی ہزار بچے پیدا ہوتے ہیں لیکن دوسری جانب شرحِ اموات میں بھی مصر بڑھا ہوا ہے۔ کیونکہ یہاں ۳۵ انسان فی ہزار ہر سال مرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصریوں کی عمر کا اوسط بہت ہی زیادہ کم ہے۔ یعنی مرد کے لیے ۲۴ سال، اور عورت کے لیے ۲۷ سال۔ اب اس کے ساتھ ہی ہم حجاب لگاتے ہیں کہ انسان کسی مفید عمل کا آغاز اٹھارہ برس کی عمر میں ہی کرتا ہے تو اس سے ثابت یہ ہوتا ہے کہ ایک مصری کے عمل کی کل مدت صرف پچھ سال ہے۔ جرمنی میں مرد کی عمر کا اوسط ۵۶ سال، انگلستان میں ۵۵ سال، فرانس میں ۵۲ سال، وراثتی میں ۴۹ سال ہے۔ البتہ ہندوستان

میں عمر کا اوسط ۴۳ ہے، تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ بہتر ہے کہ کسی شخص کے یہاں ایک بچہ پیدا ہو اور وہ پچاس سال تک زندہ رہے، یا یہ بہتر ہے کہ اس کے ان پانچ بچے پیدا ہوں اور وہ سب دس دس برس کی عمر پوری کرنے کے بعد مر جائیں؟

### مصنوعی تہرے

گذشتہ جنگ عظیم کے بعد صرف امریکہ میں تقریباً ایک ہزار آدمی ایسے تھے جن کے چہرے مکمل نہیں تھے یعنی ان میں سے کسی کی ناک اڑی ہوئی تھی کسی کا کان، اور کسی کی ایک آنکھ، کسی کا ایک رخسارہ غائب تھا، اور کسی کا ہونٹ۔ امریکہ کے ڈاکٹروں نے ان اعضاء کے بالمقابل دوسرے مصنوعی اعضاء لگانے کی کوشش کی۔ مگر وہ بعینہ قدرتی اعضاء کی طرح نہ بنا سکے۔ ان مریضوں پر ڈاکٹری کی اس ناکامی کا اثر یہ ہوا تھا کہ ان غریبوں کی زندگی اجیرن ہو جاتی تھی۔ کیونکہ غیر متوازن بناوٹی اعضاء کی وجہ سے ان کو سوسائٹی میں کیا خود اپنے گھر میں اچھی نظر سے نہ دیکھا جاتا تھا لیکن معلوم ہوا ہے کہ اب ان ڈاکٹروں کو نقل مطابق اصل کرنے میں کامیابی ہو گئی ہے۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر کا بیان ہے کہ کوئی شخص ان زخمیوں کی مسرت کا اندازہ نہیں کر سکتا جبکہ ان کا چہرہ بناوٹی اعضاء لگنے کے بعد مکمل ہو جاتا ہے۔ بالخصوص اس وقت جبکہ اصل چہرہ میں کوئی نقصان ہو، کیونکہ اس عمل جراحی کے بعد مصنوعی چہرہ قدرتی چہرہ کے مقابلہ میں کہیں زیادہ دلکش اور صاف ستھرا ہو جاتا ہے۔

### کیا نصف دماغ بیکار ہے؟

موجودہ زمانہ کے دماغی پریشین نے ایک نہایت عجیب و غریب حقیقت کا انکشاف کیا ہے۔



اب تک کون اس بات کا یقین کر سکتا ہے کہ انسانی دماغ کے ایک بڑے حصہ کو کاٹ دینے کے بعد بھی دماغ اور اعصاب اپنا صحیح کام انجام دے سکتے ہیں؟ لیکن ابھی حال میں پروفیسر بیرون سٹوکی نے نیویارک کی عصبی علوم کی انجمن میں اپنے متعدد تجربات کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ انسان کا آدھا دماغ بالکل بیکار ہے، اُس میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ بلکہ تجربہ سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض حالات میں اگر انسان اپنے نصف دماغ پر ہی اکتفا کرے اور نصف کا آپریشن کر کے اُسے نکال باہر کر دے تو یہ اُس کے لیے پورے دماغ سے زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے۔ پروفیسر بیرون نے کہا کہ میں نے ایک مریض کے دماغ کے اگلے حصہ کا جس میں ذکاوت اور فکر کی قوتیں مرکوز ہوتی ہیں، آپریشن کیا اور اس حصہ کی ایک جانب کو آلہ جراحی کے ذریعہ بالکل اڑا دیا، تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مریض میں ذکاوت کی قوت پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی اور وہ معاملہ کو پہلے سے زیادہ اچھے طریقہ پر سمجھنے لگا۔ پروفیسر موصوف کی رائے ہے کہ نصف دماغ کو اڑا دینا دماغ کے اڑا دینے سے بہتر ہے۔ پھر جو نصف باقی رہ جاتا ہے اُس میں دماغ کے چھ حصے سے زیادہ قوت فکر ہے۔ پروفیسر موصوف کی یہ بھی رائے ہے کہ دماغ کے جزا مقدم کے دو حصوں میں سے اگر صرف ایک حصہ کو اڑا دیا جائے تو اُس سے کوئی تکلیف نہیں پہنچتی۔ البتہ اگر دونوں حصوں میں سے ہر ایک سے کچھ کچھ حصہ ضائع کر دیا جائے تو اُس سے انسان میں عصبی امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔

بعض ڈاکٹروں نے یہاں تک کہا ہے کہ ایک شخص کے دماغ میں دخیل ہو گیا تھا اُس کے نصف دماغ کو جو دائیں جانب موتا ہے آپریشن کے ذریعہ بالکل ضائع کر دیا۔ اور پھر کھوپڑی میں بھیجے کے عرصہ کوئی مخلول چیز داخل کر دی۔ تو اس سے مریض پر کوئی ناگوار اثر نہیں ہوا اور وہ اپنے مریض سے نجات پا گیا۔

## عالمگیر انفلوئزہ کا خطرہ

آج کل یورپ کے اکثر علمی رسالوں اور اخباروں میں یہ خطرہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ غریب عالمگیر انفلوئزہ ایک وبا کی صورت میں پھیلنے والا ہے اس خطرہ کے احساس میں تو قریب قریب تمام ڈاکٹر ہی متفق ہیں، مگر اختلاف اس میں ہے کہ اس خطرہ کا سبب کیا ہے؟ بعض ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ یہ موذی مرنے میں ہمیشہ عالمگیر لٹرائیو کے بعد پھیلتا ہے، چنانچہ گزشتہ جنگ عظیم کے بعد بھی انفلوئزہ تمام دنیا میں وبا بن کر نمودار ہوا تھا، اس کے برخلاف بعض ڈاکٹر اس خطرہ کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ جنگ کی تخصیص نہیں، بلکہ انفلوئزہ طبعی طور پر ہر برس سال کے بعد پھیلتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء میں عالمگیر انفلوئزہ ہوا تھا۔ پھر ۱۹۱۹ء میں یہ وبا پھیلی اور اب پھر محسوس ہوتا ہے کہ اس بیماری کے جراثیم زمین کے ہر گوشہ میں موجود ہیں۔

دوسرے طبقہ کے ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ اعداد و شمار سے ثابت ہوتا ہے کہ انفلوئزہ اسے ہلاک ہونے والوں میں ۵۰ فیصدی وہ نوجوان مرد یا عورتیں ہوتی ہیں جن کی عمر سترہ اور چالیس سال کے درمیان ہوتی ہے یعنی اس مرض کا اثر ان جسام پر زیادہ ہوتا ہے جن میں عضلاتی اور اعصابی طاقت کی وجہ سے مرض کو روکنے کی قوت زیادہ ہوتی ہے۔ پس جب یہ اجسام ہلاک ہو جاتے ہیں تو انفلوئزہ ایس برس تک نظر رکھتا ہے تاکہ اُس کے لیے تازہ شکار مہیا ہو جائے۔

یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ ان دورانیوں میں سے کس طبقہ کی رائے قرین صواب ہے لیکن اس میں شبہ نہیں اگر اس میں سے ایک رائے بھی درست ہے تو انفلوئزہ کا خطرہ ضرور ہے۔ کیونکہ آج کل عظیم الشان جنگ بھی ہو رہی ہے اور پھر انفلوئزہ کی وبا کو پھیلے ہوئے بیس سال بھی ہو چکے ہیں۔ البتہ یہ طبعیات رکھنا چاہیے کہ اس میں برس کی مدت میں مغربی طب نے جو غیر معمولی ترقی کی ہے اس کے پیش نظر ایسی احتیاطی تدابیر کی جاسکتی

# تبصرہ

## رسائل

**”الندوہ“ لکھنؤ** مرتب:۔ سید ابوالحسن علی صدیقی اور عبدالسلام قدوائی صدیقی۔ صفحات ۱۱۲۔

تقریباً ۲۶۲۰ قیمت سالانہ غار۔ کاغذ کتابت، اور طباعت بہتر اسے کاچہ ”الندوہ“ بادشاہ باغ۔ لکھنؤ۔

یہ موقر جریدہ، ”دارالعلوم ندوۃ العلماء“ لکھنؤ کا ترجمان ہے جو مولانا سید سلیمان صاحب صدیقی کی زیر نگرانی ماہوار شائع ہوتا ہے۔ اب سے کچھ عرصہ پیشتر بعض ناخوشگوار حالات کی بنا پر بند ہو گیا تھا، مگر اب دارالعلوم کی ”انجمن طلبہ قدیم“ کے علمی و تعمیری ذوق و شوق نے اسے پھر حیات نو سے ہمکنار کر دیا ہے۔ اور اگرچہ یہ نقش ثانی، ابھی تک ”نقش اول“ کے درجہ پر نہیں پہنچ سکا، تاہم ہمیں امید ہے کہ اگر اب باب ندوہ کی توجہات اس کے شامل حال رہیں تو یہ اپنے سابقہ معیار کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا، اس کا مقصد جیسا کہ ”ورق عنوان“ سے ظاہر ہے، ”مسلمانوں کی تعلیمی اور تعمیری خدمت“ ہے، اور یہ اتنا عظیم و اہم مقصد ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی علمی بددوقی اور ذہنی نسبتوں کے استراکیہ دور میں اس قسم کی جتنی کوششیں بھی ہمارے سامنے آئیں ہمیں ان سب کا صدق دل سے خیر مقدم کرنا چاہیئے۔ اس وقت ”الندوہ“ کا مئی نمبر ہمارے پیش نظر ہے جس میں آٹھ مختلف عنوانات کے ماتحت ملک کے سنجیدہ اہل قلم حضرات کے مضامین شائع ہوئے ہیں۔

”سیرت کا مختصر پیام“ کے عنوان سے مولانا سید سلیمان ندوی کا ایک ریڈیائی مضمون بھی شامل ہے۔ ”اسلام کے قلعے“ مولانا ابوالحسن علی ندوی کا ایک مختصر اور اہم مقالہ ہے، اس مضمون میں عربی مدارس کی ضرورت حیات کا اظہار کیا گیا ہے۔



”بچہ اور تعلیم“ کے عنوان سے ایک مسلسل مضمون شائع ہو رہا ہے جس میں بچے سے متعلق مختلف اقوام کے تعلیمی نظام پر تاریخی روشنی ڈالی گئی ہے۔ شذرات میں عربی مدارس کو اجتماعی تنظیم کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، ہمیں امید ہے کہ علم دوست حضرات اس سالہ کی توسیع اشاعت میں کافی حصہ لیں گے۔ ”م“

”پیام حق“ لاہور مرتب:- غلام سرور ننگار۔ تقطیع ۲۰۰۲ صفحات ۶۴۷۔ قیمت سولہ روپے زیادہ آؤ

کاغذ کتابت اور طباعت عمدہ۔ مقام اشاعت ظفر منسزل تاج پورہ لاہور۔

ڈاکٹر اقبال مرحوم اپنی شاعرانہ عظمت اور مفکرانہ جلالت و برتری کے ساتھ اگر کسی زندہ قوم اور بیدار ملک میں پیدا ہوئے ہوتے تو آج ان کی یاد میں کتنے رسائل کتنے اخبارات کس قدر انجمنیں۔ کتنے کلب اور نہ جلنے کیا کیا چیزیں قائم ہو چکی ہوتیں۔ مگر خدا کی شان کہ اس نے اس شاعر اعظم کو پیدا کیا تو کہاں؟۔ غلام سرزمین پر جسے مندوستان کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ یہاں مرحوم کی کوئی یادگار قائم نہیں کی گئی قائم بہت سی ہوئیں لیکن چند کردہ اور ذاتی اغراض کی گھناؤنی بنیادوں اور نفس پرستیوں کے بھیانک خطوط پر۔ جس نے اپنا کاروبار چلانا چاہا اقبال کا نام اپنے تجارتی پراسپیکنڈ کے لئے استعمال کیا۔ یہیں آپ کے آس پاس بہت سی چیزیں ایسی ملیں گی جن پر یادگار اقبال کا لیبل لگا ہوا ہوگا۔ لیکن اگر آپ ان کی گہرائیوں کو ٹٹولیں گے اور حقیقت کو پہچانیں گے تو آپ کو ان میں اقبال کی محبت کا ایک بھی پہلو بے لوث نہ ملے گا۔ زیرِ منظر ”پیام حق“ بھی اب سے کچھ پہلے ڈاکٹر اقبال مرحوم ہی کی یاد میں جاری کیا گیا تھا۔ اور مقامِ شکر ہے کہ حالات مذکورہ بالا کی موجودگی میں یہ ماہنامہ محض نام کا ”اقبال“ نہیں بلکہ بڑی حد تک سنجیدگی اور علمی متانت کیساتھ اپنے مقصد کی زنجانی کر رہا ہے۔ اس کے فاضل مرتب ننگار صاحب اقبال سے وابستہ شخصیت رکھتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی یہ شخص اس طرح بہک بھی جاتا ہے کہ وہ اپنے نظریات و عقائد کی عینک سے اقبال کا مطالعہ

کرنے لگتے ہیں، یا کبھی کبھی بعض ایسے مضامین "پیغام حق" میں شائع کر دیتے ہیں جو رسالے کے اصل مقصد سے ہٹے ہوئے ہوتے ہیں! ہمیں امید ہے کہ آئندہ اس میں احتیاط برقی جائے گی۔ "م"

**"تصویرِ راپور"** مرتبہ برق زیدی۔ تقطیع ۲۷×۱۷ صفحات ۸۰ کاغذ عمدہ، کتابت، طباعت معمولی

قیمت سالانہ دو روپے چار آنے (۴/۰) تہہ ۱۔ نیچر "تصویر" راپور اسٹیٹ (لیوپی)

یہ مصور نامہ کچھ عرصہ سے راپور سے شائع ہونا شروع ہو رہا ہے، اس میں ادبی مضامین نظم و نشر کے ساتھ اچھے علمی و تاریخی مضامین بھی شائع ہوتے ہیں۔ لیکن رسالے کی صورتی و پوزیشن کارکنوں کی طبیعتوں پر چھائے ہوئے اس جو درد افسردگی کی غمازی کر رہی ہے، جس کا خود رسالے کے حق میں مضرت رساں ثابت ہونا لازمی ہے، اس وقت فروری و مارچ کا مشترک نمبر ہمارے سامنے ہے، جس کی کتابت اور طباعت کی فامیان ذوق سلیم پر نہایت گراں گذرنے والی ہیں۔ معلوم نہیں یہ بے توجہی کا نتیجہ ہے یا اس پرمردگی کا اثر جو ہم اس کے کارکنان کی طرف سے محسوس کر رہے ہیں۔ دونوں صورتوں میں رسالے کا جدوجہد حیات میں کامیاب ہونا امر محال ہے، ضرورت ہے کہ اگر باب تصویر اس طرف پورے طور سے توجہ دیں اور اس کے معیار کو ہر حیثیت سے بلند تر کرنے کی سعی کریں، تاکہ یہ اپنے لئے کوئی اچھا مقام حاصل کر سکے۔ "م"

**"مشہور دہلی"** مرتبہ: حکیم محمد تقی دہلوی۔ تقطیع ۳۰×۲۰ صفحات تقریباً ۵۰ کتابت طباعت عمدہ کاغذ معمولی، قیمت سالانہ ایک روپیہ۔ مقام اشاعت ہمتا منزل فراشخانہ دہلی۔

"مشہور دہلی" کا یہ نامہ اگرچہ تجارتی استفادہ کی غرض سے جاری کیا گیا ہے، لیکن ایک روپیہ میں یہ اچھے اچھے مضامین اپنے قارئین تک پہنچاتا ہے جو عام معلومات اور دلچسپی کے لحاظ سے کامیاب ہوتے ہیں، اس کے تازہ نمبر (مئی سنہ) میں ہندوستان کے مشہور ادباء و شعرا کے مضامین شریک اشاعت ہیں۔ "اصلاح تمدن" سر شہ سلیمان صاحب کا

ایک مفید مضمون ہے۔ اور سورج دیوتا ڈاکٹر سعید احمد بریلوی کی علمی کاوش ہے اور بہت پر مغز۔ افسانہ نگاروں میں انصار ناصر، فضل حق قریشی اور شعراء میں تجوید ہلوسی، جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری جیسے حضرات نمایاں نظر آتے ہیں مجموعی حیثیت سے یہ رسالہ اچھا ہے، لیکن ضرورت ہے کہ اس میں زیادہ سے زیادہ تنوع پیدا کیا جائے، کیونکہ رسالہ کا اصل مقصد اس طرح کا میانی حاصل کرے گا۔

”م“

**”مسافر مراد آباد“** اراکین ادارہ۔۔ کوکب مراد آبادی۔ رئیس امر دہی۔ عادل ادیب مراد آبادی تقطیع ۳۰۰۰۰

صفحہ ۸۸۔ قیمت سالانہ دو روپے۔ مقام اشاعت، مسافر خانہ اسلامیہ مراد آباد، کاغذ معمولی، کتابت طباعت متوسط۔ یہ ایک ادبی ماہنامہ جو چند ادب دوست اور باہمت نوجوانوں کی متحدہ کوششوں سے جاری ہوا ہے۔ قریب قریب ایک تمام مضامین کا ادارہ کی رنگینی طبع کا اظہار کرتے ہیں، اور عام ذوق و دلچسپی سے بہت قریب ہیں، سب لہ میں تنوع پیدا کرنے اور دلچسپیوں کو بڑھانے کے لئے اس کا عملہ ادارت ہمیشہ کوشاں رہتا ہے اور ضرورتوں میں ہی اس کا خیال رکھتا ہے۔ کچھ عرصہ سے اس کے آخر میں ماہنامہ ”صفت نازک“ بھی شامل کر دیا گیا ہے، جو پہلے عنایت مجید بیگم کے زیر ادارت لاہور سے شائع ہوتا تھا۔

ہم نہایت خلوص کے ساتھ ارباب مسافر سے گزارش کریں گے کہ وہ ٹھنڈے دل کے ساتھ غورو فکر سے کام لیں، اپنے جلدی کو سوائے عالم شبابیات سے بچائیں، اور صرف وہ مضامین مسافر میں شائع کریں جو نوجوانوں میں صحیح معنی میں ذہنی ارتقاء کے ساتھ فکری و عملی بیداریاں پیدا کرنے کے اہل ہوں، وقت کی ضرورتوں کو پہچانیں اور اپنے فرائض کو سمجھنا ہی انسانی زندگی کی قیمتوں کو بند کرتا ہے اور دماغی عبادتیں انسان کو تباہیوں کے سب سے گہرے غار میں پھینک دیتی ہیں، ہمیں توقع ہے کہ ہماری اس مخلصانہ گزارش کی طرف توجہ دی جائیگی۔

”م“



جوہر مراد آباد تقطیع ۳۰۲۲ صفحات ۷۲، قیمت سالانہ ۳۳۳، کاغذ عمدہ، کتابت اور طباعت نہایت معمولی۔  
مقیم اشاعت: ایوان ادب مراد آباد۔

ہر سالہ بزم مغلیہ مراد آباد کا اہم ترین جریدہ ہے، اس کے مدیر اعزازی سید راحت مولائی ایم اے ہیں جن کے علمی و تنقیدی مضامین اکثر ادبی رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں اور اس طرح یہ ملک میں ایک ادیب کی حیثیت سے خود کو پیش فرما چکے ہیں۔ اس وقت جوہر کا اپریل نمبر ہمارے سامنے ہے جس میں کئی مضمون ایسے ہیں جو پہلے دوسری جگہ شائع ہو چکے ہیں۔ باقی اکثر مضامین سطحی ہیں افسانے بھی فنی اعتبار سے کوئی خاص جگہ پانے کے مستحق نہیں۔ گلوں کا ننان کسی طرح بھی مزاحیات میں شامل کرنے کے قابل نہیں۔ زیادہ سے زیادہ اسے پھلور پن کہا جاسکتا ہے۔ مولانا محمد علی مرحوم کے سوانح حیات بھی اس میں شائع کیے جا رہے ہیں جو جناب راحت صاحب کے قلم گوہر بار کی تراش کا نتیجہ ہیں، زیر نظر نمبر میں محمد علی کا مذہب کے عنوان سے اس کی دوسری قسط شائع ہوئی ہے جو زیادہ تر راحت صاحب کی ذہنیت اور ان کے ذاتی عقائد و خیالات کی ترجمانی کرتی ہے۔ ادارہ جوہر کو اس کے ظاہری معوی بیجا گو بلند کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

پیام نسواں لکھنؤ زیر ادارت شمیم آرا بیگم نمبر ۲۰۲۰ صفحات ۷۲ کاغذ کتابت اور طباعت عمدہ، قیمت سالانہ دو روپیہ۔ پتہ منیجر پیام نسواں لکھنؤ۔

صنف نازک کا یہ ماہنامہ دو تین سال سے لکھنؤ سے شائع ہو رہا ہے، اگرچہ اس پر انسانی رنگ غالب ہے تاہم اس میں مفید تاریخی اور معلوماتی مضامین بھی دلچسپ انداز بیان کے ساتھ شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اکثر اشاعتوں میں بعض افسانے "باقی آئندہ" لکھ کر نامکمل چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ یہ بہت بھونڈا طریقہ ہے اور صرف طویل علمی مضامین کے سلسلہ میں اسے گوارا کیا جاسکتا ہے۔ یہی رسالہ کوئیکر شباب و شعر بنادینا بھی کسی طرح مناسب نہیں۔ اس لیے ہمیں امید ہے کہ پیام نسواں میں

صرف ان پاکیزہ انسانوں اور ایسے عمدہ مضامین کو جگہ دی جائیگی جو صحیح معنی میں عورتوں کے لیے مفید ثابت ہو سکیں اور جن کا مقصد تباہ کن بیداری پیدا کرنا نہ ہو بحیثیت مجموعی یہ رسالہ کامیاب ہے۔ ”ج“

## اخبارات

احرار سہارنپور | زیر ادارت مولوی سعید احمد صاحب دیوبندی صفحات ۱۰۰ سفید چمکا کاغذ۔  
کتابت اور طباعت نہایت عمدہ قیمت سالانہ ۱۰ فی پرچہ اردو دفتر اخبار احرار سہارنپور سے طلب فرمائیے  
یہ ایک سنجیدہ اور علمی سر روزہ اخبار ہے اور صحافت کے اس بدنام دور میں ملک و ملت کی صحیح اور بہترین خدمات انجام دے رہا ہے، لیڈنگ آرٹیکل اور بعض مستقل عنوانات کے ذیل میں وقت کے ضروری مباحث پر سنجیدگی اور اصابت رائے کے ساتھ روشنی ڈالی جاتی ہے، تراجم خصوصی کے ذیل میں پُر از معلومات مقالے شائع ہوتے ہیں اور یہ اس اخبار کی ایک امتیازی خصوصیت ہے، خبروں کی فراہمی کی رفتار البتہ کسی حد تک کمزور ہے لیکن اس کے پر جوش و باہمت کارکنان کی طرف سے یقین ہے کہ ان کی مساعی پیہم بہت جلد اس خالی کو دور کرنے میں کامیاب ہوں گی۔ ہم اخبار میں حضرات سے پُر زور اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس کی توسیع اشاعت میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں، تاکہ یہ اخبار اپنی خدمات کو پورے استقلال و کامیابی کے ساتھ جاری رکھ سکے۔

”الہلال“ ٹینہ | ایڈیٹر: ذکریا فاطمی صاحب، صفحات ۶ کتابت اور طباعت بہتر قیمت سالانہ ۱۰ فی پرچہ اردو دفتر اخبار الہلال ٹینہ سے طلب کیجیے۔

یہ اخبار ہفتہ وار ہے اور جمعیتہ العلماء صوبہ بہار کا ترجمان ہے۔ اس کے انتہائی مقالات میں عادت حاضرہ پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور ان پرستین و سنجیدہ تبصرہ کیا جاتا ہے۔ خبروں کا حصہ بہت کافی ہوتا ہے جن میں ہفتہ بھر کی تمام ضروری باتیں مختصر مختصر شائع کر دی جاتی ہیں مجموعی حیثیت

سے اخبار بہتر ہے۔

”ہندوستان“ بمبئی | زیر ادارت مولانا رئیس احمد صاحب جعفری ندوی، تقطیع ۲۲ پ ۳۶ صفحات  
قیمت ساڑھے مائے، فی پرچہ ار کاغذ معمولی، کتابت اور طباعت متوسط۔ ملنے کا پتہ :- روزنامہ  
”ہندوستان“ ٹیکو اسٹریٹ بمبئی ۷۔

مولانا رئیس احمد صاحب جعفری پرانے اخبار نویس ہیں۔ اور اپنی عمدہ تصنیف سیرت  
محمد علیؐ کے باعث اردو خواں طبقہ میں کافی روشناس ہیں۔ آپ مدت تک اخبار خلافت  
کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے، وہاں سے تعلق منقطع کرنے کے بعد آپ کئی ماہ  
روزنامہ ”ہندوستان“ نکال رہے ہیں، یہ اخبار تازہ بہ تازہ خبریں بہم پہنچانے میں نمایاں مقام رکھتا  
ہے۔ خبروں کے اہتمام کے علاوہ ہر شاعت میں ایک نہ ایک مسلسل صلاحی اور مندرجہ شرتی  
بھی ہوتا ہے جو زبان و بیان اور خیالات کے اعتبار سے ہر سنجیدہ مذاق شخص کے پڑھنے کے  
لائق ہوتا ہے۔ البتہ ہم اپنے محترم دوست سے یہ ضرور عرض کرینگے کہ قوم میں سیاسی اور دماغی  
بیداری پیدا کرنے کی غرض سے ہر قومی اخبار کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ وہ ملک کے سیاسی معاملات  
پر جذبات سے الگ رہتے ہوئے غیر جانبدارانہ تبصرہ کرے۔ صحافتی عظمت کا تقاضا ہے کہ  
وہ صرف کسی ایک پارٹی کی ترجمانی کے بجائے ملک کے سیاسی حالات پر بالکل آزاد تنقید  
کے۔ تاکہ تمام پارٹیاں اس تنقید کی روشنی میں اپنے پروگرام اور عمل کی اصلاح کر سکیں، مونس  
رئیس احمد صاحب کی ایک وقت ”ندویت و جامعیت“ سے توقع ہے کہ ہماری اس مخلصانہ  
کڑاوش پر غور فرمائینگے۔ ”م“

## کتابیں

پھول اور کانٹے | از گوپال منل صاحب بی۔ اے۔ ناشر: مکتبہ اردو لاہور صفحات ۹۶ ساڑھے ۲۰ پیچ



کاغذ متوسط درجہ، کتابت طباعت بہتر قیمت ۶۔

یہ کتاب چند چھوٹے چھوٹے افسانوں کا مجموعہ ہے، طرز تحریر دلکش، زبان صاف اور سادہ ہے۔ افسانے عریں، شبایات اور جنسی محرکات سے پاک ہیں، مصنف کا مقصد موجودہ سوشلسٹ کی خامیوں کے خلاف مدلل احتجاج بلند کرنا ہے۔ طبیعت کا رجحان اشتراکیت کی جانب مہم ہوتا ہے۔ اس لیے افسانوں میں نامعلوم طور پر اس کا عکس پایا جاتا ہے۔ ان افسانوں میں "شیطان کا عدم تعاون"، "انتقام" اور "پشپا" مقصد تصنیف میں زیادہ کامیاب ہیں۔ "ج" کیونسٹ مینی فیسٹو | راشنالی منشور، مترجمہ باری صاحب۔ ناشر مکتبہ اردو لاہور صفحات ۶۴،

سائز ۳۰x۳۰ کاغذ متوسط کتابت طباعت بہتر قیمت ۶۔

کارل مارکس اور اینگلس مشہور اشتراکی قائد ہیں جنہوں نے گذشتہ صدی میں ایک مینیفیسٹو اس لیے شائع کیا تھا کہ دنیا پر یہ واضح کیا جائے کہ اشتراکیت کیا چاہتی ہے اور دنیا کی اقتصادی بہبودی صورت اس میں مضمر ہے۔ اور سرمایہ دارانہ نظام کی بربادی کے لیے صرف یہی ہتھیار کام دے سکتا ہے۔ قریباً ایک صدی کے اندر اندر دنیا کی کوئی زندہ زبان ایسی نہیں ہے جس میں اس منشور کا ترجمہ نہ ہو چکا ہو، پھر اردو اس سے کیوں محروم رہتی۔

باری صاحب مشہور اشتراکی ادیب ہیں، یہ ترجمہ ان ہی کی جنبش قلم کار میں منت ہی اشتراکیت کی حقیقت اور اس کے مفید و مضر ہونے کی بحث سے قطع نظر یہ ترجمہ اصل منشور کی صحیح روح پیش کرتا ہے اور اردو لٹریچر میں ایک بہترین اضافہ ہے۔ "ج"

از عبد اللہ ملک ناشر مکتبہ اردو لاہور۔ صفحات ۷۷۔ کاغذ متوسط درجہ

سرمایہ داری

کتابت طباعت عمدہ۔ سائز ۳۰x۳۰ قیمت چھ آنے (۶)

عبد اللہ ملک اسلامیہ کالج لاہور کے ایک مہربان عالم علم ہیں۔ سرمایہ دارانہ سسٹم سے

بیزار اور — اشتراکیت کی جانب مائل نظر آتے ہیں۔ "سرمایہ داری" اسی جذبہ کا ایک نقش ہے۔ اور بہت کامیاب! سرمایہ داری کس حقیقت کا نام ہے یہ کیسے آتی ہے، غنی اور سرمایہ دار میں کیا فرق ہے۔ ایک محمود اور دوسرا ملعون کیوں ہے سرمایہ داری کے انسداد کی بہترین صورت کیا ہے اشتراکیت یا اسلامی معاشی نظام؟ یہ اس قدر اہم مباحث ہیں جو ایک مختصر سالہ میں پوری طرح ادا نہیں ہو سکتے۔ مفصل بحث کے بغیر ان مسائل کی حقیقی روح سامنے نہیں آ سکتی۔ مصنف کے پیش لفظ کے یہ جملے اس خیال کی مزید تائید کرتے ہیں۔

جب انسانیت طاقتوں کے ہاتھوں ٹڈیال ہو چکی تو مذہب نمودار ہوا۔ اور انسانیت مذہب کے تیشوں سے مجروح ہونے لگی، اس طرح سے سلامتی و آشتی کا پیغامبر "مذہب" گونا گوں مظالم کا محرک ہوا۔ اس خون سے جو مذہب اور خدا کے نام پر بہایا گیا، آج بھی انسانی تاریخ لالہ زار بنی ہوئی ہے۔ تاہم سرمایہ داری سے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ پسندیدہ اور خوب ہے۔

"ح"

قرآن مجید کی مکمل ڈکشنری  
 اردو میں سب سے پہلی کتاب جو جس میں قرآن مجید کو تمام لفظوں  
 کو بہت ہی سہل اور دلنشین ترتیب کے ساتھ جمع کیا گیا ہے۔ معنی  
 کے ساتھ ہر لفظ کی ضروری تشریح بھی کی گئی ہے۔ یہ کہنا ہے مبالغہ ہے کہ لغت قرآن پر اردو زبان میں اب تک  
 ایسی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ کتاب عالم پڑھے لکھے مسلمانوں کے علاوہ انگریزی داں اصحاب کے لئے  
 خاص طور پر مفید ہے۔ اصل قیمت للیبر رعایتی قیمت للیبر، فہرست کتب مفت طلب فرمائیے۔  
 منیجر کتب برہان قزوین ساغ نئی دہلی

عالم اسی کے نور سے پر نور ہو گیا "مشہور ایک روز میں مشہور ہو گیا"

مشہور

یہ علمی، ادبی، ادبی اور مصوٰر رسالہ نہایت آب و تاب اور پابندی دقت کے ساتھ دہلی سے  
 شائع ہو رہا ہے۔ اس میں بہترین علمی، ادبی، تاریخی اور طبی مضامین اور بہترین اخلاقی، اصلاحی اور  
 مزاحیہ، فسانے، معلوماتی مقالے، اور ادب لطیف کے جو اہم پارے شائع ہوتے ہیں۔  
 ملک کے مشہور ادیب، شاعر، افسانہ نگار اور ماہرین فن طب اسکے صفحات کو رونق بخشتے ہیں۔  
 اور سراج المطلب، نثر الحکماء، عالی جناب خان صاحب حکیم حاجی محمد سراج الدین خاں صاحب دہلوی نے  
 اس کی سرپرستی فرمائی ہے۔ ان تمام خوبیوں اور گونا گوں دلچسپیوں کے باوجود اس کی قیمت صرف  
 ایک روپیہ سالانہ ہے۔ نمونے کا پرچہ مفت طلب فرمائیے +

مقام اشاعت: ممتاز منزل، فراشتانہ دہلی



## ”نبی عربی صلعم“

تالیف مولانا قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی (ذیلندوۃ المصنفین دہلی)

تاریخ اسلام کے ایک مختصر اور جامع نصاب کی ترتیب ”ندوۃ المصنفین“ دہلی کے مقاصد میں ایک ضروری مقصد ہے، نیز نظر کتاب اسی سلسلہ کی پہلی کڑی ہے جس میں متوسط استعداد کے بچوں اور بڑوں کیلئے سیرت سرور کائنات صلعم کے تمام اہم واقعات کو تحقیق جامعیت اور اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، کتاب کی چند خصوصیتیں حسب ذیل ہیں۔  
۱۔ واقعات کے بیان میں تاریخی ترتیب کا لحاظ رکھا گیا ہے، مگر مضامین کے ربط و تسلسل کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا گیا۔

۲۔ حسب موقع و ضرورت واقعات کے اسباب و علل سے بھی پہل انداز میں بحث کی گئی ہے۔

۳۔ طرز ادب میں زبان کی کیسانیت، سہولت، سلاست، اور سادگی و شگفتگی کا غیر معمولی طور پر اہتمام کیا گیا ہے۔

۴۔ تمام واقعات عربی کی قدیم و جدید سیرت کی معتبر و مستند کتابوں سے لئے گئے ہیں۔

۵۔ کتاب کے آخر میں ایک نقشہ دیا گیا ہے جس میں سیرۃ نبوی کے تمام واقعات مشہورہ کو تاریخ وار اور سن

وار بیان کیا گیا ہے، اس نقشہ سے سیرۃ کے تمام واقعات بیک نظر سامنے آ جاتے ہیں۔

اسکول کے لڑکوں کے علاوہ جو اصحاب تھوڑے وقت میں سیرۃ طیب کی ان گنت برکتوں سے بہرہ اندوز ہونا چاہتے

ہیں، ان کو اس کتاب کا خاص طور پر مطالعہ کرنا چاہئے، یہ کہنا مبالغہ سے پاک ہے کہ ”نبی عربی“ اپنے طرز کی

بالکل جڑ اور بے مثل کتاب ہے، کتابت، طباعت، نہایت اعلیٰ، ولایتی سفید چکنا کاغذ، صفحات ۱۲۰۔

قیمت مجلد ستھری ایک روپیہ (غیر مجلد بارہ آنے ۱۲) صرف پتہ ذیل سے طلب فرمائیے۔

نیچر ندوۃ المصنفین۔ قزول باغ۔ نئی دہلی



# نئی کتابیں

**مضامین محمد علی حصہ اول دوم**۔ مولانا محمد علی کی سیاسی، مذہبی، ادبی، اور اجتماعی زندگی کی سرگرمیوں کا نہایت

دلآویز مرقع جس میں ان کی شخصیت، وطن، ملت کے مسائل، سیاسی اور اجتماعی تحریکات کی شکل میں پیش کی گئی۔ ہندوستان کے سب سے زیادہ ہنگامہ خیز دور کی تاریخ اور خود مولانا کے گوہرِ براقلم سے خود نوشت سوانح عمری بھی ہے اور ہندوستان کی سیاسی تاریخ بھی

**حصہ اول**۔ اس مجموعہ میں خود مولانا کی آپ بیتی، ملت کے مسائل، مسلمان اور متحدہ قومیت، انگریزوں کی سیاست، مسلم یونیورسٹی

ہندوستان کے مقتدر شخصیات، مسلمان اور آزادی، بادشاہت اور جمہوریت جیسے اہم اور بنیادی مسائل پر بصیرت افروز

مضامین ملیں گے۔ ہندی مسلمانوں کی زندگی کے گونا گوں پہلو سمجھنے کے لئے اس کتاب کا پڑھنا ضروری ہے۔ قیمت بیکار

**حصہ دوم**۔ یہ مجموعہ اس ہنگامہ خیز دور کی پوری تاریخ ہے، جو ۱۹۴۷ء سے شروع ہو کر ۱۹۴۷ء پر ختم ہوتا ہے، سرسید کانگریس کی

مخالفت کس بنا پر کی ہے؟ وہ مسلمانوں کو تمام سیاسی تحریکوں سے الگ رکھنے پر کیوں مصر تھے، اسلامی سیاست کا یہ مسلک و

ناداری آخر میں کیا رنگ لایا؟ مسلم لیگ کا قیام کہاں اور کیسے عمل میں آیا؟ لیگ انگریز دوستی کی روش سے ہٹ کر کیوں کانگریس سے ہٹا ہوا

ہونے پر مجبور ہوئی۔ اور کس طرح دونوں کی راہیں الگ الگ ہوئیں۔ قیمت بیکار

**جوہر عبدالحق نمبر ۱**۔ ڈاکٹر مولانا عبدالحق صاحب مستند انجمن ترقی اردو کی سترویں سالگرہ کے موقع پر مکتبہ جامعہ طلباء جامعہ کی انجمن اتحاد کے

آئین سالہ جوہر کا ادبی اور نمبر شائع کیا ہے جس میں اردو زبان پر ملک کے سربراہ اور وہ صاحب قلم مثلاً علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالحق

دریابادی، ڈاکٹر سید عابد حسین، پروفیسر حامد اللہ افسر، پروفیسر سراج احمد فانی، وغیرہ کے تنقیدی ادبی اور تاریخی مضامین کے علاوہ مولانا

عبدالحق صاحب کے حالات اور خدمات پر ایسے لوگوں کے مضامین ہیں جو مولانا کی خلوت، جلوت، شناسا اور واقف کار ہیں۔ اس کے علاوہ

ملک کے سربراہ اور وہ رہنماؤں اور قائدین ملت کے پینامات بھی شریک شاعت ہیں۔ قیمت مجلد بیکار

**اسلام کیسے شروع ہوا**۔ جناب عبد الواحد سندھی صاحب نے اسلام کی ترویج کے اسباب بیان کئے ہیں۔ ان سے ظاہر

ہوتا ہے کہ اسلام مسلمانوں کے اچھے اعمال کے باعث دنیا میں پھیلا۔ اس میں اسلام کی صحیح روح پیش کی گئی ہے۔ ۳۰۰ صفحہ قیمت مجلد بیکار

**صدر دفتر مکتبہ جامعہ نئی دہلی**

مقامی شاخ۔ جامع مسجد دہلی

دیگر شاخیں۔ ۱۔ لواری دروازہ لاہور ۲۔ امین آباد کنوئیں ۳۔ پرنس بلڈنگ جے جے اسپتال بھی

ایجنسیاں۔ ۱۔ کتاب خانہ عابد شاہ، حیدر آباد کن، سابقاں بڈ پور بھور ہندرو، پٹنہ

۲۔ سرحد بک ایجنسی، بازار قصبہ خوانی، پشاور۔



# اسلام کا اقتصادی نظام

تایف مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب سیداری

اس کتاب میں اسلام کے پیش کیے ہوئے اصول و قوانین کی روشنی میں اس کی تشریح کی گئی ہے کہ دنیا کے تمام اقتصادی نظاموں میں صرف اسلام کا اقتصادی نظام ہی ایسا نظام ہے جس نے محنت و سرمایہ کا صحیح توازن قائم کر کے اعتدال کا راستہ پیدا کیا ہے۔ اس وقت اقتصادی مسئلہ تمام دنیا کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ سرمایہ داری کی تباہ کاریوں سے تنگ آئی ہوئی قوموں کے سامنے سب سے اہم سوال یہ ہے کہ وہ کونسا نظام ہے جس کا اختیار کر کے ایک انسان کو انسانوں کی طرح زندہ رہنے کا حق مل سکتا ہے۔ آپ اگر اسلام کی اقتصادی وسعتوں کا مکمل نقشہ دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ضرور ملاحظہ فرمائیے۔ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ صفحات ۳۶۴۔ قیمت مجلد ۱۰۰ غیر مجلد ۵۰

## سوشلزم کی بنیادی حقیقت

مترجم سید معنی الدین صاحب شمس الیم

اشتراکیت کی بنیادی حقیقت اور اس کی اہم قسموں سے متعلق مشہور جرمن پروفیسر کارل ڈیل کی آٹھ تقریریں جنہیں پہلی مرتبہ اردو میں منتقل کیا گیا ہے، ان کے ساتھ سوشلزم کے حالات اور اس کی موجودہ رفتار ترقی کے متعلق مترجم کی جانب سے ایک مہسود اور محققانہ مقدمہ بھی شامل ہے، کتابت طباعت کاغذ نہایت عمدہ صفحات ۲۰۴۔ قیمت مجلد ۱۰۰ غیر مجلد ۵۰

## ہندوستان میں قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ

آلہ ہندوستان میں قانون شریعت کے نفاذ کی مکمل عملی تشکیل پر پہلا بصیرت افروز مضمون جس میں دارالقضا کے مقاصد کی تشریح، حکم قضا کی مالی مشکلات کے حل، قاضیوں کے انتخابی شرائط اور ان کے تعلیمی نصاب پر نہایت مفید اور جامع بحث کی گئی ہے۔ نیز مضمون کی تمہید میں موجودہ محڈن لا کی تمام قابل ذکر دفعات پر زبردست تنقید کی گئی ہے۔ صفحات ۴۸۔ قیمت ۳۰

منہج مزدۃ المصنفین قریب باغ نئی دہلی



## قواعد

(۱) بران ہر انگریزی مہینہ کی ۱۵ تاریخ کو ضرور شائع ہو جاتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ علم و زبان کے معیار پر پورے اتریں بران میں شائع کیے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاک خانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دے دیں، ان کی خدمت میں رسالہ دوبارہ بلا قیمت بھیج دیا جائیگا۔ اس کے بعد شکایت قابل اعتنا نہیں سمجھی جائیگی۔

(۴) جواب طلب امور کے لیے آرکائیٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا ضروری ہے۔

(۵) بران کی ضخامت کم سے کم اسی صفحہ ماہوار اور ۶۰۰ صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

(۶) قیمت سالانہ پانچ روپیے۔ ششماہی دو روپیے بارہ آنے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸

(۷) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھیے۔